جلد اول

34

خاص نمبر

1857

تاریخ پبلی کیشنز کا کتابی سلسلہ

سہ ماہی

تاریخ

ایڈیٹر: ڈاکٹر مبارک علی

تاریخ پبلی کیشنز

18- مزنگ روڈ لاہور

خط وکتابت (برائے مضامین)

بلاک 1، اپارٹمنٹ ایف۔ برج کالونی، لاہور کینٹ

فون: 042-6665997

ای میل: mubarakali21@yahoo.com

خط وکتابت (برائے سرکولیشن)

پبلشرز	:	تاریخ پبلی کیشنز
		18-مزنگ روڈ، لاہور
فون	:	042-7236634
قیمت فی شمارہ	:	160 روپے
سالانہ	:	400 روپے
قیمت مجلد شمارہ	:	200 روپے
بیرون ممالک	:	2000 روپے (سالانہ معہ ڈاک خرچ)
		رقم بذریعہ بنک ڈرافٹ بنام فکشن ہاؤس لاہور، پاکستان
اہتمام	:	ظہور احمد خاں
کمپوزنگ	:	فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز	:	سید محمد شاہ پرنٹر، نزد دربار آئی ہسپتال
سرورق	:	عباس
تاریخ اشاعت	:	جولائی 2007ء
تقسیم کار	:	فکشن ہاؤس
		18-مزنگ روڈ، لاہور
فون	:	042-7249218-7237430
ای میل	:	fictionhouse2004@hotmail.com

فہرست

جلد اول

☆ابتدائیہ 5

☆واقعات کی زمانی ترتیب 7

☆نقشہ 11

☆عظیم اللہ خاں 13

☆محمد حسین آزاد 14

مضامین

☆بغاوت اور اس کی تاریخ نویسی: ایک جائزہ بسواموئے پائی/ترجمہ: ظفر علی خان 17

☆جنگ آزادی کے مختلف تناظر شاہد امین/ترجمہ: ڈاکٹر ناظر محمود 23

☆مخفی تاریخ نین جوت لہری/ترجمہ: ڈاکٹر ناظر محمود 29

☆تاریخ کا عوامی رنگ عرفان حبیب/ترجمہ: پروفیسر طفیل ڈھانہ 34

☆1857: تاریخ کی تشکیل نو ڈاکٹر مبارک علی 46

☆1857 کو کیسے یاد رکھنا چاہئے؟ ڈاکٹر مبارک علی 58

☆1857 کا عرس یا 1857 کی یاد	دیپش چکر بارتی/ترجمہ: ڈاکٹر صولت ناگی	65
☆انڈیا میں عوامی جنگ کا آغاز	کوشک رائے/ترجمہ: ڈاکٹر صولت ناگی	79
☆ماضی کو دوبارہ سے متحرک کرنا	بدری نریان تیواری/ ترجمہ: ڈاکٹر صولت ناگی	105
☆1857 کی بغاوت کے بارے میں	پیٹر روب/ترجمہ: ڈاکٹر صولت ناگی	123
☆برطانیہ میں انڈینز کے لئے 1857 کے بہت سے معنی	مائیکل ایچ فشر/ترجمہ: ڈاکٹر صولت ناگی	147
☆تاریخ بحیثیت انتقام اور مکافات	جیوتر میا شرما/ترجمہ: ڈاکٹر صولت ناگی	173
☆1857 کی باغی فوج	سہائے، ایس، جی، داس گپتا/ ترجمہ: ڈاکٹر صولت ناگی	184
☆بغاوت پہ لکھے گئے ناول	ایشوریا لکشمی/ترجمہ: پروفیسر طفیل ڈھانہ	198
☆1857 کے سپاہی کون تھے؟	امریش مسرا/ترجمہ: ظفر علی خان	224
☆ہماری تاریخ میں 1857	پی۔سی۔جوشی	227
☆1857: چند سوال اور حقیقتیں	اشفاق سلیم مرزا	333
☆جنگ آزادی 59-1857، کسانوں کی انقلابی جدوجہد	پروفیسر طفیل ڈھانہ	356
☆1857 سے متعلق تصاویر		369

ابتدائیہ

1857 کی جنگ آزادی کو ڈیڑھ سو سال کا عرصہ گذر گیا ہے۔ اس کی تاریخ جواب تک چھپی اور فراموش شدہ تھی اسے دریافت کے بعد ہندوستانی نقطۂ نظر سے سامنے لایا جا رہا ہے۔ ہندوستان میں اس سلسلہ میں کانفرنسیں اور سیمینار بھی ہوئے اور 1857 کے نئے پہلوؤں پر تحقیق بھی ہوئی، لیکن پاکستان میں چند نشستوں کے علاوہ اس پر توجہ نہیں دی گئی، اس کی کیا وجہ ہے؟ ایسا تو نہیں ہے کہ ہماری تاریخ نویسی میں کولونیل دور کو شاندار بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور اس کی مخالفت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم آج بھی امپیریل ازم کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے جھجکتے ہیں۔ آزادی کا مطلب محض سیاسی آزادی نہیں ہوتا ہے، بلکہ ذہنی آزادی بھی ہوتا ہے۔ شاید ہم ابھی اس مرحلہ پر نہیں پہنچے ہیں کہ جہاں ہم ذہنی طور پر آزاد ہو کر اپنی تاریخ کی تشکیل کر سکیں۔

1857 کے سلسلہ میں جن دوستوں نے مدد کی ان میں احمد سلیم اور ڈاکٹر جعفر احمد کا شکر گذار ہوں کہ جنہوں نے کافی مواد فراہم کیا۔ ترجمہ کرنے والوں میں ڈاکٹر صولت ناگی کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ جنہوں نے مشکل مضامین کا خوبصورت ترجمہ کیا۔ پروفیسر طفیل ڈھانہ خاص طور سے شکریہ کے مستحق ہیں کہ جنہوں نے کئی مضامین کا ترجمہ کیا اور پروف ریڈنگ بھی کی۔ ڈاکٹر ناظر محمود اور پروفیسر ظفر علی خان نے بھی اپنی مصروفیات کے باوجود میری درخواست پر مضامین کے ترجمے کئے۔

غلام عباس حسب معمول ٹائٹل کے ڈیزائن اور تصاویر کے سلسلہ میں شکریہ کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی

لاہور

28-اگست 2007ء

واقعات کی زمانی ترتیب

سال ۱۸۵۷ء

۲۹ر مارچ: منگل پانڈے، چونتیسویں دیسی پیدل رجمنٹ کے سپاہیوں کی بیرک پور میں بغاوت

۸را پریل: منگل پانڈے کو بیرک پور میں پھانسی لگادی گئی

۹رمئی: میرٹھ میں ایک رجمنٹ کے پچاسی سپاہیوں کے چربی والے کارتوس استعمال کرنے سے انکار پر کورٹ مارشل کر کے انہیں دس سال قید بامشقت کی سزادی گئی

۱۰رمئی: میرٹھ میں تین رجمنٹوں کی بغاوت، قیدی سپاہیوں کو آزاد کروانے کے بعد ان کا دہلی کی طرف مارچ

۱۱رمئی: سپاہیوں کا دہلی پر قبضہ، بہادر شاہ کو شہنشاہ بنانے کا اعلان

۱۳۔۳۱مئی: بغاوت فیروز پور، مظفر نگر، علی گڑھ، نوشہرہ، ایتاوہ، میمن پوری، روڑکی، ایتاہ، نصیرآباد، بریلی اور شاہجہان پور تک پھیل گئی

۵۔۱۳ر جون: مرادآباد، بدایوں، اعظم گڑھ، سیتا پور، ہیچ، بنارس، کانپور اور جھانسی تک بغاوت پھیل گئی

۶ر جون: نانا صاحب کا کانپور کا محاصرہ

۷۔۸جون: جھانسی کے قلعے پر قبضہ، رانی لکشمی بائی کو دوبارہ تخت نشین کروایا گیا۔ بدلی سرائے کی جنگ اور دہلی کے قریب Ridge پر انگریزوں کا قبضہ

۹۔۱۳ر جون: دریاآباد، فتح پور، نوگانگ، گوالیار اور فتح گڑھ میں بغاوت

۲۶۔۲۷جون: کانپور پر رانا صاحب کا قبضہ

یکم جولائی: ہتھرا اور اندور میں بغاوت، لکھنو ریزیڈنسی باغیوں کا محاصرہ

۱۲ر جولائی: فتح گڑھ کے مقام پر جوالا پرشاد اور ٹکہ سنگھ کے تحت نانا صاحب کے سپاہیوں کی شکست

۱۶ر جولائی: کانپور کی جنگ اور نانا صاحب کے سپاہیوں کی بیتھور کی جانب پسپائی

۲۷ر جولائی: آراہ پر کنور سنگھ کا قبضہ

۳ر اگست: انگریزوں نے آراہ پر قبضہ کرلیا

۱۳ر اگست: جگدیش پور کے مقام پر کنور سنگھ کی شکست

۱۶ر اگست: بیتھور کے مقام پر تاتیہ توپے کی شکست

۱۷ر اگست: سر کولن کیمبل نے آرمی کے سربراہ کے طور پر کمان سنبھال لی

۱۴ر ستمبر: دہلی کے کشمیری دروازے کو انگریزوں نے دھماکے سے اُڑا دیا

۱۹ر ستمبر: دہلی کے لاہوری دروازے پر انگریزوں کا قبضہ

۲۰ر ستمبر: انگریزوں نے دہلی پر قبضہ دوبارہ حاصل کرلیا

۲۱ر ستمبر: بہادر شاہ نے ہمایوں کے مقبرے میں انگریز کے ہاتھوں شکست قبول کرلی

۲۲ر ستمبر: میجر ہڈسن کے ہاتھوں بہادر شاہ کے بیٹوں کی گرفتاری اور قتل

۲۳ر اکتوبر: سکندر باغ کے مقام سے داخل ہو کر انگریزوں نے لکھنو پر دوبارہ قبضہ کرلیا

۲۶ر اکتوبر: پانڈو کے کنارے پر تاتیہ توپ کو شکست

۲۷ر اکتوبر: تاتیہ توپ نے انگریزوں کو کانپور سے نکال کر اس پر قبضہ کرلیا

۶ر دسمبر: تاتیہ توپ کو کانپور سے کیمبل نے نکال باہر کیا اور وہ لکشمی بائی سے آن ملا۔
کالپی کی جنگ اور تاتیہ توپ کی پسپائی

سال ۱۸۵۸ء

۳ر مارچ: مہدی حسین اور گونڈہ اور چاندہ کے راجاؤں نے چاندہ کے مقام پر انگریز کیمپ پر حملہ کیا

۲۱ر مارچ: لکھنو انگریزوں کے مکمل قبضے میں آ گیا

۲۲/مارچ: اعظم گڑھ پر کنور سنگھ کا قبضہ

یکم اپریل: تانتیہ توپ جو بائیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ لکشمی بائی کی مدد کو آرہا تھا تو بیتوہ کے کنارے پر انگریزوں نے اس کو شکست دے دی

۵/اپریل: جھانسی پر انگریزوں نے دھاوا بول دیا۔ لکشمی بائی کا فرار، اعظم گڑھ میں کنور سنگھ کا انگریزوں کو دوبارہ شکست دینا

۲۳/اپریل: جگدیش پور کے مقام پر کنور سنگھ کی انگریزوں پر ایک اور فتح

۲۶/اپریل: کنور سنگھ کی شکست

۶/مئی: بریلی میں انگریزوں نے بہادر خاں کو شکست دے کر قبضہ کر لیا

۱۱/مئی: انگریزوں کا شاہجان پور کا محاصرہ، مولوی احمد اللہ نے اس کا دفاع کیا

۲۲/مئی: کالپی کی دوسری جنگ، لکشمی بائی، نواب آف باندہ اور راؤ صاحب (جو نانا صاحب کا بھتیجا تھا) باغیوں کی قیادت کر رہے تھے۔

۲۴/مئی: کالپی پر انگریزوں کا قبضہ

یکم جون: رانی لکشمی بائی، راؤ صاحب اور باندہ کے نواب نے گوالیار کے سندیا کو شکست دے دی اور نانا صاحب کو پیشوا مقرر کر دیا

۱۷/جون: انگریزوں کا گوالیار کا محاصرہ، گوالیار پر حملے میں رانی جھانسی کی موت، تانتیہ توپ کا فرار

۲۰/جون: انگریزوں کا گوالیار پر دوبارہ قبضہ

۲/اگست: ایسٹ انڈیا کمپنی سے تاجِ برطانیہ کو اقتدار کی منتقلی

۱۴/اگست: کوٹرا (اودے پور) کی جنگ اور تانتیہ توپ کی شکست

۱۷-۱۹/اکتوبر: انگریزوں کا جگدیش پور کا محاصرہ اور کنور سنگھ کے بھائی امر سنگھ کے ہاتھوں شکست، امر سنگھ کی نینادی کے مقام پر شکست

سال ۱۸۵۹ء

۲۱/جنوری: سیکھر کی لڑائی اور تانتیہ توپ کی شکست

۷/اپریل:	تانتیہ توپ کو راجہ مان سنگھ کی غداری کے باعث قید کرلیا گیا
۱۸/اپریل:	تانتیہ توپ کو پھانسی دے دی گئی
اکتوبر تا دسمبر:	شمالی اودھ اور نیپال میں باغیوں کے خلاف آخری جھڑپیں اور نانا صاحب کے چالیس ہزار پیروکاروں کو قید کرلیا گیا۔

1857 سے پہلے کے ہندوستانی انقلابی مراکز

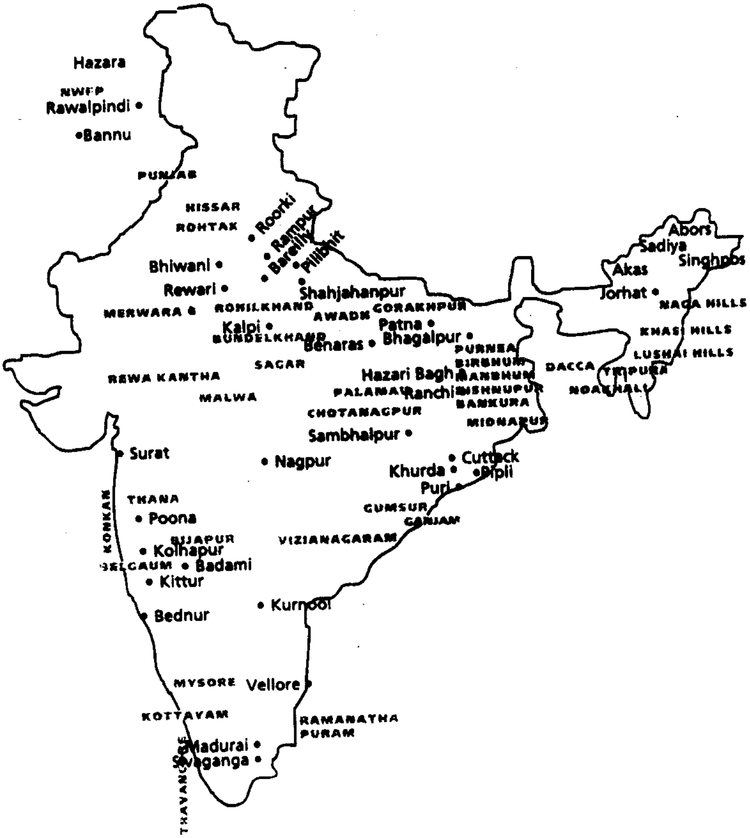

عظیم اللہ خاں

آیا فرنگی دور سے ایسا منتر مارا
لوٹا دونوں ہاتھوں سے پیارا وطن ہمارا
آج شہیدوں نے تم کو اہل وطن للکارا
توڑو غلامی کی زنجیریں، برساؤ انگارا
ہندو مسلمان، سکھ ہمارا بھائی، بھائی پیارا
یہ ہے آزادی کا جھنڈا اسے سلام ہمارا

محمد حسین آزاد

ہوتا ہے ابھی کچھ سے کچھ یک چشم زدن میں
ہاں دیدۂ دل کھول دے اے صاحب ابصار
ہے کل کا ابھی ذکر کہ جو قوم نصاریٰ
تھی صاحب اقبال و جہاں بخش و جہاں دار
تھی صاحب علم و ہنر و حکمت و فطرت
تھی صاحب جاہ و حشم و لشکر جرار
اللہ ہی اللہ جس وقت کہ نکلے
آفاق میں تیغ غضب حضرت قہار
سب جوہر عقل ان کے رہے طاق پر رکھے
سب ناخنِ تدبیر و خرد ہو گئے بیکار
کام آیا نہ علم و ہنر و حکمت و فطرت
پورب کے تلنگوں نیلیا سب کو یہیں مار
یہ سانحہ وہ ہے کہ نہ دیکھا نہ سنا تھا
ہے گردش گردوں بھی عجیب گردش دوار
نیرنگ کے غور اس کے جو کیجئے تو عیاں ہے
ہر شعبدہ تازہ میں صد بازیٔ عیار
ہاں دیدۂ عبرت کو ذرا کھول تو غافل
ہیں بند یہاں اہل زباں کے لب گفتار
عبرت کے لئے خلق میں یہ سانحہ بس ہے
گر دیوے خدا عقل سلیم و دل ہشیار

مضامین

بغاوت اوراُس کی تاریخ نویسی: ایک جائزہ

بسواموئے پانی/ترجمہ: ظفرعلی خان

1857 کی بغاوت مختلف اوصاف برطانیہ کی فتوحات اور پھیلاؤ کی پالیسی سے لے کر ہندوستان کی کالونیائی استحصال تک میں سے پیدا ہوئی۔ جغرافیائی طور پر اس نے شمال مغربی، شمالی اور وسطی ہندوستان کو متاثر کیا۔ اسے پہلے کالونیائی تحریروں میں سپاہیوں کی بغاوتوں کا نام دیا گیا تھا۔ یہ تحریریں بغاوت کے موضوع پر مرتکز تھیں۔ کالونیائی دفتریوں اور قلم کاروں کے لئے یہ صرف چند غیر مطمئن سپاہیوں کی کارستانی تھی جو 1857 میں نئی اینفیلڈ رائفل کے استعمال کے آغاز سے ناخوش تھے۔ جن کا ایمونیشن خاص تھا کہ کارتوس کو بھرنے سے پہلے منہ سے کاٹنا پڑتا تھا۔ یہ افواہیں کہ کارتوسوں پر استعمال کی گئی چربی یا تو گائے کی یا سور کی تھی۔ ان دونوں کی علامتی اہمیت تھی۔ کیونکہ گائے ہندوؤں کے ہاں متبرک سمجھی جاتی تھی جبکہ مسلمان سور کو ناپاک سمجھتے تھے۔ اس سے شدید نفرتیں پیدا ہوئیں اور اسے ہندو مسلم مذہبی عقائد پر حملہ تصور کیا گیا۔ جیسا کہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اس سمجھ نے مذہبی پہلو کو اولیت دی اور اس اندازِ فکر کو تقویت دی جو اس بغاوت کو ''مسلم سازش'' قرار دیتا تھا اور یہ ہم عصر دفتریوں میں عام قبولیت پا گئی۔ سید احمد خان نے (1817-1898) ایک رسالہ ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' (The Causes of the Indian Revolt) اس الزام کو رد کرنے کے لئے لکھا۔ جس میں اس نے 1857 کی بغاوت کے پیچھے کارفرما عوامل کا معائنہ کیا اور ان کی فطرت کا تعین کیا۔ اور اگر ان کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو وہ ''تہذیبوں کے تصادم'' کے کلیے کی بنیاد محسوس ہوتے ہیں۔ جس کی گونج آج بھی 9/11 کے بعد سنی جا رہی ہے۔

انیسویں صدی کے وسط میں ہمعصر تحریروں نے سیاسی ہیجان اور نظریہ نسلیت پیدا کیا جس نے ہندوستان کے بارے میں ''وحشی ہونے'' کا تصور پیدا کیا۔ اس کے باوجود 1857 کی بغاوت نے ظاہر کر دیا کہ انگریز رائے بذاتِ خود اپنے گھر میں منقسم تھی۔ یوں چارٹسٹوں، ارنسٹ جونز جیسوں نے بغاوت کو خوش آئند قرار دیا اور ہندوستان کے کالونیائی استحصال سے پردہ اٹھایا۔ (بغاوتِ ہندوستان یا نئی دنیا لندن 1857) بے شک سب سے زیادہ سنجیدہ اختلاف کرنے والی آواز کارل مارکس کی تھی جس نے ہندوستان کی کالونیائی لوٹ کھسوٹ کو اس غصے سے جوڑ کے دیکھا جس کا اظہار لوگوں نے بغاوت کے دوران کیا تھا۔ مارکس اور اینگلز نے برطانوی کالونیلزم کے خلاف جن مذہبی گروپوں نے اتحاد کا مظاہرہ کیا تھا انہیں سراہا۔ (مارکس اور اینگلز، پہلی جنگ آزادی 1859-1857 ماسکو، 1975)

دلچسپ بات یہ ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس نے اپنی تشکیل کے بعد (1885) حقیقی طور پر 1857 کی بغاوت کی مذمت کی۔ کیونکہ زیادہ قائدین کا سماجی پس منظر ایسا تھا کہ اپنی فکر میں برطانیہ نواز تھے۔ لیکن 19 ویں صدی کے آخر تک بغاوت نے ہندوستانی قوم پرستوں کی پہلی نسل کو متوجہ اور متحرک کیا۔ یوں ڈی ڈی سوارکر، جو شاید پہلا ہندوستانی تھا جس نے 1909 میں بغاوت کے بارے میں لکھا اور اسے 1857 کی ہندوستانی جنگ آزادی کا نام دیا۔ سوارکر کے قوم پرستانہ موقف نے اس کالونیائی دعوے جو بغاوت کو کارتوسوں کی چربی سے جوڑتا تھا کو رد کر دیا۔ اس نے کہا اگر یہی مسئلہ ہوتا تو اس بات کی تشریح مشکل ہوگی کہ نانا صاحب، دہلی کے شہنشاہ جھانسی کی رانی خان بہادر خان کس طرح اس میں شامل ہوئے۔ اس نے اس حقیقت پر بھی توجہ مرکوز کی کہ انگریزی گورنر جنرل نے چربی والے کارتوس واپس لینے کا اعلان کر دیا تھا لیکن بغاوت پھر بھی جاری رہی۔ سوارکر آگے بڑھا اور اس نے بغاوت کو برطانویوں کی طرف سے کئے گئے ظلم و بربریت سے جوڑا۔ اس کے ساتھ وہ اہمیت جو وہ مذہب کو دیتا ہے یہ اس پر سامراجی لکھاریوں کے اثر کا اظہار ہے۔

1920 کی دہائی سے مارکسی نکتہ نظر سے بغاوت کا تجزیہ کرنے کی کوششیں ایسے پہل کاروں جیسے ایم این رائے (ایم این رائے ابانی مکھر جی سے اشترک میں، بدلتا ہوا ہندوستان 1922) اور رجنی پام دت (انڈیا آج 1940)۔ رائے 1857 کو قابل توجہ نہیں سمجھتا تھا۔ وہ اس کی ناکامی میں جاگیرداری طاقت کی آخری نشانیوں کا اشتہار دیکھتا تھا۔ وہ ''1857 کے انقلاب''

پر زور دیتا تھا کہ یہ تھکے ماندے جاگیرداری نظام اور نئے متعارف ہونے والی تجارتی سرمایہ داری کے درمیان جدوجہد تھی جس کا مقصد سیاسی برتری حاصل کرنا تھا۔ اس کے برعکس پام دت 1857 کو ایک بڑی کسان بغاوت کے طور پر دیکھتا تھا باوجودیکہ اس کی قیادت زوال پذیر جاگیرداری قوتیں کر رہی تھیں یہ اپنے اعزازات واپس لینے کے لئے اور غیر ملکی غلبے کی لہر پیچھے دھکیلنے کے لئے لڑ رہی تھیں۔ نتیجتاً ہم ایک سلسلے کا آغاز دیکھتے ہیں جس نے اندرونی جاگیرداری نظام پر سوال اٹھایا اور تنقید کی۔ بغاوت کی مقبول عام بنیاد کی تعریف کرتے ہوئے۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد ذرائع تک رسائی کی بناء پر 1857 کی بغاوت کے بارے میں مطالبات سے متعلق دلچسپ پیش رفتیں ہوئیں۔ ایک نسبتاً نفیس قوم پرستانہ تاریخ نویسی جو بغاوت کی پیچیدگیوں کا راگ الاپتی تھی وجود میں آئی۔ اس میں قوم پرست تاریخ دان مثلاً آر سی ماجمدار ''سپاہیوں کی شورش اور 1857ء کی بغاوت''، 1957ء ایس بی چوہدری ''سول بغاوت ہندوستانی شورشوں میں 59-1857''، 1957 اور ہندوستانی شورش کی تھیوریاں، 1965 ایس این سین، اٹھارہ سوستاون، 1957 اور کے کے دتا، شورش پر خیالات 1967۔

یہ تاریخ دان یکسر اس خیال سے مطمئن نہ تھے کہ 1857 کی بغاوت ''ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی'' تھی۔ مزید یہ کہ انہوں نے ایسے خیالات کا حوالہ دیا جیسے قوم پرستی جو کہ فرض کیا گیا کہ 1857 میں دیکھنے میں آئی یا قومی تحریک کا آغاز اس بغاوت سے دیکھا گیا۔ بایں ہمہ وہ اس سادہ درجہ بندی سے رفاقت کے ساتھ آگے گئے جس نے دو غالب مخالفت بیانئے۔۔۔ برطانویوں کی تعریف، فاتح جو جنگ ''جیتے'' تھے اور ''باغی ہندوستانیوں'' کے دعوے جو ''شکست کھا گئے'' تھے۔

اس کا مطلب تھا ماسکے میں تبدیلی، اندرونی تضادات کا پتہ چلانے کی کوشش کے ساتھ (یعنی ہندوستانی ''امیر'' جس میں ساہوکار اور بنیے شامل تھے) اور 1857 کی مقبول عام بنیاد اور محض با اثر طبقات پر توجہ مرکوز نہ رکھنی جو کہ ہمعصر برطانوی دفتریوں کا ماسکہ رہا تھا۔ یہ یہاں ہے کہ قوم پرستانہ تاریخ نویسی نے کام کیا اور مارکسیوں کے ورثے کو بڑھایا، باوجودیکہ کچھ قوم پرست تاریخ نویسوں نے اسے ''آزادی کی پہلی جنگ'' کے طور پر دیکھنے پر ناپسندیدگی رقم کرائی۔ ان معنوں میں کم از کم قوم پرست تاریخ نویسوں نے جگہ فراہم کی۔ بغاوت کی مقبولِ عام بنیاد کو۔ چاہے کتنی بھی محدود۔

کیونکہ کسان اپنی تاریخ نہیں لکھتے تھے/ لکھتے ہیں، انہوں نے 1857 کی بغاوت سے

اپنے تعامل کو دستاویزی شکل نہ دی۔ لیکن کیا عوامی کہانیوں اور 1857 کی بغاوت کے ساتھ متعلق مزاحمت کی روائتوں سے اغماض برتنا ممکن ہے؟ مزید، کیا ہم 1857 اور اس سے پہلے مرحلے کی کسان بغاوتوں یا ہندوستان کے شمالی علاقے سے باہر والی بغاوتوں سے اغماص برتنے کے متحمل ہو سکتے ہیں! مثال کے طور پر آدی 1852 میں بھیلوں کی بغاوتوں (کاندیش، ڈھار اور مالوہ میں)، سنتھالوں کی 56-1855 (راج محل، بھاگل پور، بیر بھوم میں)، موپلاز 1854-1836 کے عرصے میں مالا بار، کاندھاز گھمسار اور باؤدھ (60-1855) میں، سواراز پارلیا کھیمیڈی کے (57-1856)، یا بنگال میں نیل کی بغاوت (جو 1859 میں شروع ہوئی اور اس کا رخ سفید فام کھیت مالکوں کے خلاف تھا) باوجود اس کے کہ بار بار مستقل بندوبست اور بھدرالوکس کے کردار کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ ان کی وجہ سے اس مرحلے میں بنگال 'امن کا گہوارہ' رہا۔

تا آنکہ آدی تاریخ کے سلسلوں کو ایک تنگ، واقعاتی انداز میں نہ دیکھے تو تقریباً یہ فرض کرنا ناممکن ہوگا کہ کسان نہ سوچ سکتے اور نہ ماضی کے اجزاء کو کالونیائی حاکمیت اور حالیہ جابروں کے خلاف اپنی جدوجہد میں شامل کر سکتے ہیں۔ ان معنوں میں کم از کم بغاوت کا مطالعہ مشکل ہے جب تک کہ 1857 سے پہلے کی کسان بغاوتوں کی سماجی تاریخ اور اس کے بعد کے مرحلے کی تاریخ کو پیش نظر نہ رکھا جائے۔

یہ کسانوں کو تلخ سامراج مخالف سیاسی جدوجہد میں دکھائے گا، جہاں اندرونی استحصال کرنے والے ساہوکار یا بنیے کو بھی نہیں چھوڑا گیا۔ یہ اس خیال کو بھی کمزور کرتا ہے جو عام فہم کے طور پر منجمد ہو گیا ہے کہ 1857 کی بغاوت کا اثر انڈو۔گنگائی میدانوں سے باہر نہیں ہوا۔

وقت گزرنے کے ساتھ دوسرے تاریخی زاویہ ہائے نظر میں ترقی نے 1857 کی فطرت سے متعلق تاریخ دانوں میں بہت سی بحثیں کھڑی کر دیں۔ بغاوت پر پہلا سیر حاصل کام بغاوت کی سوویں سالگرہ کی یاد منانے کے لئے 1957 میں شائع ہوا۔ پی سی جوشی (1857 سیمپوزیم 1957) کی ادارت میں اس نے 1857 کی بغاوت کے متفرقات اور تخصیصات پر توجہ مرتکز کی۔ اس میں 1857 کا جائزہ کالونیائی پس منظر میں شمولیت کے پہلوؤں کا معائنہ اندرونی تضادات پر بڑے پیمانے پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے کیا گیا۔ اس جلد میں عوامی کلچر کی العباد پر روشنی اس میں عوامی نظمیں جو کہ بچ گئی ہیں شامل کر کے ڈالی گئی ہے۔ یہاں آدی کے ذہن میں جو اضافے ہیں

ان میں خاص طور سے پی سی جوشی اور تلمیذ خلدون کے نام ہیں۔

بہت سے طریقوں سے اس تصنیف نے بغاوت پر سنجیدہ تحریروں کے ایک سلسلے کو متحرک کیا۔ یہاں ایرک سٹوکس کا ذکر ضروری ہے جس نے ان طریقوں جن کے تحت 1857 کی نفرت پس منظر آبادی اور ماحولیاتی خدوخال سے لے کر سماجی ترکیب اور کسانوں، خاص طور سے امیر کسانوں کے کردار سے مشروط کردہ مسائل کا جائزہ لیا۔ (VIZ کرن اور راج: کالونیائی ہندوستان میں کسان سوسائٹی اور زرعی بغاوت، 1978 اور اس کی مسلح کسان ہندوستانی بغاوت 1857، 1986)۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ تحقیق نے سٹوکس کو اپنا نکتہ نظر تبدیل کرنے کی ترغیب دی۔ چنانچہ جہاں اپنی پہلی تصنیف میں اس نے ''امیر کسان'' قیادت اور تحریک پر ماسکہ رکھا تھا، لیکن ''مسلح کسان'' میں اس نے بغاوت میں کسان شمولیت کی سماجی بنیاد کو وسیع کر دیا۔

الغرض یہ ایسے تاریخ دانوں کے لئے چھوڑ دیا گیا جیسے رودرنگشو مکھر جی (اودھ بغاوت میں 1857-58: عوامی مزاحمت کا مطالعہ 1984) اور ٹپٹی رائے (ایک مقبول عام بغاوت کی سیاست بندیل کھنڈ 1857 میں 1994) جنہوں نے بغاوت کے بارے میں ہماری سمجھ میں بغاوت کی مقبولیت کی سطح پر توجہ دلا کے اضافہ کیا۔ ان کی کوشش مخصوص علاقوں کے مطالعے پر مبنی تھی مثلاً اودھ، بندیل کھنڈ۔۔۔ یہ عوامی جنگجوئی کی پرکشش پیچیدگیاں جن سے اغماض برتا گیا تھا منظر عام پر لائی۔ اس کے ساتھ ایسے تاریخ داں جیسے اقتدار عالم خان نے تنظیم سے متعلق سوالات کا مطالعہ کیا ہے۔ (گوالیار کا دستہ 1857-58: باغی سپاہیوں کی تنظیم اور آئیڈیالوجی کا مطالعہ، سوشل سائنٹسٹ، جنوری۔ اپریل 1998 صفحے 53-75؛ بعدازاں S.Sct) گوتم بھدرا اور سید ظہیر حسین جعفری نے متوسط درجے کی قیادر پر توجہ مرکوز کی ہے (''اٹھارہ سوستاون کے چار باغی'' رنجیت گوہا ایڈیشن، سبالٹرن مطالعے IV، 1985 صفحات 229-75؛ اور ایک درویش باغی کا خاکہ۔ مولوی احمد اللہ شاہ S.Sct. میں ترتیب وار)۔ خلدون جیسے عالم (پی سی جوشی صفحات 1-70) اور ای آئی بروڈکن (علیحدگی کے لئے جدوجہد: 1857 کی شورش میں باغی اور وفادار: ماڈرن ایشین سٹڈیز میں 1972، صفحات 277-90) میں ان علاقوں میں کارروائیوں پر توجہ دی ہے جہاں برطانوی اتھارٹی بے دخل ہوگئی تھی، اور اگر 1857 بے شک، ایک بغاوت بحالی تھی۔

زیادہ قریب کی بات ہے۔۔۔ 1990 کی دہائی سے تاریخ دانوں نے 1857 کی مقبول

عام بعد یر توجہ کی ہے۔ یہاں آدی کے ایس سنگھ جیسے عالموں کا حوالہ دے سکتا ہے جس نے آدی واسیوں کی شمولیت پر روشنی ڈالی ہے۔ (''قبائلی اور 1857 کی بغاوت'' S.Sct صفحات 76-78) بدری نارائن جس نے نچلی ذاتوں، اچھوتوں مقبول عام کلچر پر توجہ مرکوز کی ہے (دلت لوگ اور 1857 کی یادیں، آئی سی ایچ آر کانفرنس کارروائی، دسمبر 2006، غیر مطبوعہ، مقبول کلچر اور 1857: بھولنے کے مقابلے میں یاد، 94-86 صفحات S.Sct) اور راجٹ رائے جس نے 1857 کی ذہنی ساختوں کا مطالعہ کیا ہے۔ (محسوس کی گئی جمعیت! یکساریت اور ذہنی ساخت ہندوستانی قوم پرستی کے ابھرنے سے پہلے، 2003 صفحات 534-353)۔ علاوہ ازیں ثقافتی مطالعوں کے ضابطہ کار کے اندر کام کرتے جینی شارپ جیسے عالم (ایمپائر کی رمزیہ کہانی: کالونیائی نصاب میں عورت کا سراپا، 1993) اور نینسی پیکسٹن (راج کے تحت تحریر: جنس اور زناء بالجبر برطانوی کالونیائی تخیل میں، 1947-1830، 1999) نے وضاحت سے بیان کیا ہے کہ سفید فام عورت سے زنا بالجبر کا موضوع درحقیقت نسل پرستی کو بھڑکانے کے لئے تخلیق کیا گیا تھا۔ جو بغاوت کے بڑے نتیجوں کے طور پر ابھرا۔

جس پر زور دینے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ 1857 کی بغاوت نمائندگی کرتی ہے سب سے طاقتور اور ڈرامائی کالونیائی مخالف تحریکوں کی۔ جس نے کسانوں اور زمینداروں کو سفاک سامراجی یلغار کے خلاف انیسویں صدی کے پہلے وسط میں متحد کیا۔ اسی وقت اس نے اندرونی استحصال کرنے والوں جیسے سودخوروں اور بنیوں کے بارے میں بھی سوال اٹھایا۔ جو بیان کیا گیا ہے وہ ہے 1857 کی بغاوت کے بارے میں تاریخ نویسی کا ارتقاء۔ جیسا کہ دیکھا گیا ہے تاریخ دانوں نے اپنا ماسکہ شورشی 'سپاہیوں' سے پھیرا اور اس میں ہندوستانی قوم پرستی کی شروعات، بغاوت کی گونا گونی کا مطالعہ، عوامی شمولیت کے پہلو اور اس سے متاثر ہونے والے علاقوں کے علاوہ اندرونی تضادات پر روشنی ڈالی ہے۔ آج کل کچھ تاریخ دان جس سے منسلک مسائل پر تحقیق کر رہے ہیں جو یقیناً 1857 کی بغاوت کے بارے میں ہماری معلومات میں اضافہ کریں گے۔

''عوام کی جمہوریت'' (People's Democracy)

کمیونسٹ پارٹی ہندوستان کا ہفتہ وار ترجمان (مارکسٹ)

❁❁❁❁❁

جنگِ آزادی کے مختلف تناظر

شاہد امین/ترجمہ: ڈاکٹر ناظر محمود

کہا جاتا ہے کہ 1857ء کی جنگِ آزادی میں کمپنی بہادر نے ٹیلی گراف اور اپنے مقامی (ہندوستانی) جاسوسوں کی مدد سے ہندوستان میں اپنی ایمپائر کو دوبارہ حاصل کیا۔ یہ تو اس وقت کا ایک تاریخی عمل تھا۔ لیکن جس نے 1857ء کے واقعات کو ایک جیتی جاگتی شکل میں چھوڑا وہ تھی فوٹوگرافی۔۔۔تباہ شدہ باقیات کی ہزاروں تصویریں جن میں پھانسی پر لٹکتے ہوئے باغی بھی تھے۔ اور کھوپڑیوں تک کھلی ہوئی لاشیں بھی۔ یہ تصویریں ایسے نظارے پیش کرتی ہیں جن سے بہت کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔

فوٹوگرافی کے علاوہ پتھروں میں بھی جنگِ آزادی کی تاریخ بکھری پڑی ہے۔ مثلاً بمباری سے تباہ ہوجانے والی لکھنو کی ریذیڈنسی یا دہلی میں فتح کی یادگار جو اس لئے تعمیر کی گئی تھی کہ آنے والی نسلوں کو ان واقعات کی یاد دلاتی رہے۔

اور پھر تصویروں اور پتھروں کے بعد جو چیز آتی ہے وہ ہے بذات خود تاریخ۔۔۔انگریزی تاریخ۔۔۔ایسے انداز میں لکھی گئی تاریخ جو مغل شاہی تحریروں کی طرح تھی۔

اب اس جنگِ آزادی کی یاد مناتے ہوئے ہمارے سامنے اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس تاریخ کو تقریبات کے شور میں گم ہونے سے کیسے بچایا جائے۔ ہمارے رہنما اور ان کی تقریریں لکھنے والے اور سرکاری کمنٹری کرنے والے۔ یہ سب میلہ لوٹنے کی کوشش میں ہیں۔

البتہ جنگِ آزادی کی ہزاروں تصویریں جو نئی دہلی کی القاضی نمائش میں رکھی ہیں ضرور عوام کو اپنی طرف راغب کریں گی۔ اور یہ تصویریں ہمارے اُن مئورخین کو للکار رہی ہیں جو

ہمارے ماضی سے صرف ایک قومی لگاؤ ہی نہیں بلکہ پیشہ ورانہ تعلق بھی رکھتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان تصویروں کو کیسے دیکھا، سمجھا اور پرکھا جائے تاکہ یہ صرف ماضی کے نمونوں کے طور پر نہیں بلکہ ایسی شبیہوں کے طور پر سامنے آئیں جو نوآبادیاتی نظام کے فتح مندانہ غرور کی جھلک دکھاتی ہیں۔

جس طرح باغیوں کو ایسے آقاؤں کی ضرورت ہوتی ہے جن کے خلاف وہ لڑ سکیں اس طرح اکثر بغاوتوں کی تاریخیں فاتحین کی تحریروں کے مقابلے میں لکھی جاتی ہیں۔ اگر ہم برطانوی یا نوآبادیاتی تاریخ کا حوالہ دیئے بغیر جدوجہد آزادی کی تاریخ لکھنے کی کوشش کریں تو یہ ایک غیر تاریخی انتقام ہوگا یا ایک طرح کی ''طلسماتی حقیقت نگاری۔''

1857ء کی عظیم بغاوت کے بعد جو کتابیں لکھی گئیں اُن میں سب سے زیادہ بااثر کتاب سرجان ولیم کے (Sir John William Kaye) کی تین جلدوں پر مشتمل ''ہسٹری آف دی سپاہی وار اِن انڈیا'' ہے۔ بغاوت کے بعد جب سرجان ولیم کے یہ کتاب لکھنے بیٹھا تو اس کے پاس جنگ میں حصہ لینے والے انگریزوں کے ذاتی خطوط بھی تھے اور انڈیا آفس سے ملنے والا معلوماتی مواد بھی جہاں وہ خود ایک بڑے عہدے پر فائز تھا۔

کے (Kaye) نے یہ تین جلدیں 1864ء سے 1876ء کے درمیان تحریر کی گئیں اور وہ یہ کام مکمل کرنے کے فوراً بعد فوت ہوگیا۔

1980ء کی دہائی کے آخری برسوں تک انڈیا آفس لائبریری میں رکھا سرجان کا مجسمہ یہ دیکھتا رہا کہ کس طرح ''مقامی'' محقق اس عظیم تاریخی دستاویز سے استفادہ کر رہے ہیں۔

کے (Kaye) کے ابتدائی کلمات پر ایک سرسری نظر ڈالیں تو یہ تاثر ملتا ہے کہ جیسے ہم نوآبادیاتی فاتحین اور مفتوحوں کے درمیان جدوجہد کی تاریخ پڑھ رہے ہیں۔ مثلاً یہ جملہ دیکھئے۔

''بیک وقت ہونے والے بے شمار جدا جدا واقعات کے درمیان واحد تعلق یہ آفاقی حقیقت تھی کہ کالا آدمی گورے آدمی کی حکم عدولی کر رہا تھا۔''

مگر کے (Kaye) کی تاریخ کالے آدمی کی بغاوت کا اتنا ذکر نہیں کرتی جتنا اسے کچلنے کے لئے گورے آدمی کی کوششوں کا کرتی ہے۔ اس داستان میں نوآبادیاتی حاکم ہندوستانی تاریخ کا ایسا موضوع ہیں کہ اُن کے خلاف اہم ترین بغاوت کا قصہ صرف انگریز سورماؤں کی بہادری سے

مزّین ہے۔اب یہ جملہ دیکھئے۔

''1857ء کی ہندوستانی بغاوت کی کہانی اب تک ہماری تاریخ میں ہمارے قومی کردار کا شاندارترین اظہار ہے۔''

سلمان رشدی کے ناول ''اطفالِ نیم شب'' (Midnights Children) کا یہ جملہ بڑا مشہور ہوا تھا۔ ''انگریزوں کو اپنی تاریخ کا کیا علم کیوں کہ اُن کی زیادہ تر تاریخ کہیں اور رقم ہوتی ہے۔''

لیکن اس جملے کے برعکس کے (Kaye) بضد تھا کہ انگریزوں کو اُن کی سمندر پار کی تاریخ پڑھائی جائے۔وہ لکھتا ہے:

''یہ بحران اس لئے پیدا ہوا کہ ہم انسانیت اور تہذیب کی تلاش میں کچھ زیادہ ہی سرگرداں تھے۔لیکن چونکہ ہم انگریز تھے اس لئے بحران ہم پر غالب نہ آسکے۔''

اس کے ردِعمل کے طور پر ہم لفظ انگریزی کی جگہ ہندوستانی لکھ دیتے ہیں یعنی یہ کہ ''ہم غلام تھے۔ہم نے بغاوت کی لیکن چونکہ ہم پورے ہندوستانی نہیں تھے اس لئے ناکام ہوگئے۔''

یہ بات سُبھدرا کماری چوہان کی مشہور ہندی کویتا (خوب لڑی مردانی......) پر بھی صادق آتی ہے جو اس نے جھانسی کی رانی کے بارے میں لکھی تھی۔اس کویتا میں ایک ''بوڑھا بھارت'' دوبارہ جوان نہیں ہوسکا۔اور 1857ء کی جنگِ آزادی کے بارے میں یہی خیال بار بار دہرایا جاتا رہا ہے۔ مگر تاریخ بہت پیچیدہ اور گنجلک ہے اور یہ قومی تاریخ کے کسی میوزیم کی طرح سادہ نہیں ہے۔

حال ہی میں رُدرنگشو مکھرجی نے بغاوت کے ایک مرکزی مقام اودھ پر ایک شاندار کتاب لکھی ہے جس میں بڑی متوازن گفتگو کی گئی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ نواب واجد علی شاہ کی جلاوطنی کو ناانصافی سمجھا گیا اور اس پر نوحہ خوانی کی گئی۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ جب ہر جگہ سے بغاوت کی کامیابی کی خبریں آنے لگیں تو وہ زمیندار جو پہلے انگریزوں کو پناہ دے رہے تھے اب لکھنو اور اس کے قرب و جوار میں اپنے کسانوں اور مسلح افراد کے ذریعے انہیں ہراساں کرنے لگے۔

یہ عجیب بات ہے کہ کسانوں اور تعلقہ داروں کے درمیان جن اخلاقی اور معاشی رشتوں کو انگریزوں نے توڑنے کی کوشش کی تھی اُن ہی روایتی وفاداریوں نے بغاوت کے دنوں میں اپنا کام

دکھایا۔ مگر کے (Kaye) کی تاریخ میں بادشاہ، نواب، تعلقہ دار، سپاہ سالار اور سپاہی سب کو چت کر دیا گیا ہے تاکہ فاتح ''انگریز سورما'' رکاوٹوں کا مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہیں مثلاً یہ جملہ بھی پڑھئے:

''ہندوستانیوں کی لاشوں پر انگریز سورما فاتحانہ انداز میں کامیابی کی طرف بڑھتے رہے۔''

چاہے وہ منگل پانڈے ہو یا پوربی سپاہی جو بیرک پور کے کوارٹر گارڈ میں دندناتے پھرتے رہے۔ یہ سب Kaye کی تاریخ کے مطابق انگریز جنرل کو دیکھتے ہی خودکشی کی کوشش کرنے لگتے تھے۔ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ جب واجد علی شاہ 1847ء میں لارڈ ہارڈنگ کے روبرو آیا تو انگریز نگاہوں کی تاب نہ لا سکا۔ اور یہ دہشت مقامی شاہ و گدا سب کے لئے یکساں تھی۔

''جب لارڈ ہارڈنگ نے شاہ اودھ کو تاکید کرتے ہوئے اپنی آواز بلند کی تو نوجوان بادشاہ اپنی جانب دیکھنے والی نیلی آنکھوں سے خوف زدہ ہو گیا۔''

یہ بات نہیں کہ Kaye کی تاریخ میں مقامی لوگوں کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ اُس کی تحریروں میں ہندوستانی لوگ اپنی اپنی جگہوں پر موجود ہیں۔ مثلاً وہ دہلی کے شمالی علاقے میں ''مقامی لوگوں سے برتاؤ'' نامی تحریر میں لکھتا ہے۔

''1857ء کی گرمیوں میں دہلی سے نکالے جانے والے انگریز فلیگ اسٹاف ٹاور میں پنجاب سے آنے والی ریل گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔ جولائی تک ہر ایک انگریز کے لئے دس مقامی لوگ موجود تھے۔ انسانیت کا تقاضہ تھا کہ انگریز مقامیوں کی طرف بہتر رویے کا اظہار کرتے۔ کیونکہ اُن کے بغیر دہلی کی دوبارہ فتح ناممکن تھی۔ مگر Kaye کے خیال میں مقامی لوگوں اور انگریزوں کے درمیانی فاصلے دہلی پر کمپنی بہادر کے دوبارہ حملے اور قبضے کی صورت میں بھی کم نہیں کئے جا سکتے تھے۔

ایک طرف تو کے (Kaye) انگریزوں کو ''سخت جان اور ثابت قدم'' پیش کرتا ہے اور دوسری طرف دہلی کا ایک طنزیہ اخبار لکھتا ہے کہ ''انگریز کی عقل کی ٹوپی اور خرد کا پتلون پھسل کر موزۂ گھبراہٹ میں آ گئے ہیں۔'' اور پھر اس بات کا مذاق اڑاتا ہے کہ انگریز دہلی کے قرب و جوار کے دیہات سے مدد لے کر دہلی پر حملہ نہیں کر سکے۔

دہلی کے شمال میں جس پہاڑی پر انگریز مجتمع تھے اُسے 1950ء تک کیکر کا جنگل سمجھا جاتا تھا۔ اس پہاڑی کی تصویریں انگریزوں کے جنگی فوٹوگرافر فیلیس بیاٹو نے بنائی تھی۔ آج بھی فلیگ

اسٹاف 1857ء جیسا ہی ہے۔

کے (Kaye) کی فاتحانہ تحریروں کی طرح فیلیس بیاٹو کی بنائی ہوئی فلیگ اسٹاف اور چوبُر جا کی تصویریں اُس بہادری اور حوصلے کی عکاسی کرتی ہیں جن سے انگریزوں نے دہلی سے کی جانے والی گولہ باری کا سامنا کیا۔ بیاٹو کی ایک تصویر میں تغلق عہد کی چوبُر جا مسجد بیابان میں کھڑی ہے اور انگریز بہادری کی گواہی دے رہے ہیں۔ مسجد کے چار میں سے تین گنبد گولہ باری کے سامنے کھڑے رہے۔

اسی مسجد اور پہاڑی کے مورچوں سے انگریزوں نے ستمبر 1857ء کو کشمیری دروازے پر فیصلہ کن حملہ کیا تھا اور شہر کی طرف بڑھتے ہوئے لال قلعے اور ہمایوں کے مقبرے تک پہنچے اور بہادر شاہ ظفر کو واپس لا کر مقدمہ چلایا اور پھر جلاوطن کر کے رنگون بھیجا۔

ہمایوں کے مقبرے کو اب عالمی ثقافتی ورثے کی حیثیت حاصل ہے اور بیاٹو کی بھوری مائل تصویروں میں یہ مقبرہ ہندوستانی ماضی کی باقیات کی جھلکیاں دکھاتا ہے۔ ایک لمبے شاٹ والی تصویر میں مقبرہ دور سے چھوٹا نظر آتا ہے مگر اُس کا بڑا اور داغ دار گنبد اور داخلے کی راہ داری الگ تھلگ اور غیر ضروری نظر آتے ہیں۔

چھوٹی دیواروں کے ٹکڑے، کیکر کا ایک تنہا درخت اور پانی سے بھرے دو چھوٹے گڑھے مل جل کر غفلت اور عدم تحفظ کے احساس پیدا کرتے ہیں۔ بیاٹو اپنی تصویر سے شاید یہ بتانا چاہتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر نے اپنے چھپنے کے لئے کسی افسردہ اور مضحکہ خیز جگہ منتخب کی تھی۔

دہلی کی شمالی پہاڑی اب ایک غیر تاریخی ماحول میں کھڑی ہے۔ تاریخی فلیگ اسٹاف کی عمارت کی اب کوئی دیکھ بھال نہیں کرتا اور یہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ اب یہاں کچھ لوگ مراقبہ کرنے یا صبح کی چہل قدمی کرنے آتے ہیں۔

نچلی منزل پر اس کا گول بڑا کمرہ صندوقوں میں دریاں اور گدّے رکھنے کے کام آتا ہے۔ وہاں کوئی عبارت ہمیں یہ نہیں بتاتی کہ 1857ء میں مئی سے ستمبر کے درمیان اس پہاڑی کی پتلی سی چوٹی پر انگریز محصور تھے۔ البتہ چہل قدمی کرنے والے لوگ دہلی کے بندروں کو کیلے ضرور کھلاتے نظر آتے ہیں۔

حتیٰ کہ پہاڑی پر جنگِ آزادی کی یادگار عمارت کو جانے والی سڑک فلیگ اسٹاف روڈ کا نام بھی بدل کر بھیم راؤ امبیڈکر میموریل مارگ کر دیا گیا ہے کیونکہ ڈاکٹر امبیڈکر دہلی میں قیام کے

دوران ایک قریبی گلی میں رہتے تھے۔اس لئے تین سال قبل ہمارے وزیراعظم کسی کے مشورے پر یہاں آئے اور فلیگ اسٹاف روڈ کا نام بدلنے کی تقریب میں شریک ہوئے۔ چوبُرجا مارگ اس بمباری شدہ مسجد مورچے تک جاتی تھی۔اس کا نام بدل کراچاریہ سُشیل مُنی مارگ رکھ دیا گیا ہے مگراس کے لئے وزیراعظم نہیں آئے تھے۔

ایسی بات نہیں کہ ہمارے ماضی وحال کے بڑے لوگوں کے نام پر سڑکیں،شہراور قصبے نہیں ہونے چاہئیں لیکن ہمارا بہت سا ماضی ایسے ہی برقرار رہنے چاہئیں۔تاکہ ہمارے حال سے اس کا تعلق برقرار رہے۔

ہماری بلدیاتی اور قومی سیاست، سرکاری فرمانوں کے ذریعے تاریخی یادوں کو بدل رہی ہے۔ 1857ء کی جنگِ آزادی سے وابستہ مقامات کے نام بدلنا اور پھر جنگِ آزادی کی یاد منانا سمجھ سے بالاتر ہے۔ یہ عمل ایسا ہی ہے جیسے کے (Kaye) کی تاریخ کو قوم پرستانہ تاریخ سے بدل دیا جائے اور پھر بلدیاتی کونسلروں اور صوبائی حکام کے کہنے پر مقامات کے نام بدلے جائیں۔

جیسے جیسے جنگِ آزادی کے سورماؤں اور شہیدوں کی تلاش میں تیزی آتی جائے گی۔دلیری اور شجاعت کو مرکزِ نگاہ بنانے کی ضرورت سے زیادہ کوشش کی جائے گی۔مردانہ وار لڑنے کو مثال بنایا جائے گا یا اُن خواتین کو نمایاں کیا جائے گا جنہوں نے مردوں کی طرح کارنامے انجام دیئے۔اس طرح ہم عورتوں کے وہ گیت نہیں سن سکیں گے جو 1857ء کے بارے میں شمالی ہندوستان کے لوک گیت بن گئے تھے۔مثلاً ''میرٹھ کا صدر بازار۔میراسیاں لُوٹنا نہ جانے۔'' یا یہ ''سب لُوٹ کے لائے چھوٹی بڑی شال۔میراسیاں گھر لایا چھوٹا رومال۔''

کیا ہمیں 1857ء کے یہ لوک گیت بھول جانے چاہئیں۔اس لئے کہ یہ عورتوں کی زبان میں ہیں۔کیا یہی کافی ہے کہ ہم ایک آدھ یادگاری پتھر نصب کر دیں یا لال قلعے کے راج گھاٹ کے دروازے پر بغاوت کی ڈرامائی تشکیل پیش کریں۔نہیں یہ کافی نہیں ہوگا۔ہمیں ان واقعات کی یاد میں رنگا رنگ تقریبات کرنی چاہئیں تاکہ ان کے مختلف پہلو واضح ہوسکیں۔

غدر کے واقعات کو ایک ہی جیسے انداز میں پیش کرنا ان واقعات کے ساتھ بڑی زیادتی ہوگی۔

(شاہد امین دہلی یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر ہیں)

❋❋❋❋❋

مخفی تاریخ

نین جوت لہری/ترجمہ: ڈاکٹر ناظر محمود

زیرِ نظر مضمون میں مصنف نے 1857ء کے حوالے سے دہلی اور جھانسی کی تاریخی یادگاروں کا موازنہ کیا ہے۔ مصنف کے خیال میں دہلی کی یادگاریں بے جان و بے روح ہیں جبکہ جھانسی کی یادگاروں میں چلتے پھرتے کرداروں کی جھلک نظر آتی ہے۔ پاکستان میں چونکہ 1857ء کی جنگِ آزادی سے متعلق یادگاریں نہ ہونے کے برابر ہیں اس لئے یہ مضمون ہمیں اس طرف سوچنے کی دعوت دیتا ہے۔

مترجم

1857ء کی جنگِ آزادی کو 2007ء میں ڈیڑھ سو سال پورے ہو رہے ہیں اور دہلی میں سرکاری طور پر اس جنگِ آزادی کی یاد منائی جا رہی ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ آزادی کے بعد دہلی کے سیاسی حلقوں نے اس جنگِ آزادی کو غیر معمولی طور پر نظر انداز کئے رکھا ہے۔ دہلی میں کوئی ایسی علیحدہ یادگار نہیں جو اس جنگ میں آزادی کے لئے لڑنے والوں سے منسوب ہو۔ نہ ہی اُن شہیدوں کا کوئی ذکر ہے جو انگریزوں کے خلاف لڑتے ہوئے جاں بحق ہوئے۔

حتیٰ کہ اُن لوگوں کی بھی کوئی یادگار نہیں جو غدّاری کے مقدمات کے بعد پھانسی پر چڑھا دیئے گئے۔ بھارت کے دارالحکومت میں 1857ء کی جنگِ آزادی لوگوں کی نظروں سے بالکل اوجھل ہے۔

البتہ کچھ برطانوی یادگاریں ضرور مل جاتی ہیں جن پر درج تحریروں میں کچھ ردو بدل کر کے مقامی رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً جنگ میں ہلاک ہونے والے برطانوی سپاہیوں کی ایک یادگار کو کچھ اس طرح تبدیل کیا گیا ہے کہ اس کی عبارت نوآبادیاتی حکومت کے خلاف لڑنے والوں کا تو ذکر کرتی ہے مگر یہ تفصیل نہیں بتاتی کہ وہ کون لوگ تھے اور کیسے جاں بحق ہوئے۔ آزادی سے پہلے کے دہلی کے حکمران اتنے لاپروا نہیں تھے۔ جنگِ آزادی کے بعد برطانوی حکمرانوں نے اپنی فتح کی یادگاریں سوچ سمجھ کر بنائیں۔ انہوں نے قبروں اور لڑائی کے مقامات کے گرد ایسا ماحول تیار کیا جس سے بہادری اور قربانی کے بے غرضانہ جذبات کا اظہار ہوتا تھا۔

اس کے باوجود دہلی کی مزاحمت کی نشانی یعنی لال قلعے میں 1857ء کی جنگ آزادی کی کوئی یادگار نہیں ہے۔ وہاں صرف عہدِ وسطیٰ کی تاریخ کی یادگاریں موجود ہیں۔ لال قلعہ دیکھنے والے بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دیوانِ خاص میں بہادر شاہ ظفر پر غدّاری کا مقدمہ چلایا گیا تھا۔ نہ ہی یہ بتایا جاتا ہے کہ نگار خانے میں برطانوی سپاہی رہتے تھے اور وہ ظفر محل کو غسل خانے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

1857ء کی ڈیڑھ سو سالہ تقریبات کے سلسلے میں یہاں بڑے اجتماعات تو ہو رہے ہیں لیکن میرٹھ سے آنے والے تھوڑے سپاہیوں کے برعکس تقریباً ستر ہزار رضا کار چار دن پیدل چل کر میرٹھ سے دہلی پہنچیں گے۔ ہمیں اگر 1857ء کے واقعات عوام کو یاد دلانے ہیں تو ہمیں اس سے کہیں زیادہ بامعنی طریقے اپنانے ہوں گے۔ جنگِ آزادی میں حصہ لینے والے تمام آدمیوں کو تاریخ کی مقفل دستاویزات سے نکالنا ہوگا۔ ایسا کرنے سے قومی تماشے والی صورتِ حال پیدا نہیں ہوگی اور نہ ہی منتظمین کو گانے بجانے کا موقعہ ملے گا۔ البتہ کانگریس اس عمل سے سیاسی فائدہ حاصل کر سکتی ہے۔

آیئے ہم دہلی کو ایک طرف رکھ کر جنگِ آزادی کے نسبتاً کم نظر آنے والے مقامات کو بھی دیکھیں۔ ایسا ہی ایک مقام جھانسی ہے جہاں جون 1857ء میں دہلی کے واقعات کو دہرایا گیا۔ باغی سپاہیوں نے گولہ بارود پر قبضہ کر لیا۔ جائیدادیں جلا دیں۔ نہتے فرنگیوں کو جان کی امان کا وعدہ کر کے قتل کیا گیا اور دہلی کی طرح ایک جھجکتے ہوئے حکمران سے مدد طلب کی گئی جسے انگریزوں نے

اقتدار سے محروم کیا ہوا تھا۔

جھانسی میں جنگِ آزادی اور مزاحمت کو یاد کرنے کے انداز اور ماحول بالکل مختلف ہیں۔ جہاں دہلی کا ''قومی'' کلچر اس تاریخی واقعہ کو بہت ہی کم اہمیت دیتا ہے وہاں جھانسی بڑے غیر روایتی انداز میں اور بڑے عوامی طریقے سے اس واقعے کو یاد کرتا ہے۔

بندیل کھنڈ میں 1857ء کو رانی لکشمی بائی کے حوالے سے یاد کیا جاتا ہے جہاں رانی کی موجودگی اب بھی محسوس کی جاتی ہے۔ رانی کو بڑے جارحانہ انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ تلوار بکف۔۔۔ گھوڑے پر سوار۔۔۔ ایک عظیم اور بہادر عورت جس کی پشت سے اس کا لے پالک بیٹا دامودر چپکا ہوا ہے۔ ایسے مجسمے پورے جھانسی میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں اور قریبی گوالیار میں بھی جہاں رانی کا کریا کرم ہوا تھا۔ گوالیار میں کانسی کا مجسمہ رانی کو شہ سوار کے طور پر تو دکھاتا ہے لیکن اس کی پشت سے دامودر کو چند سال پہلے کسی نے چُرا لیا۔ جس کی وجہ سے مجسمے کی شان وشوکت میں خاصا کمی آ گئی ہے۔

مگر جھانسی میں صرف رانی کو ہی یاد نہیں کیا جاتا بلکہ وہاں کے حلقے میں اور بھی بہت سے چیزیں ہیں۔ مثلاً یہاں جنگِ آزادی سے متعلق بہت سے نوادر محفوظ ہیں جو تہہ در تہہ مزاحمتی تاریخ کی پرتیں کھولتے ہیں۔

دہلی کے لال قلعے کی طرح جھانسی کا قلعہ بھی سترہویں صدی میں تعمیر کیا گیا تھا۔ لیکن جہاں لال قلعہ صرف مغلیہ دور کی یاد دلاتا ہے وہاں جھانسی کا قلعہ اپنے رنگ برنگے مکینوں کی خوشبوؤں سے مہکتا ہے۔ جھانسی کے قلعے میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اس بندیلہ سردار کی یاد آتی ہے جس نے یہ قلعہ تعمیر کرایا تھا۔ پھر مغل، مرہٹے، اور انگریز۔۔۔ آپ کو سب کی موجودگی وہاں محسوس ہوتی ہے۔

اسی طرح ایک تختی پر سُبھدرا کماری چوہان کی ایک کویتا ''جھانسی کی رانی'' نظر آتی ہے۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ ایک ایسی یادگار جو محکمہ آثارِ قدیمہ کے زیرِ حفاظت ہے وہاں آپ کو شاعری پڑھنے کو ملتی ہے۔ لیکن یہی وہ جذبات سے بھرپور کویتا ہے جس نے جھانسی کی رزم آرائی کو لازوال کر دیا ہے۔ کویتا لکھنے والی شاعرہ سُبھدرا کماری چوہان کو بھی بڑے دلچسپ طریقے سے یاد رکھا گیا ہے اور وہ اس طرح کہ 2006ء میں انڈین کوسٹ گارڈ کے ایک جہاز کو سُبھدرا کماری چوہان کے

نام سے منسوب کیا گیا۔

اسی طرح لکشمی بائی کو یاد رکھنے کے انداز بھی عجیب ہیں۔ رانی َ ۔پنی جاگیر کے مسلح محافظ کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے جسے باغات پسند ہیں اور جو ایک کٹر ہندو بھی ہے۔ گنیش اور شیو کے مندروں میں اور امود گارڈن میں رانی جھانسی ہمیں ایک جیتی جاگتی انسان نظر آتی ہے۔ اسی طرح بارہ دری میں ایک ایسی یادگار ہے جو لکشمی بائی کے شوہر اور جھانسی کے نسبتاً کم مشہور حکمران گنگادھر راؤ کی ہمہ جہت شخصیت کا اظہار ہے۔ یہاں ہمیں گنگادھر راؤ ایک حکمران سے زیادہ ایک فنون لطیفہ کا عاشق معلوم ہوتا ہے۔

قلعے میں گنگادھر راؤ سے وابستہ ایک عورت بھی دفن ہے جسے لکشمی بائی کی فوج میں توپچی کے طور پر یاد کیا جاتا ہے اور جو بھوانی شنکر نامی توپ چلایا کرتی تھی۔ اس طرح غلام غوث خان توپچی بھی ہے جو کھڑک بجلی نامی توپ چلایا کرتا تھا۔ موتی بائی کی طرح غوث خان بھی 4 جون 1858ء کو جاں بحق ہوا اور وہیں دفن کیا گیا۔ ایک اور سپاہی خدا بخش بھی اسی دن شہید ہوا۔ یہ سب لوگ شہیدوں کی مشترکہ یادگار کے پاس دفن ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کیسے مختلف اندازوں سے تاریخی یادگاروں کو انسانی رنگ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

سب یادگاریں بالکل درست بھی نہیں ہیں۔ مثلاً سرکاری میوزیم میں غلام غوث خان کا فائبر گلاس سے بنا ہوا مجسمہ اصل شخصیت کو پیش کر ہی نہیں سکتا۔ یہ کسی زمانے میں اُتر پردیش کی یوم جمہوریہ تقریبات میں نظر آتا تھا۔ بعد میں اسے میوزیم میں رکھ دیا گیا۔

اسی طرح ایک اس مقام کی یادگار ہے جہاں سے مبینہ طور پر رانی اپنے بیٹے کے ساتھ فرار ہوئی تھی۔ اس بات پر یقین کرنا مشکل ہے کیونکہ لکشمی بائی انگریز محاصرے سے فرار تو ہوئی لیکن وہ 4-اپریل 1858ء کو افغان جنگجوؤں کے ساتھ مرکزی دروازے سے نکلی تھی۔

جھانسی کی یادگاریں ساکت و جامد نہیں ہیں۔ حالیہ سماجی تحریکوں نے اُن میں نئی جان ڈال دی ہے۔ جنگِ آزادی کی پرانی تاریخ میں ایک نیا عنصر دلیت عورت جھلکری بائی کا ہے۔

جھلکری بائی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ لکشمی بائی کی ہم شکل تھی جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے رانی کو فرار کا موقع ملا۔ اس کہانی کا تاریخی ماخذ میں موجود ہونا اہم بات نہیں ہے۔ جس طرح دیوی دیوتاؤں پر عقیدے سے ہندو مت کو تشکیل دیا ہے اس طرح جھلکری بائی کا کردار بھی

یادگار بن گیا ہے۔ لکشمی بائی کی طرح جھلکری بائی کے بھی مجسمے اور خاکے بنائے گئے ہیں۔ ایک جھلکری بُرج بھی ہے جہاں اُس کا پتی توپ چلایا کرتا تھا۔ اسی طرح نیا پورہ کا وہ علاقہ جہاں جھلکری بائی رہتی تھی اب اُسے بلدیاتی انتظامیہ نے جھلکری پورم کا نام دے دیا ہے۔

غرضیکہ 1857ء کی یاد مناتے ہوئے ہم جھانسی کی یادگاروں سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

(نین جوت لہری دہلی یونیورسٹی میں پڑھاتی ہیں)

❁ ❁ ❁ ❁ ❁

تاریخ کا عوامی رنگ

عرفان حبیب/ترجمہ: پروفیسر طفیل ڈھانہ

برطانوی سامراج نے جس قدر مسائل پیدا کئے وہ سب اسی ادارے میں مرتکز ہو گئے جو اس نے اپنے مقاصد کے پیش نظر تشکیل دیا تھا۔ یہ تھی بنگالی فوج

1857 کی بغاوت کو اس وسیع تناظر میں دیکھنا چاہئے کہ کالونیل ازم کے دور میں ہندوستان اور ہندوستانی عوام کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا گیا۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کالونیل ازم میں ہندوستان کے وسائل مسلسل اور بے دریغ لوٹے گئے۔ اگر ہم کسٹم کے ریکارڈ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ 55-1854 میں، بغاوت سے صرف دو برس قبل، ہندوستان سے تقریباً 5.8 کروڑ روپے کے وسائل سالانہ منتقل ہو رہے تھے۔ کیونکہ ہندوستانی کسٹم ڈیپارٹمنٹ کا ریکارڈ ظاہر کرتا ہے کہ ہندوستان کی درآمدات کے مقابلے میں برآمدات کا حجم اسی قدر زیادہ تھا۔ اس لوٹ کھسوٹ کے باعث ہندوستانی عوام کو ناقابل برداشت ٹیکسوں کا بوجھ اٹھانا پڑا۔ ٹیکسوں کے بوجھ میں انتہائی اضافہ ان علاقوں میں ہوا جو محل واری ایریا کہلاتے تھے، یہاں لگان اس طرح سے متعین نہیں تھا جس طرح کہ مستقل طور پر آباد علاقوں میں اور مدراس کے روتواری علاقے میں ہو چکا تھا۔

حقیقی معنوں میں 56-1819 کے درمیان محل واری علاقے (جس میں اودھ اور وسطی ہندوستان کے کچھ حصے چھوڑ کر موجودہ یو۔ پی شامل تھا) میں ٹیکس میں 70 فیصدی اضافہ ہوا۔ جس کے نتیجے میں 58-1839 کے درمیان عرصے میں متعدد اضلاع کے 50 فیصدی کسان اپنے زرعی

رقبے فروخت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یوں اراضی اور ٹیکس کسانوں اور زمینداروں کے لئے انتہائی پریشانی کا باعث مسئلہ بن گیا تھا۔ ہمیں ذہن میں رکھنا چاہئے کہ بغاوت میں اسی علاقے کا کردار بنیادی تھا؛ یہی علاقہ تھا جس سے بنگالی سپاہیوں کا تعلق تھا، یہ اصل میں کسان تھے جنہوں نے فوجی وردی پہن لی تھی اور اسی علاقے میں بغاوت کو سب سے زیادہ مضبوط حمایت حاصل ہوئی۔

دوسرا قابل توجہ نکتہ یہ تھا جس کو اب آزاد تجارت کی سامراجی نوعیت کا نام دیا جاتا ہے۔ 1833 کے چارٹر ایکٹ کے نتیجے میں دراصل انگریز کارخانہ داروں کو ہندوستان میں ٹیکس فری مارکیٹ فراہم کردی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں کپڑے کی ایک چوتھائی مانگ برطانوی درآمدات سے پوری ہونے لگی اور مقامی صنعت میں کام کرنے والے مزدور بے روزگاری کا شکار ہو گئے۔ لہٰذا اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ خاص طور سے شہروں میں آباد جولاہوں نے بغاوت کی پُرجوش حمایت کی اور ایک خاصی تعداد بغاوت میں رضا کاروں کے طور پر شامل ہوئی۔

آزاد تجارت کے عملی نفاذ کے نتیجے میں بزور قوت الحاق کی پالیسی اختیار کی گئی جس کا مطلب ہندوستان میں خریدار پیدا کر کے منڈی کو وسعت دینا تھا۔ 56-1843 کے درمیانی عرصہ میں سندھ، پنجاب، ستارا، ناگ پور، جھانسی اور اودھ کا الحاق عمل میں لایا گیا۔ اور ان برسوں میں ہندوستان کا تقریباً 1/5 علاقہ برطانوی کنٹرول میں لایا گیا۔ ہر الحاق کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر بے روزگاری پھیلی کیونکہ سابقہ حکومتوں کے ملازمین، جیسا کہ شاہی عدالتوں کے اہلکار اور ہنرمند وغیرہ اپنے روزگار سے محروم ہو گئے۔ خاص طور سے 1856 میں اودھ کے الحاق سے بڑی پریشانی پیدا ہوئی اور 1857 میں یہاں جزوی طور پر عوام نے سابقہ حکومت بحال کرنے کی کوشش کی۔ آخر کار آزاد تجارت کی سامراجیت نے اپنی پیاس خون سے بجھانے کی ضرورت محسوس کی۔

بنگال آرمی، جو کہ ایشیا میں سب سے بڑی جدید فوج تھی، اس میں 1,35000 ہندوستانی سپاہی شامل تھے جو جنگ کے جدید طریقوں میں تربیت یافتہ تھے۔ اس دور میں یہ برطانوی سامراج کی اہم آرمی تھی جس نے برطانیہ کی جارحانہ جنگوں کو ہندوستان میں اور 1839 کے بعد ہندوستان سے باہر کامیابی سے ہمکنار کیا تھا۔ یہ فوجی افغانستان، سندھ، پنجاب، برما، کریمیا، چین

اور ایران کے خلاف جنگوں میں لڑے اور مرے اور انہوں نے ایک کے بعد دوسرے برس بڑی بڑی قربانیاں دیں۔ اس عمل نے ہندوستانی فوج کے مورال پر برے اثرات مرتب کئے اور اس طرح ان کے لئے آقاؤں کی وفاداری بھی مجروح ہوئی۔

ایک لحاظ سے، وہ تمام پریشانیاں جو سامراج یا کالونیل ازم نے پیدا کی تھیں ڈرامائی انداز سے اس ادارے میں مرتکز ہوگئیں جو اس نے اپنے مقاصد کے تحت تشکیل دیا تھا۔ ایک ہی زبان بولنے والے سپاہی حاصل کرنے کے لئے بنگال آرمی کے فوجی صرف ہندوستانی بولنے والے علاقے سے بھرتی کئے گئے تھے۔ برطانوی تعلیم یافتہ اور ڈسپلن کے حامل سپاہی چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اہم دستے، یعنی انفینٹری کے لئے برہمنوں کا انتخاب کیا اور اس سے بنگال آرمی میں ذات پات کا حساس مسئلہ ابھرا۔ 1855 کے بعد انگریزوں نے بنگال آرمی میں نچلی ذاتوں کے لوگوں کی بھرتی پر پابندی لگادی۔ کیونکہ فوج میں برہمنوں کی تعداد زیادہ ہوچکی تھی۔

بنگال آرمی کا راجوں، نوابوں، زمینداروں اور تعلقہ داروں کی بوسیدہ دنیا سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ان کو قدیم بوسیدہ نظام کے ساتھ بھی کوئی ہمدردی نہ تھی۔ سپاہیوں کی بغاوت کی فوری وجہ چربی لگے کارتوس بنے۔ یہ برہمنوں کے لئے انتہائی اہم مسئلہ تھا، جو قدرتی طور پر رسومات اور ذات پات کے ضمن میں بنگال آرمی کے دیگر لوگوں کی نسبت زیادہ حساس تھے۔ اس کے باوجود یہ فرض کرنا غلطی ہوگی کہ فوجی اپنے دین دھرم (مذہب) کی حفاظت کے لئے بغاوت پر اتر آئے تھے۔ اس لئے وہ کسی مذہبی حکومت کے تصور کے تابع تھے اور ان میں جدیدیت مخالف تعصبات پائے جاتے تھے۔

اس بحث کے دوران کہ 1857 کی جنگ غدر تھی یا غدر نہیں تھی، ہمیں بغاوت میں سپاہیوں کا فیصلہ کن کردار نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ وہ بغاوت کی جان تھے، بغاوت کا مسلح دستہ اور سب سے زیادہ ثابت قدم حصہ تھے۔ بیشک اس میں دوسرے بھی شریک ہوئے۔ لیکن کسی بھی بغاوت میں وہی قومیں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں جو کہ مسلح ہوتی ہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کی بنیاد پر 1857 کی جنگ دنیا میں سب سے بڑی سامراج مخالف جنگ بن گئی۔ سامراج مخالف کسی دوسری جنگ میں ایسی مثال نہیں کہ 120,000 سے زیادہ تعداد میں باقاعدہ فوجیوں نے حصہ لیا ہو۔ جس طرح کہ بنگال آرمی کے سپاہیوں نے جنگ میں شرکت کی۔

جمہوریت پسندی کے جذبات

بنگال آرمی کے سپاہیوں کے جمہوری یا جمہوریت پسند رویئے خاص طور سے اہمیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے جہاں نمائندہ ادارے تشکیل دیئے ان کو کونسلوں کا نام دیا اور ان کے سربراہوں کا جمہوری انتخاب کیا۔ انہوں نے دہلی میں رسمی طور پر بہادر شاہ ظفر کو بادشاہ تسلیم کیا لیکن عملی انتظامات کے لئے ایک کونسل تشکیل کر دی جس میں تمام باغی گروہوں کے نمائندے شامل کئے گئے تھے۔ اگر بغاوت کامیاب ہو جاتی تو ہمارے یہاں سنٹرل قانون ساز اسمبلی کی بجائے دہلی کی مرکزی کونسل ہندوستان کی پہلی پارلیمنٹ کے طور پر وجود میں آ سکتی تھی۔ لکھنو میں بھی باغی سپاہیوں نے اسی نوعیت کی نمائندہ کونسل تشکیل دینے پر اصرار کیا۔

یوں واضح ہے کہ سپاہیوں میں نہ صرف جمہوری تصور موجود تھا، بلکہ انہوں نے انتخابات کے ذریعے نمائندگی پر خاص طور سے توجہ دی تھی۔ (اس کے بارے میں اکثر کہا جاتا تھا کہ یہ عمل سابقہ روایت کو توڑنے کے مترادف تھا کیونکہ کوئی بھی فیصلہ طویل بحث کے بعد کیا جاتا تھا۔)

دوسری قابل توجہ خاص بات یہ ہے کہ برطانوی حلقوں کی جانب سے سپاہیوں کے غلط روئیوں پر تنقید کے باوجود، یہ حقیقت نمایاں ہے کہ دہلی پر باغیوں کے چار ماہ تک کنٹرول کے دوران (قومی محفوظات میں اس دور کے اخبارات اور دستاویزات نشاندہی کرتی ہیں) کہ سپاہیوں کی جانب سے غلط اقدامات بہت محدود پیمانے پر واقع ہوئے۔ سپاہیوں کو کوئی تنخواہ نہیں مل رہی تھی اس لئے شروع میں ان کو کچھ رقم سول آبادی سے حاصل کرنا پڑی۔ لیکن جب ان کی تنخواہ کے انتظامات ہو گئے، انہوں نے سول آبادی کو پریشان نہیں کیا، حتیٰ کہ سود خوروں کو بھی کچھ نہیں کہا۔ اس کا موازنہ برطانوی قبضہ کے ساتھ کر کے دیکھیں۔ جس میں لوگوں کو قتل عام کیا گیا اور جی بھر کے لوٹا گیا۔ اس کے مقابلہ میں بغاوت کے پورے عرصہ کے دوران باغیوں کا رویہ مثالی تھا جو انہوں نے حالات کے پیش نظر اختیار کیا۔

مذہب کے بارے میں قومی نقطہ نظر اختیار کیا گیا تھا۔ اس بارے میں باغیوں نے دلیل پیش کی کہ ہندو اور مسلم واحدانیت پر یقین رکھنے والے مذہبی فرقے تھے جبکہ عیسائی تثلیث کو مانتے تھے۔ لہٰذا ہندو اور مسلم مشترک مذہبی اقدار کے حامل تھے جو عیسائیوں سے مختلف تھیں۔ لیکن اس

کے پیچھے اہم حقیقت یہ تھی کہ ہندو اور مسلم ہندوستان کے وفادار تھے جبکہ عیسائی دوسری نسل کے لوگ تھے اور انہوں نے ہندوستانیوں کا استحصال کیا اور ان کی تضحیک کی تھی۔ ان خیالات و تصورات کا اندازہ، جو باغیوں میں پائے جاتے تھے، ان اخبارات کے بیانات سے لگایا جا سکتا ہے جو کہ دہلی پر باغیوں کی چار ماہ تک حکومت کے دوران شائع ہوئے۔

اس وقت دہلی میں تین ایسے اخبار تھے جو ہفتہ وار شائع ہوتے تھے، دو اردو میں اور ایک فارسی میں شائع ہوتا تھا۔ دہلی اردو اخبار، جو کہ بڑا اخبار تھا، نے پرزور طریقے سے موقف پیش کیا کہ انگریز غیر ملکی حکمران تھے اور انہوں نے ہمیشہ ہندوستان سے دولت کشید کی۔ وہ عیسائی تھے لہٰذا واحدانیت کو تسلیم نہ کرتے تھے۔ دوسری جانب مسلم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور ہندو ایڈی پرش پر، جس کے معنی ہیں، ایک خدا۔ اخبار نے ہمیشہ قارئین کو ملکی باشندے اور باغیوں کو فوجِ ہندوستان یا انڈین آرمی کے نام سے مخاطب کیا۔ اخبار نے بخت خاں کو ہیرو کے روپ میں پیش کیا۔ جو دہلی کا جمہوریت پسند کمانڈر انچیف تھا، جو کہ بعض جدید حلقوں میں بالکل غلط طور پر ایک وہابیؒ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

دہلی اردو اخبار نے محنت کی اہمیت کو اجاگر کیا اور اس بات پر زور دیا کہ لوگ مختلف کاموں میں مہارت حاصل کریں اور رائفلیں تیار کریں۔ اخبار نے جدید رسل و رسائل کی کبھی مذمت نہیں کی۔ بلکہ باغیوں کے زیر کنٹرول علاقے میں ڈاک کا نظام بحال کرنے کا مطالبہ کیا۔ اگست 1857 کے اعلامیہ میں، فیروز شاہ، جو باغیوں کا ایک نمایاں لیڈر تھا، نے کہا کہ باغی ریلوے اور بھاپ سے چلنے والی کشتیوں کے نظام کو ترقی دیں گے۔

بغاوت میں کسانوں کی شمولیت بنیادی طور پر ٹیکس (یا نا قابل برداشت ٹیکس) کی وجہ سے تھی جو کہ برطانوی حکومت کی جانب سے نافذ کئے گئے تھے۔ دوسری وجہ یہ حقیقت تھی کہ فوج کے سپاہی بھی دیہاتوں سے ہی آتے تھے۔ البتہ اس کی بنیادی وجہ محل واری علاقوں میں نا قابل برداشت ٹیکس تھا۔ جس کے نتیجہ میں کسان اپنی زمینوں سے محروم ہوتے گئے اور باقیوں کو یہی خطرہ لاحق تھا۔ یہ وجہ تھی کہ کسانوں کی اکثریت نے بغاوت میں شمولیت اختیار کی۔ پیشتر علاقوں میں، اور خاص طور سے اودھ میں وہ روایتی زمینداروں اور تعلقہ داروں کے مطالبہ پر جنگ میں شامل ہوئے۔

تلاشِ ہند میں (Discovery of India) میں جواہر لال نہرو جنگ آزادی 1857 کو

جاگیرداروں کی بغاوت قرار دیتا ہے یہ صرف اس حد تک درست ہے کہ اہم راہنماؤں میں متعدد شہزادے یا زمیندار شامل تھے اور ان میں چند ایک نے بغاوت میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ مثال کے طور پر کنور سنگھ اور امر سنگھ، جو جگدیش پور کے دو بڑے زمیندار تھے، نے بغاوت کی مہم میں ریوا، کالپی، کانپور، لکھنو اور اعظم گڑھ میں مہم چلائی۔

بغاوت پر لکھنے والے کئی انگریز لکھاریوں نے کہا ہے کہ اگر باغیوں کے پاس ایک درجن ایسے لیڈر ہوتے تو ہندوستان پر برطانوی اقتدار دوبارہ قائم نہ ہوسکتا تھا۔ یہاں رانی آف جھانسی، رانی لکشمی بائی، اور لکھنو کی حضرت محل تھی۔ جنہوں نے پوری تندہی سے انگریزوں کی مزاحمت کی۔ یہاں خان بہادر خاں، بریلی کا ایک زمیندار تھا جو کہ بالآخر پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔ بہادر شاہ ظفر، جس نے ابتدائی پس و پیش کو جزوی طور پر چھوڑ دیا اور آخرکار 1857 کی جنگ کے بعد کی شاعری میں باغی شہیدوں کے لئے نوحے لکھے۔

اس بات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ جب شہزادے، زمیندار اور تعلقہ دار دنیا کی سب سے بڑی سامراجی قوت کے خلاف جنگ میں شریک ہوئے، عوامی بغاوت نے فوری ضرورت کے مطابق اپنے رویوں اور نقطہء نظر میں تبدیلیاں پیدا کیں۔

آئیں اودھ کے باغیوں کے اعلامیوں کی زبان پر نظر ڈالتے ہیں، جن کی قیادت سپاہیوں کی جانب سے واضح طور پر تعلقہ داروں کے ہاتھ میں تھی۔ یہ اعلامیے عام طور پر عام لوگوں کی ہندوستانی زبان میں تھے۔ مثال کے طور پر شہزادہ برجیس قدر کا ابتدائی اعلامیہ، جو1875 میں شائع ہوا، اس کے مسودہ میں دائیں جانب اردو اور بائیں جانب ناگری میں لکھا گیا تھا۔ دونوں کالموں میں متن تقریباً ایک جیسا ہے لیکن اردو کے متن میں فارسی کے الفاظ بہت کم استعمال ہوئے ہیں اور اسی طرح ناگری متن میں پراکرتی زبان کے کم الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اس کا واضح مقصد ایسی زبان کا استعمال تھا جو عام لوگوں کی سمجھ میں آسکتی تھی۔

ابتدائی اعلانات

ابتدائی اعلانات میں روایتی تصورات کا اظہار ملتا ہے۔ جن میں وعدے کئے گئے تھے کہ انگریزوں کی شکست کے بعد ہندوستان میں پرانی جاگیرداری پر مشتمل روایتی نظام بحال کر دیا

جائے گا۔ وقت گزرنے کے ساتھ باغیوں کے اعلامیوں میں ایسے جذبات غائب ہو جاتے ہیں۔ بالآخر جب حضرت محل کے کیمپ میں شامل باغیوں نے ملکہ وکٹوریہ کے اعلامیہ 1857 کا جواب جاری کیا تو اس میں ایسے تمام معاملات کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ اب پہلی صف میں ہندوستان کے عوام کھڑے نظر آتے ہیں۔ ''ہندوستانی فوج اور عوام'' کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ ملکہ وکٹوریہ اور اس کے اعلامیہ پر اعتبار نہ کریں، جو کہ فریب اور دھوکہ دہی سے لبریز ہے۔

اودھ میں باغی سوال کرتے ہیں کہ اگر انگریز حقیقی طور پر انصاف کرنا چاہتے ہیں تو وہ میسور واپس کیوں نہیں کرتے جو انہوں نے سلطان ٹیپو سے چھینا، پنجاب واپس کیوں نہیں کرتے جو انہوں نے دلیپ سنگھ سے چھینا۔ دوسری دلیل یہ تھی کہ انتقامی کارروائی میں انگریزوں کے ہاں معافی نہیں ہے، لہٰذا عوام کو جدوجہد آزادی سے پیچھے نہیں ہٹنا چاہئے۔ اور باغی سوال کرتے ہیں کہ انگریزوں کی فتح کے نتیجے میں ہندوستانی عوام کا مستقبل کیا ہوگا۔ وہ صرف قلی ہوں گے جن کو سڑکوں کی تعمیر اور نہروں کی کھدائی کے لئے مناسب سمجھا جائے گا؟

رانی آف جھانسی کی کہانی میں ہم دیکھتے ہیں کہ خاندانی جھگڑے کس طرح بڑے مسائل کے حل کا باعث بن جاتے ہیں۔ بچے کو وراثت کے حق سے محروم کرنے اور ریاست کے الحاق سے قبل رانی کو انگریزوں سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔ ابتدائی طور پر وہ باغیوں کا ساتھ دینے پر تیار نہ تھی۔ لیکن جب وہ باغیوں میں شامل ہوگئی، اس نے ایسے ایسے کارنامے سرانجام دیئے جن کے بارے میں وہ تصور بھی نہ کرسکتی تھی۔ جب وہ شہر پر انگریزوں کے طوفانی حملہ کے بعد جھانسی سے فرار ہو رہی تھی، اس کی ملاقات دکن کے ایک برہمن، وشنو گوڈے سے ہوئی، جو دیکھتا ہے کہ وہ پٹھانوں کے لباس میں تھی۔ رانی نے اس کو بتایا کہ وہ ایک عام بیوہ تھی جس کو وہ دھرم یا بیواؤں کے لئے طے شدہ رسومات اختیار کرنا تھیں۔ لیکن قسمت کی مرضی اور تھی اور اب اس کے لئے ہندو دھرم کی عزت کے لئے لڑنا ضروری ہو گیا تھا۔ لہٰذا وہ ہندو دھرم ایسا نہیں تھا جس میں ایسی مذہبی رسومات کی بحالی لازم تھی جو پابند کرتا تھا کہ ایک بیوہ کو دنیا سے علیحدہ رہ کر زندگی گزارنی چاہئے۔ بلکہ وہ ایسے دھرم کی پیرو بن گئی جو غیر ملکیوں کو نکال باہر پھینکنے کی تلقین کرتا تھا۔ ہر کسی کے مذہب نے اب غیر فرقہ وارانہ اور حب الوطنی کی شکل اختیار کر لی تھی۔

انگریزوں نے جو کچھ کیا اس کی پردہ پوشی نہیں ہونی چاہئے، البتہ یہ سوال اٹھانا ہمارے لئے

ایک غیر سفارتی رویہ ہوسکتا ہے۔ بغاوت پھوٹ پڑنے اور اس کو دبا لینے کے بعد ہندوستانی لوگوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا اس کو تاریخ کے صفحات سے مٹایا نہیں جا سکتا۔ جس طرح کہ جے۔ڈبلیو۔کے (J.W.Kay) نے اپنی کلاسیقی سپاہیوں کی جنگی تاریخ (History of Sepoy War) میں بیان کیا ہے۔''ایک انگریز کا دم گھٹ جاتا ہے، جب وہ پڑھتا ہے کہ مسز چیمبر یا مس جینگ کو ایک بدشکل قانون شکن نے بے دردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا؛ لیکن مقامی تاریخوں میں درج کیا جا سکتا ہے کہ مائیں، بیویاں اور بچے جو عام لوگوں میں شمار ہوتے تھے، انگریزوں کی انتقامی کارروائی کے سب سے پہلے بے بس شکار تھے، اور یہ کہانیاں اس قدر تکلیف دہ ہیں کہ ہمارے دلوں کے ٹکڑے کر دیتی ہیں۔

دہلی میں قتل عام

دہلی میں قتل عام لاتعداد یادداشتوں میں بیان ہوا ہے، جو موجود پائی جاتی ہیں اور اس برطانوی رپورٹوں میں اس کا ذکر ملتا ہے۔

تمام تر شہر قتل عام کا شکار ہوا اور یہ بے آباد ہو گیا۔ قتل وغارتگری کا سلسلہ کئی دنوں تک جاری رہا۔ اگر باغیوں نے انگریزوں کو سینکڑوں میں ہلاک کیا تھا، تو انگریزوں نے لاکھوں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ لاتعداد ہندوستانیوں پر مقدمے چلائے گئے اور ان کو پھانسی دی گئی یا دہشت ناک طریقے سے گولیوں کا نشانہ بنا دیا گیا۔ جن کے بارے میں فرض کر لیا گیا کہ وہ انگریزوں کو قتل کرنے کے جرم میں شریک تھے۔ لیکن اس سے برطانیہ ہمیشہ کے لئے ذاتی انتقام میں سینکڑوں عام لوگوں یعنی مردوں، عورتوں اور بچوں کو ہلاک کرنے کا ذمہ دار بن گیا؟ ہم دونوں فریقین کو برابر کیسے سمجھ سکتے ہیں؟ اس لئے جب ہمارے حکمران (جیسا کہ ایک بار ہمارے وزیراعظم، آکسفورڈ میں) ان اچھی باتوں کا ذکر کرتے ہیں جو برطانوی حکمرانی کے دوران عمل میں آئیں، جیسا کہ انڈین سول سروس کا قیام، ان کو کبھی 1857 کے متعلق بھی سوچنا چاہئے، نا صرف باغیوں کے حوالے سے بلکہ عام شہریوں کے حوالے سے بھی جو عام مرد، عورتیں اور بچے تھے، جن کو گولی کا نشانہ بنایا گیا یا بے دردی سے قتل کیا گیا یا مختلف طریقوں سے ہلاک کیا گیا اور یہ سب کچھ ہمارے لائق تعریف محسن کی زیر نگرانی ہوا۔

باغیوں کا آئین

سول انتظامیہ۔ دہلی
انتظامی کونسل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم!

آئین کی تیاری، جس کا مقصد مختلف شعبہ جات میں پایا جانے والا ابہام دور کرنا اور فوجی و سول انتظامیہ میں پائی جانے والی بدنظمی کو دور کرنا ہے۔ جس کی تشکیل ایک کونسل کی فعالیت اور اداراتی نظام کے لئے ناگزیر اور مناسب ہے اور جس کی تشکیل لازم ہے۔ اس آئین کی اہم شقیں درج ذیل ہیں:

1- ایک کونسل پر مشتمل ادارہ قائم کیا جائے گا۔ جس کو انتظامی کونسل کا نام دیا جائے گا۔ یعنی جلسہء انتظام فوجی وملکی۔

2- اس کونسل میں 10 ارکان نامزد (منتخب) ہوں گے۔ جن کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔۔۔ فوج سے چھ ارکان اور سول سے 4 ارکان۔ فوج کے ارکان میں سے انفینٹری سے 2، کویلری سے 2 اور آرٹلری سے 2 ارکان شامل ہوں گے۔ جبکہ 4 ارکان (سول)۔

3- مندرجہ بالا 10 ارکان میں سے اتفاق رائے سے ایک کو صدر اور دوسرے کو نائب صدر منتخب کیا جائے گا۔ صدر کے دو ووٹ ہوں گے اور ہر ڈیپارٹمنٹ میں ضرورت کے مطابق سیکرٹریوں کو نامزد کیا جائے گا۔ ان میں سے 5 کی حاضری سے کورم پورا ہوگا۔

4- اپنے عہدے کا چارج لینے والا درج ذیل حلف اٹھائے گا۔ ''میں اپنے فرائض خلوص اور دیانتداری کے ساتھ سرانجام دوں گا اور کسی نوعیت کی جانبداری کا مظاہرہ نہیں کروں گا۔

پوری توجہ اور محنت سے اور سوچ سمجھ کر کام کروں گا اور انتظامی امور میں چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی نظر انداز نہ کروں گا اور بلا واسطہ یا بالواسطہ کسی قسم کی بد دیانتی سے قوت کا استعمال یا تخصیص اختیار نہیں کروں گا۔ لیکن اپنی پوری کوشش کروں گا کہ انتظامی امور اس طرح چلائے جائیں جس سے حکومت مضبوط ہو اور عوام کے لئے سہولتیں میسر ہوں اور بالواسطہ یا بلا واسطہ ان فیصلوں کے راز افشاء نہیں کروں گا جو کونسل میں کئے جائیں گے۔ جب تک کونسل یا صاحب عالم کی منظوری نہیں ہوگی۔

5- کونسل کے انتخابات کا طریقہ یہ ہوگا۔ انفینٹری سے 2 ارکان، کاویلری سے 2 ارکان اور 2 ارکان آرٹیلری سے اکثریتی ووٹوں کے ذریعے منتخب ہوں گے۔ ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ سروس میں سینئر، قابل، تجربہ کار، موزوں اور ذہین ہوں۔ لیکن اگر کوئی امیدوار ایسا ہے جو قابل، ذہین، دانا اور کونسل میں کام کرنے کا اہل ہے لیکن سروس میں سینئر نہیں ہے۔ یہ واحد کمی اس کی نامزدگی (انتخاب) میں رکاوٹ نہیں ہوگی۔ دوسرے چار سول ارکان کی نامزدگی (انتخاب) بھی اسی معیار پر عمل میں آئے گی۔

6- مندرجہ بالا 10 ارکان کی نامزدگی کے بعد ان میں سے کوئی رکن جنرل کونسل کے اجلاس میں بدنیتی، جانبداری اور بد دیانتی کی بنیاد پر کوئی رائے پیش کرے گا۔ تو اس کی رکنیت اتفاق رائے سے ختم کر دی جائے گی اور متبادل رکن کا انتخاب شق 5 کے مطابق عمل میں لایا جائے گا۔

7- تمام انتظامی معاملات، فیصلے کے لئے، پہلے کونسل میں پیش کئے جائیں گے۔ کونسل کے ارکان کی اکثریت رائے سے منظوری کے بعد یہ فیصلہ حتمی منظوری کے لئے صاحب عالم بہادر شاہ ظفر کو پیش کیا جائے گا۔ کونسل جس کے ماتحت کام کرے گی۔ صاحب عالم بہادر شاہ کی منظوری کے بعد بہادر شاہ کو منظوری کی اطلاع دی جائے گی۔ فوجی اور سول انتظامیہ میں کوئی فیصلہ موثر نہیں ہوگا جب تک کونسل کی منظوری، صاحب عالم کی منظوری اور عالی جا کو اطلاع کے مراحل طے نہیں ہوتے۔ اگر صاحب عالم کونسل کے کسی فیصلے سے اتفاق نہیں کرتے۔ فیصلہ دوبارہ غور کے لئے کونسل میں پیش کیا جائے گا۔ اگر دوبارہ صاحب عالم کو فیصلے پر اختلاف رہا تو معاملہ عالی جا کے حضور پیش ہوگا اور ان کا فیصلہ آخری

قرار دیا جائے گا۔

8- کونسل کے ارکان، صاحب عالم اور عالی جا کے علاوہ کسی کو اجلاس میں شرکت کی اجازت نہیں ہوگی۔ اگر کسی خاص مجبوری کے باعث کوئی ایک رکن اجلاس سے غیر حاضر ہے تو باقی ارکان کے فیصلے جو کثرت رائے سے ہوں گے، پوری کونسل کے فیصلے قرار دیئے جائیں گے۔

9- اگر کوئی رکن کونسل میں کوئی قرارداد پیش کرنا چاہتا ہے تو اس کو ایک دوسرے رکن کی تائید حاصل کرنا ہوگی۔ اور اس طرح قرارداد دو ارکان کے اتفاق رائے سے پیش ہوگی۔

10- جب شق 9 کے مطابق قرارداد اجلاس میں پیش ہو جاتی ہے۔ سب سے پہلے قرارداد کا پیش کنندہ اپنے موقف کی وضاحت پیش کرے گا اور اس دوران کوئی دوسرا رکن مداخلت نہیں کرے گا، جب تک وہ اپنی بات ختم نہیں کرتا۔ اگر کوئی رکن اس قرارداد پر نکتہ اعتراض اٹھاتا ہے تو وہ اس کی پوری وضاحت کرے گا اور اس میں کوئی دوسرا رکن مداخلت نہیں کرے گا۔ جب تک وہ اپنی بات ختم نہیں کرتا۔ اگر کوئی تیسرا رکن قرارداد کے پیش کنندہ اور اعتراض کنندہ دونوں کی رائے کو مسترد کرتا ہے اور ان کے موقف میں ترمیم و تبدیلی کے لئے رائے دیتا ہے۔ تو کونسل کے ارکان خاموشی کے ساتھ سنیں گے اور کاغذ پر ضروری نکات درج کریں گے۔ پھر بحث کے بعد فیصلہ ارکان کی کثرت رائے سے کیا جائے گا۔ فیصلے کی منظوری کے بعد ہر ڈیپارٹمنٹ کے سیکرٹری کو فیصلے کے بارے میں اطلاع دی جائے گی۔

11- آرمی کے مختلف شعبوں سے منتخب ہونے والے کونسل کے ارکان، جو کہ شق 2 کی شرائط پر پورا اترتے ہیں، وہ اپنے محکموں کے (آرمی میں) ایڈمنسٹریٹر ہوں گے اور ان کے ماتحت چار ارکان پر مشتمل کمیٹی تشکیل ہوگی، جن کا انتخاب شق 4 کے مطابق ہوگا اور ضرورت کے مطابق سیکریٹری بھی اس کمیٹی میں شامل ہوں گے۔ اس کمیٹی میں اتفاق رائے سے کئے گئے فیصلے اپنے آفیسر کے ذریعے کونسل میں پیش کئے جائیں گے۔ اور کونسل شق 7 کے مطابق ان پر غور کرے گی اور سول و فوجی امور میں یہی ایک طریقہ کار

اختیار کیا جائے گا۔

12- کونسل کو اختیار ہوگا کہ وہ کسی بھی وقت آئین میں اکثریت رائے سے ترمیم کر سکتی ہے۔

عرفان حبیب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تاریخ کے ایڈوانس سٹڈی سنٹر کے چیئرمین تھے۔ اب وہ پیپلز ہسٹری آف انڈیا سیریز پر کام کر رہے ہیں۔

❋❋❋❋❋

1857: تاریخ کی تشکیلِ نو

ڈاکٹر مبارک علی

کھوئی ہوئی تاریخ

جنگ، محاذ آرائی، اور مقابلے میں جب کوئی ایک فاتح ہو جاتا ہے تو اس کی کوشش ہوتی ہے کہ شکست خوردہ اور ہاری قوم کی تاریخ کو مٹا دے تا کہ اس کا ماضی حافظہ سے مٹ جائے اور وہ تمام یادوں سے محروم ہو کر فاتح کا ذہنی غلام بن جائے۔ اس طرح یہ بھی کوشش ہوتی ہے کہ اس کی شکست کے بارے میں بھی اس کے نقطہ ءنظر کو بھلا دیا جائے اور صرف جیتنے والے، اور کامیاب ہونے والے کا نقطہ ءنظر سامنے آئے، ہندوستان میں 1857 میں یہی کچھ ہوا۔

ہمیں اس بغاوت، یا جنگ آزادی کے بارے میں وہ معلومات تو ملتی ہیں کہ جب جنگ شروع ہوئی تھی اور دونوں جانب سے مقابلے کی تیاری تھی، اس وقت کے اخباروں، فرامین، اور مغل دستاویزات میں ہندوستانی نقطہ ءنظر ملتا ہے۔ لیکن جب یہ جنگ ختم ہو جاتی ہے، انگریز فتح یاب ہو جاتے ہیں تو تاریخ بھی بدل جاتی ہے۔ فاتحین نے اس پورے ہنگامے کو ''غدر'' سے تعبیر کیا، جس کا مطلب تھا کہ ہندوستانیوں نے ایک جائز حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی، اس لئے انہیں اس کی سزا ملنی چاہئے تھی۔ اس کے بعد کسی کو یہ جرات نہیں تھی کہ اس جنگ کو ہندوستانی نقطہ ءنظر سے پیش کرے، شکست کے بعد جو کچھ اہل ہندوستان کے ساتھ ہوا، اس پر لکھنے کی کسی کو اجازت نہیں تھی۔ اب صرف فاتحین تھے کہ جو اس واقعہ کو اپنی نظر سے دیکھ رہے تھے، اور اسے بیان کر رہے تھے۔ اس لئے یہ موضوع، جنگ کے فوراً بعد، اور وقت گزرنے کے بعد، اہل برطانیہ کے لئے دلچسپی کا باعث رہا۔

اس موضوع پر سرکاری دستاویزات، خط و کتابت، ڈائریاں، اخبارات، رسالے اور کتابیں لکھی گئیں، بلکہ فوٹو داں، تصویروں اور اسکیچوں کے ذریعہ بھی جنگ کے مناظر کو پیش کیا گیا۔ اس کے بعد وہ مورخ، محقق، سیاستداں، اور بیورو کریٹ آئے کہ جنہوں نے مختلف نقطہائے نظر سے اس واقعہ کی تشریح کی۔

اپنے نقطہء نظر کو ثابت کرنے کے لئے، برطانوی حکومت ہند نے ہندوستانیوں سے بھی اس موضوع پر تحریر کرایا، یہ ''روز نامچے'' غدر کو انگریزوں کی نظر سے دیکھ رہے ہیں، ان میں جیون لال کا روز نامچہ، معین الدین احسن خاں کا ''خدنگ غدر''، عبداللطیف کا ''روز نامچہ 1857'' اور سید مبارک شاہ کا روز نامچہ قابل ذکر ہیں۔ کنیا لال نے ''محاربہ اعظم'' کے نام سے واقعاتی تاریخ مرتب کی۔ ان روز نامچوں اور تاریخوں میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ باغیوں نے انگریزوں پر بڑے ظلم کئے، ان کی عورتوں اور بچوں کا قتل عام کیا، اور بلا سبب و جواز حکومت سے بغاوت کر کے نمک حرامی اور احسان فراموشی کا ثبوت دیا۔ چنانچہ سرسید کی ''تاریخ سرکشی بجنور'' ہو یا یہ روز نامچے ان میں جو زبان باغیوں یا جنگ آزادی کے لڑنے والوں کے لئے استعمال کی گئی ہے، اس میں انہیں نہ صرف برا کہا گیا ہے بلکہ ایک طرح سے گالیاں دی گئی ہیں۔ لہٰذا ان تحریروں سے باغیوں کا جو امیج بنتا ہے وہ یہ کہ یہ غیر مہذب، بدمعاش، لٹیرے، شرارت پسند، شیطانیت سے بھرپور، فتنہ و فساد کرنے والے تھے، جب کہ ان کے مقابلے میں برطانوی سرکار مہذب، قانون کی پابند، اور امن و امان کو برقرار رکھنے والی تھی۔ چونکہ باغی شورش پسند اور غیر مہذب تھے، اس لئے ان کے تمام اعمال قابل مذمت ٹھہرے، انگریز چونکہ مہذب اور امن پسند تھے، اس لئے ان کے مظالم، مظالم نہیں تھے، بلکہ قانون اور جائز حکومت کے اختیارات واپس لانے کے لئے تھے۔ اس لئے انہوں نے جو سزائیں دیں، لوگوں کو پھانسی پر لٹکایا، توپ سے باندھ کر اڑایا، یا کالے پانی جلاوطن کیا وہ سب درست اور صحیح تھا کیونکہ ملک میں حکومت کے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے یہ ضروری تھا، تاکہ لوگوں کو عبرت ہو، اور آئندہ بغاوت کی جرات نہیں کریں۔

فتح کو یاد رکھنے کا ایک ذریعہ یادگاروں کی تعمیر ہوتی ہے۔ لہٰذا 1857 کے بعد یہ یادگاریں بھی فاتحین نے تعمیر کرائیں تاکہ اہل ہندوستان انہیں دیکھیں اور اپنی شکست کو یاد رکھیں۔ کانپور کا وہ کنواں کہ جس میں انگریز عورتوں اور بچوں کو قتل کر کے ان کی لاشیں اس میں پھینک دی گئیں تھیں،

اسے ایک زیارت گاہ کا درجہ دیدیا گیا، اس کے باہر روتے ہوئے اور آنسو بہاتے فرشتہ کا مجسمہ استادہ تھا۔ مگر زیارت گاہ پر کسی ہندوستانی کو جانے کی اجازت نہیں تھی کہ اس جگہ جائے۔ ایک اور کنواں، جس کو یادگار بنایا گیا وہ پنجاب میں اجنالہ کے مقام پر تھا کہ جہاں کہ باغیوں کو پھانسی دی گئی، یا گولی مار کر قتل کیا گیا اور پھر ان کی لاشیں ایک خشک کنویں میں پھینک دی گئیں، بعد میں اس کنویں پر ایک قبر بنا دی گئی اور اس کا نام ''مفسد گھر'' رکھ دیا گیا۔ (1) اس طرح جو انگریز کمانڈر یا جنرل مارے گئے، ان کی یادگاریں تعمیر کرائی گئیں، خاص طور سے لکھنو میں ریزیڈنسی کی عمارت کو اسی حالت میں رکھا گیا کہ جو محاصرے کے بعد تھی، یعنی باغیوں نے محاصرہ کے وقت اس پر گولہ باری کر کے اس کو گرانے کی کوشش کی تھی۔ انگریزوں کے لئے یہ ان کی بہادری، ہمت، اور جرات کی یادگار تھی کہ انہوں نے مقابلہ کرتے ہوئے اپنی پوزیشن بحال رکھی۔

اس کے مقابلے میں ہندوستانیوں کی کوئی یادگاریں نہ تو تعمیر ہوئیں، اور نہ ان کے نشانات تو باقی رکھا گیا۔ جب بہادر شاہ ظفر رنگون میں فوت ہوئے تو ان کو دفن کرنے کے بعد زمین کو ہموار کر دیا گیا تا کہ قبر کا نشان مٹ جائے اور اس جگہ پر گھاس لگا دی گئی تا کہ کسی یادگار کی گنجائش نہ رہے۔ بہت بعد میں رنگون کے مسلمانوں نے وہاں آخری مغل بادشاہ کی قبر تعمیر کی۔ اسی طرح حضرت محل، اور ان کے ساتھی نیپال چلے گئے تھے، وہیں انہوں نے زندگی کے آخری دن گذارے، ان کی بھی کوئی یادگار نہیں۔ احمد اللہ شاہ کو جب پوئیں کے راجہ کے حکم سے قتل کیا گیا تو ان کا سر کاٹ کر شاہ جہاں پور کے کلکٹر کو پیش کیا گیا، ان کے سر کی شہر میں تشہیر کی گئی، جسم کے ٹکڑے کر کے انہیں آگ لگا دی گئی، بعد میں ان کا سر موضع جہاں گنج کی ایک چھوٹی سی مسجد کے قریب دفن کیا گیا۔ (2) اس کی بھی کوئی یادگار نہیں۔ نانا صاحب، تانتیا ٹوپے، جھانسی کی رانی، عظیم اللہ، منگل پانڈے، کنور سنگھ، رانا بینی مادھو، گلاب سنگھ، اور دوسرے آزادی کے لئے لڑنے والے، بغیر کسی یادگار کے رہے۔ حال ہی میں یعنی 2007 میں برطانوی حکومت نے دہلی میں نکلسن کی قبر کی مرمت کرائی۔ بہرحال، آزادی کے بعد، آہستہ آہستہ یہ احساس ہو رہا ہے کہ ہندوستانیوں کی یادگاریں بھی تعمیر کرائی جائیں، تا کہ ان کو تاریخ سے جس طرح محروم کر دیا گیا ہے، ان کی یادوں کو واپس لایا جائے۔

ایک انگریز فوٹو گرافر جس کا نام فیلس بیٹو (Fellice Beato) تھا، اس نے جنگ کے دوران اور بعد میں انگریزی افواج، جنگ کے محافظوں اور ہندوستانیوں کی پھانسیوں کی تصاویر

کھینچیں، جو اس جنگ کو انگریزوں کے نقطۂ نظر کو پیش کرتی ہیں۔

تاریخ کی دریافت

ایک مرتبہ جب تاریخ کھو جائے، اس کے نام و نشان کو مٹا دیا جائے، اس کے ماخذوں اور ذرائع کو کم کر دیا جائے، تو اس صورت میں تاریخ کی دریافت ایک مشکل مرحلہ سے گذرتی ہے۔ لیکن 1857 کی تاریخ کی دریافت کا عمل جب شروع ہوا تو اس کے لئے مختلف ذرائع اور طریقوں کو استعمال کیا گیا۔ مثلاً اول فاتحین کی تحریروں سے مدد لی گئی کہ جن میں انہوں نے دستاویزات، ڈائریوں، اور دوستوں و رشتہ داروں کو لکھے خطوط میں اپنے مشاہدات اور تاثرات بیان کئے ہیں، اس وقت کے اخبارات اور رسالوں سے مدد لی گئی، اور جنگ کے حالات کو ہندوستانی نقطۂ نظر سے تشکیل دینے کی کوشش کی گئی، خاص طور سے ان مظالم کی تفصیل ان ہی کی تحریروں سے ملی کہ جو انہوں نے فتح یاب ہونے کے بعد اہل ہندوستان پر کئے تھے، گاؤں کے گاؤں آگ لگا کر تباہ و برباد کر دیئے، لوگوں کو پھانسیوں پر لٹکا کر ان کا مذاق اڑایا گیا، قطار میں کھڑا کر کے گولیوں سے بھون دیا، توپ کے دھانے سے باندھ کر جسم کے پرخچے اڑا دیئے، ان سب واقعات کو انہوں نے بطور کارنامہ اپنی تحریروں میں بیان کیا ہے، لہٰذا ان ہی کے بیانات کی روشنی میں مواد کو اکٹھا کیا گیا۔

جب بغاوت کی شروعات ہوئی ہیں، اور میرٹھ کے سپاہی دہلی میں آئے ہیں، تو اس وقت دہلی کے شائع ہونے والے اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے شائع ہونے والے اخبارات نے لڑائی کی خبریں چھاپنی شروع کیں، اور ساتھ ہی میں دہلی میں جو واقعات ہو رہے تھے، ان کو برابر سے شائع کیا جاتا رہا۔ خاص طور سے مولوی محمد باقر کے اخبار ''دہلی اردو اخبار'' میں نہ صرف انگریزوں پر تنقید کی جاتی تھی، بلکہ ان کے پروپیگنڈے کا جواب بھی دیا جاتا تھا۔ اخبار میں بہادر شاہ ظفر کے فرامین بھی شائع کئے جاتے تھے، جن میں امن و امان اور چیزوں کی قیمتوں کے بارے میں احکامات ہوتے تھے۔

اسی اخبار میں ان کے نوجوان لڑکے محمد حسین آزاد نے ایک پرجوش نظم بھی لکھی تھی۔

دوسرا اخبار ''صادق الاخبار'' تھا، جس کے ایڈیٹر سید جمیل الدین ہجر تھے۔ انہوں نے علماء

کے اس متفقہ فتویٰ کو شائع کیا تھا کہ جس میں انگریزوں کے خلاف جنگ کو جہاد قرار دیا گیا تھا۔ ساتھ ہی میں 35 علماء کے نام میں اس میں شامل تھے۔

اس میں بہادر شاہ ظفر کا کلام بھی شائع ہوتا تھا۔

پیامِ آزادی کے ایڈیٹر بہادر شاہ ظفر کے نواسے بیدار بخت تھے، مگر اس کے روحِ رواں عظیم اللہ تھے۔ اس میں ہندوستان کے لوگوں کو ترغیب دی جاتی تھی کہ وہ آزادی کے لئے غیر ملکیوں سے لڑیں۔ یہ اخبار دیوناگری اور فارسی رسم الخط دونوں میں چھپتا تھا۔

فارسی اخباروں میں ''گلشن نو بہار'' جس کے ایڈیٹر عبدالقادر تھے، ''سلطان الاخبار'' جو رجب علی کی نگرانی میں چھپتا تھا، اور ''سراج الاخبار'' جو قلعہ معلیٰ سے شائع ہوتا تھا، ان میں جنگ کی خبریں ملتی ہیں۔

اخبارات کی خبروں سے اس وقت کے حالات، لوگوں کا ردعمل، جنگ کے دوران بحران، اور لوگوں کے جذبات سے آگہی ہوتی ہے، اس لحاظ سے یہ تاریخ کا اہم ماخذ ہیں۔

دوسرے کچھ لوگوں نے احتیاط سے واقعات کو لکھا، ان میں ظہیر دہلوی ''داستان غدر'' قابل ذکر ہے، انہوں نے دہلی کی تباہی اور وہاں کے قتل عام کو اگرچہ مختصراً بیان کیا ہے، مگر اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دہلی کے شہری شکست کے بعد کن آلام سے گذرے۔ ایک جگہ ظہیر دہلوی لکھتے ہیں کہ: ''سپاہ انگریزی، مظفر و منصور جو لوگوں کے گھروں میں لوٹ کے واسطے داخل ہوئی، جو گھر خالی پایا اسے دھڑی دھڑی لوٹنا شروع کر دیا۔ جہاں آدمی دیکھے انہیں قتل کرنا شروع کیا۔''

ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ ایک ہی محلّہ کے چودہ سو آدمیوں کو گرفتار کر کے راج گھاٹ کے دروازے سے دریا پر لے جا کر بندوقوں کی باڑیں مار دی گئیں اور لاشیں دریا میں پھنکوا دی گئیں۔ عورات کا یہ حال ہوا کہ گھروں میں سے نکل نکل کر بچوں سمیت کنوؤں میں جا گریں۔ چیلوں کے کوچہ کے تمام کنویں لاشوں سے پٹ گئے تھے۔ آگے میرا قلم نہیں چل سکتا.......... شہر کا یہ حال ہوا کہ عورات اور مردوں کو شہر سے نکالا گیا تو اس طرح کہ مردوں کو تو کشمیری دروازے سے باہر کیا گیا اور عورات کو کابلی دروازے کی راہ سے شہر بدر کیا کہ باہمی مفارقت ہوگئی۔ ایک ایک تو ڈھونڈتا پھرا۔ غرضکہ جب زن و مرد شہر سے باہر ہو گئے تو اب مخبری کا بازار گرم ہوا، وہی بدمعاش جو نمک حراموں (باغیوں) کے ہمراہ انگریزوں کو بتاتے پھرتے اور شہر کو لٹواتے تھے اب سرکاری مخبری اور

شہر والوں کو پھانسیاں دلوانے لگے۔ دو روپیہ آدمی پیچھے مخبری کا صلہ ملتا تھا۔(3)

مرزا غالب نے دہلی میں رہتے ہوئے دہلی کے محاصرے اور انگریزوں کی فتح کو دیکھا۔ اگر چہ انہوں نے کوشش کی کہ خود کو انگریزی حکومت کا وفادار ثابت کریں، اور ان کا دربار سے جو تعلق تھا، اسے کوئی اہمیت نہ دی، کیونکہ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ ذرا سے شبہ پر قید و بند اور پھانسی کی سزا مل رہی تھی۔ لیکن دہلی شہر کی تباہی پر انہیں جو غم تھا، اُس کا اظہار ان کے خطوط میں ہوا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس پورے واقعہ سے کس قدر متاثر تھے۔ ان کے ان بیانات کی تہہ میں انگریزوں کے ظلم و ستم اور ان کی سفاکانہ کارروائیاں چھپی ہوئی ہیں، ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی، قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز بازار جامع مسجد کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں، پھر کہو دلّی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔

اس کے ساتھ ہی داغؔ، اور حالؔی نے دہلی کی تباہی پر جو مرثیے (شہر آشوب) لکھے، اس سے اس عہد کے لوگوں کے جذبات کا اندازہ ہوتا ہے۔ داغ لکھتے ہیں کہ

فلک نے قہر غضب تاک کر ڈالا تمام پر دلی ناموس چاک کر ڈالا
یکا یک ایک جہاں کو ہلاک کر ڈالا غرض کہ لاکھ کا گھر اس نے خاک کر ڈالا

جلیں ہیں دھوپ میں شکلیں جو ماہتاب کی تھیں
کھنچی ہیں کانٹوں پہ جو پتیاں گلاب کی تھیں

حالؔی دہلی کے بارے میں کہتے ہیں کہ

تذکرہ دہلی مرحوم اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا مجھ سے یہ فسانہ ہرگز

پی۔ سی۔ جوشی نے اپنے مضمون ''1857 سے متعلق لوک گیت'' میں ہندوستان بھر سے ان لوک گیتوں کو جمع کیا ہے کہ جو 1857 کے واقعہ پر لوگوں میں مقبول تھے۔ ان کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ اس وقت جب کہ فاتح فرنگیوں کے خلاف کچھ لکھنا اور کہنا قابل سزا تھا، ان گیتوں کے ذریعہ لوگوں نے اپنے جذبات کا نہ صرف اظہار کیا بلکہ اس واقعہ کی یاد کو محفوظ رکھا اور اسے بھلانے نہیں

دیا۔ مثلاً چند گیت یہ ہیں:

دریا میں تلاطم بپا ہے
انگلستان بہت دور ہے
جلدی کر جلدی اے
دغاباز فرنگی! بھاگ جا
آہا! آؤ اور دیکھو
میرٹھ کے بازار میں
فرنگی کو گھیر کر مارا گیا ہے
گورے کو گھیر کر پیٹا گیا ہے
میرٹھ کے کھلے بازار میں
دیکھو! آہا دیکھو (اسے کس طرح پیٹا جا رہا ہے)
اس کی بندوق چھین لی گئی ہے
اس کا گھوڑا مرا پڑا ہے
اس کا ریوالور ٹوٹ پھوٹ گیا ہے
میرٹھ میں سرِ بازار
اسے گھیر کر پیٹا جاتا ہے
دیکھو! آہا دیکھو
فرنگی کو گھیر کر پیٹا جاتا ہے
میرٹھ میں سرِ بازار
دیکھو! آہا دیکھو۔(4)

جھانسی کی رانی کی بہادری اور جنگ میں لڑتے ہوئے مارے جانے نے اس کو لوگوں میں بے انتہا مقبول بنا دیا اور اس کی تعریف میں کئی لوک گیت لکھے گئے۔

خوب لڑی مردانی، ارے جھانسی والی رانی
برجن برجن توپیں لگا دیں گولا چلے آسمانی

ارے جھانسی والی رانی، خوب لڑی مردانی
مگر لے سپاہیوں کو بڑا جیبی
آپ نے چبائی گڑوانی
ارے جھانسی والی رانی، خوب لڑی مردانی
چھوڑ مورچہ بھاگے پھرنگی ڈھونڈ ھے ناہیں پانی
ارے جھانسی والی رانی، خوب لڑی مردانی

ہندوستان میں یہ لوک گیت آزادی کے لئے لڑنے والوں کی تعریف میں، جن میں کنور سنگھ، رانا بینی مادھو، تانتیا ٹوپے، گلاب سنگھ، اور حضرت محل قابل ذکر ہیں۔ ان کے عہد کے شاعروں نے لکھے اور انہیں خراج عقیدت پیش کیا، ان گیتوں میں انہوں نے انگریزوں کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار بھی کیا ہے، اور جو ان کے خلاف لڑے ان کی تعریف کی ہے۔ (5)

اس واقعہ کی تاریخ کو مرتب کرنے میں خواجہ حسن نظامی اور راشد الخیری کا بھی حصہ ہے جنہوں نے مغل خاندان کے افراد سے بات چیت کر کے ان کی زندگی کے حالات لکھے، اور ان پر جو کچھ بیتی تھی، اسے بڑے دلدوز اور مئوثر انداز میں پیش کیا۔

آزادی کے بعد 1957 کے بعد سے 1857 کی تاریخ کی تشکیل کا کام شروع ہوا، برصغیر ہندوستان کے مورخوں نے مختلف ماخذوں اور تحقیق کے نئے زاویوں کے ساتھ، اس موضوع کو اپنے نقطہء نظر سے لکھنا شروع کیا، جس کی وجہ سے اب ہندوستانی نظر سے بھی اس واقعہ کو دیکھا جانے لگا ہے۔ جو افراد انگریزوں کی تحریروں میں باغی، مفسد، شورش پسند، اور احسان فراموش تھے اب وہ مجاہد آزادی، اور وطن کی خاطر جان دینے والے بن گئے۔ اب ان افراد کی یادگاریں بھی بنائی جا رہی ہیں، اور ان کے نام پر شاہراہوں کے نام رکھے جا رہے ہیں۔ سہراب مودی نے تقسیم سے قبل ''جھانسی کی رانی'' فلم بنائی تھی، جسے برطانوی حکومت نے سنسر کر دیا تھا۔ اب ''منگل پانڈے'' پر ایک فلم تیار کی گئی ہے، جو اگرچہ تاریخی لحاظ سے تو قابل گرفت ہے، مگر اس میں اس عہد کے جذبات کی عکاسی کی گئی ہے۔

اب نئی صورت حال میں اس واقعہ کو امپیریل ازم سے مزاحمت کے طور پر دیکھا جا رہا ہے، اور اس کی تشریح کرتے ہوئے اس کو موجودہ امپیریل ازم اور اس کے مقاصد کے زیر اثر ابھارا جا

رہا ہے۔اس طرح 1857 کی تاریخ جو کہ کھوگئی تھی،اسے دریافت کر کے ایک نئی شکل کے ساتھ اسے زندہ کیا جارہا ہے۔

کیا1857 مغل سلطنت کے احیاء کے لئے تھی؟

ایک خیال یہ بھی ہے کہ 1857 کی جنگ کے ذریعہ کچھ جماعتیں مغل خاندان کو دوبارہ سے برسرِ اقتدار لانا چاہتی تھیں۔اگر تاریخی عمل اور حالات کا تجزیہ کیا جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مغل خاندان سیاسی اور معاشی طور پر کھوکھلا ہو چکا تھا،اس میں اتنی توانائی نہیں تھی کہ وہ دوبارہ سے اپنے اختیارات کو بحال کرے،اس کی سیاسی حیثیت صرف اس قدر تھی کہ وہ برائے نام ہندوستان کا بادشاہ تھا،اور علامتی طور پر لوگوں کے دلوں میں اس کے لئے احترام کے جذبات تھے،سماجی طور پر مغل دربار نے،ادب آداب اور رسومات کو برقرار رکھا ہوا تھا،لال قلعہ ایک کلچرل علامت تھا۔

اس لئے جب باغی دہلی میں آئے اور بادشاہ سے مدد کے طلب گار ہوئے تو ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ علامتی طور پر اس کی شخصیت کا سہارا لے کر اپنی بغاوت کو جائز قرار دیں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی بطور غاصب اور غیر ملکی طاقت کے تشہیر کر کے لوگوں کو اپنے ساتھ ملائیں۔لیکن یہ باغی فوجی مغل دربار کے ادب آداب سے واقف نہیں تھے،اس لئے جب یہ دہلی آئے اور قلعہ پر قبضہ کیا تو انہوں نے صدیوں کے آداب کو توڑ دیا۔قلعہ میں گھس کر اس باغوں میں اپنے گھوڑے باندھ دیئے۔بادشاہ سے بے تکلفی کے ساتھ مخاطب ہونے لگے۔ظہیر دہلوی نے بخت خاں کی آمد کا ذکر بڑی تضحیک سے کیا ہے۔

> دیکھتا کیا ہوں کہ ایک پوربیا فربہ اندام،پستہ قد ادھیڑ،پچاس چھپن برس کی عمر،منہ پر داڑھی،گاڑھے کا کرتہ و دھوتی بندھی ہوئی سر پر ایک انگو چھا لپٹا ہوا،چندھیا کھلی،کرچ افسروں کی اس کے گلے میں پڑی ہوئی عقب حمام کے چبوترے کی طرف سے دربار میں آیا اور بادشاہ کو سلام کر کے پاس چلا آیا۔میرے بہنوئی نے روکا بھی کہ ہیں ہیں کہاں چلے آتے ہو،مگر وہ کب سنتا تھا۔پاس آ کر بادشاہ کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا۔سنو بڑھو،ہم نے تمہیں باسا کیا۔(6)

باغیوں نے دہلی میں بادشاہ کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا، اس سے ایسے احکامات اور فرامین جاری کرالئے کہ جن میں امن وامان قائم رکھنے پر زور دیا گیا۔ اشیاء کی قیمتوں کا تعین کیا گیا، دکانداروں کو یقین دلایا گیا کہ ان کا مال و اسباب محفوظ رہے گا۔ بہادر شاہ ظفر نے ان اقدامات کا اس وقت ذکر کیا کہ جب ان پر غداری کا مقدمہ چلایا گیا، اس وقت انہوں نے اسے اپنی بے بسی بتایا کہ وہ باغیوں کے ہاتھوں میں قید تھے، وہ احکامات لکھ کر اس پر زبردستی ان سے دستخط کراتے اور ان کی مہر ثبت کرتے تھے۔

تلمیذ خلدون نے اپنے مضمون ''بغاوت عظیم'' میں تفصیل سے اس سیاسی منظر کا ذکر کیا ہے کہ بخت خاں کے دہلی میں آنے کے بعد ترتیب دی گئی تھی، اس میں بہادر شاہ کے شہنشاہ ہونے کا اعلان تھا، مگر اصل اختیارات مختلف کونسلوں کو تھے جن کا کام تھا کہ وہ ملک میں امن وامان قائم کرے، لگان وصول کریں، ساہوکاروں سے قرضہ لیں، جنگ کے انتظامات کریں۔(7) اس سیاسی تنظیم سے بخت خاں اور اس کے ساتھیوں کی سیاسی سوجھ بوجھ کو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مغل بادشاہت کے احیاء کے بجائے ہندوستان کو سیاسی طور پر سیاسی اداروں اور تنظیموں کی شکل میں بااختیار دیکھنا چاہتے تھے۔

باغی کون تھے؟

فوجی جنہوں نے بغاوت کی ابتداء کی، ان کا تعلق کسانوں کے طبقے سے تھا۔ ان کی اکثریت کا تعلق پوربیہ یا لکھنو کے دیہاتوں سے تھا۔ اس لحاظ سے ان کا رشتہ عام لوگوں سے تھا۔(8) جب بغاوت پھیلی اور کسانوں کو اس بات کا یقین ہوگیا کہ کمپنی کی حکومت کا خاتمہ ہونے والا ہے تو انہوں نے دیہاتوں میں بغاوتیں شروع کر دیں۔ ان بغاوتوں میں انہوں نے جس انداز سے اپنے جذبات کا اظہار کیا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں معاشرے کے استحصالی طبقوں کے خلاف کس قدر نفرت تھی، انہوں نے ساہوکاروں اور بنیوں کے بہی کھاتوں کو جلایا، ان کے مکانوں کو لوٹا، ان زمینداروں نے کہ جنہوں نے نیلام میں زمینیں خریدیں تھیں، انہیں نکال باہر کیا۔ نفرت کا اظہار اس سے ہوتا ہے کہ انہوں نے سرکاری عمارتوں کو نہ صرف لوٹا بلکہ انہیں آگ لگا کر تباہ و برباد بھی کیا۔(9) کسانوں کے ساتھ دینے والوں میں وہ پرانے زمیندار اور

والیان ریاست تھے کہ جنہیں کمپنی کی حکومت سے نقصانات ہوئے تھے۔ لیکن برطانوی حکومت کی حمایت کرنے والوں میں ریاستوں کے نوابین وراجے اور بڑے زمیندار تھے، جنہیں یقین تھا کہ انگریزوں کی فتح ہوگی۔ دہلی میں اشرافیہ بھی باغیوں کی آمد سے ناخوش تھی، کیونکہ وہ برطانوی افسران کے ساتھ مل کر آرام کی زندگی گذار رہے تھے، وہ باغیوں کی آمد اور شہر میں ہونے والی بدامنی یا تبدیلیوں کے لئے تیار نہیں تھے۔ یہ باغی ان کے لئے غیر مہذب اور گنوار تھے، اس لئے اس طبقہ کے لوگوں نے خفیہ طور پر انگریزوں کو خبریں فراہم کیں۔

پنجاب اور سندھ میں یہ بغاوت اس لئے ناکام ہوئی کیونکہ یہاں کمپنی کی فوج میں اکثریت پور بیہ لوگوں کی تھی جن کا یہاں کے لوگوں سے رابطہ اور تعلق نہیں تھا۔ اس لئے جیسے ہی یہاں کمپنی کے افسروں کو بغاوت کی اطلاع ملی، انہوں نے ہندوستانی سپاہیوں سے ہتھیار رکھوا لئے، جنہوں نے انکار کیا یا فرار ہوئے، انہیں فوراً گولی سے اڑا دیا، پھانسی دیدی، یا توپ سے باندھ کر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے، اس لئے یہاں بغاوت فوراً ہی ختم ہوگئی۔

1857 کا نتیجہ کیا نکلا؟

جہاں 1857 کے اور دور رس نتائج نکلے، ان میں سے چند اہم یہ تھے کہ دہلی اور لکھنو جو ہندوستان میں علمی وادبی اور کلچرل سرگرمیوں کے مراکز تھے، ان کا خاتمہ ہوگیا۔ ان کے ساتھ ہی شمالی ہندوستان کی ایک روایت تاریخ کا حصہ بن گئی۔ یہ مشترک کلچر کی روایت تھی کہ جس میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر کے شریک تھے، اس کے بعد سے ان تعلقات میں فرق آتا چلا گیا جو بالآخر فرقہ واریت پر ختم ہوا۔

1857 سے پہلے ہندوستان میں اصلاحی تحریکیں تو اٹھیں، مگر سیاسی تحریکیں نہیں تھی، مگر اب سیاسی تحریکوں کی ابتداء ہوئی، جس نے لوگوں میں سیاسی شعور کو ابھارا، اور غیر ملکی حکومت کے خاتمہ کے لئے مسلح جدوجہد کے راستے کے بجائے دستوری طریقوں اور گفت وشنید کو اختیار کیا۔

لیکن 1857 کا واقعہ ہندوستان کے لوگوں کی اجتماعی یادداشت میں محفوظ رہا، اور اب مورخین اس یادداشت کو بحال کر رہے ہیں، جس سے مزاحمت کی تاریخ کو تشکیل نو ملے گی۔

حوالہ جات

1- غلام رسول مہر: 1857 اور پنجاب۔ اکرام چغتائی کی مرتب کردہ کتاب 1857، لاہور 2007ء میں۔ص 559

2- وسیم احمد سعید: مجاہد اعظم احمداللہ شاہ: ایوان اردو، مئی 2007ء۔ص 14

3- ظہیر دہلوی: داستان غدر، لاہور 2002ء، ص ص 23-122

4- پی۔سی۔جوشی: 1857 سے متعلق لوک گیت: انقلاب اٹھارہ سو ستاون میں، دہلی 1998ء، ص ص 281 سے 296 تک

5- عابد سہیل 1857 ہندی شاعری: 1857، مرتب: اکرام چغتائی 2007ء، ص ص 569 سے 574 تک

6- ظہیر دہلوی: ص 101

7- تفصیل کے لئے دیکھئے: تلمیذ خلدون کا مضمون ''بغاوت عظیم'' پی۔سی۔جوشی۔ ص۔ص 51-44

8- جوشی: ص 91

9- ایضاً: ص 99

❁❁❁❁❁

1857 کو کیسے یاد رکھنا چاہیئے؟

ڈاکٹر مبارک علی

2007 میں 1857 کو ڈیڑھ سو برس کا عرصہ ہو گیا ہے۔ اس واقعہ کو ہندوستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت ہے، کیونکہ یہ غیر ملکی اور کولونیل حکومت کے خلاف سب سے بڑی بغاوت تھی، جس نے ان کی جڑوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ تاریخ میں اس قسم کے واقعات کی اہمیت کو بارہا بیان کیا جاتا ہے اور جیسے جیسے تاریخی دستاویزات، شہادتیں، اور نئی معلومات سامنے آتی ہیں، ان واقعات کا بیان واضح ہوتا چلا جاتا ہے۔ بعض اوقات ایسے حالات ہوتے ہیں کہ جن میں حقائق کو بیان کرنا مشکل ہوتا ہے، مگر وقت کے ساتھ جب حالات بدلتے ہیں تو مورخ ان کو آزادانہ طور پر بیان کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ واقعات کو ایک مرتبہ مسخ کر دیا جائے، حقائق کو ضائع کر دیا جائے، تو اس صورت میں تاریخ کی نئی تشکیل کا کام مشکل ہوتا ہے، لیکن جب قوم کو اپنے ماضی کی تشکیل کی ضرورت ہوتی ہے تو مورخ، اور محقق ان دشواریوں پر قابو پا کر ماضی کے ٹوٹے حصوں کو جوڑتے ہیں، اور بکھری ہوئی تاریخ کو جمع کر کے اسے ایک مکمل شکل دیتے ہیں۔

اس کی ایک مثال 1857 کا واقعہ ہے۔ انگریزوں نے اسے غدر کہا، اور آج تک مغربی مورخین اسے یہی نام دیتے ہیں۔ کیا یہ غدر تھا؟ کیا ہندوستان میں انگریزی حکومت قانونی اور جائز تھی؟ کیونکہ اب تک ہندوستان کا قانونی حکمراں مغل بادشاہ تھا، ایسٹ انڈیا کمپنی اس کے ماتحت تھی۔ لیکن یہ بغاوت چونکہ کمپنی کے خلاف تھی، لہذا کمپنی نے خود کو جائز حکمراں سمجھتے ہوئے، جس کی بنیاد اس کی فوجی طاقت و قوت تھی، اسے غدر کے نام سے موسوم کیا۔ چونکہ آخر میں کمپنی فتح یاب ہوئی، اس لئے اس کا نقطہءِ نظر غالب آیا، اور مقامی لوگوں کی رائے کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔

لیکن اب جب کہ برطانوی حکومت کا خاتمہ ہو چکا ہے، برصغیر ہندوستان کے مورخ 1857 کے واقعات کو نئے انداز سے لکھ رہے ہیں، تاکہ کولونیل نقطہءنظر کو رد کیا جا سکے اور اس تاریخ کو واپس لایا جا سکے کہ جو کولونیل دور میں گم ہوگئی تھی یا جسے بھلا دیا گیا تھا۔

1857 کو نئے نقطہءنظر سے لکھنے کی ابتداء، اگرچہ آزادی کے بعد سے شروع ہوگئی تھی مگر 1857 میں جب اس کی صد سالہ تقریبات منائی گئیں تو اس موقع پر ہندوستان کی حکومت نے نہ صرف خصوصی تقریبات، کانفرنسوں، اور سیمناروں کا انعقاد کیا، بلکہ اس موضوع پر تحقیقی کتابیں بھی لکھوائیں۔ اس موقع پر ہندوستان کے دو مورخوں نے 1857 پر دو کتابیں الگ الگ نقطہءنظر سے لکھیں۔ پروفیسر ایس۔ این۔ سین کی کتاب کا عنوان صرف ''1857'' تھا، اس کا تعارف ابوالکلام آزاد کا لکھا ہوا ہے کہ جو اس وقت ہندوستان کے وزیر تعلیم تھے۔ اس میں سین نے کوشش کی ہے کہ غیر جانبدارانہ انداز میں 1857 کا تجزیہ کیا جائے، جب کہ پی۔ سی۔ موجمدار نے اپنی کتاب میں جنگ آزادی کے خیال کو مسترد کر دیا اور اسے محض سپاہیوں کی بغاوت کہا ہے۔ اس کے بعد سے اس موضوع پر بہت کتابیں شائع ہوئیں، کیونکہ نئی دستاویزات سامنے آئیں، اور نئے ماخذوں کا استعمال کیا گیا۔ اس واقعہ کو ڈیڑھ سال گذرنے کے بعد، پھر اس بات کی ضرورت ہے کہ اس پر نئی نظر ڈالی جائے اور اسے نئے انداز سے لکھا جائے۔

پاکستان میں 1857 پر جو کچھ لکھا گیا ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ 1857 کی جنگ آزادی صرف مسلمانوں نے لڑی، اس نقطہءنظر کو بہت ہی سادہ انداز میں اس طرح سے بیان کیا گیا ہے کہ چونکہ اس بغاوت کی ساری ذمہ داری مسلمانوں کی تھی کہ جنہوں نے غیر ملکی حکومت کے خلاف جدوجہد کی، اس لئے جب اس میں کمپنی کی فتح ہوئی تو اس نے اس کی سزا مسلمانوں کو دی، ان کی جائیداد کو ضبط کر لیا، ان کو ذرا ذرا سے شبہ پر پھانسی پر لٹکایا، ان پر بھاری جرمانے عائد کئے، ان کی مساجد پر قبضہ کر لیا، اور انتقام کی آگ میں بھرے انگریزوں نے ان کا قتل عام کیا۔ لہٰذا اس واقعہ نے نہ صرف مغلوں کی حکومت کا خاتمہ کیا، بلکہ مسلم اشرافیہ کی ساکھ بھی ختم ہوگئی، اور عام مسلمان پھانسیوں، اذیتوں اور قید و بند سے سہم گیا۔ یہ نفسیاتی اثر بہت بعد تک مسلمانوں پر رہا۔ ہندو، انگریزوں کے غم و غصہ سے محفوظ رہے، بلکہ انہوں نے اس بغاوت کو ختم کرنے میں ان کی مدد کی، اس کے صلہ میں انہیں بعد میں انعام و اکرام سے نوازا گیا۔

جب 1857 کا ہنگامہ ختم ہوا تو خود برطانوی حلقوں میں اس کے بارے میں خیال آرائیاں ہوئیں کہ آخر یہ کیوں ہوا؟ اس کے کیا اسباب تھے؟ اس کے ذمہ دار کون تھے؟ ان سوالات کا جواب دینے کے لئے انگریز عہدے دار، فوجی افسران، سیاستدان، ڈپلومیٹس، تاجروں اور مورخوں نے اپنے اپنے نقطہائے نظر کو پیش کیا تا کہ مختلف زاویوں سے تجزیہ کرنے کے بعد وہ اس واقعہ کو سمجھ سکیں۔ ایک نقطۂ نظر میں حکومت کی اصلاحات کی پالیسی کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا کہ جس کی وجہ سے ہندوستان کا روایتی معاشرہ ٹوٹا، اور لوگوں میں بے چینی پیدا ہوئی، کچھ کا خیال تھا کہ عیسائی مشنریوں نے جب ہندوستانیوں کے مذہب کو تبدیل کرنے کی کوشش کی تو اس نے ان میں شدید عدم تحفظ کو پیدا کیا، کچھ نے اس بات کی بھی نشان دہی کی کہ فوج میں اور سول ملازمتوں میں ہندوستانیوں کے ساتھ برا سلوک کیا جاتا رہا ہے اور انہیں نسل پرستی کا شکار بنایا جا رہا ہے، اس کی وجہ سے ان میں ردعمل پیدا ہوا۔

دو برطانوی مورخین کہ جن میں الفرڈ لایل اور ولیم میور شامل تھے، ان کی دلیل یہ تھی کہ عمومی طور پر ہندوستان کے لوگ برطانوی حکومت سے خوش تھے، مگر مسلمان اشرافیہ کہ جس نے نئی حکومت میں اپنی مراعات اور مراتب کو کھو دیا تھا، وہ سب سے زیادہ اس حکومت کی مخالف۔ اس لئے یہ ان کی سازش تھی کہ برطانوی حکومت کا خاتمہ کر کے دوبارہ سے مغل حکومت کو مستحکم کیا جائے تا کہ اپنی کھوئی ہوئی حیثیت کو بحال کیا جا سکے۔ اس نقطۂ نظر کو جے۔ سی۔ براؤن نے اپنی کتاب ''پنجاب اور دہلی 1857 میں'' اس طرح سے بیان کیا ہے: ''مسلمانوں نے عیسائیوں کے خلاف سازش کی، اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کیونکہ ان کا مذہب انہیں یہی تعلیم دیتا ہے۔ اور یہی قرآن ان سے مطالبہ کرتا ہے۔'' (1)

اپنی اس دلیل کو تقویت دینے کی غرض سے اس نے، بہادر شاہ ظفر کے مقدمہ کے دوران جج کے بیان کو بھی دیا ہے کہ جس میں صرف مسلمانوں کو اس بغاوت کا ذمہ دار قرار دیا تھا۔ جج کے ریمارکس ہیں کہ:

> ایک مسلمان درویش جس نے کہا کہ اس نے خواب دیکھا ہے، اور اس کے پاس معجزاتی طاقت ہے۔ ایک مسلمان بادشاہ، جس کے ساتھ اس کے پیروکار اور دھوکہ باز ہیں۔ مسلمان کی ایک خفیہ سفارت جو ایران اور

> ترکی کے حکمرانوں کے پاس گئی۔ مسلمانوں کی پیشین گوئیاں جن میں ہمارے زوال کے بارے میں کہا گیا ہے۔ اور مسلمانوں کی حکومت کو ہمارا جانشین کہا گیا ہے۔ مسلمانوں کا بے رحمانہ طریقہ سے قتل کرنا۔ مسلمانوں کی حکومت کے لئے جہاد کا اعلان کرنا۔ مسلمانوں کے اخبارات جو کہ غیر ذمہ دارانہ طور پر سپاہیوں کو بغاوت پر بڑھکاتے رہے۔(2)

لہٰذا یہ نقطہ ءنظر کہ 1857 کی بغاوت میں مسلمانوں کا ہاتھ تھا چونکہ اس کے ذریعہ وہ اپنے مذہبی اور سیاسی مقاصد کو حاصل کرنا چاہتے تھے، ہندوؤں نے محض ان کا ساتھ دیا اور اس کے نتائج کا پوری طرح سے اندازہ نہیں لگایا، اس لئے ہندوؤں کو موردالزام ٹھہرانا درست نہیں۔ اس نقطہ ءنظر کو پاکستان کے مورخ اور نصاب کی کتابیں لکھنے والوں نے اختیار کیا، کیونکہ یہ دوقومی نقطہ ءنظر کو تقویت دیتا ہے، اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو ہندوؤں اور انگریزوں دونوں سے مخالفت کا سامنا تھا، اور مسلمان ابتداء ہی سے آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔

معین الحق نے اپنی کتاب ''دی گریٹ ریولوشن آف 1857 '' خود اسی پر بنیاد رکھتے ہوئے اپنے دو مضامین میں کہ جو ''روڈ ٹو پاکستان'' (Road to Pakistan) میں شائع ہوئے ان میں جنگ آزادی میں بطور ہیرو جن شخصیات کو ابھارا ہے ان میں سید احمد اللہ، جو کہ ''مولوی آف فیض آباد'' کے نام سے مشہور ہوئے، اور علماء، خطیب، اور اماموں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ جنہوں نے مسلمانوں کو جنگ آزادی کے لئے تیار کیا، اور کافروں سے جہاد کے لئے ابھارا۔(3) انہوں نے دلیل دی ہے کہ اس انقلاب کو منظم کرنے والے، اور غیر ملکیوں کے خلاف جدوجہد کرنے والے مسلمان راہنما تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آخر میں اس کا خمیازہ مسلمانوں کو بھگتنا پڑا۔ ''اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ دشمنوں کا انتقامی ہاتھ بمقابلہ ہندوؤں کے مسلمانوں پر پڑا۔''(4)

آئی۔ ایچ۔ قریشی نے معین الحق کے اس تجزیہ سے اتفاق کرتے ہوئے، 1857 کی جنگ میں علماء کے کردار کو ابھارا اور اس کی تعریف کی ہے۔ ان کی دلیل کے مطابق علماء کے کردار کو اس لئے قابل تحسین سمجھنا چاہئے کہ ان کے کوئی ذاتی اور خود غرضانہ مفادات نہیں تھے۔ وہ اس جدوجہد

میں خالص دینی جذبہ سے شریک ہوئے تا کہ کافروں کی حکومت کا خاتمہ کیا جا سکے۔اس لئے ان کے نزدیک یہ جہاد تھا۔اپنی دلیل کو ثابت کرتے ہوئے انہوں نے علماء اور ان کی جدوجہد کو ان تمام مقامات میں تلاش کیا ہے کہ جہاں جہاں 1857 میں انگریزوں کے خلاف بغاوتیں اٹھی تھیں، جیسے دہلی، آگرہ، اودھ، تھانہ، فرخ آباد، الہ آباد، حیدرآباد، جھانسی، روھیل کھنڈ، ممبئی اور جے پور وغیرہ۔قریشی اس پوری تحریک کو جہاد قرار دیتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ مقدس جنگ صرف علماء اور ان کے پیروکاروں نے لڑی، جس میں ہندوؤں کا ذکر نہیں ہے۔(5)

اردو میں لکھی جانے والی کتابوں میں اسی نقطۂ نظر کا اعادہ کیا گیا ہے۔ان میں خاص طور سے غلام رسول مہر قابل ذکر ہیں۔یہی نقطۂ نظر پاکستان میں تاریخ کی نصابی کتابوں اور زیادہ تنگ نظری کے ساتھ آ گیا، اور بار بار اس بات کو دھرایا گیا کہ شورش یا ہنگامہ کے ختم ہونے کے بعد انگریزوں نے سب سے زیادہ مظالم مسلمانوں پر توڑے۔(6) ہندوؤں کے بارے میں کہا گیا کہ انہوں نے انگریزوں سے سمجھوتہ کر لیا، جس کی وجہ سے برطانوی حکومت نے ان کی سرپرستی اور انہیں اعلیٰ ملازمتیں دیں۔حکومت کی اس پالیسی کی وجہ سے دونوں کمیونٹیز میں دوری ہوتی چلی گئی۔

اس محدود اور تنگ نقطۂ نظر کی وجہ سے پاکستان کے مورخ کے لئے بڑا مشکل ہے کہ وہ 1857 کو وسیع تناظر میں دیکھے، اور اس حقیقت کی جانب اشارہ کرے کہ یہ جدوجہد صرف مسلمانوں تک محدود نہیں تھی، بلکہ اس میں ہندوؤں نے بھی اس جوش وخروش اور جذبہ سے حصہ لیا، جس کے بارے میں مسلمانوں کا دعویٰ ہے، یہ دونوں قومیں، بطور ہندوستانی، ایک غیر ملکی حکومت کے خلاف شانہ بشانہ لڑے۔جن لوگوں نے جانیں دیں، ان میں منگل پانڈے، جھانسی کی رانی، تانتیا ٹوپی اور بہت سے ہندو راہنما اور عام لوگ تھے کہ جنہوں نے جانیں دیں۔نانا صاحب اور حضرت محل ان راہنماؤں میں سے تھے کہ جنہوں نے نیپال میں پناہ لی اور وہیں زندگی کے آخری دن گذارے۔ان مسلمانوں اور ہندو راہنماؤں اور عام ہندوستانیوں کا خواب ایک ہی تھا: آزاد ہندوستان۔

اس لئے 1857 کی جنگ ایک مشترک جدوجہد تھی، جس میں مذہب سے بالاتر ہو کر ہندو اور مسلمان مل گئے تھے، اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ جب اس کی تاریخ لکھی جائے تو یہ

تاریخ اشتراک کی تاریخ ہو۔ اس بحران کے وقت فرقہ وارانہ جذبات اور فسادات کو روکنے کے لئے بہادر شاہ ظفر نے یہ فرمان جاری کیا تھا کہ گائے کی قربانی نہ کی جائے، خاص طور سے عیدالاضحیٰ کے موقع پر۔ انہوں نے کچھ مذہبی انتہاپسندوں کو اس بات سے بھی روکا کہ وہ جہاد کا نعرہ نہ لگائیں کیونکہ اس کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں تناؤ پیدا ہوگا۔

ہندو اور مسلمانوں کے اتحاد کا اس سے اندازہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ مغل بادشاہ، جو کہ اپنی تمام سیاسی طاقت وقوت کھو چکا تھا اور برائے نام ہی حکمراں تھا، مگر ہندوستان کے عوام کے لئے وہ اتحاد کی علامت تھا اسی وجہ سے باغی، بغاوت کے باعث اس کے اردگرد جمع ہوئے۔ اس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی مذہبی تعصب نہیں تھا، وہ سب مل کر ایک غیر ملکی دشمن کے خلاف جدوجہد کر رہے تھے۔

پاکستان میں مسئلہ یہ ہے کہ ہم مشترک تاریخ کے مطالعہ پر یقین نہیں رکھتے ہیں، اور نہ ہی ایک ایسی تاریخ لکھنا چاہتے ہیں کہ جس میں اشتراک ہو۔ اب صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ 1947 سے پہلے کے واقعات اور تاریخ کو بھی کہ جس کا تعلق ہندوستان سے ہے، ہم اس سے دوری اختیار کر لیتے ہیں کہ جیسے یہ ہماری نہیں ہے۔ اس کی مثال 1857 ہے، جسے بہت ہی محدود نقطۂ نظر کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے، اور اسے مسلمانوں کی جدوجہد یا جہاد کہا جاتا ہے کہ جو فرنگی کافروں کے خلاف کیا گیا، جس میں انہیں شکست ہوئی، اس کے ساتھ ہی مغل حکومت جسے مسلمانوں کی حکومت کا نام دیا جاتا ہے، اس کا خاتمہ ہوگیا، اور ہندوستان میں مسلمان پس ماندگی کا شکار ہوگئے۔

اگر تاریخ کو ایک خاص مقصد کے تحت مسخ کیا جائے، اور واقعات کو غلط انداز میں پیش کیا جائے، تو اس کے نتیجہ میں گمراہ کن تاریخی شعور پیدا ہوگا، اور اس کے نتائج بھی غلط نکلیں گے۔ سوچنے کی بات ہے کہ اگر تاریخ کو ہم اشتراک کی قدروں کے ساتھ تشکیل دیں تو یہ ہمارے ذہن کو وسیع کرے گی، تنگ نظری، تعصب اور نفرت کو دور کرے گی۔ اس لئے 1857 کو مشترک جدوجہد کے طور پر یاد کرنے کی ضرورت ہے، یہ ایک ایسی تاریخی یادداشت ہے کہ جو برصغیر ہندوستان کے لوگوں کو آپس میں ملائے گی انہیں جدا نہیں کرے گی۔

حوالہ جات

1- J. G. Brown: *The Punjab and Delhi in 1857,* Reprinted Delhi 1999, Vol. II, P. 290.

2- Ibid., P. 290.

3- Moin-ul-Haq: *The Great Revolution of 1857, In: Road to Pakistan,* edited by Hakim Muhammad Said, Karachi 1990, P. 540.

4- Ibid., P. 573.

5- I. H. Qureshi: *Ulema in Politics,* Karachi 1974, PP. 186-7-8-9.

6- S. F. Mahmud: *A Concise History of Pakistan,* OUP, Karachi 1988, P. 225.

1857 کا عرس یا 1857 کی یاد

ایک تعارفی نوٹ

دیپش چکر بارتی / ترجمہ: ڈاکٹر صولت ناگی

یادداشت کی پریکٹس اور سیاست سے اُس کے تعلقات پہ بحث کے عمل کے لئے سماجی سائنسدان تین اقسام کی پریکٹس پہ یقین رکھتے ہیں۔۔۔ 'یادگار منانا'، 'یاددلانا' اور ذکر کرنے/بھول جانے کے عمل پر۔ 1857 کا عرس (یادگاری) اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس واقعہ کی ستائشوں کو ریت یا رسم بنادیا گیا ہے جبکہ 1857 بحیثیت داستانوں (ڈھونگ) کے بارہا اپنا اظہار کرتا ہے اور ایک مقبول مزاحمت کی حیثیت سے مستحکم رہتا ہے۔ یاد کے عمل اور سیاست سے اُس کے رشتوں پہ بحث کرنے کے لئے سماجی سائنسدان تین اقسام کی شقوں پر انحصار کرتے ہیں۔۔۔ یادگار منانے۔۔۔ یاددلانے اور ذکر کرنے/بھلا دینے کے عمل پر 1857 کی یادگاری اس لحاظ سے یکتا ہے کہ سرگزشت کی سرکاری ستائشوں میں بھی یہ ضابطہ کی حیثیت اختیار کرگئی ہے۔ جبکہ 1857 ایک قصے کی حیثیت سے اپنا اظہار بارہا کرتا ہے اور معروف مزاحمت کی علامت کے طور پر قائم رہتا ہے۔ اس خاص موضوع پہ مضامین ظاہری تضادات اور پیچیدگیوں کی جانب رجوع کرتے ہیں جو 1857 کی ''یادوں'' کو شامل کرتا ہے اور

مختلف تنوع کی یادوں کے درمیان موجود تناؤ پہ غور کرتا ہے۔

1857 کی ایک سو پچاسویں سالگرہ انڈیا کے بہت سے حصوں میں منائی جاتی ہے۔ یہ تاریخی بغاوت کی یاددہانی کی ایک قسم (نوع) ہے۔ سالگرہ کے کیلنڈروں (جنتریوں) کا احاطہ مختلف درجوں/ پرتوں تک مقرر ہوتا ہے۔ جو کہ قومی سے علاقائی تک اور (علاقائی سے) ذاتی تک پھیلا ہوتا ہے۔ کیلنڈروں کے معنی قائدے یا ترتیب کے ہیں (یعنی) قومی یا ذاتی وقت کی کسی قدر ترتیب۔ اس عمل سے متعلق لازماً غیر مقصود تاریخی رمز کا ایک جزو (موجود) ہے جس سے معروف بغاوتیں یا فتنہ انگیزیاں ۔۔۔ جن کا سیاسی خلاصہ، استحصالی نظام کو مزاحمت کی اجتماعی حیثیتوں سے دعوتِ مبارزت دینا ہے ۔۔۔ ایک ایسا مظہر جسے رنجیت گوہا نے ایک مرتبہ ''نفی'' کیا تھا ۔۔۔ قومی کیلنڈر پر (بحیثیت) سدھائی ہوئی تیوباری تاریخیں بن کر رہ جاتا ہے اور کیلنڈر بنانے والوں کی امیدوں یعنی بغاوت کے محرک کی بجائے عملاً ساکت یا کم و بیش (جامد) اُس جیسا ہو جاتا ہے (یعنی عمل پذیر ہونے سے قاصر ہو کر رہ جاتا ہے) یہ مختصر تعارفی مضمون جبلی (اصلی) واقعات کے دوہرائے جانے کی دو اقسام (انواع) کے درمیان تناؤ کے گرد تشکیل شدہ ہے۔ قوم کی زندگی میں مراجعت پذیر رسمی تاریخ کی حیثیت سے اور مستقبل میں مدام بغاوت کی تحریک کی حیثیت سے (عبارت ہے)۔

1857 کی سیاست کی یادوں کو تازہ کرنے کی سیاست کیا ہے؟ بحث کو سہل کرنا، میں یادداشت کے کام کی تین اقسام کی مشقوں کے درمیان امتیاز سے (حرفِ) آغاز کروں گا۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ یہ تین اعمال یا مشقیں یادداشت کے پیچیدہ مظہر کا صریحاً مکمل جائزہ لے سکتی ہیں۔ یہ محض وہ شقیں ہیں جو سماجی سائنسوں کی حدود میں آتی ہیں۔ جبکہ یادداشت کے اور بہت سے پہلو باقی رہ جاتے ہیں ۔۔۔ جن کا مطالعہ سائنسدان کرتے ہیں ۔۔۔ لیکن سماجی سائنسدان ان کے بارے میں کچھ کہنے کے لئے تربیت یافتہ نہیں ہیں۔ ذہن میں (موجود) تین افعال یہ ہیں۔ (1) یادگار منانا، (2) یاددلانا اور (3) ذکر کرنا/ بھلا دینا۔ دونوں (یعنی) یادگار منانا اور یاددلانا کا تعلق ماضی کی نمائندگی سے ہے۔ تیسرا فعل ۔۔۔ جو کہ ذکر کرنے/ بھلا دینے سے متعلق ہے ۔۔۔ ہمیں نمائندگی کی سیاست سے پرے لے جاتا ہے۔ 'رومن جیکوبسن'

یا 'رونالڈ بارتھز' جیسے مفکرین کی اصطلاحات میں کچھ کہنا جیسا کہ انہوں نے ایک مرتبہ بیان کیا تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یادگار منانے اور یاد دلانے کے درمیان کم و بیش استعارے اور مجاز (علم الکلام) کے درمیان رشتے سے ملتا جلتا تعلق ہے۔ جبکہ تیسرا فعل ذکر کرنا/ بھلا دینا یادداشت کے کام کو نمائندگی سے پرے (دور) لے جاتا ہے۔ ایک ایک کر کے مجھے اپنی اصطلاحات کی وضاحت کا آغاز کرنے دیجئے۔

یادداشت اور 1857 کو فراموش کرنے کا سوال

1857 کی یاد کی ایک قسم (نوع) وہ ہے جواب ناقابل واپسی حد تک کھو چکی ہے۔ یہ ذاتی دکھ کی حیثیت رکھنے والا ماضی ہے۔ یادداشت جس نے اُس لمحے میں اپنا اظہار ذاتی رنج والم میں، خاندانوں اور قریبی عزیزوں کے جتھوں میں کھو دینے اور (انسانی) المیے کے مفہوم میں، بے شمار طریقوں سے کیا ہوگا اور وہ بھی دونوں اطراف میں (یعنی) برطانوی سمت اور انڈین سمت میں۔ ذرا سوچئے، مثال کے طور پر 850 باغیوں کو (دار پہ) لٹکا دیا گیا، یا کچھ وہ جنہیں 1857 کو کرنل جان نکلسن کے حکم پر پشاور کے نزدیک بندوق کے دہانے سے باندھ کر اُن کے جسم کے چیتھڑے اڑا دیئے گئے یا وہ برطانوی قیدی جنہیں آنے والے مہینے میں جھانسی میں باغیوں نے موت کی نیند سلا دیا۔ جن کی تفصیلات 'کاوَستک رائے' کے خصوصی شمارے میں یہاں بیان کی گئی ہیں۔ ہم اُس درد و کرب کی تاریخ کے بارے میں جس سے ان کے عزیزوں کو دوچار ہونا پڑا ہوگا اور اس درد کے اظہار اور دورانیئے کے بارے میں کس قدر جانتے ہیں؟ بہت ہی کم۔ (بالکل خفیف) اس کی وجہ محض یہ نہیں ہے کہ ہمارے پاس (اس بارے میں) دستاویزات ہی میسر نہیں ہیں اگرچہ اس سے انکار ہرگز نہیں ہے کہ دستاویزات اگر موجود ہوتیں تو ہمیں ایسی درد انگیز یادداشت کی شماریات کی بازیابی میں مدد مل جاتی۔ لیکن زیادہ اہم وجہ جو مجھے محسوس ہوتی ہے کہ کیوں ہماری یادداشت نقصان کے گہرے ذاتی احساس کو مصرف میں لانے کی مشق کرتی ہے (جو) تاریخی نمائندگی کو للکارتی ہے کیونکہ یہ مشقیں اکثر برابری کے وجود یا ہستی کی بات کرتی ہیں جسے مظاہرانہ فکر کے ذریعے بہتر طور پر تسخیر کیا جا سکتا ہے بہ نسبت اُس کاغذی سلسلے کی قسم سے جس طور سے تاریخ دان ان سے تعاقب کرتے ہیں۔

اٹلی کے مصنف 'ایلسنڈرو پورٹیلی' کی قابل ذکر کتاب 'حکم بجا لایا گیا' (Order has been Carried out) میں کچھ ایسی مثالیں دیتا ہے جو اس مسئلے کے بارے میں غور وفکر کے لئے معاون ثابت ہوسکتی ہیں۔ پورٹیلی کی کتاب اُن 335 (زیادہ تر) خواتین اور بچوں کا مطالعہ ہے جنہیں بلا ہتھیار عام شہری ہونے کے باوجود 24 مارچ 1947 کو نازی قابض فوجوں نے روم میں بیدردی سے گولیوں کا نشانہ بنا دیا تھا۔ یہ ایک دن قبل نازیوں کے ساتھیوں پر ہونے والے حملے کا انتقام تھا۔ وہ غم کے اظہار کی بہت سی ایسی مثالیں دیتا ہے جہاں غم روزمرہ معمولات کے اظہار میں تشکیل پاتا ہے اور جو مستقبل کے تاریخ دان کے لئے کوئی نشان (بھی) نہیں چھوڑتا۔ 'پورٹیلی' کے مخاطبوں (انٹرویو دینے والوں) میں سے ایک کہتا ہے'' (انٹرویو دینے والے کا ایک چچا جو اس قتلِ عام میں مار دیا گیا تھا) اس قصے کے بارے میں میری دادی سے ہم کوئی سوال نہیں پوچھتے تھے۔ کیونکہ ہمیں خبر تھی کہ یہ ایک ممنوعہ موضوع ہے جسے ہم چھیڑ نہیں سکتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے چچا کی تصویر کے ساتھ اُس کے (دادی کے) پاس ایک سنہرا بروچ (جگنی) بھی تھا وہ ہمیشہ اُسے (بروچ کو) اپنے سوٹ کے ساتھ پن کے ذریعے لگائے رکھتی تھی۔ چنانچہ قصے کا درد کچھ ایسی شئے ہے جسے ہم تک بھی پہنچا دیا گیا تھا۔'' اس کے باوجود درد کا یہ انتقال اُس کے ساتھ مشروط تھا جس کا ذکر ہم نے یہاں ''انتہائی ضبطِ نفس'' کی حیثیت سے کیا تھا۔ اور یہاں ایک اور ماں کا کیس (معاملہ) ہے جس کے غم کا اظہار تمام عمر اہل دنیا کو چھٹیوں کے دوران اُس کی جسمانی سمت (کیفیات) کے ذریعے ہوتا تھا۔ بیشتر اوقات (وہ خاتون) اس کا انکار کرتی تھی اور وہ یہ سوچا کرتی تھی کہ وہ (اُس کا بیٹا) ملک سے باہر تھا وہ سوچتی تھی کہ وہ کہیں دور تھا۔ وہ (حقیقت کو) جانتی تھی لیکن اس نے موت کے نفسیاتی انکار کو پروان چڑھا لیا تھا۔۔۔ میرے دادا نے اس کے بارے میں اپنی کچھ نظموں میں لکھا ہے۔۔۔ جہاں چھٹیوں کے دوران وہ (ماں) اُس کے (بیٹے) لئے میز سجایا کرتی تھی اور جب (جب) موسم بدلتا تو وہ اُس کے سردیوں اور گرمیوں کے کپڑے نکالتی تاکہ اُن تمام لوگوں کے لئے جو اُس کی موت کے مسئلے سے سمجھوتہ کر چکے تھے، انہیں اس اذیت سے دوبارہ دوچار کیا جائے۔ (انہیں اس اذیت سے دوبارہ دوچار کیا جاسکے)

'پورٹیلی' کا مواد انٹرویوز (کے ذریعے) سے حاصل ہوتا ہے۔ لیکن ان دونوں مثالوں میں ہم غم کے اظہاروں سے معاملہ کر رہے ہیں۔ جو بلا شبہ اپنی خاصیتوں میں ثقافتی طور پر مخصوص ہیں۔

جنہوں نے کاغذ (تحریری طور) پر کوئی شہادت نہ چھوڑی ہوگی۔ (ہم) 1857 کی جانب واپس آتے ہیں، کون جانتا ہے کہ لٹنے والا کیسے غم زدہ ہوا اور کب تک (غم زدہ رہا) یہ بعد ازاں سانحے کے پس ماندگان کا دکھ کو بھول جانا، یادداشت کے فعل سے متعلق ہے جو نمائندگی کے انتہائی سوال کو للکارتا (چیلنج کرتا) ہے۔ اولین سطح پر نمائندگی کے بغیر یہاں کوئی دوسرے یا تیسرے قائدے (یا ترتیب) کی نمائندگی نہیں ہوتی جسے ہم عام طور پر تاریخ کہتے ہیں۔

چنانچہ اگر دکھ ہمیں ایک گمشدہ شئے کی نمائندگی (کی حیثیت) سے پیش کرتا ہے تو ایسا محسوس ہوگا کہ اس گمشدہ شے اور وہ شئے جس کی نمائندگی قوم کی تعمیر کرتی ہے، کے مابین ایک نازک رشتہ موجود ہے۔

آیئے ہم رابندر ناتھ ٹیگور کے عظیم ناول ''گورا'' (کی مثال) کو لیتے ہیں۔ جو پہلے پہل 1907 اور 1909 کے درمیان بنگالی رسالے ''پراباسی'' میں سلسلہ وار چھپا تھا۔ یہ ناول 1880 میں کلکتہ سے شروعات کرتا ہے۔ 'گورا' ایک ایسا بچہ ہے جس کی پرورش ہندو بنگالی دایہ گیر والدین کرتے ہیں۔

اپنی عمر کے بیسویں برس میں وہ کٹر ہندو قومیت پرست بن جاتا ہے جو کہ (ہندو قومیت پرستی) اُس دور میں بنگال پر مکمل طور پر حاوی تھی۔ محض ناول کے آخر میں جب وہ اپنے مرتے ہوئے والد کا سامنا کرتا ہے تو اُسے معلوم ہوتا کہ والد کی موت کی صورت میں اُسے اُس کے والد کا 'کریہ کرم' کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ اور اچانک اُس پر اُس کی حیاتیاتی شناخت افشا ہوتی ہے۔ اُس نے بطور ہندو جنم نہیں لیا تھا۔ وہ 1857 کے پرآشوب واقعات کے دوران ایک آئرش والدین کے یہاں پیدا ہوا تھا۔ اُس کی پرورش کرنے والا والد 'کرشنا دیال' اُسے بتاتا ہے کہ ''یہ بغاوت کے دوران ہوا۔ ہم تب 'ایٹاوا' میں تھے، تمہاری والدہ سپاہیوں سے بچتی بچاتی آئی اور اُس نے ہمارے گھر میں ایک رات کے لئے پناہ مانگی۔ تمہارا والد گذشتہ روز کی لڑائی میں مارا گیا تھا۔۔۔ وہ ایک آئرش تھا۔ اُسی رات تمہیں جنم دینے کے بعد تمہاری ماں رحلت کرگئی۔ اور اُسی وقت سے تمہاری پرورش ہمارے گھر میں ہوئی۔''

'کرشنا دیال' نے اُسے اُس کے حیاتیاتی والد کا نام بتانے کی پیشکش کی۔ ''اُس کا نام تھا۔۔۔'' 'گورا' نے جملے کے درمیان اُسے ٹوک دیا۔ ''اُس کا نام ضروری نہیں ہے۔ مجھے اُس کا

نام جاننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

جیسا کہ بخوبی معلوم ہے کہ 'گورا' کے اپنے غم/ دکھ کی گمشدہ شے کو جاننے سے سوچ سمجھے انکار پر۔۔۔اس خلا پر۔۔۔ ٹیگور اُن حالات کی تصویر کشی کرتا ہے جن کی بدولت 'گورا' کا فراخی اور سمجھ داری سے انڈین بننا ممکن ہو سکا۔ ناول کے آخری باب میں 'گورا' کہتا ہے ''آج میں بھارتیہ ہوں۔ میرے اندر پر جاؤں (Communities) کے درمیان کوئی تنازعہ نہیں ہے۔ خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان ہوں یا عیسائی ہوں۔ آج بھارت کی تمام ذاتیں میری ذات ہیں۔ ہر کوئی جو کچھ بھی نوش کرتا ہے وہی میری خوراک ہے۔'' اور وہ اُسی تسلسل سے بیان کو جاری رکھتا ہے ''میں نے آج سویرے جنم لیا ہے۔۔۔ اپنی مکمل عریاں آگاہی کے ساتھ، اپنی ذات بھارت ورشا میں۔۔۔ مجھے اُس الوہیت کے تمام منتر سکھائے جائیں جو ہندو، مسلمان، عیسائیوں، براہمو سب سے منسلک ہے۔ جس کے مندر (عبادت گاہ) کے دروازے کبھی کسی شخص (انسان) کے لئے بھی بند نہیں ہوتے۔۔۔ وہ الوہیت جو نہ صرف ہندوؤں کی ہے بلکہ بھارت ورشا کی ہے۔ یہ محض آئرش خاندان کے دکھ کو (بشمول اپنے غم کے) علامات کے کسی قائدے کے لئے عدم دستیاب بنا کر ہی 'گورا' اپنی شناخت کو انڈیا کی نمائندگی کے حصار میں لا سکا۔

چنانچہ میرا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے پاس 1857 کی کوئی یادداشتیں نہیں ہیں۔ بلا شبہ ایک وقت ایسی یادداشتیں تھیں لیکن وہ اپنے ورثا کے بغیر تمام ہو گئی ہیں۔ 'اینڈریو وارڈ' ولیم جوناشپرڈ کی داستان سناتا ہے۔ جو 'کان پور' (کے قتل عام) کا پس ماندہ تھا۔ اُس کے اعصاب اپنے خاندان کے قتل عام کے بعد اس حد تک درماندہ ہو چکے تھے کہ وہ اپنی انتہائی کوشش کے باوجود بیس برس تک اپنی ''یادداشتیں'' نہ لکھ پایا۔ اور جب اُس نے ایسا کیا تو درستی کے لئے اُسے دوسرے لوگوں کے اشاعت شدہ کاغذوں پہ انحصار کرنا پڑا۔ اُس کی آنے والی پیڑی شاید ہی اُسے جانتی ہے، اُس کے تمام خطوط گم ہو گئے۔ اُس کے خاندان نے کسی بھی بچے کا نام اُس کے نام پر نہیں رکھا کیونکہ ''انکل جان کے ساتھ میری بدقسمتی وابستہ تھی''۔ انڈین باغیوں کے متعلق خاندانی دکھ کی پیچیدگیوں کے بارے میں اتنی تفصیل بھی میسر نہیں ہے۔ اور نہ ہی یاد رکھنے/ بھول جانے کا وہ چیلنج جسے میں نے نمائندگی کہا ہے۔ جہاں تک 1857 کا تعلق ہے، جو مجھے محسوس ہوتا ہے ہمارے پاس محض وہی کچھ ہے جو واقعات کی یادگار منانے اور 'یاد دلانے' کی سیاست ہے۔ یوں کہا جائے کہ یہ فی الحقیقت

1857 کے مرکب نام کے استعمال کی استعاری اور مجازی نمائندگی کی سیاست ہے۔

یادگار منانے کا استعاری عمل

یادگار منانے کا تعلق (یادگاری) نشانیوں کی تخلیق سے ہوتا ہے۔ خواہ وہ عارضی ہوں یا مستقل۔ لیکن (یادگاری) نشانیاں محض اشیاء کی حیثیت سے یادگار منانے کے فعل کو سرانجام نہیں دے سکتیں۔ یادگار منانے کا عمل تب ظہور پذیر ہوتا ہے (جب مخصوص اشیاء جو کسی (شخصیت) سے یا کسی واقع سے وابستہ ہوں (جنہیں) ہم یاد رکھنا چاہئیں، اُنہیں یاد کرنے کی رسومات کی تخلیق کے لئے معین معمولات (Practices) کے تعلقات میں ڈالا جائے۔ ایسی رسومات یا رسمیات فطرتاً عموماً اجتماعی ہوتی ہیں۔ ایک اچھی مثال 'رائے گیڈ' مہاراشٹرا میں شیوا جی کی یادگار کی جدید کہانی ہے۔ ایک زمانے میں وہ ایک ایسے بادشاہ کی یاد میں تعمیر (کھڑی) کی گئی تھی جس نے مغلوں کی بہت سی راتوں کی نینداچاٹ کردی تھی۔ لیکن انیسویں صدی میں وہ انتہائی خستگی کی حالت میں پہنچ گئی جب کہ اُس کے گردونواح کو جنگل نے ڈھانپ لیا۔

(1883 میں) یہ Book of Bombay (بمبئی کی کتاب) کا یورپین مصنف جیمز ڈگلس جس نے سب سے پہلے اس (یادگار) کی خستہ حالت کی جانب توجہ دلائی اور چھتر پتی شیوا جی کی یادگار کونظر انداز کرنے پر مہاراشٹر کے قوم پرستوں کو سرزنش کی۔ اور پھر تب راناڈے، تلک اور بہت سے دوسروں نے اس کی مرمت کے اخراجات کے لئے 1880 میں حکومت سے سرمائے کی عرض گذاری (پٹیشن داخل کی) اور بعدازاں انہوں نے سمادھی کے گرد قوم پرستانہ مذہبی رسومات تخلیق کرلیں۔ تب (اُس وقت) سمادھی نے ازخود کوئی یادگار منانے کا فعل سرانجام نہیں دیا تھا۔ یہ محض اپنے مادی وجود اور (قومیت پرستانہ) مذہبی رسوماتی سرگرمیوں کے اتصال کے باعث جو اُس کے ساتھ وابستہ تھیں، سمادھی نے بطور یادگار اپنا مقام بحال کروایا۔

ٹھیک اُسی طرح 1857 نے بہت سے مادی نقوش چھوڑے ہیں جو لکھنو میں ریذیڈنسی (Residency) کی عمارت کے کھنڈرات سے کان پور کے یادگار (میموریل) کنویں، فیلس بیٹو کی تصاویر، ولیم سمپسن کے آبی رنگوں سے لے کر اہلِ علم (سکالرز) کے تاریخ سے متعلق دستاویزات جو اُنہوں نے بغور دیکھے ہیں تا کہ وہ بغاوت کے تاریخی احوال کو (پیدا) دکھاسکیں۔ یہ

کھنڈرات یا نشانیاں یادگاریں بن سکتی ہیں لیکن اس کا انحصار اس پر ہے کہ ہم انہیں کس طور کام (استعمال) میں لاتے ہیں۔ اور بعض اوقات انہوں نے فی الحقیقت یادگاروں کا کام دیا ہے۔ جیسا کہ نرائن گپتا لکھتا ہے۔ 1858 کے برس میں شمالی ہندوستان کے مہمان (ملاقاتی) 1857 کے واقعات کو انتہائی عزت سے یادوں میں تازہ کیا کرتے تھے، ان کی یادداشتوں کو زمین پہ پھیلا کر تفصیلی نقشوں کی مدد سے اور تصویروں کی بکثرت البموں کے ذریعے (انہیں دوہراتے تھے)۔ جیسے (جیسے) جگہیں زائرین کی منزلیں بن گئیں تاریخی طرزِ تعمیر کے استعمال کے لئے یادگاری عمارتوں/میناروں کی تعمیر کا نظریہ پھیل گیا تاکہ مقدس مناظر جیسے کہ دہلی کا علاقہ پہاڑ گنج (Ridge at Dehli) اور اُن تمام لوگوں کی یادگاریں جو 58-1857 میں مارے گئے تھے، شامل کی جاسکیں۔ دہلی کے قلعے جیسی تاریخی عمارتوں کو بغاوت کے واقعات کے ساتھ اُن کے تعلقات کے باعث نئی دلچسپیوں (Intersts) کے ساتھ متصف کیا گیا۔''

زیرِ غور معاملہ 'یادگار بنانے' کو ممکن بنانے میں معمولات کے نازک یا تنقیدی کردار کا ہے۔ تصویریں، نقشے، کہانیاں، سفر اور زیارت کے ساتھ جڑی ہوئی معمولات 'یادگار بنانے' کے مرکب کا حصہ ہوسکتے ہیں۔ کتابیں یا یہاں تک کہ فلمیں اس معاملے میں جیسا کہ ''رچنا مجمدار'' اور میں نے اپنے مضامین میں تجویز کیا ہے، یادگار منانے کے لئے چکی کا پسان ہوسکتی ہیں۔ یقیناً 'سریندرناتھ سین' کی 1857 کی تحریر شدہ سرکاری تاریخ حکومت انڈیا نے عظیم الشان یادگار سال کو منانے کے لئے جاری کی تھی۔ قومی کیلنڈر کی نشان دہی کرنے والی کتاب کی اشاعت، صحافت، سیمیناروں اور کانفرنسوں کے ذریعے مطالعہ کرنے والوں کی تخلیق، فی الحقیقت 'یادگار منانا' ہی تھا۔

مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ 'یادگار منانے' کی جانب پہلا قدم واقعات کے جھرمٹ (set) میں سے ایک دوسری یا اعلیٰ درجے (قائدے) کی نمائندگی کی تخلیق ہے۔ یہ وہ ہے جسے میں نے 'یادگار منانے' کا استعاری پہلو کہا ہے۔ جیسے کہ جیکوبسن نے 'استعارے' کی تعریف زبان میں بحیثیت ''لفظ برائے لفظ'' کے تعلق سے کی ہے تو (اسی طرح) یہ کہا جاسکتا ہے کہ 1857 کے واقعات کو ایک وسیع اور مربوط موضوع کے مقام پر کھڑا کرنا (لانا) یعنی ان واقعات کو ان کی فوری نوعیت سے (بالاتر) پرے کچھ نمائندہ حیثیت کا حامل بنانا (مقصود) ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں یہ موجودہ معاملہ 1857 کی برسی کی ایک سو پچاسویں برسی کی نشان دہی کی یادگار منانے کا کارِ عظیم

(اس) ایک مقام پر برسیوں پر ایک تنقیدی (نازک) موقف اختیار کرتا ہے۔ یہاں پر جمع شدہ بہت سے موجود مضامین، اُن استعاری افعال کو جو کسی برسی کو نمائندگی کی حیثیت سے آگے بڑھاتے ہیں، تنقیدی طور پر مصروف (عمل) رکھتے ہیں۔ 'پیٹر روب' دراز تر استعاروں میں سے بہت سوں پر سوال اٹھاتا ہے جو عالمانہ انداز سے پھیلے ہوئے ہیں اور موضوع میں شائق دلچسپیوں کے حامل ہیں۔ (یعنی) انڈین بغاوت کا قصہ (ڈھونگ myth) اور نوآبادیاتی دلائل جنہوں نے 1857 کو ''انڈیا کی فطرت اور اُس پر حکومت کئے جانے کے طریقوں'' کے لائحہ عمل پر بحث کا باعث بنا دیا۔ 'سابھی اساچی داس گپتا' بھی 1857 کو ''عوامی بغاوت'' کے رجحان کی حیثیت سے دیکھنے پر سوالیہ نشان لگاتا ہے۔ البتہ 'کوشک رائے' بغاوت کے واقعات کو ''عوامی جنگ'' کے مطمع نظر کا ایک موقعہ سمجھتا ہے۔ جسے وہ انیسویں صدی کے درمیانی حصے میں ابھرنے والی عوامی تاریخ کے حصے کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔ 'ایشوریہ لکشمی' اور 'سواروپا گپتا' دونوں نوآبادیاتی اور بنگالی قومیت پرستانہ کاوشوں کی بالترتیب خاکہ کشی اور تقریظ کرتے ہیں وہ انڈیا (جو نوآبادیات بننے کے لئے خواہش مند تھا) کے قحط زدہ منظر (نامے) کے بارے میں مفصل تر بیانات کے ذریعے 1857 کو قابل فہم بناتے ہیں۔ یا بطور ایک ایسی خالی جگہ کے جو قوم کو نیا روپ دے رہی ہو''۔ 'بارلو اور سبرامنیم' کی شمالی ہندوستانی موسیقی کے کیرئیر کے بارے میں تفصیلی بحث اور 1857 سے پہلے اور بعد 'انو کماز' کا دہلی کالج کے بارے میں مضمون دونوں یہ دریافت کرتے ہیں کہ کیا فی الحقیقت 1857 وہ چوٹی تھی جس کے گرد برطانوی راج میں موسیقی اور تعلیم میں 'جدیدیت' کی تبدیلی کی حکایت کا رخ بدلا۔ 'فشر' کا مضمون 1857 کی تاریخ کے عالمی پہلو کو برطانیہ میں انڈینز پر مرکوز کر کے منظر عام پر لاتا ہے۔ یہاں دوبارہ 1857 کو سلطنت میں نسلی تعلقات کے وسیع تر بیانات میں تبدیلی کے اہم موڑ کی دونوں حیثیتوں سے سجایا (نمایاں بھی کیا) بھی جاتا ہے اور اس پہ استفسار بھی کیا جاتا ہے۔

کسی واقعے کی پبلک کی زندگی سے متعلقہ استعارے میں تبدیلی جو پبلک کے دائرہ اختیار میں اس لحاظ سے ایک درجے کی مقابلہ بازی پیدا کردے کہ کس واقعے کو (بطور) یادگار پیش کیا جائے یعنی یہ کہا جائے کہ کونسا واقعہ منتخب استعارے کا بہترین علمبردار ہو سکتا ہے۔ جمہوریتوں میں ایسے مقابلے مساوی یا متناسب نمائندگی کی دستیاب زبان سے مستعار لے لیتے ہیں۔ اپنی مذکورہ

بالا کتاب میں 'پورٹیلی' اپنے ایک انٹرویو کرنے والے کا ذکر کرتا ہے جو 1944 میں نازی قتل عام کی یاد کے طور پر 'فوسے آرڈی ایٹائن' کے مینار کو ملنے والی توجہ پر نالاں تھا۔ اُس کے ایک انٹرویو دینے والے 'نکولیٹا لیونائی' نامی شخص کا کہنا ہے ''یہ درست نہیں ہے کہ ہم روم میں محض 'فوسے آرڈی ایٹائن' کا ذکر کریں۔ ہمیں 'فورٹ برے وٹ' کے بارے میں بھی بات کرنا چاہئے اور 'سینٹ لوریٹا' کے بارے میں بھی، میرے دادا کو بھی سزائے موت دی گئی تھی۔ غالب امکان ہے کہ اُس کی موت 'فورٹ برے وٹ' میں ہوئی ہو۔ اگر وہ 'فورٹ برے وٹ' میں فوت ہوا تھا تو میں کیا محسوس کروں گا (یعنی برا محسوس کروں گا) اگر لوگ محض 'آرڈی ایٹائن' کا ذکر کریں لیکن میڈیا، اگر آپ اُسے 'فورٹ برے وٹ' کے بارے میں بتائیں بھی تو وہ (ذرا برابر بھی) دھیان نہیں دیتا۔ کیا آپ کو خبر ہے کہ 'آرڈی ایٹائن' کیوں اتنا اہم ہے؟ کیونکہ (مینار) یادگار وہاں پر ہے۔

جیسے کہ لیونائی کے پیش کردہ سوالات کی بازگشت موجود (سنائی دے رہی) تھی، سابھی اساچی گپتا اس معاملے میں دریافت کرتا ہے ''(آخر) ہم 1857 کی بغاوت ہی کو پہلی جنگ آزادی کیوں کہتے ہیں؟ ہم 'سنتھال' اور 'موپلا' کی شورشوں کو یا اسی طرح بہت ساری دوسری بے شمار بغاوتوں (کے جشن) کو کیوں نہیں مناتے اُن کی 150 ویں برسی کو یاد کیوں نہیں کیا جاتا۔ مثلاً 'چارو گپتا' 'بدری نیرنگ' شانک سنہا اور لتا سنگھ کے ''طوائفیں اور 1857 کی بغاوت'' نامی مضامین میں حصے کی طور پر مقابلے (جدوجہد) کی اِسی روحِ رواں کے دستاویزی ثبوت ملتے ہیں۔

یہ تمام مضامین نکولیٹا لیونی کے سوالات کے قلبِ ماہیت (کے بارے میں) دریافت کرتے ہیں۔ وہ 1857 کی یادداشتوں اور تاریخوں میں، کم ترین نمائندگی کا اظہار کئے ہوئے (طبقوں) کا اظہار تلاش کرتے ہیں۔ (یعنی ان طبقوں کا جن کا اظہار غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ مترجم) یعنی جن میں طوائفیں، دِلت (اچھوت) اور دلت خواتین، اور نظر انداز کئے جانے والے مذہبوں کے قبائلی لوگ شامل ہیں۔ وہ اس مطالبے کو تحریر کرتے ہیں (دستاویزی شکل میں لاتے ہیں)۔۔۔ بعض اوقات وہ کسی حد تک نئی یادوں اور سالگروں (برسیوں) کا کافی حد تک احساس بھی دلاتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نئے قومی کیلنڈروں اور نئے ہیروز کے جتھوں کا یعنی متادین، بھنگی، جال کری اِبائی اور دوسروں کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ گپتا اور نارائن اپنی نظموں اور

نغموں کے استعمال کے ذریعے مشہور اور بالائی طبقے کی مخالف تاریخ کی اقلیم کی جانب اشارہ بھی کرتے ہیں اور جشنوں کی متبادل مشقوں، اور قوم کے اُن دعووں کی طرف جو انڈین نیشنلزم کے سرکاری بیانات کو للکارتے (چیلنج کرتے) ہیں۔ دونوں معاملات میں جو دلکش ہے وہ ہے شمالی ہندوستان کی انتخابی سیاست کی زبان میں اُن کا جذب ہونا۔۔۔ 'مایاوتی' کے ذریعے۔۔۔بھوجن سماج پارٹی اور دوسری ایجنسیوں کے ذریعے ہے۔۔۔ دِت ہیروز اور 1857 کی لڑائیوں سے متعلقہ اُن کی بہادری کی داستانوں کے بارے میں (واقعات کا زبانِ زدِ عام ہونا)۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ 'یادگار منانا' ایک عوامی کردار رکھتا ہے اور عوامی زندگی کے لئے استعارات پیدا کرنے کے تاریخی لمحے پر قابض ہو جاتا ہے۔ تاہم اُسی وقت یہ عوامی زندگی کے مقامیوں کے لئے فراخ بھی (کھل) ہو جاتا ہے اور مضامین کا یہ مجموعہ اُن مقامیوں کے لئے کافی اور گراں بہا شہادتیں مہیا کرتا ہے۔

1857 کا یاددلانا۔۔۔ایک مجازیت کا فعل

یاددلانے کو میں اُس کام کے یادرکھنے کے عمل کا حوالہ کہتا ہوں جس کا مختصر نویسی کی حکمت کے ذریعے سے بولنے/ کہنے کے انداز میں حافظہ بڑھانے کے ہنر سے تقابل کیا جاسکے۔

تاہم 'یاددلانے' کی میری اصطلاح کا استعمال جو بہت حد تک فرانسس ییٹز (Yets) اور 'پال رکوئیر' کی کلاسیکی تعلیمات کا مرہونِ منت ہے، اُن سے مختلف بھی ہے۔ سو مجھے کچھ وضاحت کرنے کی حاجت ہوگی۔ 'ریکوائیر' کے پڑھنے والے میرے 'یاددلانے' اور 'ذکر کرنے' کے تقابل کو اس پیراگراف کے پہلے جملے میں ہی عجیب پائیں گے کیونکہ ریکوئیر ان دنوں اصطلاحات میں، درست وجہ سے مخالف معنی دیکھتا ہے۔ ہم اُن چیزوں کو یاد کرتے ہیں جو پہلے ظہور پذیر ہوچکی ہوتی ہیں، ریکوئیر لکھتا ہے ''گذشتہ کا زمانی نشان چنانچہ یاد کے ممیز نشان کو تشکیل دیتا ہے۔''

''کسی شئے کے یاد کرنے کو 'یاتز' اپنے وسائل کو یکجا کرتے ہوئے 'مصنوعی یادداشت' کہتا ہے۔ جس کا تعلق کسی غیر شناسا شئے (جیسے کہ کوئی بھی غیر ملکی زبان) پہ غالب ہونے کے لئے سیکھنے کی حکمت عملی/ لائحہ عمل کے طور پر ہم جان بوجھ کر استعمال کرتے ہیں، سے ہوتا ہے۔''

چنانچہ میں 1857 کی نسبت سے 'یاد کرنے' (کے لفظ) کو کیوں استعمال کرتا ہوں؟ میں یاد

کرنے اور یاد دلانے کو ہو بہو جملے میں کیوں استعمال کرتا ہوں؟ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ 1857 نے یورپین کی جانب زیادہ افراتفری پیدا کی تھی (میری اس رائے میں نہ جھگڑنے والے (غیر متحارب) انڈین بھی حصے دار ہیں)۔

باغیوں کی جانب اس کے برعکس خوف ہوگا۔ وہ خوف جو برطانوی انتقام اُن میں سمو دینا چاہتا تھا۔ اس افراتفری اور اُس کی یاد کا مسلسل شمار انتہائی دشوار ہے۔ اور یہ کہ اس نے ا (افراتفری اور اُس کی یاد نے) 1857 کے بعد آنے والے سالوں میں نوآبادیاتی سرکار پر کیا (اثر) کیا ہوگا۔ ہمارے پاس کچھ ایسی بالواسطہ شہادتیں ہیں جہاں تک ہماری رسائی ہو سکتی ہے۔ 1857 کی صد سالہ تقریب کے موقعے پر کمیونسٹ لیڈر اور مصنف 'پی۔سی۔ جوشی' نے یاد کروایا کہ 'کیر ہارڈی' 1907 میں انڈیا آیا ''جو کہ 1857 کی بغاوت کا پچاسواں برس تھا'' ہارڈی نے غور کیا کہ ''برطانوی نظام حکومت کو چلانے والے (ایڈمنسٹریٹرز) کس قدر زود حسی کا شکار تھے'' جوشی نے ایڈورڈ تھامسن کے بارے میں بھی ذکر کیا کہ جس نے 1905 میں 'بغاوت'' کو بحیثیت ''ایک بے انتقام اور غیر شانت بھوت'' لکھا تھا ''جو بحیثیت انڈین کے جب وہ ایک انگلش آدمی سے بات کرتا ہے، بہت سے ذہنوں سے کافور ہو گیا ہے۔ تھامسن کے بیان میں ممکن ہے کس حد تک سچ ہو لیکن وہ بھی غالباً شیشے میں (خود کو) جھانک رہا تھا (ایک انگریز کی حیثیت سے)۔

اس کے ایسے بیانات اور ہارڈی کا یہ نقطہ کہ انڈیا میں برطانویوں کے اذہان (ذہنوں) میں 1857 کے واقعات کی بعد از حیات طوالت (موجود ہے)۔

بالکل اُسی وقت 'بائیں بازو' کے تاریخ دانوں پر بھی یہ ظاہر تھا، اس بحث سے قطع نظر کہ کیا 1857 ایک مقبول بغاوت تھی بھی یا نہیں کہ بہت عرصے تک (عوام کی) یہ اٹھان دیہی علاقوں میں فتنہ انگریزی کی عمومی شکل کے معنی رکھتی تھی اور جو بیسویں صدی میں ہونے والی سیاسی ترقیوں پہ دلالت کرتی تھی۔ 'میکس ہرکوٹ' جس نے 1970 بہار میں ہونے والی کسانوں کی بغاوتوں اور ''انڈیا چھوڑ تحریک'' کے دوران مشرقی یو۔پی کا مطالعہ کیا تھا۔ اُس تحریک کے پرتشدد واقعات اور 1857 کے واقعات کی یکسانیت پر ششدر رہ جاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ''بے چینی کا انداز 1857 کی بغاوت کے ہمراہ دیہی بدنظمیوں کی بالکل ویسی باقیات تھی۔'' فرق محض اتنا تھا کہ کسان جس سے 1857 کے بعد ہتھیار رکھوا (چھین) لئے گئے تھے۔ برطانیہ کے مقابلے میں تقریباً نہ ہونے

والے ہتھیار تھے۔ انیسویں صدی کے انڈیا میں کسانوں کی شورش پر رنجیت گوہا کی کلاسیکی کتاب۔۔۔ جس میں اس نے 1857 اور اُس عرصے میں کسانوں میں ہونے والی دوسری شورشوں کی عمومی مثال کا نچوڑ نکالنے کی کوشش کی ہے جس کے مطابق 1970 کے درمیانی عرصے میں شمالی ہندوستان میں 'نس بندی مخالف مہم' میں بھی بغاوت کا وہی عمل کارفرما نظر آتا ہے۔ 77-1976 میں دیہی ہریانہ اور شہری یو۔ پی میں نس بندی کے خلاف ہونے والی بدنظمیوں سے باآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انتقالِ اقتدار (انگریز سے انڈین تک) نے اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں بیان کی گئی کسانوں کی بغاوتوں کی قوت کی مثالوں کو کس حد تک کم کیا ہے۔ وہ تاثیر جو 'گوہا' کے الفاظ نے ''مخصوص تعلیمات'' (تصنیف) کے ذریعے اپنے نوجوان ساتھیوں کو مہیا کی ہے، آج بھی عمل کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ وگرنہ اس کا اور کیا باعث (ہوسکتا) تھا کہ دہلی میں ''جمہوریت کی ابتدا'' کے فورم میں گاندھی امن فاؤنڈیشن نے 20 مارچ 2007 کو 1857 اور کسانوں کی مزاحمت کے ورثے کو منانے کی رائے دی اور اُس کا عنوان 'تیب ہا گا' 'تلنگانا' نکسل باری اور اب 'سن گر' تجویز کیا؟ یہ واضح طور پر محض قومی کیلنڈر (تیوہار) کا جشن منانے کا واقعہ نہیں ہے بلکہ اصل میں 1857 کو بہت سی دوسری (مستقبل میں) آنے والی بغاوتوں کے پیش رو کی حیثیت سے دیکھنے کے برابر ہے۔

چنانچہ خواہ یہ ''نوآبادیاتیوں' کے جانب سے ہو یا 'بائیں بازو' کے نقطہ نظر سے 1857 سرکشی کی عمومی ہیئت میں ہی ترتیب دیا گیا ہے۔ اس ترتیب کے مطابق 1857 محض بھڑکانے کی ایک مقبول سیاسی تحریک تھی۔ سرکشی کی ایک دعوت۔ میں نے قوانین یا قائدوں کو ترتیب دیئے جانے والے خاموش عمل، یادداشت کا وہ مجموعہ یا خزانہ جو چھیڑ دیئے جانے کے باعث (استعاری عمل یا جیکوبسن کی اصطلاح میں لفظ کا لفظ سے تعلق) سرگرم ہو جاتا ہے کے لئے ''یاد دلانے'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔

1857 کی یہ موخرالذکر نوع کی یاد سادہ سالگرہ (برسی) کے جشن کی منطق کو بڑھاوا دیتی ہے۔ (یعنی اُس کی منطق کو مزید بامقصد بنا دیتی ہے) یقیناً اگر 1857 (کی تحریک) سرکاری حلقوں میں آج بھی ایک طاقتور اور ممکنہ عوامی بے چینی کی ہیئت اختیار کرنے کی صلاحیت کی حامل ہوتی جو ملک میں کسی بھی وقت بڑے پیمانے پر پھوٹ پڑنے کی اہل ہوتی، تو دہلی کی حکومت اس

برسی کی تقریبات کو منانے کے لئے میوزیم اور سمیناروں کو سہل بنانے کے لئے سرمایہ تقسیم نہ کرتی۔ 1857 کی دو مختلف قسم کی یادیں۔۔۔معروف سیاست کا بھڑ کنا، قومی کیلنڈر پر تیوہاری وقت اور اُن کے درمیان موجود ایک جبلی تناؤ اسی معاملے کو میں اس تعارفی مضمون میں مخاطب کرنا چاہتا تھا۔ (مناسب حد تک) درست تاریخی وجوہات کے باعث میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ انڈیا میں اُسی طرح شورشیں مقبول سیاست کی مخفی ماہیت رہی ہیں۔ جیسے کہ انقلاب کے بعد فرانس کی جمہوریت میں سڑکوں پر ہونے والے فسادات (مظاہرے)۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک کا عنصر کبھی بھی مکمل طور پر نہ تو سدھایا جا سکتا ہے اور نہ ہی (اس کی آگ کو) بجھایا جا سکتا ہے (خواہ) اُنہیں 1857 جیسے واقعات کی سیاسی برسیوں کے مستحکم قومی کیلنڈروں کے عمل کا حصہ ہی کیوں نہ بنالیا جائے۔

❁❁❁❁❁

انڈیا میں عوامی جنگ کا آغاز

کوشک رائے/ترجمہ: ڈاکٹر صولت ناگی

بغاوت کے خلاف برطانیہ کے (جواب) ردِ عمل کے سبب اگلی صدی میں ان کی حکمرانی کے انداز میں (نمایاں) بنیادی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ لیکن بہت سی نسبتوں (پہلوؤں) سے 1857 کی بغاوت کی راہ میں لڑی گئی جنگ انقلابی طور پر گذشتہ لڑی گئی جنگوں سے مختلف تھی، اس نے ماضی کی ''محدود جنگ'' کے برعکس ''عوامی جنگ'' کی آمد کا پتہ دیا، نہ صرف یہ کہ شہریوں میں سے ملیشیا اور مقامی 'لیویز' کا قیام عمل میں آیا بلکہ شکست خوردہ سویلین آبادی پر جان بوجھ کر کیا جانے والا وحشیانہ پن دشمن کے مورال کو ختم کرنے کی ایک شعوری کوشش تھی۔ دوسری موثر حکمت عملیاں جو کہ سویلین کو جنگ کی کوششوں میں کھینچنے (دھکیلنے) کے لئے تیار کی گئیں، اُن میں مذہب کا استعمال اور افواہوں کا سوچا سمجھا استعمال شامل تھا۔

انیسویں صدی نے ایک نئی قسم کی جنگ کے ظہور کا مشاہدہ کیا۔ اٹھارہویں صدی کی 'محدود جنگ' انیسویں صدی کے درمیان کی 'عوامی جنگ' میں تبدیل ہوگئی۔ جس نے اپنی باری پر بیسویں صدی کے پہلے حصے کے دوران 'مکمل جنگ' کو جنم دیا۔ یورپین (لوگوں) کی اٹھارہویں صدی کی جنگیں محدود، جواب دہی کی جنگیں تھیں جو کہ بغیر کسی اخلاقی یا نظریاتی جواز کے لڑی گئیں۔ اٹھارہویں صدی کی یورپین جنگیں پروردہ فوجوں کے تنازعوں پہ مشتمل تھیں جسے نوکر شاہی پہ مبنی بادشاہت نے مسلح کیا اور (اُن کو) پروان چڑھایا۔ ایسی فوجیں، جنگ و جدال کرتے وقت مسلح طاقتوں (افواج) اور عام شہریوں میں واضح امتیاز کرتی تھیں۔ تاہم عوامی جنگ کے عہد میں ایسی تمام پابندیاں ختم ہو گئیں۔ [illegible] اور جورج نیگر' کے بقول یہ عوام کی فوج تھی جس نے

'عوامی جنگ' کی رہنمائی کی۔ایسی افواج میں،شہری فوجی بن گئے اور جنگ کی کوششوں کی مدد کے لئے گھریلو محاذ کو بھی متحرک کیا گیا۔ اس کے نتیجے میں گھریلو محاذ اور جنگ کے محاذ کے درمیان سیل بند خانہ بندی ختم ہوگئی۔اور عوامی رائے نے موثر طریقے سے ایسی جنگوں کے اہتمام کو شکل دینے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔

جان وائٹ کلے چیمبر II کہتا ہے کہ ثقافتی رویوں نے (ذہنیت جو دشمن کے تمثالی پیکروں کو شکل عطا کرتی ہے) نے بھی جنگ کی بربریت کو مدد دی۔ سپاہی دولت اور مالی التفات کی بجائے نظریات کے باعث زیادہ متحرک تھے۔فورسٹر اور نیگلر سے بہت پہلے ایرک روبنسن نے کہا تھا کہ اٹھارہویں صدی کے برعکس فرانسیسی اور امریکہ کی انقلابی جنگوں نے نظریاتی جنگوں کا آغاز کر دیا تھا جو بیسویں صدی کی دو عظیم جنگوں میں اپنے بلند ترین مقام تک پہنچ گیا۔ 1789 میں فرانسیسی انقلاب نے ملٹری کے فلسفے کو پیدا کیا جسے ''ہتھیاروں میں قوم'' کہا جاتا ہے۔

اس مطمعِ نظر کے مطابق ایک ریاست جس کے پاس عوامی (معروف) خودمختاری ہو مطلق العنان بادشاہت سے کہیں زیادہ مضبوط تھی کیونکہ اُس کے لوگوں نے رضامندی سے اپنے ملک کے دفاع کے لئے اُسے اپنا سمجھتے ہوئے خون کا نذرانہ دیا۔ اور اس نے عوامی جنگ کے طلوع ہونے کا اشارہ دیا۔ یہ قابلِ غور ہونا چاہئے کہ اس متن میں عوام کی جنگ ریاست کے اندر جنگ کے حوالے سے ہے چنانچہ 'ماؤ' کے پیروکاروں کے عوام کی جنگ کے نظریے سے مختلف ہے جو کمیونسٹ پارٹی کے ذریعے مخصوص طبقات کو سیاسی طور پر متحرک کرتی ہے تا کہ وہ حکمران طبقوں کے خلاف گوریلا اور روایتی جنگی طریقے استعمال میں لائیں۔

''عظیم بغاوت'' 10 مئی 1857 سے اپریل 1859 تک جاری رہی۔کئی پہلوؤں سے اس عرصے میں جنوبی ایشیا میں لڑائی عوامی جنگ کی مثال کے قریب تھی۔ وہ تمام عناصر جو عوامی جنگ کی خصوصیات کے حامل ہیں اس بغاوت کے پھیلنے میں مختلف مدارج تک موجود تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی (اب سے محض EIC) کی 1770 سے 1849 تک دیسی قوتوں سے جنگیں، یورپین کی اٹھارہویں صدی کی جنگوں سے ملتی جلتی تھیں۔لیکن 1857 کے دوران معرکہ،سوسائٹی (سماج) پر جہاں تک مقصد/ارادہ، شدت اور اثر کا تعلق ہے، ایک مہلک اضافے کی نمائندگی کرتا ہے۔'الیگزینڈر ریلولین' پرزور طریقے سے کہتا ہے کہ 1857 میں دونوں اطراف کا مقصد

دشمن کا مکمل خاتمہ تھا۔ علاوہ ازیں، 1857 میں برطانوی، انڈیا میں بہت زیادہ بے رحمی سے لڑے، جو اسی عشرے میں (منعقدہ) کریمین کی جنگ سے واضح ہوا۔ آیئے ہم دیکھتے ہیں کہ عوامی جنگ کا وہ نمونہ جسے مورخین نے یورپ اور امریکہ کی جنگوں کے متن میں واضح کیا ہے اس بغاوت کے دوران انڈیا کے لئے کتنا مستحکم (درست) ہے۔ چنانچہ یہ مضمون جنوبی ایشیا میں انیسویں صدی کے فوجی تجربات کی شمالی امریکہ اور مغربی یورپ کے ساتھ مماثلت اور فرق (بھی) کو بیان کرتا ہے۔

1857-58 کے دوران عوامی جنگ

پچھلی (گذشتہ) جنگوں میں غیر مشابہہ، جنگی قیدیوں کی زندگیوں کی حفاظت نہ تو باغیوں نے کی اور نہ ہی برطانویوں نے۔ 1857 سے قبل ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپاہیوں کے ہاتھوں قیدیوں کی موت کے واقعات بہت کم تھے۔ لیکن انڈیا میں 1857 سے 1859 کے درمیان چلنے والی مہمات کے دوران قیدیوں کا قتل عام کیا گیا۔ 20 مئی 1857 کو پشاور سے کچھ فاصلے پر انفنٹری رجمنٹ نے بغاوت کر دی، اور کرنل جان نکلسن سے اُس پر حملہ کر دیا۔ اُس کی فوجوں نے اُن میں سے 150 (لوگوں) کو ہلاک کر دیا، اور ایک سو کو گرفتار کر لیا۔ ان قیدیوں میں سے چالیس کو بندوق (بندوق سے یہاں مصنف کی مراد غالباً توپ سے ہے۔ مترجم) کے منہ (پر باندھ کر) سے اڑا دیا گیا، اور باقیوں کو پھانسی دے دی گئی۔ نکلسن کوئی استثنیٰ نہیں تھا۔ جیسے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کے فوجی نومبر 1857 میں لکھنو کی جانب بڑھے، ایک برطانوی (جو لڑائی میں شامل تھا) ساجھے دار نے لکھا ''اُن دنوں کے دوران جب ہم خیمہ زن تھے میں نے بہت سے لوگوں کو فوجیوں کے ہاتھوں بغیر کسی مقدمے کے پھانسی پاتے ہوئے دیکھا''۔ 29 جنوری 1858 کو جب 'ہیوروز' کے فوجیوں نے جن کا تعلق مرکزی انڈیا کی فیلڈ فورس سے تھا راحت گڑھ کے قلعے پہ قبضہ کیا تقریباً (84) چوراسی باغی زیرِ حراست آئے جن میں سے (24) چوبیس کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اکثر اوقات باغی قیدیوں کو تمام کر دیتے تھے۔ 8 جون 1857 کو باغیوں نے جھانسی کے قلعے پر حملہ کر دیا۔ تقریباً 5 بجے برطانویوں نے اس شرط پہ ہتھیار ڈال دیئے کہ اُن کی جان بخش دی جائے گی۔ جیسے ہی اُنہوں نے ہتھیار ڈالے قیدیوں کو تلواروں کی نذر کر دیا گیا۔

عوامی جنگوں میں جنگ آوروں اور غیر جنگ آوروں کے درمیان امتیاز ختم ہو گیا۔ فورسٹر اور نیگلر کا دعویٰ ہے کہ 65-1861 کی امریکہ کی خانہ جنگی نے اور 1871 کی فرانکو۔ پروشیا کی جنگ نے سویلین کی جانب رخ کرنے والی حکمت عملی کے ارتقا کی شہادت (گواہی) دی۔ یہ اس لئے (ضروری) تھا کیونکہ جنگ کی کوششوں کو برقرار رکھنے کے لئے سویلین کی موجودگی ضروری تھی۔ اور اول الذکر اکثر اوقات عوامی فوجوں کے ساتھ شامل ہو جایا کرتے تھے۔ لوگ ہتھیار اٹھا لیتے تھے یا انہیں اوپر سے حرکت میں لایا جاتا تھا اور یا وہ اپنے آپ یک لخت متحرک ہو جاتے تھے۔ محکوم تاریخ (محکوموں کی تاریخ) لکھنے والے اختیار، خود انتظامی اور واسطے/ وسیلے کو عام لوگوں سے منسوب کرتے ہیں۔ اس راستے پہ عمل کرنے والے زور دیتے ہیں کہ عوام کے اٹھائے گئے پہلے معروف/ مقبول قدم نے ہجوم کے تشدد کو شکل دی، جس نے اپنے آپ کو 1857 میں ایک اجنبی حکومت کے خلاف عیاں کیا۔ 'ریدرنگ شومکر جی' تو یہاں تک کہتے ہیں کہ باغی علامتی تشدد کے اعمال وافعال میں شامل (کے خوگر) تھے۔ عوامی بے چینی کے مقبول واقعات، عوامی نفرت اور غصے کی علامات تھیں۔

امریکہ کی خانہ جنگی کے دوران حلیف (Confedrate) قوتوں نے قصبوں پر حملہ کیا اور کھپوں (ساز وسامان) پر قبضہ کر لیا۔ باغیوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی دونوں کے سپاہیوں نے ہی انتقام کی خاطر غیر جنگ اور لوگوں اور ذاتی ملکیتوں پر حملے کئے۔ باغیوں کے لئے پہلا نشانہ سفید فام لوگ، اُن کے گھر بار اور کاروبار تھے۔ 4 مئی 1857 کو 'آرچ ڈیل ولسن' نے میرٹھ سے اپنی بیوی کو لکھا ''وہ پچاسی لوگ (تیسری کیولری) جنہوں نے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر دیا تھا، ان پہ اجتماعی مقدمہ چلایا جائے گا۔ اُنہیں جلتے ہوئے بنگلوں (کوٹھیوں) کی جانب لیجایا گیا ہے۔ پچھلی رات اُنہوں نے ایک خالی بنگلے کو جلا دیا جو کیو۔ ایم۔ سارجنٹ کا تھا۔ اور کچھ دن قبل اُنہوں نے کٹہروں کے اصطبل کو جلایا تھا۔ اس کے علاوہ ایک آدمی کی جھونپڑی کو بھی (نذر آتش کر دیا تھا)۔'' ولسن 11 مئی 1857 کو میرٹھ سے اپنی بیوی کو لکھتا ہے۔ ''ساڑھے چھ بجے جیسے ہی میں سواری کے لئے بگی میں بیٹھا۔ 'وش' ہگنٹ دوڑتا ہوا صحن میں یہ کہنے آیا کہ مقامی رجمنٹ اور تیسری کیولری دونوں کھلی بغاوت کی حالت میں ہیں۔ اور وہ جس یورپین سے ملتے ہیں اُسے موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ بدمعاشوں نے (محض) ایک گھنٹے میں ''نُلّہ'' (nullah نل لاہ) کے

جنوب میں واقع تمام بنگلوں کو نذر آتش کر دیا ہے۔ جس میں جنرل، اور 'گرمیڈ' کے بنگلے بھی شامل ہیں، اور مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بہت سے افسر، عورتیں، بچے اور یورپین سپاہی ظالمانہ طریقے اور انتہائی بیدردی سے قتل کر دیئے گئے ہیں۔ کرنل فنس جو 11 ویں (گیارہویں) کو اور کیپٹن ٹیلر جو دسویں کی قیادت کر رہا تھا، میرے خیال میں سب سے پہلے مار دیئے گئے، ان کے ساتھ ہی کیپٹن میکڈ آنلڈ، لیفٹیننٹ میک نیب، ڈپٹی سرجن فلپس اور ڈاسن، مسز ٹریگین اور ڈاکٹر کرسٹی شدید زخمی ہوئے۔ مسز چیمبرز ہلاک ہو گئیں۔ مسز میکڈونلڈ لاپتہ ہیں، یہ فرض کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے گھر میں جلا دی گئیں۔ تین یورپین عورتیں اور نو مرد ہلاک ہوئے۔ تین یا چار دوسرے زخمی ہوئے۔''

ایک برطانوی افسر جو 1857 کی بغاوت میں لڑا تھا، اُس کے شمار کے مطابق شمال مغربی صوبے میں یورپین کی آبادی کا 1/5 (پانچواں) حصہ باغیوں کے ہاتھوں ہلاک ہو گیا تھا۔ دہلی میں باغیوں نے یورپین لوگوں کو مار دیا اور اُن کے گھر نذرِ آتش کر دیئے گئے۔ دہلی میں باغیوں نے دہلی بنک کو تباہ کر دیا جہاں یورپین اپنا تمام سرمایہ رکھتے تھے اور اُن کے تمام اکاؤنٹس (کھاتوں) کو بھی جلا دیا۔ الٰہ آباد کے اردگرد میلوں تک برطانویوں کی ملکیت میں ہونے والے گھروں کو جلا دیا گیا اور اُن کی جائیداد لوٹ لی گئی۔ 5 جون کو سینتیسویں انفنٹری رجمنٹ نے برطانوی کاشتکاروں کی نیل کی فیکٹریوں پر حملہ کر دیا اور اُس کے علاوہ جون پور میں برطانوی افسروں کے گھروں پر ہلہ بول دیا۔

ریاستی اداروں کی تمام علامتوں پر حملہ کیا گیا۔ یہ کمپنی کے راج کے جواز (جائز ہونے) کو (سوچا سمجھا) جانہ بوجھا اور کھلا چیلنج تھا۔ 12 جون 1857 کو لکھنو میں تیسری ملٹری پولیس رجمنٹ جو کہ جیل کی حفاظت کر رہی تھی، کھلی بغاوت پہ اتر آئی، اور سلطان پور کی طرف مارچ (سفر) شروع کر دیا۔ باغیوں نے چھاؤنیوں کو جلا دیا، اور برطانویوں کے ملکیتی (ذاتی) گھروں کو لوٹ کر نذرِ آتش کر دیا۔ اگست 1857 میں جھانسی میں باغیوں نے سرکاری ریکارڈ عوامی الاؤ میں جلایا۔

باغیوں نے ہر اُس چیز پر حملہ کیا جو ''مغرب'' کے ساتھ وابستہ تھی۔ صرف اس لئے نہیں کہ اُس کی محض علامتی قدریں تھیں۔ بلکہ اس حقیقت کے باوصف بھی کہ وہ 'راج' کی ٹیکنالوجی کی پیداواروں کے برتر دوہرے استعمال کو تباہ کرنے کے فوجی فوائد سے بھی آگاہ تھے۔ 1857 کی

بغاوت اور امریکہ کی خانہ جنگی دنوں میں فوجی اپریشنز (عملی طریق کاروں) کی خصوصیت میدانِ جنگ (فیلڈ) میں ٹیلی گراف کا استعمال تھا۔ برقی تار گھروں (ٹیلی گراف) کی ایجاد سے قبل پیامبر گھوڑوں پر احکامات اور ہدایات کو اُن کی منازل تک پہنچایا کرتے تھے۔ دوسری انگریز (اینگلو) مرہٹہ جنگ کے دوران (05-1803) جنرل 'جی۔ لیک' جو شمالی انڈیا میں مہم میں مصروف تھا اُس کے خطوط بارہ دنوں کے بعد 'فورٹ ولیم' میں گورنر جنرل تک پہنچا کرتے تھے۔

ٹیلی گراف کی مہربانی کی بدولت 1857 کے دوران کلکتہ میں مقیم گورنر جنرل اور شمالی انڈیا میں مصروفِ عمل اُس کے فیلڈ (میدانِ جنگ کے) کمانڈروں کے درمیان باہمی رابطہ محض چند گھنٹے کی بات تھی۔ جب برطانوی یونٹ آگے بڑھتے تو ٹیلی گراف کی لائنیں بچھاتے جاتے۔ 30 مئی 1857 کو جب وہ کرنال میں خیمہ زن تھا کرنل 'کیتھ ینگ' نے اپنی بیوی کو لکھا ''ٹیلی گراف گرانقدر ہے۔ سگنل (اشارہ) دینے والا سامان اس شام ہمارے ساتھ جائے گا اور ہمارے اگلے پڑاو 'گارونڈا' پر نصب ہو جائے گا۔ تاکہ جب ہم وہاں اپنے مقام پر پہنچیں تو ہمیں فوراً معلوم ہو جائے کہ 'انبالہ' میں کیا ہو رہا ہے۔''

باغیوں نے ٹیلی گراف کی لائنوں پہ حملہ محض برطانویوں کو نقصان پہنچانے کے لئے نہیں کیا تھا بلکہ اُن کا مقصد اُس ٹیکنالوجی کو اپنے مقاصد کے لئے بہترین طور پر استعمال کرنا بھی تھا۔ ایک برطانوی افسر جو باغیوں کے ساتھ لڑائی میں شامل ہوا، لکھتا ہے کہ ''تھان کے احاطے میں داخل ہوتے ہی ہمیں باغیوں کی سلامت فراست کا ثبوت مل گیا جو انہوں نے اپنی پوزیشن کی موجودہ اشد ضروریات (احتیاجات) کے لئے ہماری برقی ٹیلی گراف لائینوں کے مواد کی بہت بڑی تعداد کو اپنا کر پیش کی تھی۔ انہوں نے جستی لوہے کے بہت سے پیچ کھولے، جن کے درمیان ٹیلی گراف کے کھمبے رکھے گئے، پیچوں کی پوروں کو اڑا دیا گیا، اُن میں چھونے والے سوراخ بنائے گئے اور انہیں سواری یا بگھی پر بندوقوں کی طرح چڑھا دیا گیا۔ اُنہوں نے مضبوط ٹیلی گراف کی تار کو انہیں فلکس (باندھنے) کرنے اور مضبوط بنانے کے لئے استعمال کیا، اس کے علاوہ لمبے لمبے ٹکڑوں کو کاٹ کر کم لمبائیوں میں بدلا تاکہ چھروں کا کام لیا جا سکے''۔

باغیوں اور برطانویوں دونوں نے عام شہریوں کو تشدد کا نشانہ بنایا، 'روز' کے سپاہیوں نے نہتے انڈین شہریوں پر حملہ کیا۔ 'جے۔ ایچ۔ سلوسٹر' جو کہ فوج کے ساتھ ایک میڈیکل افسر کی حیثیت

سے تعینات تھا، نے 25 اکتوبر 1857 کو اپنی ڈائری (روزنامچے) میں لکھا۔'' نتائج یہ تھے کہ ڈیوٹی سے فارغ آدمیوں، یہاں تک کہ کچھ مقامی سپاہیوں بالخصوص (86 ویں) چھیاسیویں اور آرٹلری (کے سپاہیوں) نے مقامیوں کے شراب خانوں کو لوٹ کر خوفناک حد تک (شراب) چڑھائی اور اُس کے بعد اُنہوں نے لوٹنا اور ہر سیاہ فام شئے، بوڑھے لوگوں، نوجوان عورتوں اور بچوں کو ہلاک کرنا شروع کر دیا۔ یہ یقیناً قابل افسوس (گھناؤنا) تھا۔ لیکن مجھے اس کا اندازہ تھا وہ چلائے، کان پور، دہلی اور وہ نیچے کی جانب چلے گئے۔ (یہ ناقابل توضیح تھا) وہ کہتا ہے کہ اُس نے ایک کمرہ عورتوں کی لاشوں سے بھرا ہوا دیکھا اور بچے اُن کی چھاتیوں (سے دودھ) بھینچ رہے تھے۔ دوسری عورتوں کو مردہ باہر لایا گیا۔ بچے رحم کی التجا کر رہے تھے۔

بقول غالب ؎

دل میں ہو درد تو دوا کیجئے
دل ہی جب درد ہو تو کیا کیجئے

جب جنرل فضیلائرز نے بنارس سے الہ آباد کی جانب سفر کیا تو اُس نے ایک سسٹم کے تحت چھ ہزار انڈینز کو قتل کیا۔ قتل ہونے والے لوگوں میں دوکاندار، دست کار، خوانچہ فروش اور بوجھ اٹھانے والے (لوگ) شامل تھے۔ اُنہیں درختوں کی شاخوں کے ساتھ باندھ کر پھانسی دیا گیا۔ سفید فام فوجیوں میں پسندیدہ جملہ یہ تھا ''سیاہ فاموں کو بوری میں ڈالنا۔'' مدعا لوگوں کو ڈرا کر عاجزی اور خامشی طاری کرنا تھا۔ مارکیٹ کی جگہوں اور سڑکوں پر لٹکتی ہوئی لاشیں برطانوی (اتھارٹی) حاکمیت کی دکھائی دینے والی علامات تھیں۔ جب بدبو ناقابلِ برداشت ہوگئی تو لاشوں کو سواریوں پر ڈال کر تلف کر دیا گیا۔ 'نیل' کسی قدر امریکہ کی خانہ جنگی کے دوران یونین کے کمانڈر 'ولیم۔ٹی۔شیرمین' سے ملتا جلتا تھا۔ جس کا مقصد 'جارجیا' سے بھیڑیے کی مانند آوازیں نکلوانا تھا۔ (جارجیا کو گریہ وزاری میں مبتلا کرنا تھا) 1864 میں جب شرمین اتحاد (Confedency) میں شامل ہوا، تو سویلین کو گھروں سے بزورِ قوت باہر نکالا گیا۔ اور شہروں کو آگ لگا دی گئی۔ امریکہ کی خانہ جنگی کے منظر میں 'شرمین' کوئی استثنا نہیں تھا۔ 'فلپ شیراڈین' نے ایک منظم طریقے سے 'شینن ڈونا' وادی کے کھیت جلا دیئے۔ واپس برطانوی انڈیا میں 'نیل' سے ملتی جلتی بہت سی شکلیں تھیں، بنارس میں بہت ساری ٹکٹکیاں تعمیر کی گئیں جہاں کمشنر 'مسٹر گبن'

اونچی ذات کے لوگوں کو پھانسی پہ لٹکا کر انصاف مہیا کیا کرتا تھا۔

باڑ کے ساتھ بیٹھنے والے اور اس کے علاوہ 'راج' کے انڈین معاون، باغیوں کے حملوں کا نشانہ بنتے تھے۔

رسالدار مولا بخش رام گڑھ کی 'بے قاعدہ' (Irregular) کیولری میں تھا جب بغاوت پھوٹی، اُس وقت اُسے نوکری کرتے ہوئے 35 برس گذر چکے تھے۔ بغاوت کے دوران اُس نے باغیوں کی دھمکیوں اور ترغیبات کی پروا کئے بغیر اُن کے ساتھ شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ مولا بخش کے فن اور قیادت کے باعث 'چھوٹا نگر' پہ تعین رام گڑھ کی 'بے قاعدہ' کیولری (انگریز کی) وفادار رہی۔ اُس کے بدلے میں باغیوں نے اُس کے گھر کو جلا دیا اُس کی جائیداد پہ ہاتھ صاف کر لئے۔ وہ انڈینز جو کمپنی کی ریاست کی غیر فوجی برانچوں (شاخوں) پہ کام کر رہے تھے، بھی حملے کا شکار ہوئے۔ جب باغی دہلی میں کشتیوں کے پل سے گزر کر داخل ہوئے تو اُنہوں نے آلات رکھنے والوں کو کاٹ دیا۔ جھانسی میں بنگالی خصوصی طور پر باغیوں کا نشانہ بنے کیونکہ وہ کمپنی کی ریاست میں کلرکوں کی حیثیت سے انتظامیہ کے کام انجام دے رہے تھے۔

1857 سے قبل ایسٹ انڈیا کمپنی نے شاید ہی کسی نوابی ریاست کے سویلین افسروں کو قتل کیا ہو جن سے اُن کی لڑائی ہوئی تھی۔ 1781 کے دوران پہلی اینگلو مرہٹہ جنگ میں ایک استثنا ہوا۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی علیحدہ فوجیں جنرل گوڈ ذارڈ کی زیرِ قیادت 'کلیان' سے 'کوکان' مارچ کرتے ہوئے پیشوا کے بہت سے چوکیداروں (سول افسروں) کو ہلاک کر دیا تھا۔ لیکن بغاوت کے دوران اُن انڈین سویلین اور سرکاری افسروں کو باغیوں کے ساتھ رفاقت کے شبہہ کے باعث ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپاہیوں کے ہاتھوں اقبال جرم اور سزا کے درمیان بہت کم وقت دیا گیا۔

جیمز گراہم جو باغیوں کے خلاف لڑائی میں شامل تھا (اس) نے نومبر 1857 کے بارے میں لکھا ہے: فتح گڑھ سے ہم بڑی (عظیم) شاہراہ کی جانب گئے اور جہاں تک میرا خیال ہے اتنی دور جتنا کے 'کان پور' ہے اور پھر آدھا راستہ واپس مڑے تا کہ آگرہ سے آنے والے عورتوں اور بچوں کے 'کون وائے'' (گروپ Convoy) کی حفاظت کی جا سکے۔ اور 'نانا' کے بھائیوں اور ساتھیوں کو اودھ عبور کرنے سے روکا جا سکے۔ تاہم وہ اسے عبور کر گیا، (کیونکہ) ہمارے پولیس کے محافظوں نے اُن کے لئے کشتیاں روانہ کی تھیں۔ اور اگر مجھے یاد پڑتا ہے تو نتیجے کے طور پر میں

نے ان سترہ ذکر شدہ محافظوں کی لاشوں کو ایک درخت سے لٹکتے دیکھا تھا۔

اپنی بقا کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی کے فوجیوں اور باغیوں دونوں ہی نے عام شہریوں کو لوٹا۔ یہ ایک ایسی خصوصیت تھی جو 1857 سے قبل وجود نہیں رکھتی تھی۔ 12 جون 1857 کو دہلی میں باغیوں کے لئے صورتحال مایوس کن تھی۔ اُن کے پاس محض تین روز کا سامانِ رسد (خوردونوش) تھا۔ چنانچہ باغی سپاہیوں نے دہلی کے سوداگروں اور تاجروں کو لوٹنے کا راستہ اختیار کیا۔ 18 جون 1857 کو بے آس 'پادشاہ (بہادر شاہ ظفر) نے حکم جاری کیا کہ فوجیوں کی دہلی میں لوٹ مار برداشت نہیں کی جائے گی وہ سپاہی جو لوٹ کھسوٹ اور غارت گری میں شامل تھے انہیں دہلی شہر کے باہر کی طرف خیمہ زن ہونے کا حکم دیا گیا۔

ایک مختلف جنگ

اینگلو۔سکھ اور اینگلو مرہٹہ جنگوں میں ایسٹ انڈیا کے سپاہیوں نے خال خال ہی لوٹ مار کی تھی۔ ستمبر 1781 میں جب پہلی اینگلو مرہٹہ جنگ جاری تھی 'گوڈرڈ' نے سورت کے سوداگروں سے 40 لاکھ روپے بٹورے۔ یہ ایک بے ضابطگی تھی۔ بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے فوجی کمانڈر اس حد تک محتاط تھے کہ انہوں نے وہ سب کچھ واپس لوٹا دیا جو کہ سپاہیوں نے دیہاتیوں سے چھینا تھا۔ دوسری اینگلو مرہٹہ جنگ (05-1803) کے دوران آرتھر 'ویلز لے' نے اُس تمام چاول کے دام ادا کئے جو اُس کے سپاہیوں نے اکٹھے کئے تھے۔ لیکن 1857 اس سلسلے میں ایک وقفہ تھا۔ 'رافع گریگلو وان' نے دکھایا ہے کہ دہلی کو دوبارہ فتح کرنے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپاہی بے مثل لوٹ مار میں اُس بے رحمی کے ساتھ شامل ہو گئے جس کی نظیر نہیں ملتی تھی۔ اور جس کی محرک مکافات/ انتقام کی روح تھی۔ ایک برطانوی سویلین افسر جو سپاہی بن گیا ایسٹ انڈیا کمپنی کے کمک کے طریقوں کے بارے میں مندرجہ ذیل الفاظ میں لکھتا ہے۔

''ہرا'' میں ہم نے ہمسایہ گاؤں میں میرٹھ سے تازہ کمک کی آمد کے بارے میں سنا، دو گھوڑوں والی آرٹلری کی بندوقیں، اور قرابین کی ایک پارٹی (گروپ) جنہیں ہمارے لئے 'گھاٹ' کو تھامے (قبضے میں) رکھنے کے احکامات دیئے گئے تھے، وہ ہماری طرح تمام رات چلتے (مارچ کرتے) رہے۔ لیکن اُن کے ہمراہ میرٹھ کا کوئی ڈسٹرکٹ (ضلعی) افسر نہ تھا۔ اور کیوائی کا

رانگھڑ گاؤں جہاں پہ وہ رکے بری طرح سے متاثر تھا۔ اُن کے پاس کھانے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ جب میں رات کو گھڑ سواری کرتے ہوئے وہاں سے گذرا تو سپاہی پچھلے چوبیس گھنٹوں سے فاقہ کشی کی حالت میں تھے۔ میں یک لخت گاؤں میں داخل ہوا تا کہ سربراہ کو گرفتار کرسکوں۔ اسے بتادوں کہ اگر وہ (گاؤں کے لوگ۔۔۔ دیہاتی) خوراک لے آئے تو اُنہیں معاوضہ دیا جائے گا اور اگر ایسا نہ ہوا تو اُن کے گھروں کو نذرِ آتش کر دیا جائے گا۔ چند ایک بچھڑوں کو مٹر گشت کرتے ہوئے دیکھ کر میں نے ایک کو قابو کیا، اور میرے اردلیوں میں سے ایک نے دوسرے پر۔ انہیں ہم نے قرابین کو پیش کر دیا۔ گاؤں کے سردار کو بھی حکومت کے ریونیو (خراج) کے طور پر تحفظ کے لئے یرغمال بنالیا۔''

جنوبی ایشیا میں دوسرے تنازعوں کے برعکس خواتین ان جنگوں کا ایک ناگزیر حصہ بن گئیں، بغاوت کے دوران جنگ کی ہیبت نے سفید فام عورتوں (کے دلوں) کو بھی چھولیا۔ ایک برطانوی عورت نے 30 جون 1857 کو اپنے رسالے میں لکھنو کی ریذیڈنسی کے حالات کے بارے میں ان الفاظ میں تحریر کیا۔

''نو بجے ہم محاصرے کی حالت میں تھے۔ مکمل طور پر دشمنوں کے گھیرے میں، اور (یکا یک) زبردست گولیاں چلنے لگیں۔ 'بیلی گارڈ گیٹ' پر اس گھر کے پچھواڑے سے ایک زبردست حملہ ہوا۔ جیسے ہی پہلی بندوق کی گولی چلی تمام خواتین اور بچوں کو جلدی سے سیڑھیوں کے نیچے زیرِ زمین کمرے میں لے گئے جسے تہہ خانہ کہتے تھے۔ نمدادار، سیاہ اور اداس جیسے کوئی مقبرہ اور انتہائی غلیظ۔ وہاں ہم تمام دن بیٹھے رہے (خودکو) انتہائی بیکس، بیتاب اور بات کرتے ہوئے بھی خوفزدہ محسوس کرتے رہے۔ شرفاء (شریف آدمی) کبھی کبھار ہماری یقین دہانی کے لئے نیچے آتے اور ہمیں بتاتے کہ واقعات کیسے رونما ہورہے ہیں۔ جیمز تقریباً تمام دن ہسپتال میں رہا جہاں منظر انتہائی دردناک تھا۔ جگہ زخمیوں اور مرتے ہوئے لوگوں سے اس قدر بھری ہوئی تھی کہ اُن کے درمیان سے گذرنے کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی، اور ہر چیز ناقابلِ بیان تکلیف، بے آرامی اور الجھاؤ کی کیفیت میں تھی۔''

''شرفاء'' کی یقین دہانیوں کے باوجود دوشیزاؤں کے لئے تکلیف میں اُس وقت اضافہ ہوا جب جنگ کے ہیبت ناک چہرے نے زیرِ محاصرہ خواتین پہ خود کو عیاں کیا۔ یکم جولائی 1857

مندرجہ بالا خاتون (اپنی ڈائری/ جرنل میں) کچھ اس طرح اضافہ کرتی ہے۔ ''مظلوم مس پالمر کو اس شام ریذیڈنسی میں گولی لگی، سر ہنری لارنس بھی بال بال بچے، گولیوں کا ایک راؤنڈ اُن کے کمرے سے جہاں وہ بیٹھے ہوئے تھے ہوتا ہوا اُن کے سر کے بالکل اوپر سے گذر گیا۔ تمام دن گولیاں مسلسل برستی رہیں۔ ہم تہہ خانے کے بند قیدی تھے۔''

عوامی جنگ کے ظہور نے انڈیا میں خواتین کو پردے سے باہر آنے کی اجازت دے دی تا کہ وہ عوامی معاملات پہ ہدایات دے سکیں۔ 1857 سے قبل جنگ میں عورتوں کی شمولیت بہت محدود تھی۔ نظام حیدر آباد کے یہاں خواتین سپاہیوں کی دو بٹالین تھیں جو ہر ایک ایک ہزار (خواتین) پہ مشتمل تھی۔ 1795 میں اُنہوں نے مرہٹوں کے خلاف خاردا کی جنگ میں حصہ لیا تھا۔ 1857 میں مشہور ترین جنگجو خاتون جو انڈیا کی جانب سے سامنے آئی وہ واجد علی کی حسین و جمیل بیگم، حضرت محل تھی۔ حضرت محل جو بنیادی طور پر ایک رقص کرنے والی لڑکی تھی جس کا نام افتخار النساء تھا، اور ایک بہت غریب خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ 1856 میں جب واجد علی شاہ کو برطانویوں نے تخت سے محروم کر دیا اور وہ لکھنو چھوڑ کر کلکتہ چلا گیا تو حضرت محل اودھ ہی میں رہی۔ بیگم محل کی خواہش تھی کہ اودھ کو انگریزوں کے قبضے سے آزاد کروائے اور اپنے بیٹے 'برجیس قادر' کو تخت نشین کروائے۔ اگست 1857 کو بارہ سالہ برجیس قادر' تخت نشین ہوا اور تخت کے پیچھے اصل قوت کی حیثیت سے اُس کی والدہ سامنے آئی۔ 'حضرت محل' نے اپنے بیٹے کی تخت نشینی کو دہلی کی باغی حکومت سے جائز قرار دلوا لیا۔ اور وہ اودھ میں مزاحمت کی روح کی علامت بن کر ابھری۔ اودھ میں باغیوں کا سب سے بڑا مرکز لکھنو تھا۔ جہاں باغیوں نے بیگم کی زیرِ قیادت دفاعی حکمتِ عملی اپنائی۔ 'حضرت محل' اپنا دربار منعقد کرتی جہاں وہ سرداروں اور سپاہیوں کو برطانویوں کے ساتھ بہادری کے ساتھ جنگ کرنے پہ اکساتی (تیار کرتی) تھی۔ جب راجہ مان سنگھ برطانیوں کی جانب چلا گیا تو بیگم نے اُس کی تمام تر ریاست ضبط کر لی۔ حضرت محل اگرچہ میدانِ جنگ کی کمانڈر نہیں تھی لیکن ایک اعلیٰ درجے کی ماہرِ حربیات (حکمتِ عملی کی ماہر) اور اچھی منتظم تھی۔

1858 میں 'کولن کیمبل' کے ہاتھوں لکھنو پہ دوبارہ قبضے کے بعد 'بیگم' اپنے حواریوں کے ساتھ شہر چھوڑ کر شمالی اودھ میں قیام پذیر ہوگئی۔ لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجوں اور نیپالی فوج کے ہم مرکز دباؤ کے باعث مارچ 1859ء میں 'بیگم' کی افواج کو جو چالیس ہزار انفنٹری اور دس ہزار

کیولری (گھڑسوار) پر مشتمل تھی جن کے پاس اٹھارہ بندوقیں (توپیں) تھیں کو مجبوراً دریائے 'گندگ' کو عبور کر کے نیپال کے 'تیرائے' کے علاقے کی طرف جانا پڑا۔ باغی فوجوں کے تعاقب میں بنگال اجتماعی گھڑسوار فوج (بنگال Yeomanry کیولری۔۔۔ برطانیہ میں رضاکارانہ طور پر بھرتی ہونے والی گھڑسوار فوج کو Yeomanry کہتے ہیں۔ ویسے اس کے معنی اجتماعی کے بھی ہیں۔ مترجم) اور 'کرنل ہم دال تھاپا' کی زیرِ قیادت نیپالی فوج کا ایک علیحدہ حصہ بھی سایے کی مانند آرہا تھا۔ 'بیگم' کی فوج بہت بری طرح سے بیماری اور خوراک کی کمی کا شکار ہوگئی۔ برطانیوں کے دباؤ تلے مہاراجہ جنگ بہادر نے بیگم کو سیاسی پناہ دینے سے انکار کر دیا۔ اور اُس کی بجائے اُسے دھمکی دی کہ وہ اپنے ہتھیار رکھ دے۔ وگرنہ انتباہ کیا کہ جنگ بہادر، برطانوی اور نیپالی فوج اکٹھے بیگم پہ حملہ آور ہوں گے۔ اُس نے کبھی ہتھیار نہ ڈالے اور بالآخر 1879 میں نیپال میں رحلت کر گئی۔

1857 کی ایک اور ہیروئن جھانسی کی رانی تھی۔ جون 1857 کے آغاز میں جھانسی میں باغیوں کو پینتیس ہزار روپے کی نقد رقم، دو ہاتھی اور پانچ گھوڑے 'رانی' کی طرف سے ملے۔ 'رانی' نے چودہ ہزار لوگوں (کی فوج) کو تیار کیا اور دو بندوقیں (توپیں؟) حاصل کیں جو کہ برطانیوں کی نظر سے پوشیدہ رکھنے کی خاطر قلعے کے اندر دفن کر دیں۔ ایک سچے جنگجو کی طرح 'رانی' نے میدانِ کارزار میں اپنی جان نذر کی۔ بالائی طبقے کی خواتین کے ساتھ ساتھ محکومیت کی سطح کی خواتین بھی اچانک جنگ میں شامل ہوگئیں۔ 30 اپریل 1858 کو 'ہیوروز' جھانسی کے محاصرے کے متعلق لکھتا ہے کہ ''عورتوں کو توپ خانے میں کام کرتے ہوئے اور اسلحہ اٹھاتے ہوئے دیکھا گیا''۔ اکثر اوقات نازنینوں کو ہتھیار رکھنے والے مردوں سے احسن برتاؤ نہیں ملتا تھا، 12 مارچ 1858 کو 'ارتھر لینگ' ایک نوجوان انجینئر افسر جس نے لکھنو کی مہم میں حصہ لیا نے اپنے 'جرنل' میں مندرجہ ذیل (باتیں) تحریر کیں۔ ''ہمارے مردوں نے مقامی عورتوں کو بھی ہلاک کیا'' تاہم امریکہ کی خانہ جنگی اور 1857 کی بغاوت کے دوران دراصل بہت کم خواتین اگلی (فائرنگ) لائن میں کھڑی ہوئیں۔ خواتین نے مورال بلند کرنے، گھر کے محاذ کو برقرار رکھنے، اور اہم غیرِ جنگی کاموں میں جو کہ فوج سے وابستہ تھے جیسے خوراک فراہم کرنے، اسلحہ اور دوسری کمک پہنچانے میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔

عوامی جنگ میں زیادہ تر شرکت کرنے والوں نے اپنی زندگیوں کو معقول ترغیبات کی

بجائے نظریاتی بنیادوں پر داؤ پر لگایا تھا۔ 'کینفیڈ ریٹ' (ساتھی/حلیف) اور 'یونین' کے فوجی آزادی اور 'جمہوریہ' (جمہوریت پسندی) کے خیالات سے متاثر تھے۔ بہت سے کنفیڈریٹ 'سپاہی خودفرمانروائی' کے مطمع نظر کے لئے مرنے کو بھی تیار تھے۔ جیمز۔ جے۔ میکفرسن اپنی (تصنیف) ''امریکن خانہ جنگی کی لڑائی کی تحریک کا مطالعہ'' میں پرزور طریقے سے کہتا ہے کہ ''حب الوطنی اپنے مقصد کے ساتھ کھرے سپاہیوں کے لئے آخری پناہ گاہ تھی۔ خاص طور پر جب حالات انتہائی کٹھن ہو گئے تھے۔''

قومیت پرستی کے سیکولر نظریات کے ساتھ ساتھ مذہب نے بھی شرکت کرنے والوں کو 'برستی گولیوں کی قطار' (اگلی قطار) میں شامل ہونے کی ترغیب میں اہم کردار ادا کیا۔ شاہی جرمنی میں پروٹسٹنٹ نظام نے بالخصوص درمیانے طبقے اور دانشوروں میں قومیت پرستی کو انقلابی قوت بخشی۔ اس نے اپنی باری پر عسکریت کی روح کی تخلیق کی جو پہلی عالمی جنگ کے دوران عیاں ہوئی۔

سی۔ اے۔ بیلے لکھتا ہے کہ انڈیا کے کچھ حصوں میں باغیوں نے حب الوطنی کی بغاوت کے تناسب حاصل کر لئے تھے۔ انیسویں صدی کے درمیانے عشرے میں انڈیا میں، مذہب ذات (پات) اور نسلی احساسات کے درمیان موجود پیچیدہ مرکب نے ''گورا۔ لوگ'' مخالف (سفید فام مخالف) قوم پرستی کو شمالی انڈیا کے ہندو اور مسلمانوں کے ایک بہت بڑے حصے میں اجاگر کر دیا تھا۔ باغیوں نے انڈینز کو زیادہ تر مذہب کے معاملے پہ متحرک کرنے پہ تکیہ کیا۔ سویلین بیوروکریٹ جارج کلرک یہ دعویٰ کرنے میں بالکل درست تھا کہ جو اُس نے پیل کمیشن (جسے 1859 میں قائم کیا گیا تاکہ وہ 1857 کی بغاوت کے پیچھے کارفرما وجوہات کو متعین کر سکے) کے سامنے کیا تھا کہ مذہبی جنونیت نے 1857 کی بغاوت میں اہم کردار انجام دیا تھا۔ باغی محض پیشہ وارانہ وقار یا مادی حصول کی کشش کے باعث نہیں لڑے تھے۔ وہ جنہوں نے باغیوں کی طرف شمولیت اختیار کی اُن کے لئے لڑنے اور مرنے کے لئے ایک نظریہ تھا۔ متحرک کر دینے والے نظریے کی حیثیت سے مذہب کا استعمال کسی حد تک اختیاری تھا۔ 6 جون 1857 کو پچاس سواروں اور تین سو سپاہیوں کا ایک گروہ جس کی قیادت جھانسی میں جیل کا داروغہ 'بخشی علی' کر رہا تھا نے صدا بلند کی ''دین کی جے'' (مذہب کی فتح)۔ جب تیسری کیولری (گھڑ سواروں کا دستہ) دہلی میں داخل ہوئی تو وہ پکارے 'دین۔ دین' اور ان کے پیچھے مسلمانوں کا ایک

برانگیختہ ہجوم تھا۔

لیفٹیننٹ کرنل 'تھامسن لاؤتھ ہیرنگٹن' سنگِ میل کے بالکل نزدیک تھا جب1859 میں اُس نے یہ کہا کہ باغی فوجی کبھی کبھار اپنی رنجشوں کے جواز کے لئے مذہب کو واسطے کی حیثیت سے استعمال کر لیتے تھے۔ باغیوں نے وسیع انڈین سماج میں (کے اندر) اپنے عمل کو جائز قرار دینے کے لئے مذہب کا استعمال کیا۔ اور انڈین لیڈروں نے اس پتے کو بہت بے رحمی سے استعمال کیا۔ جھانسی کی رانی نے مذہب کے ماحصل کو اپنے معیار کے رنگروٹ حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا۔ رانی نے لوگوں کے درمیان مذہبی نفرت کی چنگاریوں کو ہوا دینے کے لئے مذہبی درویشوں کا استعمال کیا۔ نانا صاحب نے بھی مذہبی پتے کا کھیل کھیلا۔ 2 جنوری 1858 کو 'نانا' کے چیف (سب سے بڑے) لیفٹیننٹ نے 'کالپی' نے مندرجہ ذیل فرمان جاری کیا۔

''میرے آقا سری منت مہاراجہ پیشوا بہادر نے ہر آسائش اور آرام، دولت اور جائیداد کے عوض ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے مذاہب کے دفاع کی غرض سے عیسیٰ کے پیروکاروں کو ذبح کرنے کے لئے خود کو تیار کر لیا ہے کیونکہ وہ (حضرت عیسیٰ کے پیروکار) مسلمانوں اور ہندوؤں کے عقیدوں کے دشمن ہیں۔ اس مذکور (بیان کئے گئے) راجہ نے عیسائیوں کے خلاف جنگ ٹھان کر اُن میں سے بہت ساروں کو تلوار کی نذر کیا، اور یہ قصد کیا کہ وہ اُس وقت تک انہیں ہلاک کرنے سے خود کو نہیں روکے گا جب تک وہ اپنی زندگی کی ہوا میں سانس لے رہا ہے۔ اور اب انڈیا میں اس نسل کے لوگوں کو یک قلم فنا کر دے گا۔''

باغی لیڈروں (قائدین) نے اپنے پیروکاروں کو متحرک کرنے کی غرض سے اس تنازعے کو مذہبی بشمول نسلی رنگ دیا۔

مذہب کا استعمال عوام کو 'فرنگیوں' کے خلاف 'سبھی کچھ یا کچھ بھی نہیں' کی جدوجہد میں متحرک کرنے کی حکمت عملی کے مقصد کے علاوہ ایک فوری فنی فائدہ حاصل کرنے کے لئے بھی استعمال کیا گیا۔ باغیوں نے مذہبی علامتوں کو ایسٹ انڈیا کمپنی سے وفادار فوجی حصوں کے، فوج سے فرار کو یقینی بنانے کے لئے بھی استعمال کیا۔ 19 ستمبر 1857 کو شامبھی سے تقریباً دس میل دور تھانہ 'بامیون' میں تین ہزار باغیوں نے مسلمانوں کا روایتی جھنڈا بلند کر دیا۔ باغیوں نے اس نصب العین کو نمایاں کیا کہ وہ کافروں کے خلاف اسلام کے لئے جنگ کر رہے ہیں۔ اس کے نتیجے میں

پہلی پنجاب کیولری کے تین 'وفادار' اور تیرہ سوار (جو ہریانہ سے تعلق رکھنے والے مسلمان تھے)، فوج کو تیاگ گئے۔

ذات (پات) اور مذہب

انیسویں صدی کے انڈیا میں نوآبادیاتیوں اور نوآبادکاروں دونوں نے ذات کے ماحصل کو سنجیدگی سے لیا۔ اور ہندوؤں کے لئے تو یہ اُن کے مذہب سے منسلک تھا۔ اور دونوں اطراف نے خاص طور پر جب افواہوں کا بازار گرم تھا، 1857 کی جدوجہد کو 'ذات کی جنگ' کی حیثیت سے سمجھا (تصور کیا)۔ 13 جون 1857 کو ایک برطانوی سویلین نے پنجاب سے لکھا ''یہ سوچنا پچھتاوے کی بات ہے کہ یہ سب کچھ جنرل 'این سَن' کی آدمیوں کی ذات میں دخل اندازی کی احمقانہ حرکت کے باعث ہوا کہ کارتوسوں کی گولیوں کو گائے کے گوشت کی پٹھے کی چربی اور سور کی چکنائی کو (باہم) ملا کر چکنائی زدہ کر دیا اور یہ (اگرچہ یہ لاعلمی کی بنیاد پر کیا گیا ہے) ایک یا دو افسروں سمیت جنہوں نے بردباری سے زیادہ بھرتی سے اپنے لوگوں (آدمیوں) کو تبلیغ کی اور سوچنے پہ مجبور کیا کہ حکومت اُنہیں زبردستی عیسائی بنانے کا ارادہ رکھتی ہے۔'' بارہویں انفنٹری رجمنٹ جو کہ جھانسی میں مقیم تھی کو دہلی کی باغی حکومت کی جانب سے ایک سندیسہ ملا کہ بنگال کی فوج نے بغاوت کر دی ہے۔ چونکہ یہ رجمنٹ ابھی تک برطانیوں کی وفادار ہے (چنانچہ اس کے) آدمی 'ذات' سے خارج ہو گئے ہیں (اچھوت بن گئے ہیں) اور اپنا دھرم کھو بیٹھے ہیں فوراً چار سپاہیوں نے جو سرکردہ قائدین تھے اُنہوں نے رجمنٹ کو بغاوت پہ اکسانا شروع کر دیا۔ اور بالآخر وہ کامیاب ہو گئے۔

افواہیں جو کہ محکومیت میں رابطے کا بنیادی ذریعہ ہوتی ہیں، (انہوں نے) بغاوت کو متحرک کرنے میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ افواہوں نے ایک دوستی کے احساس کو جگایا۔ ''گیاتری چکراورتی سپی واک'' لکھتا ہے کہ ان پڑھ کسانوں کی ذہنیت کو مرکزی اوزاروں کے نظام (Phonocentrism) کی ایک روایت۔۔۔''سروتی'' کہ جو کچھ کہ سنا گیا ہے۔۔۔سب سے عظیم اتھارٹی (قوت) ہے۔ اُس کے مشاہدات کا اِس سے بھی زیادہ انڈیا کے انیسویں صدی کے درمیانی عشرے کے کسانوں پر اطلاق ہوتا ہے۔ پہلی پنجاب کیولری کے مسلمان سوار بھی جنرل

'کورٹ لینڈز' کی فوجوں کی سرگرمیوں کے بارے میں افواہوں کے متعلق پریشان تھے۔ (کیونکہ) وہ (کورٹ لینڈز کی فوجیں) ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ 'ہنسی' اور روہتک کے اضلاع میں مصروف عمل تھیں۔ یہ وہ علاقے ہیں جہاں سے ان کیولری کے لوگوں کو بھرتی کیا گیا تھا۔ مشکل کے لمحات میں لوگ افواہوں پہ کان دھرنے لگتے ہیں (بلکہ یقین کرنے لگتے ہیں) آدمیوں میں افواہیں گردش کر رہی تھیں کہ سفید فام سپاہی انتقاماً انڈین عورتوں کو ہلاک کر دیتے ہیں۔ اودھ کی ''بیگم'' نے جان بوجھ کر ان افواہوں کو پھیلایا تاکہ باغیوں میں مزاحمت کی آخری کوشش کی حوصلہ افزائی کی جا سکے۔ جیسے جیسے فوجی صورتحال بدترین ہوتی چلی گئی 'بیگم' کے پیروکاروں نے اودھ کے بسنے والوں میں یہ افواہ پھیلا دی کہ برطانوی نہ صرف یہ کہ عوام الناس سے ہتھیار چھین لیں گے بلکہ اُنہیں اُن کی ذات اور مذہب سے بھی محروم کر دیا جائے گا۔

برطانوی بھی افواہوں کے اثرات سے محفوظ نہیں تھے۔ برطانوی افسروں اور سویلین لوگوں کی خوفناک بے تابیوں نے اُنہیں افواہوں (پہ یقین کرنے کا) متحمل بنا دیا، اور اُن کے جذبات کو بھی ہوا دی۔ 1857 میں مئی کے درمیانی عرصے میں ایک افواہ لکھنو کے برطانوی شہریوں میں پھیل گئی کہ باغی دہلی کی گلیوں میں برطانوی فوجیوں کی لاشوں کو عریاں کر رہے ہیں۔ بجائے اس کے کہ مردوں کو عیسائیت کے طریقے سے دفن کیا جاتا، برطانیوں کا خیال تھا کہ باغی لاشوں کی بے حرمتی کر رہے ہیں۔ افواہ میدانِ جنگ سے کہیں دور پار بھی گردش کر رہی تھی۔ اور یہی اُن سفید فام سویلین کے خام جذبات کی اٹھان کی ممکنہ وضاحت کرتا ہے جو خون ریزی کے منظر سے کہیں دور تھے، جان شالمر جو کہ پنجاب میں تعین سکاٹ لینڈ سے تعلق رکھنے والا سول انجینئر تھا۔ بائیس جون 1857 کو اُس نے اپنے ایک دوست کو گوجرانوالہ سے بھیجے گئے خط میں لکھا ''میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میرا انتقام ان بدبختوں کے خلاف اتنا برانگیختہ ہے کہ میں خوشی سے اُس ٹھوس (شے) کا حصہ بننا چاہتا ہوں جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ (اسے) ان کے اندر اس طرح داخل کیا جائے کہ کوئی جگہ باقی نہ بچے۔'' اُسی دن شالمر نے اپنے ایک دوست کو لکھا ''ہزاروں یورپین لوگوں کو بے رحمی سے قتل کیا گیا ہے۔ یورپین خواتین کی بے حرمتی کی گئی ہے۔ اُنہیں عوام میں عریاں کیا گیا ہے۔ اور پھر تشدد کے ذریعے اُنہیں موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔ سپاہیوں نے یورپین بچوں کو ایک سنگین سے دوسری سنگین کی طرف اچھالتے ہوئے حظ (لطف) اٹھایا ہے۔ درحقیقت

اُنہوں نے ہر کسی کو تشدد کا نشانہ بنایا ہے اور قتل کیا ہے جس پہ وہ قابو پا سکتے تھے، جو سفید فام تھا اور جو اگر چہ سیاہ فام تھا لیکن عیسائیت کا اقرار کرتا تھا، اور یہ سب کچھ عمر اور جنس کے حوالے کے بغیر عمل پذیر ہوا۔ یہاں تک کہ سفید فام عورتوں میں بھی خام جذبات کی عکاسی (اٹھان) تھی۔ 16 مئی 1857 کو ایک برطانوی خاتون جو کہ لکھنو میں قیام پذیر تھی، نے اپنے 'جرنل' میں یہ لکھا ''تم ان ایشیاؤں (ایشین) پہ صرف خوف کے ذریعے حکومت کر سکتے ہو۔ اگر یہ خوفزدہ نہیں ہیں تو یہ اپنی انگلیاں تمہاری طرف بڑھائیں گے۔''

انڈیا کے باشندوں میں افواہوں کا ایک سرچشمہ آزاد پریس بھی تھا۔ 1857 میں پریس نے جدید معیار کے تقاضوں کے مطابق کچھ 'غیر ذمہ دارانہ' رویوں پہ دلالت کی۔ مئی 1857 میں فارسی زبان میں اشاعت شدہ اخبارات نے شہر کے مسلمان باشندوں کی فرنگیوں سے لڑائی کے متعلق حوصلہ افزائی کی۔ پنجاب سے ایک سکاٹ کے لکھے گئے خط سے انگریزی زبان کے اخباروں کے طرزِ عمل کی جھلک کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ایک خط جس پر 30 مئی 1857 کی تاریخ کنندہ تھی، وہ لکھتا ہے۔

''اخبارات سے آپ کو دہلی کے معاملات کا خوفناک شمار ملے گا۔ لیکن اس کا ایک حصہ کبھی بھی شائع نہیں ہوگا۔ ظالموں نے تیل چھڑکا اور پھر ایک خاتون کو نذرِ آتش کر دیا۔ چھاتی سے لگے بچوں کو قتل کر دیا، اور پچاس خواتین اور بچے جو بادشاہ کے دربار میں چلے گئے، وہ بدمعاش جسے ہم نے تخت پہ بٹھایا ہے۔ اور جو کئی برسوں سے بارہ ہزار سٹرلنگ پاؤنڈ ماہانہ کی پنشن وصول کر رہا ہے، اُنہیں (عورتوں اور بچوں کو) وہاں پانچ دن رکھنے کے بعد، ننگا کر دیا گیا، آگ برساتے ہوئے سورج تلے، اُس ریاست میں جو انڈیا کا سب سے بڑا شہر ہے، کی پرہجوم گلیوں (بازاروں) میں گھمایا گیا اور پھر نیزوں کی مدد سے آہستگی اور بے رحمی سے قتل کر دیا گیا۔۔۔ خواتین اور بچے جنہیں اس سے قبل ایک میل چلنے کی بابت بھی کوئی خبر نہیں تھی (یعنی وہ کبھی ایک میل بھی پیدل نہیں چلے تھے۔ مترجم)

دلچسپی کی بات یہ ہے کہ امریکہ میں بھی (خانہ جنگی کے دوران) اُس وقت کے اخبارات جو فوجی کیمپوں میں سب سے زیادہ مروج (گردش) تھے، انہوں نے کنفیڈرنسی اور یونین دونوں کے شہریوں کے جذبات کو ہوا دی۔

چکنائی زدہ کارتوسوں کے متعلق افواہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے لئے سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہوئی۔ بہادر شاہ نے بھرپور انداز میں کہا ''نہ تو سلطنتِ روم (عثمانیہ) اور نہ ہی روس کے زار نے فتح کو اتنا سہل بنایا ہے۔ ایک واحد ہتھیار ایک کارتوس تھا۔ 19 مئی 1857 کو کیپٹن رے نالڈ ٹیلر جو پنجاب میں کنگرہ کے مقام پر دوسرے درجے کا کمشنر تھا نے میجر 'ڈیوڈ ویلکی' جو کہ ناگپور میں چوتھی انفنٹری رجمنٹ کی قیادت کر رہا تھا، کو لکھا۔

''ہاں مجھے یقین ہے یہ سب کچھ کارتوس کی بدولت ہوا ہے۔۔۔ ہم نے تمہارے مقامی افسروں سے بات کی تھی۔۔۔ پچھلی رات۔ اُن کا لہجہ کافی حد تک فطری تھا۔ اُن کا کہنا تھا کہ حکومت بلاشبہ قلعوں کی حفاظت کی خاطر اپنے انتظامات کرنے میں بالکل حق بجانب تھی۔۔۔ وہ بہت عرصے سے حکومت کے نمک خوار ہیں اور بالکل بھی نافرمانبرداری کرنے پہ مائل نہیں ہیں۔ لیکن جہاں تک کارتوسوں کا تعلق تھا تو حکومت کا انہیں واپس لینا ایک مہربانی تھی۔ اور اُن کی بات چیت سے یہ واضح طور پر ظاہر ہوتا تھا کہ اُنہوں نے اس تاثر کے زیرِ سایہ محنت کی ہے کہ ان میں (کارتوسوں) میں کچھ تھا اور کوئی بامقصد چال تھا جو ان کے مذہب کے لئے ضرر رساں تھی، اُن کا تاثر یہ تھا کہ اس سے قبل حکومت نے کبھی کچھ ایسا نہیں کیا جو اس نوعیت کا ہو۔ میں نے پوچھا کہ کیا حکومت یا دوسرے افسران نے کبھی کسی موضوع پہ اُن کے ساتھ جھوٹ بولا تھا، اور اُنہوں نے کہا۔۔۔ کبھی نہیں۔ لیکن تاہم یہ (اس موقعے پر) ایسا ہو سکتا ہے۔ یہ ایک غیر معمولی چیز ہے اور ہمارے لئے (اس میں) ایک سبق ہونا چاہئے۔''

عوامی جنگ کی حد بندی (مجبوری یا معذوری)

تمام مقامی باقاعدہ فوج اپنا ناطہ توڑنے کے لئے تیار ہے اور اگر ایک دھچکہ نہ لگایا جا سکا تو بے قاعدہ جسم کی حیثیت سے اُن کے پیچھے چل پڑیں گے۔ ہماری فوجوں کو ایران سے واپس بلا لیا جائے، چائنہ (چین) کی جانب جانے والی فوج کو روک دیا جائے اور اُسے کلکتہ کی جانب روانہ کیا جائے۔ (چیف کمشنر پنجاب جان لارنس کا برقی تار (ٹیلی گرام) جی۔ف۔ ایڈمین سٹون حکومتِ انڈیا کے سکریٹری کے نام) 18 مئی 1857۔

انڈیا میں 58-1857 کے دوران انتہائی شدید جنگ کے باوجود برصغیر میں عوامی شمولیت

کی سطح امریکہ کی خانہ جنگی کی نسبت بہت کم تھی۔ بغاوت سے بالکل کچھ عرصہ قبل یہاں تین لاکھ گیارہ ہزار سپاہی، سوار اور بندوق چلانے والے توپچی تھے جن کی قیادت 5362 (پانچ ہزار تین سو باسٹھ) برطانوی افسر اور چالیس ہزار یورپین فوجی (ایسٹ انڈیا کمپنی اور ملکہ کی شاہی فوج سمیت) کر رہے تھے۔ پہلے ہم برطانیہ کی متحرک فوجی مردمی قوت کا جائزہ لیں گے اور پھر باغی حکومت کے ذریعے کا۔ (جائزہ لیں گے)

جہاں تک ایسٹ انڈیا کمپنی کی متحرک شدہ فوجی انسانی قوت کا تعلق ہے، تخمینہ گھڑسوار (بلند کردہ) پولیس کو بھی شامل کرتا ہے جسے گورنمنٹ نے تشکیل دیا۔ (کیونکہ) جیسے کہ انہوں نے باغیوں کے ساتھ جنگ میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ مئی 1857 میں سب سے زیادہ خاص بنگالی فوج کے یونٹوں کو دریائے ستلج کے مغرب میں تعینات کیا گیا۔ پنجاب میں برطانیوں کے پاس اڑتیس ہزار پانچ سو سپاہی تھے (بارہ ہزار یورپین فوجی، سولہ ہزار پنجابی انفنٹری، نو ہزار پنجابی گھڑسوار (کیولری) اور 1500 گورکھے) پنجاب میں (موجود) بنگال کی فوج نے یا تو بغاوت کر دی یا اُن سے ہتھیار رکھوا لئے گئے۔ اور برطانویوں نے ملتان، فیروزپور وغیرہ سے فوج تیار کی۔ 1857 میں پہلی اور دوسری بے قاعدہ سکھوں کی کیولری رجمنٹ کو سابقہ خالصہ سپاہیوں (کی فوج) سے قائم کیا گیا۔ جن پر دوسری اینگلو۔سکھ جنگ کے بعد پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ 1857 اور 1859 کے درمیان پنجاب فرنٹیر فورس (جسے P.F.F کہا جاتا تھا) کی تعداد میں اضافہ پچیس ہزار سے تینتالیس ہزار تک اور پھر باون ہزار چار سو چوالیس تک ہو گیا۔ PFF نے مغربی پنجاب سے پنجابی مسلمانوں کو (موجودہ دور میں پاکستانی پنجاب، یعنی ''سالٹ رینج'' کے ارد گرد کا علاقہ وغیرہ) سندھ کے اس پار کے مسلمان (پشاور اور کوہاٹ سے) اور مرکزی پنجاب سے سکھوں (مانجھا اور مالوا) اور اُن کے ساتھ ہریانہ سے جاٹ (قوم) کو بھرتی کیا۔

یکم اپریل 1858 کو بنگال فوج کے وفادار عناصر اور پی۔ایف۔ایف اَسّی ہزار ترپن انڈینز پر مشتمل تھی۔ (آرٹلری میں 1715، سرنگ لگانے والے اور کان کن 209 اور 114453 کیولری اور باقی کی انفنٹری میں تھے) ان میں سے صرف 8818 نچلی ذات کے ہندو اور 572 عیسائی تھے، راجپوت اور برہمن لوگ انتہائی کم ہو کر بالترتیب 8,526 اور 10,363 کی تعداد تک محدود ہو گئے۔ انسانی قوت کا سب سے بڑا حصہ پنجاب سے آیا۔ بمبئی کی فوج ہندوستانیوں یعنی

شمالی ہندوستان کے آدمیوں پر یعنی (برہمنوں، راجپوتوں اور خصوصاً اودھ سے) 'کون کوینز' اور 'دکینیز' (دکن والے) (دکن سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں) پہ مشتمل تھی۔ دوٹیبل (فہرستیں) یہ ظاہر کرتی ہیں کہ بغاوت کے درمیان میں مدراس اور بمبئی کی افواج کی تعداد میں کوئی مقداری جست نظر نہیں آتی۔ 1857-59 کے درمیان بمبئی کے یورپین سپاہیوں کی تعداد میں اضافہ گوکافی تھا لیکن بہت زیادہ نہیں تھا۔ اپریل 1858 تک برصغیر میں 96000 برطانوی فوجی تھے اور جن کی مدد کے لئے وفادار انڈین سپاہیوں کی ایک بہت بڑی تعداد موجود تھی۔

مارچ 1858 میں لکھنو پہ (انگریزوں کے) دوبارہ قابض ہونے کے بعد، باغی تمام شمالی ہندوستان میں پھیل گئے اور کہیں کہیں کم سطح کی جنگ انگریزوں کے خلاف جاری رکھی۔ گوریلا جنگ 8 اپریل 1860 تک جاری رہی۔ جب راجہ مان سنگھ نے 'تانتیا ٹوپے' کو انگریزوں کے حوالے کردیا۔ اس طویل گھسٹتی ہوئی جدوجہد نے برطانیوں کو مجبور کردیا کہ وہ اضافی انسانی قوت کو متحرک کریں۔ (کناروں) حاشیے پہ دھکیلے گئے گروپوں کو دونوں مرتبہ فوجوں میں خدمات دینے کی اجازت دے دی۔ انڈیا میں 1857 کی بغاوت کے دوران، اور بالترتیب امریکن خانہ جنگی کے دوران شمالی امریکہ میں 'کالوں' (سیاہ فام لوگ) نے امتیاز کے باوجود امریکن خانہ جنگی کی افواج میں خاص مقام حاصل کیا۔ تقریباً ایک لاکھ اناسی ہزار کالوں نے جن میں سے بیشتر سابقہ غلام تھے نے یونین فوج میں خدمات انجام دیں۔ جب کہ بنگال فوج کی بالائی ذات کے لوگ ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف ہو گئے تو برطانیوں نے نچلی ذاتوں کو متحرک کرنا شروع کردیا۔ اودھ سے جہاں بالائی ذاتوں میں انگریز کے خلاف بغض سب سے شدید تھا بہت ساری سپاہ کو جمع کیا جن کا تعلق زیادہ تر نچلی اور درمیانی ذاتوں سے تھا۔ ایک ایسی جمع شدہ سپاہ 'علی گڑھ لیوی' تھی جو اینگلو۔ انڈینز اور نچلی ذاتوں پہ مشتمل تھی۔ ایک اور نچلی ذات کی قوت 'فتح گڑھ لیوی' تھی۔ اودھ پولیس فورس آہرز، پاسیز، کرمز، بھنگیوں، چماروں، لودھ، کوری، دھن نوک اور بھاٹس پر مشتمل تھی۔ برطانویوں نے ایمرجنسی حالات کے لئے وحشی قبائل کو بھی متحرک کیا۔ 1825 کے آغاز ہی میں برطانیوں نے بھیل کے سپاہیوں کی مرکزی انڈیا کے پہاڑی راستوں پہ سپاہ گری کے لئے تشکیل کی، 1857 میں برطانیوں نے دوسری بھیل کی سپاہ جو ایک ہزار بھیلوں پر مشتمل تھی تشکیل کی۔ انہیں 'سنڈیا' میں باغی فوجیوں کے خلاف استعمال کیا گیا۔ تاہم نچلی ذاتیں اور قبائلی

جنہیں برطانوی انڈین فوج کے بے قاعدہ یونٹوں میں داخل کیا گیا اُن کی مجموعی تعداد باقاعدہ فوجیوں کی تعداد کے مقابلے میں بہت کم تھی۔

برطانویوں نے انڈین شہزادوں کی افواج پر بھی انحصار کیا جو ہمیشہ کمپنی کے ساتھ وفادار رہیں۔ شہزادگان علاقے کے بہت بڑے حصے پر حکومت کر رہے تھے۔ اور اُن کی فرمانروائی میں باشندوں کی مکمل تعداد چار کروڑ تھی۔ کشمیر کے راجہ گلاب سنگھ کی جموں کی فوج کے حصے اور حیدرآباد کی معاون قوت (10698) نے بغاوت کے دوران انگریزوں کو بہت اچھی خدمات مہیا کیں۔ دوست ہمسایے نیپال کی شاہانہ حکومت کو بھی اپنے سپاہی باغیوں کے خلاف میدان میں بھیجنے پڑے۔ 1858 میں لکھنؤ کی مہم کے دوران جنگ بہادر 16000 گورکھوں کو ساتھ لایا۔

برطانیوں نے بہت سے انڈین سرداروں اور بڑے بڑے جاگیرداروں کو مسلح آدمیوں کو پالنے کا حکم دیا تا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ وہ قانون اور قاعدے کو برقرار رکھ سکیں۔ مثال کے طور پر سیف اللہ خان ایک مسلمان شریف آدمی جو کہ مرکزی انڈیا میں راجپوت ریاست کراؤلی میں تھا، اُسے برطانیوں کی مدد کے لئے توڑے دار بندوقوں والے 600 سپاہیوں کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی۔ ایسی بیشتر مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ تاہم ایسی غیر رسمی فوجیں جنہیں برطانوی تیار کرتے تھے اپنے حجم کے لحاظ سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے تصرف میں موجود باقاعدہ یونٹوں سے کہیں کم ہوتی تھیں۔

باغی اُن سپاہیوں اور سواروں پر اعتماد کرتے تھے جنہوں نے (نہ صرف) بغاوت کی بلکہ اپنے علاقے (زمین) سے لوگوں کو بھی تیار کیا۔ جہاں پہ وہ عارضی طور پر قابض ہوئے تھے۔ باغی کیمپوں میں سپاہیوں اور سواروں کا اندازاً تخمینہ لگایا جا سکتا ہے۔ بنگال کی فوج کی گھڑسوار (کیولری) رجمنٹوں نے مسلمانوں کو اودھ اور روہیل کھنڈ سے بھرتی کیا۔ اور انفنٹری کی رجمنٹوں میں بہار اور اودھ سے اونچی ذات کے ہندوؤں کو لیا۔ درمیانی ذاتوں جیسے 'آہرز' کی بہت کم تعداد بنگال کی فوج میں تھی۔ نچلی ذات کے لوگوں اور یورپی۔ ایشین (وہ ایشین جو کسی یورپی مرد یا عورت سے جنم لے جبکہ اُس کی ماں یا باپ مقامی ہوں) لوگوں کا (فوج میں) داخلہ بند تھا۔ بہار سے 'بھومی ہارز' (bumihars) نے 18 ویں صدی میں بنگال آرمی انفنٹری میں شامل ہونا شروع کیا۔ بنگال آرمی کی انفنٹری کے بہت سے برہمن اودھ کے اضلاع 'بیس دارا' اور 'بانوڈا' سے

آ ئے۔پی۔جے۔اوٹیلر کے تخمینے کے مطابق تقریباً ایک لاکھ انڈین سپاہیوں نے بغاوت کی تھی۔ جولائی 1858 تک موت اور مفرور ہونے کے باعث اُن میں سے محض -/15000 باقی بچے۔ سٹیفن پی۔جے۔کوہن کہتا ہے کہ بنگال فوج کے ایک لاکھ سینتیس ہزار انڈین سپاہیوں میں سے 70000 بغاوت میں شامل ہوئے۔تیس ہزار مفرور ہو گئے یا اُن سے ہتھیار رکھوا لئے گئے اور تیس ہزار ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ وفادار رہے۔

بہت سے شہزادوں کی فوجوں نے بھی باغیوں کا ساتھ دیا۔مثال کے طور پر گوالیار کا حصہ جو کہ سات انفنٹری رجمنٹوں، پانچ ملٹری بٹالینوں اور دو کیولری رجمنٹوں پر مشتمل تھا تمام کا تمام باغیوں کے ساتھ شامل ہو گیا۔ ماہیہ پور، مالوا، بھوپال، اور کوٹھا (کی فوجوں) کے حصوں نے بھارت پور کیولری کے ساتھ مل کر 1857 میں بغاوت کی۔ باغی فوجیوں نے بھی مسلح آدمیوں کی بہت سی لیویز تیار کیں'اودھ' کی بیگم کی فوج (جو کہ باغی رجمنٹوں میں جمع اُس خاتون کی تیار کی ہوئی لیویز پہ مشتمل تھیں) جس نے دریائے گندھک کو عبور کیا اُس کے تخمینے کے مطابق چالیس ہزار آدمی شامل تھے۔فروری 1859 تک 'اودھ بیگم' کی فوج جو اودھ نیپال کے بارڈر کے ساتھ ساتھ حرکت کر رہی تھی۔ اُس کی تعداد پانچ سے دس ہزار کے درمیان کیولری اور 10000 دس ہزار انفنٹری کے قریب تھی۔ تاہم باغیوں کی خدمات میں شامل شہزادگان کے یونٹوں اور لیویز کا درست اندازہ اعدادوشمار (data) کی کمی کے باعث نہیں لگایا جاسکا۔

خانہ جنگی سے پہلے امریکی فوج، سپاہیوں کی فوج کی نسبت کہیں زیادہ قابلِ رحم حالت میں تھی۔ یونائیٹڈ سٹیٹس کی باقاعدہ فوج کی تعداد محض 16000 آدمیوں پر مشتمل تھی۔ اور اُن کے پاس کوئی ایسا افسر موجود نہیں تھا جس نے جنگ میں پُل بنانے سے زیادہ بڑی کسی بھی شئے کی تشکیل کی قیادت کی ہو۔ تاہم جنگ کے دوران عوامی تحریک روز کا معمول بن گئی۔ مجموعی طور پر کچھ تین ملین لوگوں نے خانہ جنگی کے دوران دونوں اطراف سے ایکشن (کو عمل پذیر) ہوتے ہوئے دیکھا۔ شمالی امریکہ کی آبادی 1860 میں اکتیس ملین تھی۔ (تین کروڑ) کنفیڈریسی اور یونین نے بالترتیب اپریل 1862 اور مارچ 1863 میں جبری بھرتی کا عمل شروع کیا۔ یونین آرمی میں مکمل تخمینے کی تعداد 2,898,304 اور کنفیڈرل آرمی میں تقریباً 1,406,180 آدمیوں کی تھی۔ انڈیا میں جبری بھرتی موجود نہیں تھی کیونکہ امریکہ کی خانہ جنگی کے مقابلے میں انڈیا کے انسانیت پہ مبنی

وسائل بے تحاشا تھے اور بغاوت کے دوران کم انسانی قوت کی احتیاج تھی۔ انڈیا کی آبادی 200 ملین سے زیادہ تھی۔ یہاں تک کہ (انڈین بغاوت کے مقابلے میں) کریمین کی جنگ نے بہت بڑی تعداد میں فوجی انسانی قوت کے متحرک ہونے کی شہادت دی ہوگی۔ تین لاکھ فرانسیسی انگریز، سارڈی نائن اور ترک سپاہیوں کے خلاف روس نے 1856 میں 31954 افسر 17,42,343 آرمی اور مزید 25,00,000 (25 لاکھ) ملیشیا اور بے قاعدہ فوج کو تیار کیا تھا۔ سویلین کے (جانی) نقصانات کو نکال کر امریکن سول وار (خانہ جنگی) نے 3 لاکھ ساٹھ ہزار 'یونین' سپاہیوں کی زندگیاں چھین لیں۔ اور 2 لاکھ 60 ہزار کنفیڈریٹ سپاہی جان گنوا بیٹھے۔ 1857 کی بغاوت نے بہت کم جانی نقصانات اٹھائے ہیں۔ بغاوت کے دوران جنگ میں تقریباً دو ہزار چونتیس برطانوی سپاہی کام آئے۔ اور بیماری کے ہاتھوں 8978 سپاہی ہلاک ہوئے۔ مرنے والے انڈین سپاہیوں اور سویلین کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ کمتر ہارڈویر (دھات کی اشیاء، سے یہاں مراد بہتر اسلحے سے ہوسکتی ہے۔ مترجم) کے علاوہ باغیوں کے لئے کمانڈ (قیادت) بھی ایک سنجیدہ مسئلہ تھی۔

بنگالی فوج کی یونٹوں کے زیادہ تر انڈین افسروں نے جو بغاوت کے مرتکب ہوئے تھے۔ باغیوں کو قیادت فراہم کی۔ بنگال فوج میں (موجود) سپاہیوں کو سنیارٹی کی بنیاد پر ترقی دے کر افسروں کا درجہ دے دیا گیا۔ اوسطاً رنگروٹ فوج میں تقریباً سترہ برس کی عمر میں شامل ہوتے تھے۔ جمعدار کے عہدے تک ترقی حاصل کرنے کے لئے کم از کم 35 برس کی نوکری کی ضرورت ہوتی تھی۔ تاہم تمام وہ سپاہی اتنے خوش نصیب نہیں ہوتے تھے۔ اور جمعدار کی حیثیت سے تقریباً 13 سال مزید نوکری کی ضرورت ہوتی تھی تاکہ صوبیدار کا عہدہ حاصل کیا جاسکے۔ سوصوبیداروں اور جمعداروں کی اوسط عمر تقریباً 70 اور 65 سال ہوا کرتی تھی۔ بہت سارے انڈین افسر اپنی عمر کے باعث بے استقلال ہوتے تھے اور ہمیشہ غیر موثر پلٹن کی جانب تبدیلی کے لئے تیار ہوتے تھے۔ انڈین افسروں کی ایک بہت بڑی تعداد ناخواندہ ہوتی تھی۔ انڈین افسر کو کسی کم درجے سے اوپر کے درجے میں ترقی کے لئے کسی تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ وہ جنگ کے لئے ذہنی یا جسمانی طور پر اتنے موثر نہیں ہوتے تھے۔

اس کے علاوہ عوامی جنگ کے ظہور نے انڈینز میں بہت سارے نئے سویلین قائدین کو

ابھرتے ہوئے دیکھا۔ باغیوں کی جانب بہترین کمانڈر تانتیا ٹوپے (جس کا اصل نام رام چندرا ہندورانگ) تھا، ایک اکتالیس سالہ برہمن جس کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے پیشہ وروں کے ساتھ اُس کا کوئی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بغاوت کے پھوٹنے سے قبل نانا صاحب کا مصاحب (ساتھی) تھا۔ اُس کے پاس کوئی فوجی تجربہ یا تربیت حاصل نہیں تھی۔ اس جواں سالی میں وہ محض تلوار زنی اور نشانہ بازی میں ماہر تھا۔ باغی قائدین کی بہت بڑی خلقت کو قیادت فراہم کرنے اور اُن میں (باہمی) تعلق پیدا کرنے، اور اُن کی تکنیکی پیچیدگیوں کو سمجھنے کی عدم صلاحیت بہت سی جنگوں میں اُن (باغیوں) کی شکست کا باعث بنی۔

اُن کے مقابلے میں برطانوی افسر پیشہ ور تھے۔ پروفیشنل ازم (پیشہ ور ہونا) منظم تشدد کے اطلاق میں مہارت پر مشتمل ہوتا ہے۔ وہ جو کمیشن کے ذریعے عہدوں تک پہنچے فوجی اکیڈمیوں میں سے فارغ التحصیل (تعلیم یافتہ) تھے۔ اور اُن کے کیریئر میں ترقی اُن کے پیشے میں مزید علم حاصل کرنے کا تقاضا کرتی تھی۔ 1741 سے 'وول وچ' کی رائل ملٹری اکیڈمی نے اُن تمام افسروں کو جنہوں نے انجینئرنگ کے شعبے اور ملٹری کے یونٹوں میں شمولیت اختیار کی۔ انہیں ٹیکنیکل (تکنیکی) تعلیم مہیا کی تھی۔ انفنٹری یونٹوں کے افسروں کو 'سینڈہرسٹ' سے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی 'ایڈس کومب' کی فوجی تعلیم گاہ سے فارغ التحصیل کیا جاتا۔ یہ درست ہے کہ خرید کے نظام کی موجودگی میں برطانوی افسروں کی پلاٹونوں میں جرمن افسروں کی نسبت پیشہ واریت بہت کم تھی۔ اس کے باوجود تکنیکی مہارت اور جنگی طریقوں کی تھیوریوں کی تعلیم میں برطانوی افسر، انڈیا کے باغی فوجیوں سے کہیں زیادہ بلند تھے۔ اور امریکہ کی خانہ جنگی کی فوجوں کے معاملات میں 'ویسٹ۔ پوائنٹ' کے گریجویٹوں نے قیادت مہیا کی۔ فرانس میں ای کول پولی ٹیکنیک کے نمونے پر 'ویسٹ پوائنٹ' کا نصاب انجینئرنگ، ورزش اور چھوٹے یونٹوں کی تکنیکوں پر زیادہ زور دیتا تھا۔

اختتام

باغیوں اور برطانیوں نے ایک دوسرے پر اور بسا اوقات غیر جنگ آوروں اور شہری معاشرے پہ جو تشدد کیا وہ ایک معاون فعل تھا۔ تشدد کرنے سے دونوں نوآبادیاتی ریاست اور باغی فوجوں نے اپنی جنگی کوششوں کو پشتہ دیا، اور اپنے دشمن کو کمزور کیا۔ بڑے پیمانے پر تشدد کرنا

ضروری تھا تاکہ دشمن کے معاشی اور جغرافیائی خفیہ قوت/ جوہر کو تباہ کر دیا جائے۔ اور اُن کے مورال پر اثر انداز ہوا جائے۔ 59-1857 میں برطانیوں اور باغیوں دونوں نے جو وحشیانہ پن 'غیر جنگ آوروں' کے خلاف جاری رکھا۔ اُس میں کچھ بھی بے مثل طور پر نوآبادیاتی نہیں تھا۔ جنگ میں بربریت دونوں طرف کی نظریاتی ذمہ داریوں کے باعث ہوئی تھی۔ حب الوطنی اور انتقام کی حس نے یونین اور کنفیڈریٹ کے سپاہیوں کو بھی (اس آگ کی طرف) دھکیل دیا۔ بالکل اُسی طرح زور آور (بلکہ منہ زور) عیسائیت اور انتقام نے انڈیا میں برطانیوں کو آگ مہیا کی۔ باغیوں کا محرک مذہب کا 'امتزاج' اور ذات کا فخر تھا جو ایک قسم کے جدیدیت سے پہلے کی قوم پرستی پر مشتمل تھا۔ دوبارہ (یہ تذکرہ کہ) خواتین نے امریکن خانہ جنگی اور بغاوت میں اہم کردار ادا کیا۔ لیکن اصل مقابلے (جنگ) میں اُن کی شمولیت بالکل معمولی رہی، مقابلے کی تاریخ بھی ایک قسم کی متوازی تاریخ ہوتی ہے۔ اور متوازی تاریخ متوازی لکیروں کی طرح کبھی نہیں ملتی۔ چنانچہ انیسویں صدی کے درمیانی عشرے کی امریکن عوامی جنگ اور 58-1857 کی انڈیا کی (عوامی جنگ) کے درمیان بہت سی تفاوتیں موجود ہیں اور اُن کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے امریکن خانہ جنگی کے دوران عوامی فوجوں کو متحرک کرنے کے مقابلے میں انڈیا میں فوجی انسانی قوت کی تحریک کو 1857 کے دوران دونوں باغیوں اور کمپنی نے بہت کم تر استعمال کیا (مطلق تعداد کے لحاظ سے اور آبادی کی بنیاد کے مقابلے میں فی صد اصطلاح میں بھی) شمالی امریکہ میں کونے میں دھکیلے گئے گروپوں کی (سیاہ فام لوگوں کی) خانہ جنگی میں شمولیت، 1857 کی بغاوت میں انڈیا میں قبائل اور نچلی ذات کے لوگوں کے ادا کئے گئے کردار کی نسبت بہت زیادہ شدید تھی۔ اس کے باوجود امریکن خانہ جنگی اور 1857 کی بغاوت دونوں نے جنگ کے چہرے کو ہمیشہ کے لئے تبدیل کر دیا۔

فہرست I بمبئی کی فوج کی قوت

تاریخ	انڈیا کی فوج کا حصہ				یورپین فوج کا حصہ		
	یورپین افسر	انڈین افسر	عہدے	مجموعہ	افسر	عہدے	مجموعہ
یکم جولائی 1856	836	810	34313	35960	506	8967	9473
یکم جولائی 1857	866	818	35701	37385	528	8948	9476

یکم جولائی 1858	855	991	40605	42541	1141	21,556	22,697
یکم جولائی 1859	863	1072	44147	46082	1042	22361	23403

چیف کمانڈر کا ریکارڈ 76-1865

فہرست II مدراس فوج کے انڈین حصے کی قوت

تاریخ	مدراس فوج کے انڈین حصے کی قوت	ریمارکس
یکم جنوری 1857	41288	یکم اپریل 1857 اور 31 مارچ 1860 کے درمیان 22874 رنگروٹ شامل ہوئے
یکم جنوری 1858	46662	
یکم جنوری 1859	58999	
یکم جنوری 1860	60377	

(جنرل فریڈرک رابرٹس۔ انگلینڈ (کے ساتھ) کا نمائندہ۔ مدراس میں کمانڈر انچیف 85-1881)

ماضی کو دوبارہ سے متحرک کرنا

دِلت اور 1857 کی یادیں

بدری نریان تیواری/ترجمہ: ڈاکٹر صولت ناگی

الوہیتیں، تاریخیں اور روزمرہ کی زندگی

کسی بیان کے بغیر یادگار پتھر اور اتر پردیش کے بہت سے علاقوں میں بہت سی خانقاہیں اُن دِلت ہیروز کی یاد مناتی ہیں جنہوں نے 1857 کے واقعات میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس علاقے میں یہ خانقاہیں مقدس ساختیں (ڈھانچے) ہیں جہاں اُن کے ہیروز کی عبادت/پوجا کی جاتی ہے۔ جبکہ کہانیاں اور قصے جو اُن سے متعلق ہیں۔ خواشیوں (کونے میں دھکیلے ہوئے لوگوں) کے لئے ایک نئی تاریخ کو بنانے میں استعمال ہوتے ہیں، وہ (تاریخ) جو دِلت باغیوں کے کردار کی ثناء کرتی ہے جو انہوں نے 1857 میں ادا کیا۔

اتر پردیش کے اعظم گڑھ ضلعے میں ایک گاؤں ہے جسے 'مجھاوا' کہتے ہیں۔ جس کی آبادی فوقیت کے اعتبار سے دِلت ذاتوں، جیسے چمار، پاسی، دھوبی، مالی وغیرہ پر مشتمل ہے۔ اس گاؤں میں کھیت کے اندر ایک تنگ راہگذر کے برابر میں چار سیمنٹ سے بنے ہوئے پتھر رکھے ہوئے ہیں۔ انہیں گاؤں کے لوگ 'شہید بابا' کہتے ہیں۔ اس گاؤں کے دِلت ان پتھروں کی پوجا سرخ پاوڈر سے کرتے ہیں۔ وہ اُن پر پانی ڈالتے ہیں اور گھر کی بنی ہوئی مٹھائیاں جیسے 'ٹھیکوا' وغیرہ عبادت کی شکل میں باقاعدگی سے نذرانے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان ذاتوں کی تمام نئی شادی

شدہ دلہنیں اپنے مستقبل کی خوشی کے لئے یہاں عبادت/ پوجا کرتی ہیں۔ان پتھروں کی تاریخ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے پر، گاؤں کے سکول ماسٹر نے جوذات کے اعتبار سے (خود بھی) چمار تھا، کہا کہ 1857 کی بغاوت کے دوران اس گاؤں کے چار چماروں نے اپنی زندگی کی قربانی دی، ان چار آدمیوں نے لوگوں کے خوابوں میں ظاہر ہونا شروع کر دیا، اور یہ پیغام دیا کہ اگر ان چار شہیدوں کے لئے پوجا کی گئی تو یہ (گاؤں والے) تمام پھولیں پھلیں گے۔تب سے گاؤں والوں نے انہیں دیوتا کی حیثیت سے اپنی نظروں میں مجسم کر لیا اور انہوں نے (گاؤں والوں نے) اُن کی یاد میں خانقاہیں تعمیر کیں۔اور وہاں پر اپنی خوشی اور خوش حالی کے لئے دعائیں مانگنا شروع کر دیں۔

بہار کے ضلع 'آررا' میں شاہ پور گاؤں کے گرد ایک 'الوہی' جسے 'راجت بابا' کہا جاتا ہے اس کی پرستش اس علاقے کی کچھ نچلی ذات کی کمیونٹیاں کرتی ہیں۔اس کے ''تھان'' (یادگاری پتھر) عموماً پیپل کے درختوں تلے پائے جاتے ہیں۔جن کی سرخ لنگوٹ، سرخ پاؤڈر کے نشانات، مہکتی ہوئی چھڑیوں اور گھر کی تیار شدہ مٹھائیوں سے آرائش کی جاتی ہے۔گاؤں کے لوگ 'تھانہ' پہ اپنی مرادوں کی تکمیل کی خاطر دعا کرتے ہیں، اور مراد پوری ہونے پر 'پرساد' نذر کرتے ہیں۔یہ کہا جاتا ہے کہ رجیت بابا 1857 کی لڑائی کے دوران انگریزوں کے خلاف لڑتا ہوا شہید ہو گیا، اسے تب سے خدا/ بھگوان کا اوتار سمجھا جاتا ہے۔

یہاں فقط دو مثالیں ہیں جو ظاہر کرتی ہیں کہ کیسے شمالی انڈیا کے مختلف علاقوں میں 1857 کی بغاوت میں نچلی ذات کے شہدا وہاں پہ بسنے والے دلت لوگوں کی زندگیوں کا اٹوٹ (لازمی) حصہ بن گئے۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ دِلت جن کے کردار کو علمی تاریخ نے بھی تسلیم نہیں کیا، نے کیوں 1857 کی بغاوت کے اپنے ہیروز (بہادروں) کو دیوتا کی طرح کا مقام دیا۔کیا یہ علمی تاریخ کی تحریر اور عوام کی تحریر کے درمیان (موجود) وسیع خلیج کو آشکار نہیں کرتا؟ یا 1857 کی بغاوت میں اُن کے ہیروز کا دیوتاؤں کی حیثیت سے اوتار نچلی ذات کی وجودیت کی ایک ضرورت تھی جو کہ اُنہوں نے اپنی بقاء کے لئے بنائی تھی۔کیونکہ انڈیا (کی آبادی) کا نام نہاد بڑا دھارا اُن کے وجود کو سرے سے تسلیم کرنے کے لئے تیار ہی نہیں تھا؟ یا یہ اس لئے تھا کہ 1857 کی بغاوت کی یاد فرشی (بنیادی) سطح پر اجتماعی نفسیات میں گہری حد تک پختہ اور راسخ ہو چکی تھی، اگرچہ دعویٰ کیا

جاتا تھا کہ بغاوت بادشاہوں اور جاگیرداروں تک ہی محدود تھی اور اس جدوجہد میں نچلی ذات کا حصہ محض اُن کے سپاہیوں، محافظوں اور لٹھ برداروں تک ہی (محدود) تھا۔

رجت بابا کون تھا؟ جس کی پرستش اتنی محویت سے شاہ آباد کے علاقے میں کی جاتی ہے جو اب بہار کے آرا ضلع میں ہے۔ جب یہ سوال میرے ذہن میں اُٹھا تو میں نے تاریخی دستاویزات سے مدد حاصل کرنے کی ٹھانی۔ میں نے 7 فروری 1859 کی تاریخ میں 'ایلن' کی ڈاک میں کسی 'راج رام' کا ذکر پایا۔ (ودھروی 1989:36)۔ راجیت رام کا قصہ کچھ یوں تھا۔

''میرا نام راجیت رام ہے۔ ذات کی حیثیت سے میں گوالا (دودھ دینے والا) ہوں۔ میں چالیسویں پلاٹون کی پہلی کمپنی میں ایک حوالدار تھا جس کا کام سپاہیوں کو تنخواہیں بانٹنا تھا۔ میرے والد کا نام 'ہراسن رام' ہے۔ میں شاہ پور گاؤں، ہراگنا شاہ پور ضلع شاہ آباد کا رہائشی ہوں۔ اس لمحے میری عمر 56 برس کی ہے۔ میں آغاز عمر ہی سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔ 25 جولائی 1857 کو میں نے 'دیناپور' کی بغاوت میں حصہ لیا۔ ہماری پہلی کوشش 'کوایلور گھاٹ' کو فتح کرنے کی تھی اور پھر ہمیں 'آررا' کی جانب حرکت کرنا تھی۔ میں 'آررا' میں دو گھنٹے رکا، اُس کے بعد میں نے صوبیدار 'سیتا رام' سے کہا کہ میں گھر جانا چاہتا ہوں اور مجھے رخصت دی جانی چاہئے۔ مجھے چھ دن کی چھٹی ملی جو میں نے شاہ پور میں گذاری، اُس کے بعد میں جگدیش پور کے جنگل کی جانب روانہ ہو گیا، جس دن میں وہاں پہنچا ہمیں برطانوی فوج سے لڑنے کے لئے 'دُلی پور' جانا تھا۔ بدقسمتی سے ہم ہار گئے، جس کے باعث ہم میں سے بہت سے جنگل میں ٹھہر گئے۔ بہت سے 'باران' کی جانب چلے گئے اور باقیماندہ 'پرّ و' کی طرف۔ اگلے دن ہم سب اکٹھے ہوئے۔ اُس وقت بابو کبر سنگھ اور بابو امر سنگھ ہمارے لیڈران (راہنما) تھے۔ اُن کی قیادت میں ہم سب 'نوکہا' پہنچ گئے۔ وہاں سے ہم 'ساسا رام' گئے، پھر 'پھریا' میں 'تلب ہو' اور بالآخر ''روتاش گڑھ'' قلعے میں پہنچے۔ ہم نے انگریزوں کو شکست دینے کی کوششیں جاری رکھیں۔ پہاڑی سڑکوں سے معاملات طے کرتے ہوئے ہم 'رپت گنج' کے ذریعے 'ریوا' (رابرٹس گنج) اور 'دھر مادھ گنج' پہنچے۔ لیکن ہمیں نہ تو ریوا میں ٹھہرنے کی اجازت ملی اور نہ ہی اُسے چھوڑنے کی۔ اس وجہ سے ہم نے باندا جانے کا فیصلہ کیا۔ جہاں ہم نے تقریباً ڈیڑھ ماہ گذارا۔ باندا میں دوسرے علاقوں سے بھی باغی فوجی آ کر جمع ہو گئے۔ گروپ اُن سپاہیوں پر مشتمل تھا (جو غالباً پہلے وہاں موجود تھے) اُن کے علاوہ وہ جو فتح پور سے بڑی شاہراہ کے

ذریعے پہنچے تھے۔ یہاں باون نمبر کی پلاٹون کے انڈین سپاہیوں کی ایک کمپنی بھی موجود تھی۔''

یہ کہنا مشکل ہے کہ کیا راجیت بابا جس کی پرستش بہار کے بہت سے حصوں میں کی جاتی ہے وہی راجیت رام ہے یا نہیں لیکن ایک بات واضح ہے کہ ایک سپاہی نے جو (پیچھے رہ جانے والی) نچلی ذات سے تعلق رکھتا تھا، نے اپنے نام کے ساتھ 1857 کی بغاوت کے ذاتی تجربات کو دستاویزی شکل دی ہے۔ ایلن کی ایک اور ڈاک 'آررا' اور 'شاہ آباد' کے علاقے سے تعلق رکھنے والے چار بھنگی باغیوں کے کردار کا تذکرہ بھی کرتی ہے۔ چار بھنگیوں کی موجودگی کے بارے میں یہ حقیقت 'برکھنداج' نامی ایک نچلی ذات کے برطانوی مخبر کے بیان سے ظاہر ہوئی ہے۔ جس کی شہادت 31 مئی 1858 کو 'دھم راؤ' پولیس سٹیشن میں ریکارڈ کی گئی۔ اس کی شہادت (گواہی) کہتی ہے کہ چار بھنگی بغاوت کے دوران بہت مصروفِ عمل تھے۔ جن کے نام انگریزوں کے لئے دہشت کا باعث تھے۔ (ڈدروھی 1987:37)

II

دیہی شمالی انڈیا اور 1857 کی کہانی

یہ جاننا دلچسپی سے عاری نہیں ہوگا کہ 1857 کا واقعہ ابھی تک شمالی ہندوستان میں بہت مشہور ہے۔ بغاوت شمالی انڈیا میں گنگا کے علاقے میں دہلی سے بنگال تک بھرپور طریقے سے مجتمع تھی۔ اس کا آغاز 10 مئی کو میرٹھ میں اس خبر کے ساتھ ہوا کہ دہلی کی گریژن نے بغاوت کر دی ہے اور انگریزوں کو نکال باہر کیا ہے۔ اس نے جلتی پہ تیل کا کام دیا، اور اس کے باعث سول آبادی کے حصے میں بہت زیادہ ہلچل مچ گئی۔ جلد ہی یہ یو۔ پی کے دوسرے حصوں تک پھیل گئی۔ 20 مئی کو یہ علی گڑھ تک پہنچ گئی۔ 23 مئی کو 'ایتاوا' اور 'منی پور' اور 27 مئی کو 'ایتا' تک (کے علاقوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا)۔ (مکرجی 2001:65) اِسی طریقے سے یہ یوپی اور بہار کے دوسرے علاقوں جیسے کان پور، اودھ، بنارس، اعظم گڑھ، گورکھ پور، گونڈا، بہرپچ، سیتاپور، غازی پور، سلطان پور، مغربی بہار اور بالآخر بنگال تک پہنچ گئی۔ بالائی انڈیا میں یہ زیادہ تر پرآشوب زرعی طوفان کی شکل میں تھی جو وسیع نوعیت کی بے اطمینانی کو مجتمع کئے ہوئے تھا۔ بغاوت نے برطانیوں کے خلاف اب تک کسی منظم تحریک کی شکل اختیار نہیں کی تھی۔ لیکن اسے وسیع عوامی حمایت

حاصل تھی، خاص طور پر اودھ، تمام شمالی مغربی صوبوں اور مغربی بہار میں سپاہیوں کی بے اطمینانی بغاوت کا لازمی حصہ تھا لیکن بغاوت نے اپنی قوت سول آبادی سے اخذ (حاصل) کی۔ (مٹکاف 60:1990)۔ کسان، سیاسی سادھوں، مقامی بادشاہوں اور سب سے اہم سماج کے روایت پسند حصے جنھوں نے برطانوی راج کے زیرِ سایہ سب سے زیادہ تکالیف برداشت کی تھیں، نوآبادیاتی نظام کے خلاف لڑائی/مزاحمت میں اکٹھے ہو گئے۔ برطانوی حکومت نے باغیوں کے خلاف سخت مدافعت کی۔ اُن کی مکافات سخت اور مہلک تھی۔ گاؤں کے گاؤں جلا دیئے گئے یا باغیوں کو تباہ کرنے کے لئے توپ کے گولوں سے زمین بوس کر دیئے گئے۔ ہزاروں باغیوں کو دار پہ لٹکا دیا گیا، اور اس کے مساوی ایک بہت بڑی تعداد کو فوری سزا کے طور پہ درختوں سے لٹکا دیا گیا۔ اگرچہ بغاوت بالآخر ناکام ہو گئی لیکن اس نے لوگوں میں خاص طور پر یو۔ پی میں اودھ کے علاقے میں جہاں بغاوت شدید تھی، لوگوں میں نوآبادیاتی نظام کے خلاف آگاہی کو جنم دیا۔

اسے انڈیا کے ہندی بولے جانے والے علاقوں میں احیاء کا آغاز بھی کہا جا سکتا ہے۔ باغیوں نے عام لوگوں کے ذہن پر گہرے نقوش چھوڑے جو کہ اُس عرصے کی کی گئی خال خال ریکارڈ شدہ تاریخ سے بہت مختلف تھے۔ ریکارڈ شدہ تاریخ نے محض امیر جاگیرداروں، بادشاہوں اور ملکہ لکشمی بائی اور 'تانتیا ٹوپی' کی کہانیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ غیر معروف ہیروں کی کہانیاں جنھوں نے تحریر شدہ تاریخ کے پردوں کے پیچھے اپنا کردار ادا کیا، دیہی شمالی ہندوستان کی محض زبانی تاریخ ہی میں پھیلی ہیں۔ اس حقیقت نے دِلت دانشوروں کو بغاوت کے اپنی ہیروز کو منتخب کرنے کی بہت سی آزادی دے دی، اور دِلت تمثالیوں/بتوں (Icons) کی حیثیت سے اُن کے تمثالی پیکر بنانے میں مدد دی۔ یہ تمثالی/بت بنیادی سطح پر اُن دِلتوں کی شناخت کی تشکیل میں استعمال ہوئے جن کی شناخت کے ساتھ کوئی ہیروز یا بت وابستہ نہیں تھے۔ باغیوں کے ان ہیروز کے تمثالی پیکروں کی تشکیل بعد ازاں اُن علاقوں میں بسنے والے دِلتوں کے اُن ہیروز کو جہاں سے اُن کا تعلق تھا دیوتا بنانے کے کام آئی۔

III

دلت اور 1857 کی یادیں

دلت کا 1857 کی جنگ کے ساتھ جذباتی تعلق ہے۔ کیونکہ اُنھیں یقین ہے کہ اس کا آغاز

اُنہوں نے کیا تھا۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ 1857 میں برطانیہ کے خلاف جھانسی میں ہونے والی سپاہیوں کی بغاوت جس میں زیادہ تر انڈین دِلت سپاہی شامل تھے، پھیل کر آزادی کی جنگ میں تبدیل ہوگئی۔ یہ آزادی کی جنگ تھی کیونکہ دلت بجائے طاقت حاصل کرنے کے اپنی دھرتی ماں کے لئے لڑ رہے تھے۔ جنگ کی قیادت 'بھوبکشی' اور 'پورن کوری' کر رہے تھے اور اُن کے ساتھ 'جھلکری بائی' تھی جس نے دھرتی ماتا کے لئے برطانیوں سے بہادری سے جنگ لڑی (ڈنکر 62:1990)۔ دلت کی پہلی جدوجہد آزادی کا بیان بہادر خواتین، شہدا جن کا تعلق پسے ہوئے طبقات سے تھا جیسے جھالکری بائی، ایونتی بائی، ہنادھائی، اودھادیوی، اور مہاوری دیوی کی کہانیوں سے بھرا ہوا ہے۔ اُن کے مطابق 1857 کی جنگِ آزادی جو اشرافیہ کے دعوے کے مطابق 'منگل پانڈے' نے شروع کی تھی درحقیقت وہ 'متادین بھنگی' سے متاثر ہوئی۔ اس کہانی کو اس انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ متادین بھنگی بغاوت کی تخلیقی تحریک کے ماخذ کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ بیان کچھ ایسے ہے۔

'بارک پور میں ایک فیکٹری (کارخانہ تھا) تھی جہاں کارتوس بنائے جاتے تھے۔ اس فیکٹری کے بہت سے محنت کشوں کا تعلق 'نہ چھوئے جانے والی کمیونٹی' یعنی اچھوتوں (Untouchables) سے تھا۔ ایک دن ایک محنت کش کو پیاس محسوس ہوئی اُس نے ایک سپاہی سے پانی کے متعلق کہا۔ سپاہی منگل پانڈے تھا۔ منگل پانڈے ایک برہمن تھا اُس نے پانی دینے سے انکار کر دیا کیونکہ محنت کش ایک اچھوت تھا۔ یہ محنت کش کے لئے بہت توہین کی بات تھی۔ اُس نے یہ کہتے ہوئے سپاہی کو جواب دیا۔ 'تم خود کو انتہائی قابلِ احترام برہمن سمجھتے ہو۔ لیکن جس کارتوس کو تم اپنے دانتوں سے کاٹتے ہو اور اپنی بندوق میں ڈالتے ہو، گائے اور سؤر کے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ اُس وقت تمہاری ذات اور مذہب پہ کیا گذرتی ہے؟ لعنت ہے تمہارے برہمن ہونے پر'۔ یہ سن کر سپاہی حیرت زدہ رہ گیا۔ یہ اچھوت متادین بھنگی کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ جس نے انڈین سپاہیوں کی آنکھیں کھول دیں۔ اور چھاؤنی میں انڈیا کی آزادی کا پہلا شعلہ جلا دیا۔ (روشن کر دیا)۔ متادین بھنگی کے الفاظ جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئے۔ بہت جلدی آزادی کی شمع روشن ہوگئی۔ یکم مارچ 1857 کی صبح کو منگل پانڈے نے پریڈ کے دوران لائن کو توڑ دیا۔ برطانویوں کو اُن کے (انڈینز) کے مذہب کو بھرشٹ کرنے کا الزام دیتے ہوئے اُس نے اندھا دھند گولیاں

چلانا شروع کر دیں۔ یہ وہ لمحہ تھا جب برطانویوں کے خلاف لڑائی کا پہلا خط کھینچ دیا گیا۔ منگل پانڈے کو زخمی حالت میں گرفتار کر لیا گیا۔ اُس کا کورٹ مارشل ہوا اور 1857 میں اُسے تمام سپاہیوں کے سامنے دار پہ کھینچ دیا گیا۔ منگل پانڈے کی قربانی تمام سپاہیوں کے لئے مشعلِ راہ بن گئی۔ 10 مئی 1857 کو بارک پور میں آزادی کی تحریک کے طوفانی کواڑ پھٹ گئے۔ جس میں انڈیا کے بہت سے بہادر سپوت شہید ہو گئے۔ الزام کی جو فہرست تیار کی گئی اُس میں سب سے پہلا نام متادین بھنگی کا تھا جسے بعد میں گرفتار کر لیا گیا۔ تمام گرفتار شدہ انقلابیوں کا کورٹ مارشل کیا گیا۔ 'متادین' پہ برطانیہ کے خلاف سازش کا الزام لگایا گیا۔ (ڈنکر)

ناتھ (1998) نے اپنی کتاب ''1857 کی کرانتی کا جنک (Janak): ناگ ونشی بھنگی متادین بھیلا'' میں ایسی ہی کہانی بیان کرتا ہے جس میں 'متادین' کو 1857 کی بغاوت کا (جانک) والد ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ ان کہانیوں میں 'متادین بھنگی' کو 1857 کی بغاوت کے پیچھے ایک متحرک قوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ وہ دکھاتے (ظاہر کرتے) ہیں کہ کیسے آگے بڑھے ہوئے (بالائی) طبقے ایک اچھوت کو پانی کا گلاس دینے پہ منکر ہیں اگر چہ وہ اُس کارتوس و چباتے/کاٹتے ہیں جو گائے کی چربی سے چکنائی آلود ہے۔ چنانچہ یہ بیانات اور اس کے ساتھ قومیت پہ بنی تحریک انڈین سماج کے پیر شاہی ڈھانچے پہ سوالات کرتے (ہوئے دکھائی دیتے) ہیں۔ وہ سخت ڈھانچہ جس کے مطابق اچھوتوں کو اعلیٰ (برتر) ذاتوں کے قریب جانے کی اجازت اس لئے نہیں ہے کہ اُن کا تعلق کم حیثیت (نچلی) پیدائش اور 'مذہبی غلاظت' سے ہے، اُس پہ شدید تنقید کی گئی ہے۔ اس واقعے کی تاریخی حیثیت کو ثابت کرنے کے لئے ایک 'شری اچاریہ بھگوان دیپ' کی کتاب ''انڈیا کے امر ہو جانے والے انقلابی'' کو 'ڈنکر' نے پیش کیا ہے۔

متادین بھنگی کی یاد اور قومیت کی تحریک میں اُس کی خدمات کو 'دلت' بہت سے طریقوں سے مناتے ہیں۔ اُس کے اعزاز میں بہت سے گانے ترتیب دیئے گئے ہیں جنہیں ثقافتی اور سیاسی دونوں طرح جلوسوں اور فنکشنوں میں گایا جاتا ہے۔ یادگاری فنکشنوں میں قصبوں اور [illegible]وں میں اُس کے احترام میں ڈرامے سٹیج کئے جاتے ہیں۔ رسالوں میں خاص شمارے جاری کئے جاتے ہیں جس میں معروف لکھاری اُس کی خدمات کو نمایاں کرتے ہیں۔ ایک پندرہ روز اخبار 'دلت کیسری' نے 1857 کی بغاوت پہ ایک خصوصی شمارہ شائع کیا (جاری کیا)۔ جس میں نمایاں (اہم) مضمون

متادین بھنگی پر تھا۔ 'انار یہ بھارت' ایک اور دلت اخبار جو یو پی میں منی پور سے شائع ہوتا ہے نے 1857 کی بغاوت میں 'دلت' کی خدمات کے بارے میں ایک خصوصی فیچر شائع کیا۔ ان تمام اشاعتوں میں اُنہوں نے متادین بھنگی کو انڈین آزادی کی پہلی جنگ کے 'ہادی' کے طور پر نمایاں کیا ہے۔ 'حمایتی' جو کہ 'دلت' کا ادبی رسالہ ہے۔ اُس نے مئی 1996 کے شمارے میں 1857 کی یاد کو مناتے ہوئے متادین بھنگی کی خدمات کے بارے میں ایک خصوصی فیچر اور ایک نمایاں مضمون شائع کیا۔ 'سوہن پال سوماتک شر' نے بھرپور طریقے سے اُسی شمارے میں لکھا کہ وہ پہلا آدمی جس نے 1857 کے انقلاب کے بیج بوئے وہ متادین بھنگی تھا لیکن بدقسمتی سے مورخین اُس کی خدمات کو فراموش کر چکے ہیں۔

اس طریقے سے اشرافیہ کی قومیت پہ مبنی تاریخ کو 'دلت' نے اپنی حمایت میں تہ و بالا کر دیا ہے۔ کنور سنگھ، تانتیا ٹوپے اور نانا صاحب 'دلت' کی 1857 کی آزادی کی جدوجہد میں کسی شمار میں نہیں آتے۔ وہ لوگ جو شمار میں آتے ہیں وہ ہیں، جھلکری بائی، اودھا دیوی، اَونتی بائی، مہاوری دیوی، نہند دھائی، چیترم جتاو، بالو مہتر، بانکے چمار، اور ویرا پاسی جنہوں نے سماج کی نچلی تہوں میں جنم لیا تھا۔ اگرچہ اشرافیہ کے قوم پرست ہیروز کی نفی نہیں کی گئی، لیکن اُنہیں مکمل طور پر نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ اُن کا زور قوم کے لئے دِلت شہدا کی قربانیوں پر ہے اس کے باوجود کہ اُن کی پیدائش نیچی (ذات کی) ہے اور سماجی و معاشی سطح پر اُن کا مقام غریبی پر مبنی ہے۔ برطانویوں کے ساتھ ان کے بہادرانہ ٹکراؤ کو بھی نمایاں کر کے پیش کیا گیا ہے۔ بالو رام مہتر اور چیت رام جاتیو کی کہانی اس انداز سے بیان کی گئی ہے۔

''اگرچہ دِلت انڈین پروہتانہ ذات پات کی سب سے نچلی ذات میں پیدا ہوئے ہیں، اور اپنے غربت زدہ سماجی و معاشی مقام کے باعث اُنہیں بہت سی سختیاں جھیلنی پڑی ہیں۔ لیکن اُنہوں نے کبھی بھی اپنے ملک کے لئے (خلاف) خود کو نہیں بیچا۔ کوئی بھی کسی 'دِلت' کو ایسا کرنے کا الزام نہیں دے سکتا۔ جب بھی ضرورت کی گھڑی آئی اُنہوں نے اپنی دھرتی ماتا کے لئے اپنی زندگیاں قربان کر دیں۔ ملک کے اِن دلیر بیٹوں میں بالو رام مہتر اور 'چیت رام جاتیو' کا نام چمکتے ہوئے (روشن) حروف سے لکھا جائے گا۔ جیسے ہی 'بیرک پور' انقلاب کی خبر لوگوں تک پہنچی، انقلابیوں کا ایک ہجوم سڑکوں پہ آن پہنچا۔ 'فلپ' جو کہ 'ایٹا' ضلعے کا ایک افسر تھا، اُس نے ہجوم پہ قابو پانے کی

کوشش کی۔

26 مئی 1876 کو ضلع 'ایٹا' کے سوہرو کے علاقے میں 'چیت رام جاٹیو' اور 'بالورام مہتر' اپنی زندگیوں کی پروا کئے بغیر بارک پور انقلاب میں شامل ہو گئے۔ اس انقلاب میں سادھا شیو مہر، چاتر ب جُج دیش وغیرہ بھی موجود تھے۔ 'چیت رام جاٹیو' اور 'بالورام' جو انقلاب کے پیچھے متحرک قوت تھے، کو درختوں سے باندھ دیا گیا اور گولی ماردی گئی۔ باقیوں کو 'کاس گنج' کے علاقے میں درختوں سے لٹکا کر پھانسی دے دی گئی'' (ڈنکر 56)۔

شہید بنکے چمار کی بہادری کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ وہ کانپور کے گاؤں مچھی شہر ضلع جانپور میں رہتا تھا۔ جب انقلاب ناکام ہو گیا تو برطانویوں نے 'بنکے چمار' اور اُس کے 18 دوسرے ساتھیوں کو ''باغی'' (انقلابی) قرار دے دیا۔ 'بنکے چمار' کو گرفتاری کے بعد پھانسی پہ لٹکائے جانے کا حکم دیدیا۔ چنانچہ اس بہادر انقلابی نے ملک کے لئے اپنی جان نچھاور کردی۔

'امار شہید وراپاسی' ایک اور دِلت ہے جسے دلت (دلتوں) کے بیان کے مطابق ایک بہادر جنگجو کے طور پر یاد رکھا جاتا ہے۔ وہ 'مرار ماؤ' کے مہاراجہ، پن مہادیو کا (سکیورٹی گارڈ) محافظ تھا۔ راجہ بنی مہادیو سنگھ کو بغاوت میں حصہ لینے کی پاداش میں گرفتار کرلیا گیا۔ ایک رات 'وراپاسی' جیل میں داخل ہو گیا اور بادشاہ کو بھاگنے میں مدد فراہم کی۔ یہ برطانوی انتظامیہ کے لئے بہت بڑی توہین تھی اُنہوں نے 'وراپاسی' کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اور اُس کے سر کی قیمت -/50000 مقرر کی۔ تاہم وہ اُسے پکڑنے میں ناکام رہے۔ (ڈنکر)

1857 کی تحریک کے دوران ایک گاؤں میگارووارا جو کہ لکھنو کی شاہراہ پہ (شہر) 'اُننے او' (UNNAO) سے تقریباً 10 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اُس کے کردار کے بارے میں ایک اور کہانی بیان کی جاتی ہے۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ 20 جولائی 1857 کو برطانوی فوج کی ایک چھوٹی سی بٹالین جو کہ ہنری ہیولاک کی قیادت میں ایک اور بٹالین کی مدد کے واسطے جو کہ ریذیڈنسی میں پھنس گئی تھی، میگارووارا کے راستے سے گزر رہی تھی۔ تقریباً دو ہزار 'پیسز' (Pasis) اپنی جھونپڑیوں سے باہر نکل آئے اور اُنہوں نے بٹالین پر پتھروں کی بارش کردی۔ جس نے اُسے (بٹالین کو) کان پور چھاؤنی واپس جانے پر مجبور کردیا۔ 4 اگست 1857 کو وہی بٹالین گاؤں میں (دوبارہ) آئی، لیکن اس مرتبہ انہوں نے بہت سی تیاریاں کررکھی تھیں۔ جب میگارووارا کے پیسز (Pasis) نے اُن کو

آگے بڑھنے سے روکنے کی کوشش کی (تو) ایک لڑائی چھڑ گئی، اور تقریباً 2 ہزار پیسز (Pasis) مار دیئے گئے۔ (پاسی 1998:34)

اس کے علاوہ ایک اور کہانی جو پیسز نے بیان کی ہے وہ دریائے 'سائی' کے ساحل کے واقع گاؤں 'بانی' کے بارے میں ہے جو میگاروارا کے قریب ہے۔ جب برطانوی فوج اس شاہراہ سے گذری تو اُسے پیسز کی جانب سے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس سے خفا ہو کر برطانوی افسروں نے پیسز کو پانچ منٹ کے اندر علاقے کو خالی کرنے کے لئے کہا۔ جب انہوں نے انکار کیا تو برطانویوں نے اعلان کیا کہ وہ جھونپڑیوں کو توپوں سے اڑا دیں گے۔ اس نے خطرے کی گھنٹی بجا دی، اُنہوں نے بچنے کی کوشش کی لیکن اس کے باوجود بہت سے پیسز توپوں کی نذر ہو گئے۔ برطانویوں کو یہ علاقہ بہت فرحت افزا لگا۔ اور اُنہوں نے یہاں ایک قلعہ تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا، جہاں اُن کے سپاہیوں کو کان پور کی چھاؤنی کو چھوڑنے کے بعد پیسز کی جانب سے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا، تاکہ وہ وہاں ستا سکیں اور اپنی قوت کو بحال کر سکیں۔ یہ کہانی اُس علاقے کے پیسز کی اجتماعی یادداشت کا حصہ ہے اور زبانی روایت ہے اور اُسے اکثر ڈراموں اور گانوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ گانا یہ ہے۔

گاؤں 'بانی' بنایا گیا تھا، اور پھر تباہ کر دیا گیا۔
دوبارہ بنایا گیا اور دوبارہ تباہ کر دیا گیا۔
تب بانی کو ایک مرتبہ پھر بنایا گیا اور وہ 'بانی' رہا۔

کہانی آگے بیان کی جاتی ہے کہ اگلے دن جنرل ہیولاک اپنے سپاہیوں کے ساتھ آگے بڑھا تاکہ وہ ریذیڈنسی میں پھنسے ہوئے سپاہیوں کو آزاد کروا سکے۔ ایک مرتبہ اُسے پھر انڈین آزادی کے جنگجوؤں کے غیض وغضب کا سامنا کرنا پڑا۔ (لیکن) اس مرتبہ عالم باغ بھویا بھون میں اس لڑائی میں دونوں انڈین اور برطانوی سپاہیوں کا جانی نقصان ہوا۔ جب جنرل، دلکشا باغ تک پہنچا تو اُسے دوبارہ انڈین باغیوں سے لڑنا پڑا۔ ان واقعات نے برطانوی سپاہیوں سے (بھاری) قیمت وصول کی۔ اور ہیولاک کی قوت کو نڈھال کر دیا۔ وہ بیمار پڑ گیا اور بالآخر 24 نومبر 1857 کو اپنی بیماری کے ہاتھوں زندگی سے شکست کھا گیا۔ اُسے عالم باغ کے انگریزی قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ یہ کہانی ملک کی آزادی کی جدوجہد میں پیسز کے حصے کی

دستاویزی شہادت میں ریکارڈ کی گئی ہے۔ جہاں سے یہ ایک مرتبہ پھر دِلتوں کی زبانی یادداشتوں میں منتقل کر دی گئی ہے۔

ایک اور کہانی جو بہت دمکتی ہوئی اصطلاحات سے بیان کی جاتی ہے، اودھا دیوی کے خاوند 'مکہ پاسی' کے بارے میں ہے جس نے اپنی بیوی کی طرح اپنی زندگی بغاوت کی نذر کر دی۔ یہ واقعہ 10 جون 1857 کو پیش آیا۔ جب برطانوی سپاہیوں کی ایک چھوٹی بٹالین ہنری لارنس کی زیر قیادت 'آوادھ' سے 'چن ہیٹ' کی جانب جاتے ہوئے 'بارا بانکی' سے گذر رہی تھی۔ 'چن ہیٹ' کے گاؤں میں 'مکہ پاسی' نے دوسو پیسز کی فوج اکٹھی کی اور بہت سے سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اُس خطرے کو محسوس کرتے ہوئے لارنس نے 'مکہ پاسی' کو گولی ماردی تاکہ اُسے مزید سپاہیوں کو مارنے سے روکا جا سکے۔ 'پاسی' کے اولیاء کے تذکرے میں یہ دعوٰی کیا جاتا ہے کہ 'اودھا دیوی' اور 'مکہ پاسی' دنیا کی تاریخ میں وہ واحد جوڑا ہیں جہاں دونوں شریک (حیات) شہدا بن گئے ہیں۔ اس جوڑے نے نہ صرف پاسی کمیونٹی کے وقار میں اضافہ کیا بلکہ تمام ملک کو بھی (عزت و توقیر دی)۔

بیان، شناخت اور مقام (جگہ) کی تلاش

'دلت' نے اپنے 1857 کے بیانات کے ذریعے نہ صرف اپنے ہیروز کو مقام دینے کی کوشش کی ہے بلکہ بیانات کے بڑے دھارے سے اونچی ذات کے موجود ہیروز کا تختہ الٹنے کی سعی بھی کی ہے۔ یہ بیانات اونچی ذاتوں کی تصویر کشی غداروں، سازشیوں اور اپنی دھرتی ماتا سے بدعہدوں کی شکل میں کرتے ہیں۔ ان بیانات کے ذریعے وہ یہ بھی ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اونچی ذاتیں تاریخ اور سیاسی منظر پہ قابض ہو کر اب خود کو تمام کمیونٹیز میں سے سب سے زیادہ قوم پرست ظاہر کرتی ہیں۔

جھالکر بائی کی کہانی کے ذریعے سے بھی، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ (ارنی) لکشمی بائی کے سنگ لڑی تھی۔ 'دلت' یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ملکہ اقتدار کی ہوس میں مبتلا تھی۔ وہ برطانیوں کے خلاف لڑنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ محض جھالکرابائی کے زیر اثر ایسا کرنے پر رضامند ہوئی تھی۔ 1857 کی جدوجہد کے بعد وہ ایک شہید نہیں بنی بلکہ اس نے خود کو پرتاپ گڑھ کی جاگیر میں

چھپا لیا تھا۔

ان بیانات کی تاریخی سچائی پر ایک سوالیہ نشان ہے۔ لیکن ان کہانیوں کی تخلیق اور بیان کے پیچھے کارفرما سیاست بڑے دھارے کے بیان کردہ مستحکم ہیروز کو سرنگوں (کا تختہ الٹانا ہے) کرنا ہے۔ ایک سہ رخی بعید از مطلب حکمت عملی اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اپنائی گئی۔ پہلا (یہ) ہے کہ 1857 کے واقعات کے متعلق بڑے دھارے کی تحریروں کی مسخ شدگی کے بارے میں الزامات تراشنا۔ دوسرا (یہ کہ) اپنے ہیروز کو آزادی کے جنگجوؤں کی حیثیت سے مستحکم کرنا۔ اور تیسرا یہ کہ زمینداروں، جاگیرداروں، سماج کے امیر طبقوں کو برطانیہ کے مددگاروں کی حیثیت سے سازشی تھے۔ تعلیم یافتہ انڈین دانشور (طبقہ) پر بھی برطانیہ کی مددگاری (کے باعث) سازشی ہونے کا الزام تھا۔ اپنے کتابچے ''سپاہیوں کی بغاوت 58-1857، ایک انڈین دغا بازی'' کے پیش لفظ میں اے۔ کے۔ بس۔ واس، جو کہ مغربی بنگال کا 'دلت' تھا اور بعدازاں ایک IAS افسر بن گیا نے لکھا۔

''انڈیا کی تاریخ تعلیم یافتہ انڈینز کے ہاتھوں نپی تلی مسخ شدگی کا شکار رہی ہے۔ زندگی کے بہت سے شعبوں میں ایسے واقعات بے انت ہیں۔ سپاہیوں کی بغاوت (58-1857) ابھی صرف دو سو سال بھی پرانی نہیں ہوئی ہے اگرچہ ہمعصر لٹریچر (ادب) کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ جو بالکل اُسی طرح کے جنونی پاگل پن کا شکار ہو چکا ہے۔ (جس کی حیثیت جنونی کیفیت سے مسخ کر دی گئی ہے۔ مترجم) سچائی کو قالین کے نیچے چھپا دیا گیا ہے۔ آج سپاہیوں کی بغاوت کو تعریفی انداز میں عالمی طور پر انڈیا کی آزادی کی پہلی جنگ قرار دیا جا رہا ہے (اور اُس لمحے کو) جب باغیوں نے ایک انتہائی طاقتور ایمپائر کے خلاف بغاوت کے پرچم کو کھولا تھا (قابل تعریف کہا جا رہا ہے) تاہم ہم عصر لٹریچر (ادب) ایک انتہائی مختلف بلکہ حیران کن تصویر کو پیش کرتا ہے۔ سپاہیوں کو اُس وقت سازشی، دغاباز، شیطان اور غلط کار وغیرہ کہا جا رہا تھا۔ انڈین صحافی سخت ترین اصطلاحات میں اُن کی مذمت کر رہے تھے۔ دوسری طرف جاگیردار طبقے نے شاہی فوجوں کو مضبوط اخلاقی اور مادی امداد فراہم کی، جنہوں نے اس بغاوت کو کچل دیا۔ اس واضح تضاد کا ذکر ہمارے وقتوں کی تاریخ کی نصابی کتابوں میں نہیں ملتا جس کی وجہ کو تلاش کرنا کچھ زیادہ دور (دشوار) نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس کا علم آج کی نسل کو ہے۔''

ماضی کے ان بیانات کو 'دلت' (موجودہ) جاری سماجی جدوجہد میں قوت حاصل کرنے کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ وہ حال کے ذریعے ٹوٹے ہوئے، اور مقابلے سے بھرپور ماضی کی ساختِ نو کی سعی کر رہے ہیں اور 'دلت' کی تمام ذاتوں کے لئے اتھارٹی کی پوزیشن حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ماضی کی ازسرِ نو ساخت کے اس عمل کی بنیاد اُن کے خلاف روا رکھے گئے ہم عصر سماجی سیاسی اور ثقافتی تجربے کے امتیاز کی بنیاد پر ہے جس کا سامنا اُنہیں روزمرہ کی زندگی میں کرنا ہوتا ہے۔ وہ اپنے موجودہ وقت کے تجربات کا تعلق اپنے دور افتادہ ماضی سے جوڑتے ہیں۔ اور موخرالذکر کی تصدیق اُس کی تاریخی حیثیت قائم کر کے کرتے ہیں۔ چنانچہ دلتوں کے لئے تاریخ کی دریافت، اپنی کمیونٹی، قوم اور سماج قربانی کی پرانی ریت (رسم) کو قائم کرتے ہوئے، اپنی شناخت کے لئے جواز حاصل کرنا ہے۔ اس مفہوم میں یہ تجویز کیا جاسکتا ہے کہ ماضی ایک اتھارٹی (قوت) ہوسکتا ہے لیکن اس اتھارٹی کی فطرت کو تبدیل ہوتے ہوئے بے ڈول اور مداخلت کے تابع کیا جاسکتا ہے۔

تاریخوں کی ازسرِ نو ساخت اور مستقبل کی سیاست

دِلت کے لئے 1857 کی آزادی کی جنگ سے اپنا رشتہ جوڑنا کیوں ضروری ہے؟ اور اس واقعے سے جڑے ہوئے (وابستہ) بت/شبیہات بہت سے دوسرے واقعات کی مناسبت سے کیوں زیادہ اہم ہیں؟ 1857 اُن کے لئے کیوں کر اہم ہے؟ اُس کی ممکنہ وجوہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس عرصے کے دوران واقعات کی دستاویزی حیثیت پورے طور پر معتبر نہ ہو۔ چنانچہ دلتوں کو اپنی تاریخ ایجاد کرنے کے لئے بہت سی جگہ/گنجائش مل گئی ہو اور جہاں وہ اپنے ہیروز کو (بھی) وضع کرسکیں۔ عام لوگوں بالخصوص 'دلتیوں' کے لئے 1857 کی بغاوت ایک انتہائی رومانوی (اہمیت کی حامل) ہے، کیونکہ بہت سے مقامی ہیروز کی خصوصیات رکھنے والے (افراد) دیسی ہتھیاروں کی مدد سے برطانویوں کے خلاف بہادری سے جنگ لڑے تھے۔

(عام لوگوں بالخصوص 'دلتیوں' کے 1857 کی بغاوت ایک انتہائی رومانوی حیثیت کی حامل ہے کیونکہ اس میں بہت سے مقامی ہیروز کی خصوصیات رکھنے والے (موجود) ہیں جنہوں نے انگریزوں کے ساتھ دیسی ہتھیاروں کے ذریعے انتہائی دلیری سے جنگ لڑی)۔

یہ بیان ایسے ہیروز کی تخلیق کا موقع فراہم کرتا ہے جن کا تعلق اُن کی کیمونٹی سے ہو اور جن کے ساتھ یہ اپنی شناخت کرواسکیں۔ ان ہیروز کی تصدیق کرنا ایک بحث طلب (معاملہ) ہے۔ لیکن ان کے پاس (اتنی) قوت ہے کہ یہ لوگوں کے تصور کو ہلا (کررکھ) سکیں جبکہ دوسری جانب جو واقعات بیسویں صدی میں رونما ہوئے اُن کی دستاویزات پوری طرح موجود ہیں۔ کیونکہ اُس عرصے کے قائدین نے انڈین آزادی کی متحد اور یکساں (ایک جیسی) کہانی تشکیل دینے کی کوشش کی۔ اس نے 'دلت' کو بہت تھوڑی گنجائش فراہم کی، کیونکہ کہانی پہ بالائی سطح (ذات) کے قائدین کو فوقیت حاصل تھی، انہیں (دلتوں کو) جن کے پیچھے چلنا پڑا۔ یہ درست ہے کہ بہت سی نچلی ذات کے لوگوں نے عدم تعاون، انڈیا چھوڑنے، اور ایسی دوسری تحریکوں میں اپنی زندگیوں کی قربانی دی، لیکن عظمت بالائی ذات کے لیڈروں کے حصے میں آئی جنہوں نے انہیں (تحریکوں کو) ترتیب دیا تھا (منظم کیا تھا)۔

1857 کی تحریک زیادہ تر شمالی ہندوستان کے علاقوں تک محدود رہی۔ جس نے اس علاقے کے دلتوں کے لئے جو ہیروز کی تلاش میں تھے اپنے ہیروز کی ایجاد کرنا، اور اُنہیں ایسی جگہوں پہ آباد کرنا سہل کر دیا جہاں نچلی ذاتوں کا اجتماع ہو جیسے کہ آوادھ، بندل کھنڈ، اور بھوج پور۔ ان واقعات کی یاد محض دلتوں کی یادداشتوں کا حصہ نہیں ہے بلکہ اُس علاقے کی وسیع اجتماعی یادداشت کا حصہ ہے جس کا انعکاس گانوں، ڈراموں، اور مشہور ثقافت کے دوسرے واسطوں سے بھی ہوتا ہے۔ اس حقیقت نے 'دلتیوں' کو اس قابل بنادیا کہ وہ اپنے ہیروز اور اپنی تاریخ کو ایجاد کرسکیں، جو دونوں (یعنی) مقامی ہیروز بھی بن سکیں اور تمام کیمونٹی کے لئے روزمرہ جدوجہد میں وقار اور عزت نفس کے لئے شناخت کی علامت بھی بن سکیں، 'دلت' لیڈر یہ سمجھتے تھے کہ اپنے آپ کو قومیت کے بیان کے ساتھ منسلک کرنا، اور آزادی کی جدوجہد میں اپنے کردار کو موثر بنانا انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ تاہم آزادی کی تحریک کے اہم حصے میں اُنہیں گنجائش کو تلاش کرنا دشوار ہو گیا کیونکہ جب 'دلت' کے ابھرنے کی جدوجہد زور پکڑ رہی تھی تو اُن کے لیڈر بی۔ ر۔ ایمبیڈ یکر کے گاندھی کے ساتھ اختلافات پیدا ہو گئے۔ جو کہ اُس عرصے کا سب سے اہم قائد تھا۔ چنانچہ اُن کے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ باقی نہیں تھا کہ وہ اپنے ہیروز کو 1857 کے انقلاب میں تلاش کریں، تاکہ ریاست کی مخالفت مول نہ لیں جس نے قومیت پرستانہ بیانات کو جائز قرار دیدیا تھا۔ کیونکہ

ریاست کے ساتھ گفت وشنید دلتوں کی قومیت پرستانہ حکایت کے ظہور کے لئے انتہائی مددگار ہو سکتی تھی وہ اسے نظر انداز کرنے کی حماقت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ نہ تو ایمبیڈکر اور قومیت پرستانہ تحریک پر اُس کے بیان کی نفی کر سکتے تھے اور نہ ہی برتر (فوقیت شدہ) قوم پرستانہ بیان کی (نفی کر سکتے ہیں) جسے موجودہ ریاست کی بنیاد کی حیثیت سے بلند/نمایاں کیا جارہا ہے۔ ان دونوں کے درمیان توازن کو برقرار رکھنے کی کوشش نے 'دلتیوں' کو قوم پرستانہ بیان کے اندر اپنے ہیروز کی تلاش پر مجبور کیا۔ اور وہ واقعات جنہوں نے انہیں ایسا کرنے کی گنجائش فراہم کی وہ 1857 کی جدوجہد تھی۔

ایک اور وجہ جس کے باعث 'دلتوں' نے 1857 کی جدوجہد سے اپنے تعلق کو قطعی/لازمی سمجھا، تاکہ بی۔ جے۔ پی سے تعلق رکھنے والے کچھ دانشوروں نے 'دلتوں' پر قومی مخالف کا جو الزام لگایا تھا اُس کا توڑ کیا جا سکے۔ ان دانشوروں کے مطابق ایمبیڈکر گاندھی کی زیر قیادت بڑے دھارے کی قومیت پہ مبنی تحریک کے خلاف تھا۔ اور اُس نے بسا اوقات برطانویوں کی حمایت کی۔ یہ مثالیت پسند 'دلتیوں' کا قد یہ کہہ کر چھوٹا کرنے میں مصروف تھے کہ انہوں (دلتیوں) نے انڈیا کو برطانویوں کے لئے فتح کیا۔۔۔ دسھا داور 'باہلیاز' 1757 میں لارڈ کلائیو کے لئے پلاسی کی جنگ لڑے۔ دلت کی اپنی تاریخ لکھنے کی کوششوں کی مخالفت کی ایک سعی میں اور قومیت کے بیان کے بڑے دھارے کو پھاڑنے کی خاطر "آل انڈیا کی تاریخ کو مجتمع کرنے کا منصوبہ" (آل انڈیا ہسٹری کمپائیشین پروجیکٹ) جس کی تشکیل R.S.S نے کی تھی تاکہ تاریخ کو R.S.S کے نظریات کے مطابق ڈھال کر پیش کیا جائے، (R.S.S) نے 17 اور 19 جولائی 1999ء کے درمیان الہ آباد میں ایک کنونشن منعقد کروایا۔ اس کنونشن میں محافظ 'مورا ایشوار نیل کنٹھ پنگامے' نے رائے دی کہ شودروں، گوالوں اور قبائلیوں کی تاریخ لکھنے کے باعث سماج کے حصوں میں نفرت پیدا ہوئی، اور اس نے مکمل/مطلق انڈین سماجی زندگی کے لئے مسائل تخلیق کئے۔

ایسے بیانات کے ردعمل کی غرض سے 'دلت' 1857 کی بغاوت میں اپنے کردار پہ زور دینے پر مجبور ہو گئے۔ اُنہوں نے کہا کہ 1857 کے ساتھ اُن کی وابستگی نے انڈیا کی قومی تشکیل کی تاریخ میں انہیں ایک ممتاز مقام دیا ہے۔ بی۔ جے۔ پی اور ر۔ ایس۔ ایس کے ممبران کی آرا کے درمیان فرق بالکل واضح تھا جب یو۔ پی کے گورنر 'سورج۔ بھان' نے اسی کنونشن میں اُن کو

سرزنش کی جو آزادی کی جنگ میں 'دلتیوں' کے کردار کی نفی کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور اُس (سورج بھان) نے کہا کہ اُنہوں (دلتیوں) نے عظیم تر ممکنہ حد تک آزادی کی جنگ میں حصہ لیا تھا۔ اُس نے کہا یہ 'وال مِکی' ہی تھا جو رامائن کا مصنف تھا، جو دلت کی کمیونٹی سے تعلق رکھتا تھا۔ اُس کے بغیر کسی کو بھی راما اور سیتا کے بارے میں کبھی کوئی علم نہیں ہونا تھا۔ اُس نے 'جھلکاری بائی' کا نام بھی لیا جو جھانسی کی رانی کے بھیس میں آزادی کی پہلی جنگ میں بہادری سے انگریزوں کے خلاف لڑی تھی۔

VI

بہت سارے مقامات اور مقابلہ کرتی ہوئی سیاست

دستیاب شدہ بکھری ہوئی اطلاعات کو پڑھنے کے بعد اور اُن بیانات کو جو نیچی ذاتوں کی لوک کہانیوں اور لوک رِیتوں میں ظاہر ہوتے ہیں، یہ عیاں ہے کہ ان ذاتوں کے بہت سے لوگ 1857 میں سرگرمی سے شامل تھے۔ درحقیقت جس بڑے پیمانے پر اس بغاوت کا آغاز کیا گیا تھا وہ ان ذاتوں کی شمولیت کے بغیر ممکن ہی نہ تھا۔ لیکن یہ غور کرنا دلدوز ہے کہ ان کے حصے کو نہ کبھی دستاویزی شکل دی گئی اور نہ انڈیا کی تاریخ نویسی میں (انہیں) تسلیم کیا گیا۔

نچلی ذاتوں کے کردار کا جو کوئی بھی تھوڑا سا ذکر ملتا ہے وہ محض کسی بادشاہ، جاگیردار یا زمیندار کے نوکر کی حیثیت سے ہے۔ جس نے یا تو ان کے حصے کی نفی کر دی ہے یا اُنہیں بغاوت کی تاریخ میں حاشیے (علیحدہ کونے) میں کھڑا کر دیا ہے۔ (رائے 2005)۔ یہ درست ہے کہ 'جھلکاری بائی' کی کہانی کا 'لکشمی بائی' سے اور 'اودھا دیوی' کی کہانی کا 'بیگم حضرت محل' سے تعلق ہے، لیکن ایک ایسے وقت میں جب بہت سارے بادشاہ اور جاگیردار اپنی قوت کو برطانیہ کے ساتھ اُس سے فائدے اٹھانے کے لئے شامل کر رہے تھے تو نچلی ذات کی ان بہادر جنگجوؤں کے کردار کو درست تاریخی پس منظر میں دیکھنا اشد ضروری ہو گیا ہے۔ ان مثالوں سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ انگریزوں کے خلاف بغاوت میں 'دلیت' نے اونچی ذات، بادشاہوں، ملکاؤں اور جاگیرداروں کے ساتھ مل کر انتہائی اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس کے علاوہ دلت مورخ نچلی ذات کے ہیروز کی ایسی بہت سی مثالیں پیش کرتے ہیں جنہوں نے کسی اونچی ذات کے بادشاہ یا ملکہ سے وابستہ ہوئے بغیر اپنی

حیثیت میں انگریز کے خلاف جنگ لڑی، بہت سے انتہا پسند ایمبیڈ کر کے پیروکار، اور بائیں بازو کے صحافی اور عالم، جو باغیوں کو غیر مطمئن جاگیرداروں، بادشاہوں، سپاہیوں اور کسانوں کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ 'دلت' کے (اس) کردار کی نفی کر رہے ہیں۔ (کمار 12:2002) 'دلت' دانشور جنہیں BSP کی حمایت حاصل ہے جو مقامی ہیروز، تاریخوں، ڈھونگ/قصوں اور حکایات کا استعمال کر کے 'دلت' کو زمینی سطح سے متحرک کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں یو۔ پی جہاں 1857 کے بہت سے واقعات رونما ہوئے، کے علاقے کی زبانی تاریخ میں وسائل کی دولت ہاتھ آئی ہے۔ (فرائن 2006) پارٹی کی سیاسی حکمت عملی ان ہیروز کی کہانیوں کے بارے میں بتانا اور دوہرانا ہے۔ بارہا اُن کی کہانیوں کے گرد جشن ترتیب دینا اور اُن کی یادگاریں بنانا ہے تا کہ عام لوگوں کی نفسیات میں اجتماعی یاد کی تشکیل ہو سکے۔ کہانیاں اس انداز سے بیان کی گئی ہیں کہ 'دلت' نے زیادہ اہم کردار سرانجام دیا ہے۔ بہت سی کتابیں جیسے کہ سواتن تراتا، سنگرام میں اچھوتوں کا یوگ دان، (ڈنکر 1990) جھوٹی آزادی (مدن 1987) ''پاسی سماج کا سواتن تراتا میں یوگ دان'' (پاسی 1998) دلت دستاویج (وردوہی 1989) وغیرہ وغیرہ۔ دستاویز 1857 کی بغاوت میں مختلف دلت ہیروز کا حصہ۔ یہ بیانات اُن کی مدد کرتے ہیں کہ وہ قومی تعمیر کے ہمعصر عمل میں ایک قابل تعظیم مقام کا دعویٰ کریں، اور ریاست کے کفالت کردہ ترقیاتی منصوبوں میں ایک بڑے حصے کا مطالبہ کریں اور دوسرے جمہوری فوائد کا حظ اٹھائیں۔

قومی تعمیر کے عمل میں اُن کے کردار کو بارہا بیان کرنے سے حاشیے کی جانب کونے میں دھکیلی گئی کمیونٹیاں تحفظات کی حمایت میں اخلاقی منطق کو اور اپنے لئے سماجی انصاف کو آگے بڑھاتی ہیں۔ وہ تکرار کرتے ہیں کہ اگر چہ اُنہوں نے اس قوم کی تعمیر و تشکیل میں اپنا خون اور پسینہ بہایا ہے اور اس کی (ریاست) ترقی میں اُن کے تاریخی کردار کے باوجود ریاست نے اُنہیں اُن کے سماجی، ثقافتی اور معاشی نقصانات سے باہر آنے میں کوئی مدد فراہم نہیں کی۔ ان بیانات کے ذریعے وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قومی تعمیر کی ریکارڈ شدہ تاریخ میں اُن کے کردار کو (تسلی بخش) کافی حد تک تسلیم نہیں کیا گیا اور آزادی کی جدوجہد میں اُن کے حصے کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ (ڈنکر)

دلت سیاستدان اور دلت دانشور، تاریخ، یادوں، اور 1857 کے بتوں کو اپنے راستے میں مختلف طریقوں سے استعمال کر رہے ہیں۔ پہلے (پہل) جب 'ذات' (پات) کی کانفرنس کی تنظیم

بحیثیت شناختی تشکیل کے ایک قدم کے طور پر ہوئی تو اُنہوں نے ایسے پوسٹرز اور ہینڈ بل چھاپے جن میں 1857 کی جدوجہد (کے دوران) میں اُن کی ذات کے ہیروز کے حصے کا ذکر تھا۔ دوسرے۔ وہ ریاست سے اپنا مطالبات کو 1857 کی تحریک میں اُن کے کردار کے نعم البدل کے طور پر صحیح ٹھہراتے ہیں۔ تیسرے۔ انتخابی مہم کے دوران BSP کے قائدین نے 1857 کی تحریک کے اُن ہیروز کے کردار کو نمایاں کیا جن کا تعلق اُس ذات سے تھا جن (لوگوں) سے وہ مخاطب تھے۔ چوتھے۔ بہت سی ذاتوں نے، ریاست کے پالے ہوئے تعصّبات کے خلاف عوامی جدوجہد میں پوسٹرز اور پمفلٹ شائع کئے جن میں اُنہوں نے 1857 کی جدوجہدِ آزادی میں اپنے کردار کا تذکرہ کیا۔ بہت ساری ذاتیں پرانے نوآبادیاتی ایکٹوں (قوانین) کی بنیاد پر، جن کو ابھی بھی پولیس لاگو کئے ہوئے ہے حالانکہ وہ ختم کئے جا چکے ہیں، ابھی بھی مجرم گردانی جاتی ہیں۔ ایسی ذاتوں کا کہنا ہے کہ جب بالائی ذاتیں انگریزوں کے ساتھ ملی بھگت میں مصروف ہو کر رائے بہادر کے خطابات حاصل کر رہی تھیں اور دلت کے اجداد کی ملکیتی زمین پر قبضہ کرنے میں مصروف تھیں تو اُس وقت یہ (دلت) برطانویوں کے خلاف نبرد آزما تھے۔ طیش میں برطانویوں نے انہیں (دلتوں کو) 1871، 1896، 02-1901، 1909، 1911، 14-1913، 1919، اور 1924 کے کریمنل ٹرائب ایکٹس کے تحت ''مجرم قبائل'' قرار دے دیا۔ اگرچہ اب ان قبائل کے خلاف نوٹس واپس لے لئے گئے ہیں لیکن جب کبھی کوئی مجرمانہ سرگرمی عمل میں آتی ہے تو پولیس پہلے سے تحریر شدہ بیانات پر عمل کرتے ہوئے سب سے پہلے ان قبائل کے ممبران کو گرفتار کرتی ہے۔ (ڈنکر)۔ اس طور کے ریاستی جبر کے خلاف احتجاج کے طور پر یہ کمیونٹیاں احتجاج ترتیب دیتی رہتی ہیں۔ اور پوسٹرز اور ہینڈ بل شائع کرتی رہتی ہیں جن میں وہ 1857 کی تحریک میں اپنے کردار کا تذکرہ کرتی ہیں۔

چنانچہ 1857 کی یاد بہت سے دوسرے طریقوں سے 'دلتوں' کی اجتماعی نفسیات میں ابھی تک زندہ ہے۔ جو انہیں روزانہ سماجی، معاشی اور سیاسی استثنیٰ اور تفریق جس کا وہ سامنا کرتے ہیں، کے خلاف اُن کی جدوجہد میں اُن کو متاثر کرتی ہے۔

❁❁❁❁❁

1857 کی بغاوت کے بارے میں

ایک خیال کی مختصر تاریخ

پیٹر روب/ترجمہ: ڈاکٹر صولت ناگی

1857 کے بارے میں نوآبادیاتی نظریات کا زیادہ تر مرکز انڈیا کی فطرت اور اُس طریقے کار پر تھا جس سے اس پر حکومت کی جاسکتی تھی۔ اپنی جگہ آزادی کے بعد انڈین کے دلائل بھی بالکل اسی طرح انڈین قومیت پر بحث کرتے ہوئے پائے جاتے تھے۔ یہ مباحث آج بھی جاری ہیں۔ کیا اُس وقت ایک کثیر الثقافتی سیاست قیام پذیر تھی یا یک ثقافتی شناخت عمل پذیر تھی؟ 1857 کی فطرت پر بہت سے دلائل جیسے کہ ایک بغاوت کے خیال کی تاریخ بھی شعوری دہلیز سے کمتر مفہوم (Subliminal Sense) میں شناخت پر اور قوم کی افزائش پر ایک بحث ہے۔

'ایرک سٹوکس' نے 58-1857 کی بغاوت کی جانب یہاں تک کہ بیسویں صدی کے آخر میں بھی اُس کے ردِعمل کی شدت پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ اُس نے کان پور میں ہونے والے بدنامِ زمانہ مناظر کا حوالہ دیا ہے (جن کے دوران) بھینٹ چڑھنے والوں کو کنویں کے اندر تک ٹھونس دیا گیا تھا۔ اور یادگار کی وہ جگہ جہاں عیسائیوں کے علاوہ تمام انڈین لوگوں کا، آزادی کے حصول تک

داخلہ ممنوع تھا۔ بعدازاں اُسے (یادگار کو) نانا صاحب کے ایک جنرل 'تانتیا ٹوپی' کے کانسی کے پتلے سے تبدیل کر دیا گیا۔ یہ انوکھا بدمزہ اور غلیظ انتقام، 'سٹوکس' کے مطابق علامتوں کی طاقت کا عجیب شہادت تھا۔ مرنے والے یورپین لوگوں کی یادوں کو پامال کیا گیا جبکہ برطانوی ظلم وتشدد کی بھینٹ چڑھنے والے اَن گنت افراد بغیر کسی یادگار کے ختم ہو گئے۔ سٹوکس دلیل دیتا ہے کہ ''دونوں انڈیا اور پاکستان کے لئے یہ بغاوت اُن کی قومی تاریخ کا سب سے اہم اور دیرپا اثر رکھنے والا پرتشدد واقعہ بن گیا تھا۔ ثبوت (یہ ہے) کہ نوآبادیاتی نظام خون کی ہولی کے باوجود قائم رہا۔'' کیا اسی لئے بغاوت مقبول تصور میں ابھی تک اتنی نمایاں ہے (اُسی طرح) آج کے انڈیا میں بھی جیسے کہ انیسویں صدی کے آخر میں برطانیہ میں تھی۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ نمایاں پہلو کی حیثیت سے یہ محض انڈین فوج کے اندر بغاوت اور انڈیا کے کچھ حصوں کی سرکشی نہیں تھی بلکہ یہ برطانیہ کے خلاف انڈین کی بغاوت تھی۔ ایک موجودہ تاریخ دان کے مطابق ''انڈین، ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔'' یہ بغیر کسی تامل کے کہا گیا ہے۔ چنانچہ بغاوت ایک قطعی دوٹوک مرحلہ تھا، اور یہ دو قوموں کی تشکیل کا اظہار تھا۔ یہ مضمون بغاوت کی خصوصیات کے متعلق ہے۔

تعریفوں (definations) سے فرق پڑتا ہے۔ ریاستیں جذبات اور وفاداری سے تشکیل پاتی ہیں اور اس کے علاوہ ذاتی مفادات اور قوت کے بل پر بھی۔ بلاشبہ ٹیکنالوجی اور مادی تبدیلیاں قوموں کی تخلیق کے لئے اہم ہوتی ہیں۔ لیکن یہ اُن راستوں پر عمل کرتے ہیں (جن پر) لوگ خود کو اور اپنے باہم ملنے یا جڑنے کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہیں۔ حالات اور فہم وفراست معاشی اور سیاسی طاقت کے بل پر تشکیل پاتے ہیں۔ لیکن عوامل پیچیدہ ہوتے ہیں۔ قومیں ترقی کرتی ہیں (جیسے کہ محنت کے تعلقات اور پیداوار کے ذرائع اور طریقِ کار) لیکن محض سرمایہ دارانہ نظام کی منطق کے باعث نہیں بلکہ مزاحمت، احتجاج اور قانون کی وجہ سے بھی، جو کہ خیالات اور تجربات کے اظہار ہیں۔ اسے دوسرے طریقے سے دیکھتے ہیں۔ یہاں ایک سرمایہ دار یا سیاستدان یا جنرل کی قوت ہے۔ لیکن عبارت، تنظیم اور فصاحت کی بھی قوت ہے۔ یہ علیحدہ علیحدہ (واضح) ماہیتیں ہیں جو باہم عمل پذیر ہوتی ہیں۔ اپنے اصلی موضوع کی جانب واپس لوٹتے ہوئے۔ 1857-58 کی عظیم بغاوت زیادہ تر اپنے مدرکات اور اصطلاحات کے اثرات کے باعث انتہائی اہم تھی۔ 'سٹوکس' کا ایک اور نقطہ ہے۔ یہ یورپ میں 1848 میں اُٹھتی ہوئی بغاوتوں کی لہر تھی جو 1858 کے بعد

'تائی ہنگ' اور 'نائن' میں گئی۔ لیکن ان سب میں ایک قدر مشترک تھی کہ یہ سب ناکام ہوگئیں۔ انڈین سرکشی اس لئے زیادہ اہمیت کی حامل تھی کیونکہ برطانوی راج بحال ہوگیا۔ اس کی اہمیت کہیں زیادہ ہوتی اگر برطانیہ کو انڈیا سے باہر نکال پھینکا جاتا۔ اس کے مادی اثرات اس کے زمینی اثرات سے کہیں زیادہ کم تر تھے۔

1890 میں ایچ۔ جی۔ کین (جو 1847 سے 1882 تک انڈین سول سروس میں تھا) اس نے طلباء اور کالجوں کے لئے انڈیا کی تاریخ تحریر کی۔ اسے ڈبلیو۔ ایچ۔ ایلن اینڈ کو نے شائع کیا جو ''انڈین آفس کے اشاعت کنندگان تھے۔'' اُس نے غدر اور بغاوت کو (لارڈ) ڈلہوزی کی ضرورت سے زائد اولوالعزم تبدیلیوں کو متعارف کروانے پر موردِ الزام ٹھہرایا۔ ایسی پالیسیاں جنہوں نے دو بڑے مقامی طبقات (ہندو اور مسلمانوں) کو للکارا۔ جو ''اگرچہ غیر مہذب تو نہیں تھے لیکن ابھی انسانی ترقی کے ابتدائی مرحلوں میں تھے۔'' چنانچہ اُنہوں نے عیسائیت کی پریکٹس (عموال) اور خیالات کو ناقابل فہم پایا۔ ہندوؤں نے ''برہمنوں کے خاص طبقات میں'' (موجود) بہت سی شادیوں پہ پابندی کی کوششوں پہ اعتراض کیا۔ اور انہیں بنگال میں جوان ''بابوؤں'' کے انگریزی خیالات کے ذریعے کرپٹ ہونے پر بھی تشویش تھی۔ مسلمان نواب آف اودھ کے معزول کئے جانے پہ چوکنا تھے، (مزید برآں) دہلی کے بارے میں اُن کا خوف اور اعلیٰ ملازمتوں کا نقصان (جس کے باعث) اُنہوں نے دانشمندانہ نصیحت کو نظر انداز کر دیا جس کے مطابق اسلامی قوانین کے تحت نہ تو برطانوی راج کے خلاف لڑنے کی ضرورت تھی اور نہ ہی اس کی اجازت (انڈین لوگوں کو بیگانہ بنانے کا عمل اور اُن کے غیر عقلی تعصب کو تو بغاوت سے بہت پہلے ہی دوہرانے کے عمل کے ذریعے عام طور پر پھیلا دیا گیا تھا) کین، تب 1857 میں زیادہ مادی مقاصد کے تنوع کا اقرار کرتا ہے۔ سپاہی اپنی حالتِ زار کی شکایت کرتے تھے، خاص طور پر جب اُنہیں سمندر پار مہمات پر بھیجا جاتا تھا اودھ میں ہنری لارنس کو اعلیٰ اور کم تر کے میلاپ کا سامنا کرنا پڑا۔ جو مفتوح ہونے کے باعث خفا تھے۔ جائیداد اور مراعات (کھو جانے کے باعث) زخم خوردہ تھے۔ یا فوج سے فارغ کر دیئے جانے کی وجہ سے مشکلات کا سامنا کر رہے تھے یا پھر لکھنو میں عدالت کے خاتمے (بادشاہت کے تمام ہونے) پر کاروبار کے نقصان کے باعث پریشان تھے۔ لیکن (متفقہ) فیصلہ یہ تھا کہ (بلاواسطہ) مداخلت مسئلہ تھی۔ اُن علاقوں کے برعکس جن پہ بالواسطہ

اُن کے اپنے حکمرانوں کی حکومت تھی۔ 'کین' برطانوی ملٹری کی جوانمردی پہ شاد تھا اور اُس کے ساتھ سکھوں کی وفاداری پہ (خوش تھا)۔ وہ اس فتح کے کچھ فوائد بھی بتاتا ہے جیسے کہ ڈائریکٹروں کی عدالت (حکومت) کا خاتمہ۔ فوج کی دوبارہ سے تنظیم، اور مغلوں کا آخری اخراج۔ وہ دونوں یعنی تاریخی تجزیہ اور برطانوی راج کی کامیابی کے لئے نمونہ یا مقدمہ بھی پیش کرتا ہے جو کہ جہاں تک ممکن ہو بالواسطہ ہونا چاہئے لیکن وفاداری کی جانب جھکا ہوا اور مستحکم۔

'کین' جذبات کی اہمیت کا اقرار کرتا ہے۔ اور مزید برآں فوری (انسانی) زندگی کے نقصان، کاروبار میں رکاوٹوں اور مالیاتی و معاشی بوجھ کا بھی اعتراف کرتا ہے۔ اور یورپین اقوام اور مقامی آبادی کے درمیان اچھے تعلقات کی معطلی کی بڑی دوررس قیمتوں پہ بھی غور وخوض کرتا ہے۔ پرانی کلاسیکل تاریخ میں ''کے'' بھی برطانوی راج سے واضح اور گہری بیگانگی کی جانب توجہ دلاتا ہے جبکہ 'مالیسن' ('کینگ' کی کمزوریوں پر وحشیانہ انداز میں حملے کے علاوہ) ایک تفصیلی سازش کی تھیوری کو آگے بڑھاتا ہے۔ بہت سے عہدے دار غیر وفادار مسلمانوں کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ بعدازاں پاکستان کا وہ دوست این سٹیفن (دوسروں میں سے ایک) مسلمانوں کی تقدیر کے انحطاط کو برطانوی انتقام کا نتیجہ بتاتا ہے۔ سید احمد خان نے ابتدا ہی میں برطانوی حکمرانوں میں اپنی ساکھ مفروضاتی اسلامی غداری کے ابطال سے قائم کی۔ (اور وہ بھی) برطانوی نااہلیت کو ملزم ٹھہرانے والوں میں اپنی صدا کو شامل کرتے تھے۔ جبکہ اُسی جانب ایک اور ہم عصر عہدے دار 'چارلس مٹکاف' مسلمانوں کو کسی بھی سازش کرنے کی نسبت سے انتہائی پھوہڑ سمجھتا تھا جبکہ اُس کے خیال میں ''ہندو سازش کرنے میں انتہائی ذہین تھے'' مسلم ذمہ داری اُن کے تشدد کے مظہر اور جنونیت پر فرض کی جاتی تھی جبکہ ہندو تقدیر کے شاکر اور انفعالی (بے مزاحمت) سمجھے جاتے تھے۔ زیادہ تر عہدہ دار وقت کے ساتھ مٹکاف کے نقطۂ نظر کے زیادہ قریب آ گئے جب انہوں نے ہندو احتجاجیوں اور انقلابیوں کا سامنا کیا اور مسلمانوں کو اپنا حلیف بنانے کی کوشش کی۔ ال کارتھل (بی۔سی۔کینیڈی) جو کہ ICS تھا کا جعلی قلمی نام اس بات کا قائل تھا کہ 1857 (محض) ہندوؤں کی بغاوت تھی جو کہ مرہٹوں میں برہمنوں کی برتری کی تحریک کے باعث اٹھی تھی۔ اور جس نے بعدازاں اُن ہندو قوم پرستوں کو متاثر کیا جنہوں نے مغربی راج اور علم کے خلاف ردِعمل کا اظہار کیا۔ کارتھل۔ کینیڈی کے حساب سے بغاوت مغرب کے ساتھ سیکولر جنگ کا

ابتدائی حصہ تھی۔ جو بالآخر ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو گرفت میں لے کر رہے گی۔

الزامات کا مقصد جو بھی ہو۔ ایسی نوآبادیاتی تاریخوں میں ہمیں جانے پہچانے قناعت پسند اور بے خبر (جاہل) فریب خوردہ دستیاب ہو جاتے ہیں جنہیں سنکی یا جنونی اور برطانویوں کے انجانے مخالفین کے درمیان موجود خفیہ میلاپ رکھنے والے (راہ سے) بھٹکانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہ (الزامات) 1857 میں نہیں بنائے گئے تھے اور ثبوت کے طور پر یہ تمام حکومتوں کے رجحانات میں موجود ہوتے ہیں لیکن یقیناً غدر اور بغاوت کے سارے حسابات (شماریات) نے انہیں قابل اعتبار (معزز) بنا دیا اور انہیں مقبولیت بھی دی۔ نوآبادیاتی راج کے دوران عناصر بسا اوقات مختلف صورتحال میں بڑے پیمانے پر دوہرائے گئے۔ جیسا کہ ہم غور کرتے ہیں سیاسی تجزیے کے یونٹ کی حیثیت سے خصوصیت سے مذہبوں پر اُن کا اطلاق کیا گیا اور انڈین مذہبیت سے متعلق لکیر کے فقیروں (غیر متبذل لوگوں) کے ساتھ انتہائی صفائی سے مسلط کر دیا گیا۔

دوسرے نوآبادیاتی مصنفین انڈین لوگوں کے درمیان چاہت کی عدم موجودگی کو کمتر یا واضح کرنے سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ان نتائج کی بھی اپنی جڑیں موجودہ پالیسی اور رجحانات میں موجود ہیں۔ ''رائس ہومز'' نے سوچا کہ اُسے تاریخی اہمیت کے واقعات کے تفصیلی بیانات کو (لازماً) محفوظ رکھنا چاہئے۔'' اس کے دیئے گئے انتخابات دیکھنے میں سادہ ہیں۔ اُس کی بہتات سے دوبارہ اشاعت شدہ کتاب، جس کی اشاعت پہلے پہل 1883 میں ہوئی اُس کا مکمل نام یہ ہے ''انڈین غدر کی تاریخ اور اُس سے پیدا شدہ بدنظمیاں جو اُس کے ہمراہ سول آبادی کے ہمرکاب ہوئیں۔ عنوان (خود) ہی سب کچھ بیان کر دیتا ہے۔ 'ہومز' اس پہ اختتام کرتا ہے کہ غدر سے فوج کے ساتھ بہتر سلوک کے ذریعے، بہتر ڈسپلن کے ذریعے اور یورپین افواج کے زیادہ تناسب سے بچا جا سکتا تھا۔ لیکن ایک مرتبہ جب فوج نے بغاوت کر دی تھی ''تو زمین پر موجود کوئی قوت بھی ان نیم بغاوتی بدنظمیوں کو روک نہیں سکتی تھی۔ بالکل ویسے ہی جیسے کہ بارہویں صدی کے لاقانون اور ظالم نوابوں (بیرن) نے بادشاہ سٹیفن کی کمزوری کا فائدہ اٹھایا اور بعدازاں منصف اور طاقتور بادشاہ پلینٹجنٹ (Plantagenet) کے خلاف لال پیلے ہوتے رہے۔ یا جیسے لندن میں چور اور غنڈے جرم کے بڑھتے ہوئے تشدد کو ہوا دیں۔ اگر پولیس نے بغاوت کی تھی تو تعلقداروں نے بھی کی، محروم زمین کے مالکان، گجروں اور انڈیا کے بدمعاشوں نے حکومت کی کمزوری کی پہلی علامت کو

اپنی خودغرضانہ جبلتوں کی تسکین کے لئے ایک سگنل سمجھ لیا۔'' قصہ مختصر حکومت کی کمزوری کہیں بھی خودساختہ مفادات کی بغاوت کو بڑھاوا دے گی۔ اور یہ ایک بغاوت (ہم غور کرتے ہیں) مایوس، لاقانون اشرافیہ اور موقع پرست مجرموں نے پیدا کی۔ یہاں پر بہت زیادہ بچگانہ پن بھی تھا۔ 'ہومز' لکھتا ہے کچھ باغی سکول کے بچوں کی مانند تھے جو طاقت (اتھارٹی) کی تکریم کے لئے یوں تو تیار ہوتے ہیں لیکن وہ اپنی شرارت کی اندرونی محبت کو راستہ دینا چاہتے ہیں۔ جب اُنہیں محسوس ہوتا ہے کہ اُن کا مالک اُن پہ قابو پانے کی طاقت نہیں رکھتا۔

تب اپنی جگہ (پوزیشن) کو تبدیل کرتے ہوئے 'ہومز' تسلیم کرتا ہے کہ کسی حد تک عوامی ناراضگی (بے چینی) ہو سکتی ہے۔ لیکن کہتا ہے کہ اگر ایسا تھا تو یہ بہت سوں کی حفاظت کی خاطر کچھ زیادہ اقدامات کے باعث تھا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے آخری حصے میں برطانوی لوگوں کے حساب سے یہ سوچنا کسی طور بھی قابل قبول نہ تھا کہ 'ڈلہوزی' اور 'کیننگ' کی غیر ضروری مداخلت کے سبب جذبات چھڑے اور عوامی بغاوت کا سبب بنے۔

حکومت کے بہتری کو بڑھانے کے فرض کو بہت مرتبہ مشتہر کیا گیا۔ 1857 میں مسئلہ کافی حد تک سختی اور پراثر قابو کی عدم موجودگی اور پرانی اشرافیہ کی مخالفت کا تھا جو محروم کئے جانے کے ہی لائق تھی۔ وہ ذہین، بہت سے رابطے رکھنے والا قدامت پسند عہدے دار 'ہرکورٹ بٹلر' 'سر الفرڈ لائل' کے بیان کا حوالہ دیتا ہے۔'' 1857 کا وحشیانہ جنونی پھیلاؤ اپنی علتوں میں رجعت پسندانہ تھا لیکن معلول کی حیثیت سے انقلابی تھا۔ ایک لمحے کے لئے اس نے سلطنت کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا لیکن اُس نے تعمیر نو اور بہتری کے لئے راستے صاف کردیئے'' انڈین آمریت اور اُس میں مخفی اچانک تشدد پہ محض غور کرتے ہوئے لحہ بھر رکتے ہوئے، 'بٹلر' پھرتی سے ملکہ وکٹوریہ کے سمجھوتے کے اعلان کی پراثر زبان کی جانب لوٹتا ہے۔(1858)۔

پہلی نظر میں ایک فرنچ مبصر اور برطانوی سلطنت کا ثناء خواں بغاوت کے ایک اور مطالعے میں ان مخالف برطانوی تناظروں کو (آپس میں) ملاتا ہوا نظر آتا ہے۔ (جو مطالعہ) 'کین' اور 'ہومز' سے ذرا پہلے انگریزی زبان میں شائع ہوا تھا۔ 'یوجین۔ ڈی۔ دال بیزن' کے لئے 1857 کا پھوٹ پڑنا فوج میں مضمر بدنظمی اور ذات (پات) کی روح کے ذریعے پیدا کردہ دیوانگی کی افراتفری جو جذبات اور کمزوری کا مرکب ہے، اس سے منسوب کیا جا سکتا تھا۔ اُس نے سوچا کہ

برطانوی راج کی سب سے زیادہ عمدہ شئے بہت سوں (بہت سارے لوگوں) پر بہت ہی کم کا تسلط تھا۔ جب برطانویوں نے مغلوں کے برعکس اپنے محکوموں کے ساتھ کوئی سماجی تعلق رکھنے کی کوشش نہیں کی، انڈین سلطنت کو ایک ایسے برطانوی (حاکم) مالک کی حیثیت سے مجسم کیا جا سکتا ہے جس نے اپنی قومیت (شہریت) اور تجرد پسندی کو ایک ناقابل عبور رکاوٹ کے ذریعے سے مقامی لوگوں سے جنہیں اُس نے غارت کر دیا تھا، خود کو علیحدہ رکھا۔ یہاں تک کہ جدید تہذیبیں بھی انڈیا پر کوئی اثر چھوڑے بغیر اُس کی دھرتی سے گذر گئی ہیں۔'' تاہم بغاوت قومیت پرستانہ نہ تھی۔ ہندو نہ صرف یہ کہ غیر ملکی حاکموں سے حسد کرتے تھے بلکہ اُن سے نفرت بھی کرتے تھے۔ لیکن اس عجیب و غریب زمین سے محبت (یا محب الوطنی) میں قومیت کا احساس اور آزادی کی بازگشت لوگوں میں موجود نہ تھی۔'' سو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈی۔ وال۔ بیزن انقلاب کا ایک ایسا بچہ تھا جو قومیت اور آزادی کو مساوی سمجھتا تھا۔ اور فرانس کے انجام دیئے ہوئے سلطنت (ایمپائر) سے مشابہت (رکھنے) والے منصوبوں کا بھی پیروکار تھا۔ وہ اُن علامتوں کو دیکھ نہیں پایا کہ ''جدید تہذیب'' کے پہلوؤں کی حوصلہ افزائی جو کہ امیر اور تعلیم یافتہ انڈین اشرافیہ نے اس طرح سے کی کہ جس کے باعث نئی نسلوں تک برطانیہ کو انڈیا میں راج کرنے میں مدد مل گئی اور نہ ہی اُس نے اس حقیقت پر کوئی زور دیا ہے کہ برطانوی راج کا تسلسل یا اُس کی تسلسل گری ایک مختصر اور وہ بھی یورپین مردوں پر محیط لوگوں کی وجہ سے تھی جو کہ انڈین سول سروسز کی بنیاد تھے اور نہ ہی فوج کے عہدہ داروں کی کھیپ کے باعث۔

II

انڈینز میں متوازی اور متعلق فکری اختلافات، روزمرہ کے ماحصل/نتائج کے زیرِ زمین رجحانات کے ساتھ گہرے انداز میں جڑے ہوئے تھے۔ سب سے اہم گرما گرم بحث بغاوت کی قومی خاصیت (کردار) سے متعلق تھی۔ وی۔ ڈی۔ ساورکر نے اسے انڈیا کی پہلی بغاوت کا معروف خطاب دیا۔ بعدازاں اُس کے پیروکاروں نے اسے ہندو تاریخ کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ 'ساورکر' نے پرتشدد مزاحمت کو حق بجانب قرار دیا۔ 1857 میں ہندو مسلمان تعاون پہ غور کیا اور مسلمانوں کے غلبے کو مسترد کر دیا۔ انتقالِ اقتدار کے بعد 'ایس۔ بی۔ چودھری' اور 'ر۔ س۔ مجمدار'

کے درمیان اس بات پر مشہور و معروف کشمکش رہی کہ کیا یہ مقبول بغاوت تھی یا نہیں۔ ان کے تبادلوں (تبادلہ فکر) نے آزادی کے شروع کے برسوں میں بغاوت سے متعلق معنوں کے ایک طویل سلسلے کو اکٹھا (کوزے میں بند) کر دیا۔ اُن کی اہمیت پہ آئندہ (صفحات میں) بحث ہوگی۔ 'ایس۔ این۔ سین' کے نتائج میں بھی مختلف پہلو موجود تھے۔ جس نے یہ تلاش کیا کہ یہ ایک اچانک خود بخود ظہور پذیر ہونے والی بغاوت تھی جو کہ ہر شعبے (طبقے) کے لوگوں سے شروع ہوئی۔ وہ تسلیم کرتا ہے کہ قانون شکن لازمی طور پر محبِ وطن نہیں تھے۔ اُس نے کثیر النوع افعال اور مقاصد کا مطالعہ کیا جو بغاوت میں باہم شریک تھے۔ وہ مانتا ہے کہ ''(اُس وقت) انڈین قومیت کا تصور ابھی تک نومولود (تخمہ) تھا۔'' اور ''انفرادی آزادی کا بھی کوئی تصور موجود نہیں تھا۔''

تمام اطراف کی جانب سے ہونے والی بیدردی کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تہذیب اور بربریت پن کے درمیان جنگ نہ تھی۔ اور نہ ہی انڈینز ہی یورپین لوگوں کے خلاف لڑے تھے۔ کیونکہ کم و بیش 20 انڈینز ہر ایک یورپین کے لئے کمپنی کے ساتھ تھے۔ جو (نہ صرف) لڑاکا بھی تھے بلکہ کیمپ کے پیچھے (ساتھ) چلنے والے بھی تھے۔ تاہم 'سین' اس پر مصر ہے کہ یہ بہر حال ایک بڑی تحریک تھی۔ یہ عوامی خصوصیت (مزاج) کی ایک مقبول بغاوت تھی مورخ حب الوطنی کے ساتھ جدوجہد میں مصروف تھا۔ اور پہلے پہل محبّ وطن (جنگ) جیت گئے۔ اُس نے فیصلہ کیا ''کوئی انحصار کرنے والی قوم ہمیشہ کے لئے غیر ملکی غلبے سے اپنا سمجھوتہ نہیں کر سکتی۔ پھر تاریخ دان (خود کو) سنبھالتا ہے ''پہلے پہل تعلیم یافتہ انڈینز کو مسلح جدوجہد (کی کامیابی) پہ کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ اور بغاوت کی ناکامی نے اُس کے یقین کی تصدیق کر دی۔ اُس نے اپنی اُمیدوں کو برطانوی آزاد خیالی سے وابستہ کر لیا۔ چنانچہ ادھوری تکمیل کی تیاری کے قیاس پہ اُمید کو اُس مخالفت کی خاطر موقوف کر دیا گیا جو کہ گاندھی کی قیادت میں سرگرم تو تھی لیکن عدم تشدد پر مبنی تھی۔

ابوالکلام آزاد نے 'سین' کی کتاب کے دیباچے میں لکھتے وقت سوچ سمجھ کر توازن کو اپنایا ہے جس نے کانگریس کے قائدین کے اُس کے (آزاد کے) جنگجو دستے کی روح کو یکجا کیا ہے۔ یہ وہی تھا جس نے کہا ''اب معروضی تاریخ کا وقت ہے۔'' بغاوت کو سیاسی مباحثے کا حصہ نہیں ہونا چاہئے تھا جبکہ ایسا ہوا تھا جبکہ یہ دعویٰ (اُس وقت) کیا جاتا تھا کہ یہ جنگ اشرافیہ کی کھوئی جانے والی مراعات کی جنگ ہے۔ بہتر طور پر اُس نے یہ کہا ۔ انڈیا کا قومی کردار اس حد تک (گراوٹ کی

نچلی ترین حد) تک گر چکا تھا کہ کوئی بھی متفقہ قیادت تلاش نہیں کی جاسکتی تھی (یا کی جانے ممکن تھی) جو لوگوں کو متحد کر سکے۔ بکھرے ہوئے احتجاج کو منظم اور مربوط دشمن کا مقابلہ کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ تانتیا ٹوپی کو تحفظ کی توقع پر مرہٹوں کے علاقوں کی جانب فرار ہونا پڑا لیکن اُسے بھی اُس کے ایک دوست کی غداری کی بدولت جنگلات میں (موت کا) شکار ہونا پڑا۔ آزاد کو یہ اضافہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی کہ تب سے کانگرس نے انڈینز کو کیونکر متحرک کیا اور مزاحمت کرنا سکھایا۔ اس کے باوجود 1857 میں (وہ حال پہ نظر رکھتے ہوئے اور ذاتیات اور ہندو شاونت، جس نے اس کے پروپیگنڈے کو مسترد کرنے کے عمل کو گھٹانے کی کوششیں کیں) کہتا ہے ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک ارفع درجے کا اشتراک وتعاون تھا، اور باقیماندہ مغل حاکمیت کے ساتھ گہری وفاداری تھی۔ برطانیہ کا مغل حکمرانوں کا تختہ الٹ دینا اور انڈین قابلیت کے لئے احترام کی عدم موجودگی نے بغاوت کی چنگاری کو آگ میں بدل دیا۔ اُس وقت '' آزاد' انڈیا کے صدر تھے۔ انہیں اس بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی کہ اُنہوں نے اپنا ہی ابطال (تضاد) کب پیش کیا۔

بحران کی عمومی تھیوریاں بنیادی طور پر ثقافت (تہذیب) کے تصادم میں یقین رکھتی ہیں۔ اگر یہ (تضاد) مذہب کی بنیاد پر نہیں تھا تب (بکلر کے مشہور بیان کے مطابق) یہ سیاسی جواز (جائز ہونے) کے لئے جدوجہد تھی۔ چارلس مٹکاف ڈی۔ وال۔ بیزن سے سبقت لیتے ہوئے برطانیہ کے خلاف بڑھتی ہوئی عدم چاہت (نفرت) کے دعویٰ کو دوہراتا ہے، جبکہ برطانوی راج ایک '' خنک اور کڑی (آہنی) گرفت '' کے ذریعے پھیلایا گیا تھا۔ کئی لوگوں نے وسیع معاشی ٹوٹ پھوٹ کو اس کی وجہ گردانا ہے۔ تاہم یہ نہ صرف پیچیدہ ہے بلکہ تضادات سے بھرپور بھی۔ 'سٹوکس' کمپنی کی 'احتیاط' پر مصر ہے۔ (یقیناً یہاں مراد غیر ضروری احتیاط ہی ہوگی۔ مترجم) 'بیلے' اور دوسروں نے 19 ویں صدی میں جاری معاشی اور سیاسی تسلسل کو اس کی وجہ بتایا ہے، یہاں تک کہ بہت سے وہ لوگ بھی جو برطانوی اثر کی نوعیت پہ یقین رکھتے تھے اُن میں بھی کمپنی اور نوآبادیاتی راج کے دوران ہونے والے نقصان پہ یکساں رائے نہیں ہے۔ 'موریس' اور 'میک ایلپن' نے بسا اوقات چیلنج شدہ دعوؤں کو جو مارکیٹ کے زیر اثر اور نوآبادیاتی ریاست کی فطرت جو عمومی بہتری میں کمی لانے کی بجائے بہتری کی جانب لے جاتی ہے (کم از کم 1850 کے بعد) کو پیش کیا ہے۔ اس کے مقابلے میں 'مائیکل مان' کے جان ڈالنے والے مطالعے نے برطانوی قبضے کے بعد شروع

سے یہاں تک کہ بہت شروع کے سالوں میں شمالی انڈیا میں بے تحاشا معاشی، سماجی اور ارضیاتی نقصانات کی نشان دہی کی ہے اور کاشت کاروں کی، کی گئی زرعی تبدیلیوں کی بھی جنھوں نے زمین کو اُس کی فطری حیثیت سے کہیں زیادہ پیداوار دینے پر مجبور کیا تھا۔ تاہم اصل مسئلہ بغاوت کے لئے معاشی اور دوسرے عمومی مقاصد/اسباب کے اظہار میں نہیں ہے، دراصل یہ وہ لوگ تھے جو (خودکو) آزردہ محسوس کرتے تھے (اور) اُن کے پاس ایک انتخاب تھا کہ عمل کیسے کیا جائے۔ وہاں جمود ہوسکتا ہے، اجتناب، انفرادی اور اجتماعی احتجاج، سیاسی تنظیمیں یا شورشیں ہوسکتی ہیں۔ عام عوامل کو نہ صرف عام مقاصد کی احتیاج ہوتی ہے بلکہ اُنھیں عمومیت رکھنے والے ذرائع اور ادراک کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا یہ سب کچھ 1857 میں واضح تھا؟

'سٹوکس' نے کسانوں کے لئے اُن کے زرعی تجربے کی مختلف تفصیلات کی خواندگی کے ذریعے مخصوص وضاحتیں تلاش کیں۔ اس سے دلائل کو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا کہ اُس نے کسانوں کی بغاوتوں پر زیادہ توجہ دی ہے۔ اور (جبکہ) اس نے مشرق اور اودھ کی جانب بغاوتوں کو نظرانداز کر دیا ہے۔ اُس کا گرانقدر اضافہ (معاونت) بہت سے علاقوں میں بغاوت کی مادی اور مقامی بنیادوں پہ اُس کا گہرا تجزیہ ہے۔ اُس کے دلائل اُس کے اپنے وقت (زمانے۔۔۔اور جگہ۔۔۔ کیمبرج) کے ہیں جب ذاتی مفاد کو نظریات پر فوقیت دی جاتی تھی۔ بالکل ویسے ہی جیسے تاریخی عوامل نے 'عظیم انسانوں' کا شمار ختم کر دیا تھا۔ اس کے باوجود وہ تمام معاملات جن کا اُس نے تجزیہ کیا ہے اور جنھیں دوسروں نے آگے بڑھایا ہے وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ بغاوت کوئی ہم ربط واقع نہیں تھی۔ اور نہ ہی ایک دوسرے سے متعلقہ واقعات کا پھیلاؤ تھی۔ اس کی بجائے یہ جداگانہ واقعات اور جوابات کے وقوع پذیر ہونے کا انبوہ کثیر تھی۔ جو ایک دوسرے کو مضبوط بناتے تھے۔ بغاوت کے پھیلاؤ اور اُس کی طوالت کا تعلق گروہوں (جتھوں) کے آپس میں جڑے رہنے سے تھا نہ کہ نامحرومیوں کے باعث تھا۔ سٹوکس کو اس حیثیت سے سمجھنے کی ضرورت نہیں کہ اس سے یہ منسلک کیا جائے کہ انڈین لوگوں کے پاس کوئی (ایسے) خیالات نہیں تھے جنھوں نے اُن کے تجربے کو شکل عطا کی۔ لیکن سوچ کا ایسا انداز زیادہ عام نہیں تھا۔ 'منشی جیون لال' جو فوج میں غدر کے بعد اتنا ''خوفزدہ'' تھا کہ ''اُس کے دل نے تقریباً دھڑکنا بند کر دیا تھا۔'' (اس کے باوجود) اپنی پرجوش ڈائری میں دہلی میں اس حادثاتی اور برجستہ بغاوت کی خصوصیت کی حمایت کرتا ہے۔

'مارکوِٹس' بغاوت کے پھیلاؤ کو درختوں کے بغیر (سے عاری) جگہ کی آگ کے محاورے سے تشبیہ دیتا ہے۔ لیکن وہ زور دیتا ہے کہ دوئی تاریخ ساز شخصیتوں کے گرد حقیقی پرستش (کا ہالہ) جوان ہوگئی تھی اور وہ نا قابلِ تسخیر شخصیات تانتیا ٹوپی اور جھانسی کی رانی تھیں۔ 'سٹوکس' کے کام کے اثرات کے ذریعے سے سوچنے میں ابھی تک ہچکچاہٹ کا پہلو ہے، کوئی سنجیدہ مورخ تھا، انڈینز میں اتحاد کے فسانے کو، یہاں تک کہ تمام ہندوؤں کے (مکمل) اتحاد کو تسلیم نہیں کرتا، جنہوں نے پیشگی آزادی کی جدوجہد کو جائز قرار دیا تھا۔ لیکن 'سٹوکس' کی دریافتیں مقبول اور بہت زیادہ عالمانہ فہم کے ساتھ گو بے چینی سے مگر درست بیٹھتی ہیں، 'سین' ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اس کی بجائے بڑی تحریک 1857 دراصل 'کل' مفادات کے اظہار کی تحریک نہیں تھی حالانکہ اس میں بہت سے مشترک رنجشیں ضرور ہوں گی۔ لیکن اس کا تذکرہ ایک عمومی تحریک کے طور پر کیا جاتا ہے۔ ہر لمحے میں جب ہم انڈینز اور برطانیہ یا ہندو یا مسلمانوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔

III

نوآبادیاتی اور قومیت پرستانہ بحثوں میں حیران کن حد تک (بہت کچھ) مشترک ہے۔ جب یہ کلیت کے ایک مقام تک پہنچتے ہیں تو یہ غیر تاریخی ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ کہا گیا ہے 1857 کے تمثالی پیکروں میں غیر متبدل ہونا دو بڑے مخالفین سے متعلق تھا (یعنی) یورپین اور انڈین اور انڈیا کے اندر موجود دو حصے، مسلمان اور ہندو۔ ہمیں علم ہے کہ یہ دونوں (نقطہ ہائے نظر) دھوکے پہ مبنی ہیں۔ لیکن یہ دونوں ہی بغاوت کے مطالعے کے لئے تقریباً ہمیشہ ہی بنیادی حیثیت کے حامل رہے ہیں۔ اور تمام مقبول شماریات میں بدیہی طور پر لازماً مانے جاتے ہیں۔ دونوں طرف انڈیا میں بھی اور برطانیہ میں بھی۔ آیئے ہم انہیں الٹ ترتیب میں دیکھتے ہیں۔

دوسرے غیر متبدل جو کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے بارے میں ہے کے متعلق بہت بحث ہو چکی ہے اور اس مسئلے پر دوبارہ تفصیلاً جگہ بھرنے کی ضرورت نہیں ہے (دوبارہ تفصیلاً بحث کی ضرورت نہیں ہے)۔ 1857 میں یقیناً انڈینز ''دو بڑے طبقات'' میں منقسم نہیں تھے۔ جیسا کہ 'کین' نے شناخت کی ہے۔ اس سے میری ہرگز یہ مراد نہیں ہے کہ اُس وقت کوئی تسلیم شدہ اسلامی جذبہ یا عمل موجود نہیں تھا۔ یا برہمنوں اور کھشتریوں یا شیوا کے پیروکاروں اور دشناوا۔۔۔ یا اسی

طرح غیر ذات (اچھوت) اور تہذیب کی لمبی (دراز) روایات موجود نہ تھیں۔ شناختوں کو موجودہ دور میں ایجاد نہیں کیا گیا بلکہ اُن کا تصور دوبارہ سے بنایا گیا اور اُن پر دوبارہ سے مزید (توجہ) مرکوز کی گئی تمام تر تاریخ میں افعال کا انحصار مختلف طبقوں اور مذہبوں کی انتہائی عمومی اطاعت پر رہا ہے۔ میں نے نام نہاد 'وہابیوں' کے بارے میں یہ نقطہ نظر بنایا ہے اور یہ انیسویں صدی کی مقبول مذہبی اور سیاسی تحریکوں میں واضح ہے۔

بغاوت میں شامل کچھ لوگوں میں عمومی مذہبی جذبہ بھی پایا جاتا تھا۔ لیکن جو'ایرک سٹوکس' نے دکھایا ہے کہ جب وہ تحریر میں لا رہا تھا تو بڑے علاقائی (کمیونل) اور سماجی زمروں کی بہت حمایت کی گئی۔ اور بعد میں آنے والے جدت پسندوں نے بسا اوقات اُنہیں اپنایا اور ایسے (طرزِ عمل نے) 1857 کے رویے کی وضاحت کے لئے بخوبی کام نہیں کیا۔

ایسے نظریات کی پیش قدمی کے لئے عجیب دوہری قدریں (ambivalence) سامنے آتی ہیں۔ ہندو اور مسلمانوں کا طاقت کے تاخیری زمروں کی حیثیت سے ادراک 'فونکولڈین' اور دوسروں کی بے داغ بعد نو آبادیاتی اسناد کے ساتھ عیاں ہوتا ہے جنہوں نے اطاعت اور زمروں کی ایجاد کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے جس سے فرمانبرداریاں (اطاعتیں) اور زمرے ایجاد کئے گئے۔ تاہم اس کے ساتھ ایک بدنام نو آبادیاتی دُم وابستہ ہے۔ ایک طرف تو وہ صحافی اور مصنف 'بیورلے نکلس' (1898-1983) اور ہٹلر کی شکست سے قبل اُس کا ہندوؤں، گاندھی اور فاشسٹ کانگرس پہ غیر معمولی حملہ ہے۔ وہ انڈینز کی موجودگی کا ایک خاص پایے کے انکار سے حرف آغاز کرتا ہے اور بعد ازاں وہ 200 صفحات کے بعد جناح کے ساتھ اپنے انٹرویو کے ذریعے اپنے دیوتا بنانے کے عمل تک پہنچتا ہے۔ وہ (جناح کو) ''ایشیا کا سب سے اہم انسان'' اور دنیا کے سب سے بڑے مسائل میں سے ایک کے حل کے لئے ''سب سے زیادہ قابل انسان'' کہتا ہے۔ 'جناح' نے اُسے بتایا تھا کہ انڈین مسلمانوں کا نظریہ ہندوؤں سے بنیادی طور پر مختلف ہے اور اکثر اوقات ہندوؤں سے جبلی طور پر مخالفانہ ہے کیونکہ وہ مختلف ''ہستیاں'' ہیں اور زندگی میں کوئی بھی ایسی شئے نہیں ہے جو اُنہیں مشترک کر سکے جبکہ دوسری جانب آزاد خیال شاہی معذرت خواہ 'ایڈون بیون' کو بھی شاید زیرِ غور لانا ہوگا جس نے جو اپنے مخصوص انداز سے ایمپائر (سلطنتِ برطانیہ) کو اس باعث درست ثابت کیا کہ برطانیہ نے انڈیا کو خدمات مہیا کیں۔ جب وہ انڈین پیش روی کی

حوصلہ افزائی کے ذکر تک پہنچا تو اس نے انگریزوں کے فکری عدم تصور کی مذمت کی۔ وہ لاکھوں 'انڈینز' کی "سادہ دل قناعت" پر یقین بھی رکھتا تھا۔ اور وہ نہ صرف بڑی علاقائی تقسیم کو بلکہ انڈیا کی چھوٹی چھوٹی سوسائٹیوں (سماجوں) میں اُن کے تھوڑے سے عامیانہ مفادات کی خاطر تقسیم (ٹوٹ پھوٹ) ہونے کو بھی ایک بڑی رکاوٹ کی حیثیت سے دیکھتا تھا۔

انڈیا کی سالمیت کی ٹوٹ پھوٹ پر اصرار بدنصیب بازگشتوں کا حامل ہے۔ چنانچہ انگریزوں میں سے وہ تمام جنہوں نے اپنی ایمپائر کو برتری کی خفگی کے احساس کے باعث معاف کر دیا تھا۔۔۔ جیسے کہ یہ محض فرانس کو (منظر سے) باہر اور مقامیوں کو خاموش رکھنے کی فتح سے ذرا (ہی) کچھ زیادہ ہو۔ سو انہوں نے واپس 'ہنری مین' کی نسبتی سماجی تاریخ پر کان دھرے، اُن تہذیبوں کے ساتھ جو ترقی کے مختلف مدارج میں ہوں۔

'بیون' نے تصور کیا ہے کہ "خواہ کسی غیر ملک کے اندرونی حالات کتنے بھی قابلِ مذمت کیوں نہ ہوں، انگلش سیاستدان کو کبھی بھی اپنے لوگوں کو (اس پر) قبضہ محض خالصتاً خلق دوستی کی حیثیت سے نہیں کرنا چاہئے۔" 'بیون' کی اپنی دی گئی مثال سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بہت کم انگلش سیاستدان جو ایک ایمپائر پہ قابض ہوں اپنی سچائی پہ مبنی انسان دوستی سے کنارہ کشی کر پائیں گے۔

تاہم میں نے کہیں اور لکھا ہے کہ اس آزاد خیال ایجنڈے کے انڈیا کے لئے اپنے فوائد تھے اور اب اس انکار کے ذریعے اس الزام کو مزید بڑھا دیجئے کہ ہندو اور مسلمان نے 1857 میں مکمل طور پر وحدت پہ مبنی زمروں کی حیثیت سے حملہ (اپریشن) کیا تھا۔ اسے بالکل پیچھے چھوڑتے ہوئے کہ (انہوں نے) بڑی بٹالینوں کی حیثیت سے ایک مشترک مقصد کی خاطر جنگ لڑی تھی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے اقوام کے درمیان تصادم کی حیثیت میں بغاوت کا پہلا غیر متبدل (بھی) اتنا ہی مشکوک ہے۔ یہاں ہم واپس لوٹتے ہیں عظیم تحریک کی غیر مصالحانہ قومی مزاحمت کی جانب۔ کیا بالآخر یہ ایک نسل کا معاملہ تھا؟ میں بغاوت کی شدت اور اُس کے دباؤ (کی شدت) کا کم اندازہ نہیں لگا رہا۔ 'کان پور' کے قتل عام میں وحشیانہ دشمنی کا اظہار ہوا۔ اور برطانوی فوجوں نے واپس لوٹتے ہوئے اپنے دشمنوں کو سرِ راہ کھڑے ہوئے (عام) لوگوں سمیت ظالمانہ تباہی کا نشانہ بنایا۔ تمام اطراف سے تمام مذہبی عمارتوں اور دوسرے مخالفانہ نظاموں اور نظریوں کی علامتوں کے خلاف بھرپور غصے کا اظہار کیا گیا۔ بہت سے مصنفین نے بالکل شروع ہی سے برطانوی راج پر

گہرے عدم اعتماد کا حوالہ دیا تھا۔ مٹکاف کے ترجمے میں معین الدین حسن خان کے بیان کے مطابق یہ دعویٰ کیا گیا کہ ''انگریزوں کو مداخلت بے جا کے مرتکب سمجھا جاتا تھا۔''

ہمعصر یورپین، پریس اور بعدازاں یادداشتوں اور داستانوں میں ثقافتی غلط فہمیوں اور نسلی نفرت کی بہت سی شہادتیں مل جاتی ہیں۔ 'کیننگ' کی 'رحمدلی' پہ اُس کے بہت سے ہم وطنوں نے ناک بھوں چڑھائی جو 'ہومز' کے ساتھ متفق تھے کہ بغاوت اس لئے ہوئی تھی کہ برطانوی کمزور تھے نہ کہ تحکم پسند۔

مقامی بغاوتوں کی فطرت کی تفصیلی شہادتوں کے بغیر بھی جو کہ اب جمع کی جا چکی ہیں، یہ سوچنا انتہائی سڑی پن (پاگل پن) ہے کہ برطانیہ کے خلاف بغاوت کے وسیع تر ردعمل کی وجہ 'اُن کا غیر ملکی ہونا تھا'۔ باہر کے لوگوں (غیر ملکیوں یا مختلف الانواع لوگوں) کا انڈیا میں راج میں استثنٰی کے برعکس ایک معمول تھا اور ایسا کئی سو برسوں سے ہو رہا تھا۔ آج شاید ایک مشترک ثقافت اور یقیناً ایک مشترک فرمانبرداری (اطاعت) کے بارے میں سوچا جانا ممکن ہے۔ لیکن 1850 میں آج سے بھی کہیں زیادہ مختلف بہت سی تہذیبیں اور وفاداریاں تھیں۔ کیا یہ 'ڈلہوزی' اور 'کیننگ' کے تحت جدید راج (حکومت) اُن کے پیشروؤں کی نسبت شمالی انڈیا کے لئے عمومی طور پر زیادہ ناپسندیدہ (ناگوار) تھا۔ یہاں تک کہ مدراس، بنگال اور بمبئی کے کمپنی کے پیش روؤں سے بھی کہیں زیادہ؟ حکمران بہت سے لوگوں کو ہر وقت ناراض کرتے ہیں، اور کمپنی نے 1850 میں شمالی ہندوستان میں بہت سے لوگوں کو برافروختہ کیا۔ لیکن اس کے غیر ملکی (ہونے کی) خصوصیت پر عمومی نفرت کی بہت کم شہادتیں (دستیاب) ہیں بالمقابل وجے نگر یا دکنی سلاطین یا اورنگ زیب یا گوا کے پرتگیزیوں یا ٹیپو سلطان کے خلاف، کیا وہ سپاہی جن کے خاندان شاید نسلوں سے کمپنی کی خدمت کر رہے تھے۔ اُنہوں نے میرٹھ میں یک لخت یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اب 'فرنگی' یا 'ملیچھ' کے سکّے کو قبول کرنے کے لئے اصولی طور پر معترض ہیں؟ کیا اودھ کے مفلسی کے شکار کاشتکار نے نئے راج کو (غیر قانونی ہونے کے برعکس) بحیثیت غیر ملکی کے مسترد کر دیا تھا، یہ فرض کرتے ہوئے بھی کہ وہ 1856 کے تسلط کو سمجھ چکا تھا۔ 'مارکووٹ' جو بغاوت کی شکست کو برطانوی بے رحمی اور جبر سے منسلک کرتا ہے لکھتا ہے کہ کچھ مقامی عناصر سکھوں اور گورکھا (نیپالی سپاہی) سپاہیوں نے برطانیہ کی فتح میں بہت مدد کی۔ کیا یہ غدار تھے؟ کیا 1857 میں دیسی (مقامی) یا نیپالی ہونے کے کوئی معنی تھے؟

بغاوت کے لئے غیر ملکی راج کے خلاف ردِعمل کی حیثیت کے لئے دو اطراف یعنی انڈین اور برطانوی یا ہندو/مسلمان اور یورپین ہونے کی ضرورت تھی۔ برطانوی راج کے خلاف نام نہاد انڈین بغاوت کے لئے نسل پرستی کا ہونا ضروری تھا۔لیکن یہ ایک نسلی جنگ نہیں تھی حالانکہ اس شرارت کا خاکہ کچھ ایسا ہی بنایا جاتا ہے۔ نہ ہی یہ ترقی یافتہ اور جہالت زدہ تہذیبوں کے درمیان جنگ تھی۔ یہ حقیقت کہ باغی انڈین نہیں تھے 'سٹوکس' کی اصلاح یا ترمیم پسندیوں کا بغاوت اور اُس کے مقاصد کی فطرت کے بارے میں پیغام ہے۔ سطحی طور پر شمولیت کرنے والوں کے باعث یہ واضح ہے۔ برطانیہ کے ملے جلے حامی اور مخالفین جو کہ زیادہ تر واضح طور پر سماجی، مذہبی اور سیاسی زمروں میں اور مختلف علاقہ جات میں بٹے ہوئے تھے، اُس بڑی تعداد کے ساتھ ساتھ جس نے خود کو علیحدہ رکھا یا اطراف تبدیل کرتے رہے یا (جنہوں نے) ایک تنگ ذاتی مفاد کو پیش نظر رکھا برطانویوں کا کیا ہوا؟ کوئی بھی اوپر بیان کردہ سکھوں اور دوسرے دیسی متحاربوں یا بنگالیوں کو جو برطانوی راج کے ساتھ بالائی علاقوں میں ہجرت کر آئے تھے اور بعض حالات میں بغاوت کا نشانہ بھی بنے، کو کوئی بھی آسانی سے فراموش نہیں کر سکتا۔ مٹکاف غور کرتے ہوئے کہتا ہے ''خون کی ہولی اور تشدد کے درمیان یہاں پر فرمانبردار اور سچے مقامی بھی دستیاب تھے جن کے ذہنوں پر وقت کے جنوں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اور پھر دوبارہ سے ہر کوئی اس سے باخبر ہے لیکن اسے بھول جاتا ہے۔ شہادتوں کو نظر انداز کرنا قصص و روایات کا طریق کار ہے۔ یہ ایک صدمہ ہے کہ 'ایٹن بورو' کی فلم 'گاندھی' میں ایک مرکب انڈین گورنمنٹ کو شان و شوکت سے بھرپور گندھے ہوئے یورپین کی بھری ہوئی میز کی طرح دکھایا گیا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ تین معروف انڈینز پر مشتمل تھی لیکن اس سے کہانی کا مزہ کرکرا ہو جاتا۔ یہ تمثالی پیکروں کی ڈرامائی سادگی کو الجھا دیتی۔ دلیل کے طور پر (میں اس سے انکار نہیں کرتا) یہ ڈرامے کی سچائی ہے۔ 1857 میں بھی باغیوں کے مخالفین برطانوی نہیں تھے۔ اگر بہت سی مختلف اقسام کے لوگ واپس لوٹتی ہوئی افواج کے ساتھ مل کر جنگ آزما ہوئے، یا باقی ماندہ برصغیر میں (اُنہوں نے) اپنی حکومت کو برقرار رکھا (تو 1857 میں بھی باغیوں کے مخالف برطانوی نہیں تھے) بہت سے انڈینز نے نمک حلالی کی بنا پر یا عام انسانیت کی خاطر یورپین اور عیسائی بھگوڑوں کی اعانت کی۔ اگر مقبول اور یہاں تک کہ عالمانہ تاریخ ان غیر سہل پیچیدگیوں پہ نظر دوڑائے جواز خود بغاوت کے بارے میں بتانے کی بجائے ہمیں

بغاوت کے خیال کے بعد کی حیات کے بارے میں ہمیں زیادہ بہتر طور پر بتاتی ہیں۔

IV

غدر کی ان خصوصیات کے نتائج بحیثیت قومیتوں اور اقوام کے تصادم کے، کیا تھے (بحیثیت قومیتوں اور اقوام کے تصادم کے، غدر کی ان خاصیتوں کے نتائج کیا تھے) اس سوال کو دوسری طرح پوچھا جائے کہ آزادی کے فوراً بعد نہ صرف یورپین حکمرانوں بلکہ انڈینز میں بھی بغاوت کی فطرت کے بارے میں گرما گرم بحث کا سیاق وسباق کیا تھا؟ برطانوی نوآبادیاتی مباحثوں کی وجوہات پہ بہت سے مشورے پہلے ہی دیئے جاچکے ہیں اور وہ اتنے واضح ہیں کہ اُن کی وضاحت کی مزید ضرورت نہیں ہے۔ میں یہاں ہندو قوم پرستوں کی بغاوت کی نمائندگی کا پیچھا نہیں کروں گا۔لیکن انڈین ردِعمل کے بارے میں ابھی بھی بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔

نوآبادیاتی دور کے دوران انڈیا کو جدید قومیت کے دو نمونے پیش کئے گئے تھے۔ یہ حسبِ معمول ایک دوسرے سے علیحدہ نہ تھے۔ حالانکہ انہیں انٹرنیشنل قانون کے عالموں (ماہرین) نے ضمناً پیش کیا تھا۔مثال کے طور پر جیمز کرافورڈ نے ایک باب میں حقوق کے تصور کے پھیلاؤ پر بحث کرتے ہوئے، ایسا کیا تھا۔ اُنہوں نے ریاست کی تعریف مکمل طور پر مخلوط (گڈمڈ) انداز میں پیش کی۔ (یعنی) ریاست بحیثیت لوگوں کی علاقائی یا ارضی کمیونٹی کی سماجی حقیقت، جس میں ایک متعین سیاسی تنظیم ہو،لیکن اس کے بعد وہ آگے بڑھتے ہوئے 'بیگ ہارٹ' کی تعریف تک آن پہنچتے ہیں، مطلق فرمانروائی سے متعلق اختیارات اور گروپوں کے تسلسل سے متعلقہ اختیارات کے درمیان تفریق کرنا۔۔ اُسی طرح ریاست کا پہلا تصور جسے میں شناخت کرتا ہوں علاقے کی بنیاد کے گرد گھومتا ہے۔اس پر دوبارہ عمل درآمد مطلق فرماں روائیت کے دعوؤں سے قائدوں اور پالیسی کے ذریعے سے کروایا گیا۔ اور قومی مفاد اور ریاستی ذمہ داری کے نظریات کے ذریعے سے اس نے زمین اور قانون کے شہری پیدا کئے۔ یہ مخفی طور پر کثیر الثقافتی تھا۔ طبقے اور تہذیب (ثقافت) کا مختلف ہونا اس قومیت پرستی کے لئے لازم تھا۔ کیونکہ جائے پیدائش ایک تھی۔ ایک ریاست کے ساتھ مشترک وفاداری تھی۔قوانین کی مشترکہ تابعداری اور قومی منصوبے میں مشترکہ شمولیت۔ اس قومیت کی تشکیل، افعال کے ذریعے، اختیار کے ذریعے

سے، اور فائدوں کے ذریعے سے جن کی تعریف حد بند خلا میں کی گئی، سے ہوئی (سے ممکن ہوئی)۔ جیسے کہ 'سگا تا بوس' کہتا ہے ''جدید نوآبادیاتی سلطنتیں بھاری بھرکم حد تک یورپین قومی ریاستوں کے نمونوں کو جومرکزیت پہ مبنی ساختیاتی اور حکومتِ مطلق کے وحدت پسندانہ نظریات کو حاصل کرتی ہیں۔ اور اُنہیں وصیتاً بعد نوآبادیاتی قومی ریاستوں پر مسلط کر دیتی ہیں۔ 'نکلس ڈرک' بھی اس نتیجے کے اقرار پر پہنچا ہے کہ انڈیا کی حکومتِ مطلق (خودمختاری) کی فہم کو یورپین مباحثوں سے تنہا/جدا کر کے دوبارہ سے تشکیل دینا ناممکن ہے۔ قومیت کے دوسرے نمونے کا انحصار نسلیت اور ثقافت پر ہوتا ہے۔ یہ جدید ریاستوں کی تاریخ میں اہمیت اختیار کر چکی ہے۔ خاص طور پر اپنی لفاظی کی قوت کی بنیاد پر۔ یہاں شہری اپنی چھاپ سے یا قوم بحیثیت کمیونٹی پہچان کی حامل تھی۔ یہ پر اثر طور پر یکساں ثقافت کی حامل تھی۔ ایک بنیادی یکسانیت کا تصور کرنا پڑتا ہے، طبقے کی موجودگی کے باوجود یا دوسرے متحارب مفادات کے موجود ہوتے ہوئے بھی، اگرچہ بلاشبہ انہیں قابلِ ادراک حدود اور روابط کی حدود میں رکھنا ہوتا ہے۔ آئینی ابھار (امتیاز) کا درجہ ایک کسوٹی تھا جو نمائندگی کے مطمعِ نظر کو دیا گیا تھا۔ اگر خود ارادیت مقصد تھا تو ''ذات'' کی تعریف لازم تھی۔ 1857 کی بغاوتوں میں شامل ہونے والے شاید بہت ہی کم تعداد میں تھے جو قوم کے ان تصورات کو سمجھ سکتے تھے۔ اور لیڈر حضرات یقیناً ان کی مخالفت کرتے۔ یہ تفاوت بغاوت کی تاریخ کو بحیثیت ایک 'خیال' کے وضاحت کرتے۔ یہ تفاوت بغاوت کی تاریخ کو بحیثیت ایک نصب العین کے واضح کرتی ہے۔

یورپ اور امریکہ میں جہاں ان نظریات نے جنم لیا تھا دونوں عناصر نے ایک دوسرے کے قریب آنے کی کوشش کا آغاز کر دیا۔ لیکن ہمیشہ دو ممتاز توجیہات کو جوڑنے کے عمل کی حیثیت سے۔ (برطانوی جزیروں میں نقائص زدہ واقعات کا مرکب موجود تھا جو کہ یونائیٹڈ کنگ ڈم (انگلینڈ) میں خلا کی حیثیت سے اور برطانویوں میں عوام کی حیثیت سے موجود تھا۔) اتحاد (Union) کی دستور ساز ریاستوں کے درمیان ہم سری بہتر تھی۔ لیکن بعض اوقات غریب اور امیر کے درمیان کیتھولک اور یہودی یا سکاٹش اور برطانوی کے درمیان عوام الناس کے تعلق کو لازماً تسلیم کرنا پڑتا تھا۔ دوسرے لمحوں میں یہ ٹوٹا ہوا پایا جاتا تھا۔ برطانیہ نے اپنے منصوبوں اور قوانین کے دو نمونوں کے درمیان بھی (ڈولنے کی) حرکت کی ہوگی۔ بعض اوقات دولتِ مشترکہ میں بسنے

والے دور دراز کے لوگوں کے لئے عام شہریت کی کوشش اور دوسری طرف محض سابق (سفید) ہجرت کنندگان کی نسلوں کا برطانیہ میں داخلہ (اور دوسروں پر اس کی پابندی)۔

امریکہ میں جگہ کی شناخت اب تک غالب ہے۔ کیونکہ مختلف قسم کے لوگوں کے امریکہ کے ساحلوں پر پہنچنے اور زمین پر غیر قانونی قبضے اور آبادکاری کے بعد بھی جبکہ وہ پہلے سے موجود شناختوں اور تہذیبوں کے قلوبِ ماہیتوں کو برقرار رکھے ہوئے تھے، ان بہت سے مختلف لوگوں کو امریکن کہا گیا، یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ جب مقامی امریکیوں کو راضی کیا گیا تو انہیں ''تحفظات'' فراہم کئے گئے۔ یا اخراج زدہ کالوں کا (لائبیریا سے راستافیریزیا کالے مسلمانوں کے استثنیٰ کے باوجود) جمہوریہ کے شہریوں کی حیثیت سے، امریکی ہونے کی حیثیت سے مکمل اختیارات حاصل کرنے کا اکثریتی دعویدار ہوتا ہے۔

تاہم جرمنی ایک مختلف روایت ہے اُس کا اتحاد ہزاروں سیاسی اکائیوں سے تخلیق ہوا تھا۔ سو نتیجتاً اُس کا انحصار اُس کے لوگوں (Volk) اُس کی زبان اور اُس کے کلچر پر تھا۔ تیسری ریخ کے مظالم اُسی منطق کے مرضیاتی پھیلاؤ تھے۔ ہٹلر نے جرمنوں کی سرزمین اور اُس کی سرحدوں کی سالمیت کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ اُس نے مفروضاتی جرمن نسل کے خالص ہونے اور جرمنوں کی ترقی کے لئے دعویٰ شدہ مزید جرمن علاقوں کا مطالبہ کیا تھا۔ (Lebensraum) بیسویں صدی کے آخر میں تنبیہہ کے باوجود ''گیسٹر ابٹین'' (Gastarbeiten) مہمان ہی رہے۔ مشرقی جرمن ہمیشہ ایک مشہور جرمن قوم کا حصہ تھے۔ اور روسی ''جرمن'' جو نسلوں تک غائب رہے اور عموماً ''غیر مہذب'' تھے، اُنہیں اُسی طرح سے واپس لوٹنے اور ملکیت کا حق تھا جیسے کہ اُن سے قبل 'سوڈی ٹین لینڈ' کے جرمنوں کو تھا۔ اہلِ اٹلی نے بھی اتحاد کا وہی راستہ اپنایا جبکہ یونانیوں، چیکوسلواکیوں، ہنگریوں اور کیتھولک ائرِش نے بڑی اکائیوں یا مضبوط ہمسایوں سے خود کو علیحدہ کرنے کی کوشش کی۔ یہ بحیثیت عوام تھا کہ انہوں نے قوم بننے کا مطالبہ کیا۔ فلسطینیوں اور کردوں نے بھی علیحدہ قومیت کو اجاگر کرنے کے لئے علاقے کی تلاش کی۔ صیہونیوں کا اسرائیل پر اصرار، یہودیوں کے لئے خطۂ زمین اسی سوچ کی ایک مثال ہے۔ پاکستان کا مطالبہ اور 'ہندووتیا' کا مطالبہ بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ وطن نے لوگوں کا اظہار کیا اور وہ جو کہیں بھی ہیں اُنہیں محفوظ کیا۔ (وطن) جو کہ توضیع شدہ شہریت کا عکسی تمثالی پیکر ہے (آئینہ دار تمثالی پیکر) اور جسے سرحدوں کی ریاست نے

گھیر رکھا ہے۔ بحثیت عوام، تقسیم (تقسیمِ ملک) اور یہاں تک کہ نسلی 'غارت گری' قومیت کے اس نمونے سے کچھ زیادہ دور نہیں ہوتے۔

جیسے کہ دوسری جگہوں پر ہوا، جنوبی ایشیا میں دو نمونے یا عناصر اکٹھے رہے یا ایک دوسرے کے اوپر خود کو منڈھا دیا (over lapped) ایک جانب برطانوی راج کا پورا رجحان حدود کے اندر ایک وحدت پہ مبنی ریاست کا قیام تھا۔ شروع کے سالوں میں برطانوی جنم بھومی اور ''شہری (انڈین) جنم بھومی'' (اگرچہ اس میں ملی جلی نسل بھی ایک مسئلہ تھا) کے درمیان آب وہوا اور جگہ کے سرابوں نے ایک تفاوت کی آبیاری کی۔ انیسویں صدی میں سفر کرنے والوں اور زائرین کو پاسپورٹ جاری کر دیئے گئے۔ تمام شہری 'رعایا' اور تمام اختلاف کرنے والے 'باغی' ٹھہرے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں گول میز گروپ اور دوسروں نے 'شاہی فیڈریشن' کی تجویز پیش کی جس میں انڈیا بھی شامل تھا۔ اُس وقت مسلمان ترکی، خلیفہ، ہلالِ احمر اور 'امہ' کی حمایت کر سکتے تھے جو دنیا بھر میں (پھیلی ہوئی) اسلام کی کمیونٹی (جمعیت) تھی۔ اور اس کے ساتھ (باوجود مسلمان) انڈین قومیت پرست اور ایمپائر کی وفادار رعایا بھی ہو سکتے تھے۔

جب کہ دوسری جانب برطانوی مذہبی گروہ بندیوں اور نسل پرستیوں کے بارے میں اتنے وہمی تھے کہ اولذکر اُن کے لئے ثانیاً الذکر سے زیادہ اہم تھا۔ اور ہر جگہ واقعتاً قومیتیں زیادہ تر ثقافتی (تہذیبی) تھیں۔ ماسوائے 'سائنسی' نسل پرستی کے بدترین تجاوزات کے، جیسے کہ قبضہ شدہ پولینڈ میں تاریوں کے بچوں میں 'آریئوں' (Aryans) کا پاجی انتخاب یہ لازماً ثقافتی تھا جس نے نسلی یورپین لوگوں کو علیحدہ کر دیا تھا۔ برطانوی خود اپنے لئے اٹھارہویں صدی سے ایک واحد اور مخصوص شناخت پر مصُر ہو رہے تھے۔ اور یہ (سب کچھ وہ) انگلش اور سکوٹ لوگوں کی طرح بہت پہلے کر رہے تھے۔ یونانیوں نے اپنی قومیت، زبان اور پرانی تاریخ کے دعوے سے حاصل کر لی تھی۔ اطالیوں نے روم کی شان وشوکت کی یاد اور احیاء سے حاصل کی۔ آئرش نے آفت اور نغموں سے حاصل کی۔ چنانچہ یونان کی آزادی، اٹلی کا اتحاد، آئرلینڈ کی آزادی اور پہلے جاپانیوں اور پھر چینیوں کی قومی بنیاد کی مضبوطی، انڈیا کے لئے انتہائی مناسب امثال تھیں۔ اس مقابلے کے باعث بہت سے لوگوں نے یہ دعویٰ کیا کہ انڈیا کبھی بھی اپنے اژدھام (قومیت کے اژدھام) اور سیاسی تقسیم کے باعث قوم نہیں بن پائے گا۔

تاہم انڈینز نے بھی ایسی تواریخ اور خصوصیات تلاش کرلیں جن کی مدد سے وہ اپنی تعریف کر سکتے تھے۔ جناح کے دعوے کے باوجود نسل، ثقافت اور تاریخ کی ناطے داری کے لئے پریشان کن گماشتے سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں تھی۔ انڈینز قوم پرستوں کو تاریخ، ثقافت، علاقائی معیشت اور وسیع جغرافیے پر زور دینے کے لئے بہت سی عملداریوں کی انتہائی ضروریات تھیں۔ پہلے سے موجود سیاسی اکائیوں کے اندر یا باہر کی طرف موجود سیاسی شناختوں کے اثرات پر قوم پرستوں نے اعتماد کیا۔ چنانچہ وہ کمیونل گروہ بندی کی تقسیم کے خطرے کا شکار ہوگئے۔ جو سیاسی حدبندیوں میں تبدیل ہوگیا اور دوسری علیحدگیوں/خروج کا بھی (جیسے کہ سکھ، دلت، ڈراوڈین وغیرہ) جن سے محفوظ رہنا ممکن ہو سکا۔ اور اس وقت بعض ایسے مصنفین نے جنہیں ہم نے (خود) دیکھا اور اس کے علاوہ بہت سے دوسروں نے بھی غصے کے عالم میں انڈیا کی خصوصیات اور رسومات کو بے قدری سے دیکھنا شروع کر دیا۔ یہاں پر بھی 'انڈینز' کے لئے واضح جواب (ردِعمل) شادمانی اور اپنی تہذیب کو نئے سرے سے پرکھنے کا ہونا چاہئے تھا۔ اور ماضی پر غالب آنے یا اُسے نئے معنی پہنانے کی ضرورت تھی۔ جیسا کہ جب بنگالیوں نے راجپوتوں کی تواریخ (کا جشن) کو منایا، ہندوؤں یا مسلمانوں نے اپنے شاندار لمحات یا ادوار (کے جشن) کو منایا، بشمول 1857 کی ان کی بہادرانہ قربانیوں بھی موجود تھیں۔ جیسا کہ برطانیہ میں (جنہوں نے اپنے شاہی اور سپاہیانہ کارناموں کو سراہا)۔ یہ دونوں صورتیں ہی کمیونٹی کی شناخت کی تخلیق کی پیداوار اور ذریعہ تھیں۔ مخالفت کے خیالات میں تبدیلی کا توازن وقت کے ساتھ تبدیل ہوگیا۔ اور ارضیاتی طریقہ کار انڈیا میں 1920 تک غالب تھا اور دوسرا اُس کے بعد اصرار/زور دینے کی تبدیلی کا وقت، دنیا بھر میں ''انڈینز'' کے مشترک مفادات کے اقرار کے ساتھ مطابقت رکھتا تھا۔ ساؤتھ (جنوبی) افریقہ میں گاندھی سے لیکر فجی میں اُن کے دوست سی۔ ایف۔ اینڈریو تک (دونوں کے لئے) معاہدے کے تحت لائے گئے مہاجرین کی حالت کے بارے میں اُن کی مشترکہ مہم سیاسی ارضیات پر کمیونٹی کی شناخت کی اہمیت کا اصرار (دعویٰ) تھا۔ اس دورانیے کے گرد ہونے والی تبدیلی انڈیا کے لئے بحیثیت ایک مقصد کے، حکومتِ خود انتظامی (Self Govt) خوداختیاری کی رعایت کی علامت تھی۔ اور قوم اور قومیت پہ مبنی اداروں اور پالیسیوں، قانون سازی اور انتظامیہ میں زیادہ سے زیادہ نمائندگی، فوج اور نوکرشاہی میں زیادہ سے زیادہ انڈینز کے داخلے، عالمی تنظیموں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ

(الحاق) رئنیت، ترقی تجارت اور غیر ملکی تعلقات کے ساتھ حکمتِ عملیوں کی تشہیر کے لئے عرق ریزی (جان فشانی) تھی۔ سیاستدانوں کو اپنی حلقہ بندیوں کو تلاش کرنا تھا۔ لیڈرز کی تعریف نہ صرف اُن کے کارکن تھے بلکہ اُن کا مرتبہ (حیثیت) بھی تھا۔ مذہبی علامتیں حمایت کرنے والوں کے لئے مضبوط علامتی محرک بن گئیں۔

اسی زمرے میں نہرو رپورٹ (1928) نے انڈین اتحاد کے اندر سمجھوتا تلاش کیا۔ اور کانگریس نے اپنے سیکولرازم کا دعویٰ جس کے معنی مذاہب کے درمیان غیر جانبداری کے ہیں لیکن ان چالوں نے بھی پہلے ہی سے مذہبی شناخت کے سیاسی کردار کو تسلیم کر لیا تھا بالکل اُسی طرح پاکستان کے اصلی نعرے نے بھی ایک ڈھیلے ڈھالے اتحاد کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اور اگر اسے کھردرے (خام) الفاظ میں کہا جائے تو عام الفاظ میں یہ دونوں اطراف میں یرغمالی تھے۔ بہت سے مسلمان انڈیا میں تھے اور بہت سے ہندو اور سکھ غیر تقسیم پنجاب اور بنگال میں۔ لیکن قوم کے اس کثرت اور علاقے پہ مبنی نظریے کو بیسویں صدی کا خود ارادیت کا عقیدہ نگل چکا تھا۔ سرحد کے کمیشن کو کہا گیا تھا کہ وہ ڈسٹرکٹ سے بھی نچلی سطح پر مذہبی اکثریت کی بنیاد پر لکیریں کھینچ دے۔ یہ آبادی کے انتقال اور قتل عام کے لئے محرک تھا۔

اُس وقت تک برطانوی حکمرانوں (اگر چہ تمام برطانوی حکمرانوں کی رائے میں ایسا نہ تھا) کو اس کا یقین ہو چکا تھا کہ ''انڈینز'' موجود ہیں اور اپنے قائدین کے ذریعے سے وہ اپنی نمائندگی بھی کر سکتے ہیں اور یہ نتیجہ نکالا گیا کہ ''انڈیا'' کو موجود ہونا ہوگا۔ ''مونٹیگو۔ چیلنجر'' رپورٹ (1918) نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ انڈین مہاراجوں کی ریاستوں کو کسی بھی طریقے سے واحد حیثیت سے مدغم کرنا ہوگا خواہ وہ مرکزی سیاست کے ذریعے سے ہو۔ یہ بھی دلیل دی گئی کہ علاقے پہ مبنی حلقے (حد بندیاں) خود پر حکمران قوم کو تشکیل دینے کے لئے اُسی طرح سے اہم ہیں جیسے کہ نو آبادیاتی افسروں کی گذشتہ نسل نے سول سوسائٹی اور شراکتی جمہوریت کے وعدے پر بھرپور عوامی تعلیم اور مقامی خود مختارانہ حکومت کی حمایت کی تھی۔ یہ اقدامات اس لحاظ سے اہم تھے کہ کسی حد تک یہ ایک مخصوص غیر متبدل نسل پرستوں کو پیچھے دھکیلنے میں کامیاب ہو گئے جو خود مختار حکمرانی کے قابل تھے۔ اور کسی حد تک صوبائی خود مختاری کے روکنے میں کسی حد تک کامیاب ہو گئے، جس کی کچھ لوگوں نے عملی بنیادوں پر اور یورپ کی مشابہت کی نسبت سے وکالت کی تھی۔ 1930 سے یہ

مفروضے کہ جہاں برطانوی راج نے تقسیم کیا اور حکومت کی (کی بجائے) اُن نمائندگان کے درمیان بات چیت اور کانفرنسوں تک پہنچ گئے جن کا مقصد انڈیا کی قانون ساز اسمبلی میں بالآخر قطعی طور پر اکثریت پہ مبنی قومی وحدت پیدا کرنا تھا۔

لیکن یا تو یہ تمام دھچکے ناکافی تھے اور یا عملی طور پر یہ دبے ہوئے تھے۔ عوامی تعلیم انتہائی کم، مالی امدادی خواب رہا۔ کمیونل رائے دہندگان سیاسی طور پر بہت تیز رفتار تھے۔ مہاراجوں کی ریاستوں کو پہلے بلاواسطہ علیحدہ رکھا گیا اور بعدازاں انڈیا کے زیرِ حکمران صوبوں سے بھی جدا رکھا گیا۔ (اُس سے) ایک غیر حل شدہ مسئلہ (پیدا ہوا) جو آزادی کے بعد بہت گہرے اثرات مرتب کرسکتا تھا۔ چنانچہ 1940 تک کھینچے جانے والی خودمختار حکمرانی کی جانب عظیم بات چیت عملداری اور اکثریتی (عمل) اپنی اہمیت کھو بیٹھا۔ قوم کو بحیثیت قلمرو تخلیق کرنے کی کوشش ناکام ہو چکی تھی۔

یہ سچ ہے کہ پاکستانی مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین ناکامی کے باوجود اکثریت/اژدھام انڈیا میں ایک مضبوط اور لازمی مقصد کی حیثیت سے باقی رہا۔ اور اِسے آگے بڑھانے کی کاوشوں نے 'یونین' کو محفوظ رکھنے میں مدد دی۔ (یہی) کمزوری یا اکثریتی ابہام 1970 میں پاکستان کے ٹوٹنے کا باعث بنا۔ جبکہ دوسری جانب قومی شناخت (کے مسئلے) پر انڈیا کی پوزیشن پریشان خیالی اور الجھاؤ کا شکار ہے۔

گاندھی اس لحاظ سے بدنام لیڈر ہے کہ اُس نے مذہب کو اہمیت دیتے ہوئے اور استعمال کرتے ہوئے یگانگت (ہم آہنگی) کی حمایت کی۔ اور جس نے 'دلیتوں' کو ایسی شناخت میں گھسیڑنے کے لئے جدوجہد کی جو اُنہی کے خلاف تفریق کا باعث تھی۔ اور یہ کہ جواہرلال نہرو جو ایک لبرل (آزاد خیال) سوشلسٹ اور بین الاقومیت کا قائل تھا اور مذہبی سیاست کی جاگیردارانہ ذہنیت سے نفرت کرتا تھا، لیکن انڈین ثقافت کی اساس کے لئے نیم متصوفانہ احترام کا اظہار بھی کرتا تھا۔ کشمیر پہ اُس کا قبضہ مذہبی تعلق کے خلاف عملداری پر زور دیتا ہے۔ لیکن گوا پر اُس کا حملہ قانونی احاطہِ اختیار پر اُس کی نسل پرستانہ برتری کا ثبوت ہے۔

مجموعی طور پر ثقافت اور نسل پرستی ابھی بھی دو مضبوط ترین عناصر ہیں۔ وسیع قومی سطح پر اثر انداز اداروں کی موجودگی انڈیا کے لئے پاکستان کی نسبت (زیادہ) سودمند ثابت ہوئی ہے لیکن انڈیا میں بھی ہندوپن کے کردار اور لسانی بنیادوں پر مبنی ریاستوں کی جدوجہد نے علاقے کی بجائے

کمیونٹی کے انتخاب کو بحیثیت اولین شناخت کے طور پر ترجیح دی ہے۔ تقسیم کے وقت دونوں اطراف کے عہدہ داروں نے قیدیوں، مریضوں، اور خواتین کی ''واپسی'' اُن کی جگہ پیدائش کی بجائے اُن کے مذہب کی بنیاد پر کی۔ جبکہ اُسی وقت انڈین سیاستدان سیکولرازم اور غیر فرقہ پرستی کو نئی ریاست کے راہنما اصول کے طور پر پیش کر رہے تھے۔ یہ برطانوی قانون کی شدید خلاف ورزی تھی (اگر ان معاملات پر ان کا عملدر آمد ہوتا تھا) انڈیا حکومت نے جنوبی ہندوستان سے تعلق رکھنے والوں (بشرطیکہ اُن کے نام ہندو ہوں) لوگوں کو جو برطانیہ میں پیدا ہوئے تھے کو ویزا کی مراعات کی پیشکش کی۔ جبکہ دوسرے برطانوی درخواست دہندگان کو بہت کم مراعات دیں۔ جبکہ انہوں نے الجھاؤ پیدا کرتے ہوئے جنوبی ہندوستان کے 'مسلمان' برطانوی شہریوں سے تقاضا کیا کہ وہ یہ ثابت کریں کہ اُن کے والدین وہاں پیدا نہیں ہوئے تھے جو کہ اب پاکستان تھا۔ 1857-58 کی بغاوت کی نمائندگی نے بطور ''انڈین غدر'' کے ثقافتی اور نسلی قسم کا قصہ ایک تاریخ اور (بہت سارے) ہیروز مہیا کئے۔ چنانچہ سکھ اور بہت سے دوسرے جو انگریزوں کے لئے لڑے اپنی قومی شناخت کے طور پر غدار ٹھہرے، اگرچہ اس تکلیف دہ نتیجے کو ایسے شمار میں نظر انداز کر دیا گیا، اُس کے مقابلے میں ملکہ وکٹوریہ کا یہ اعلان جس کا نوٹس انڈیا کے امیدوار فریقین (aspirant) نے بھی لیا وہ تھا قلمرو (عملداری) کے اصول کی تشہیر، اور اکثریت جس کے تحت، تاج (برطانیہ) کی تمام رعایا احترام اور برتاؤ میں مساوی حیثیت کے حامل تھے۔ خواہ ان کا عقیدہ یا نسل کوئی بھی تھا۔ 1857 کے بارے میں نوآبادیاتی دلائل اپنے کچھ حصوں میں انڈیا کی فطرت کے بارے میں تھے اور اُس طریقے کے بارے میں (بھی) کہ انڈیا پہ کس طریقے سے حکمرانی کی جائے گی۔ انڈیا کی آزادی کے بعد انڈین قومیت کے بارے میں انڈین دلائل اُسی طرح کے مباحثے تھے، جو آج تک جاری ہیں (اور وہ یہ ہیں کہ) کیا یہاں کثیر الثقافتی سیاست ہے یا یکساں ثقافتی شناخت ہے۔ 1857 میں جو کچھ ہوا اُس کے ذریعے جواب میں تمیز کی جا سکتی ہے۔ کیا یہاں کوئی بڑی تحریک تھی یا نہیں بہر حال یہ غیر ملکیوں کو قومی طور پر رد کرنے کا عمل تھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ افراد (اشخاص) لازماً باخبر تھے کہ وہ کس کے بارے میں بحث کر رہے تھے۔ اگرچہ کچھ اس سے باخبر بھی تھے (جیسے کہ ساورکر)۔

میرا مشورہ یہ ہے کہ یہ مباحث کم تر مقام پر متوازی تھے۔ بالخصوص بغاوت کے بعد کے عہد

کی زندگی میں اسے تمام طبقات کے تصادم کا رنگ/شکل دینے سے یعنی دیسیوں اور اجنبیوں، یا انڈین اور اہلِ برطانیہ کے درمیان تصادم (کا رنگ/شکل دینے سے) دونوں اقوام کی بحیثیت شناختوں کے لازمی تاریخ کو مرتب کرنے میں مدد ملی۔

❁❁❁❁❁

برطانیہ میں انڈینز(Indians) کے لئے 1857ء کے بہت سے معنی

مائیکل ایچ فشر/ترجمہ: ڈاکٹر صولت ناگی

بہت سے تاریخ دانوں اور مبصرین نے 1857 کی جدوجہد کے دوران انڈیا میں موجود ''انڈینز'' اور مختلف برطانوی لوگوں کے مختلف النوع کرداروں اور ردِعمل پر بحث کی ہے۔اوراس کے ساتھ ساتھ برطانیہ میں موجود برطانوی لوگوں کی آرااور پبلک پالیسیوں کے بارے میں بات کی ہے۔ یہ مضمون ایسے کارہائے نمایاں کی تکمیل کرتا ہے کہ برطانوی سوسائٹی میں بسنے والے وہ'انڈینز' جن کا ان واقعات سے تعلق تھا اور اُن طریق ہائے کاروں کے بارے میں جن کے تحت 1857 سے قبل، اُس کے دوران اور بعدازاں برطانوی رویوں میں اُن کی (انڈینز) کی جانب تبدیلی آئی۔

1857 کی خونی لڑائی کے بارے میں انڈیا سے آنے والی خبروں نے برطانیہ کے لوگوں کو صدمہ پہنچایا۔ بشمول تمام طبقات سے تعلق رکھنے والے ہزاروں'انڈینز' کو بھی جو وہاں سکونت پذیر تھے یا وہاں اُنہوں نے عارضی طور پر ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ ہر انڈین کو جو لندن میں یا برطانیہ کی کسی بھی جگہ پر مقیم تھا، یہ فیصلہ کرنا تھا کہ کیا اس کے بہت سے ہم وطنوں کا جو انڈیا میں مقیم تھے

برطانیہ کے خلاف تشدد درست تھا۔ (انصاف پہ مبنی تھا)، مزید برآں ہر ایک کو یہ انتخاب کرنا تھا کہ برطانیہ کے لوگوں کے ساتھ (برطانیہ میں رہتے ہوئے) بشمول برطانوی پیار کرنے والوں (ایک دوسرے سے محبت کرنے والے جوڑوں) خواتین یا شوہروں، دوستوں، مالکوں اور سڑکوں پر گذرتے ہوئے راہگیروں کے ساتھ کیسے رہا (برتاؤ کیا) جائے۔ تقریباً تمام 'انڈینز' نے خواہ وہ کسی بھی مختلف پس منظر (Background) سے متعلقہ تھے یا انڈیا میں لڑائی کے بارے میں اُن کے ذاتی احساسات کچھ بھی تھے یا برطانیہ کی سوسائٹی میں اُن کا مقام جو بھی تھا۔۔۔ اُنہیں (سب کو) بڑھتے ہوئے برطانوی تعصب کا سامنا کرنا پڑا۔ انڈین مردوں کو خاص طور پر برطانوی جنسی خوف کے (شکار کا) مرکز بننا پڑا۔ نتیجتاً برطانیہ میں (موجود) بہت سے انڈین نے، جیسے جیسے انہیں اپنے گرد اجتماعی برطانوی دشمنی کا سامنا کرنا پڑا، ایک دوسرے کے لئے کہیں زیادہ بھائی چارہ محسوس کیا۔

جیسا کہ EPW کی اس اشاعت سے ظاہر ہوتا ہے۔ نامور تاریخ دانوں اور دوسرے مبصرین نے 1857 کے بہت سے معنوں پر بحث کی ہے۔ کچھ نے انڈیا میں (موجود) مختلف برطانوی اور انڈین لوگوں کے انوکھی وضع کے کرداروں اور جوابی عملوں پہ غور کیا ہے۔ دوسروں نے برطانیہ میں برطانویوں کی پبلک پالیسیوں اور آرا کا تجزیہ کیا ہے۔ یہ مضمون اُس اعلیٰ مرتبہ کے کام کو نمایاں کرتے ہوئے اُس کی تکمیل کرتا ہے کہ کیسے بہت سے مختلف (مکتبہ فکر کے) 'انڈینز' جو کہ برطانوی سوسائٹی میں موجود تھے، نے خود کو اُن واقعات کے ساتھ متعلق رکھا، اور مزید برآں اُن بدلتے ہوئے طریقوں کی بھی تکمیل کرتا ہے جو 1857 سے قبل، دوران اور بعدازاں برطانوی رویوں نے اُن کے ساتھ روا رکھے۔

1857 کے بارے میں برطانیہ میں (موجود) 'انڈینز' کا تاریخی (پس منظر) قرینہ

جب کہ انڈیا سے برطانیہ کی جانب لوگ تقریباً 1600 (عیسوی) سے سفر کرتے رہے ہیں۔ بے تحاشا بڑھتی ہوئی برطانوی ایمپائر اور اٹھارہویں صدی کے بعد ایشیا میں اس کے پھیلتے ہوئے مواصلاتی نظام (نیٹ ورک) کے معنی یہ تھے کہ تمام طبقات کے اور بھی زیادہ 'انڈینز' نے یہ

سفر کرنے کا فیصلہ کیا۔ (وزرام 2002، فشر 2006، لاہری تھانڈی 2007) انڈیا میں 1857 سے پہلے کی صدی میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے نہ صرف ہزاروں بادشاہتوں کو فتح کیا اور انہیں اپنی قلمرو میں شامل کر لیا بلکہ 1.6 ملین سکوئر کلومیٹر اور بشمول اندازاً تین چوتھائی آبادی کو بھی اپنے ساتھ ملحق کر لیا۔ انڈیا کا باقی ماندہ 8 لاکھ سکوئر کلومیٹر علاقہ اور ایک تہائی آبادی نام نہاد خود مختار انڈین ''شہزادوں'' کے زیر حکومت رہے۔ جنہوں نے اپنے تخت کو تو قائم رکھا لیکن برطانیہ کے بالواسطہ راج کے تحت (اپنی بقا کے لئے) جدوجہد کرتے رہے اور ملحق ہونے سے خوفزدہ رہے۔ ان تمام لوازمات نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنی افواج، سول نظامِ حکومت اور کمرشل معاہدوں (وعدوں) کے ذریعے انڈینز کو نوکری دینے والے مالک (یا ادارے) کی حیثیت دے دی۔ علاوہ ازیں زیادہ تر 'انڈینز' کو ایک یا دوسرے طریقے سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے محصولات اکٹھے کرنے والوں، منصفی عدالتوں، ڈاک یا تعلیمی نظام یا سیاسی ایجنٹوں سے سابقہ پڑتا رہتا تھا۔

زیادہ تر برطانویوں اور برطانوی حکمرانوں (اتھارٹیوں) سے جبری تعلقات کی بنا پر تیس سے چالیس ہزار 'انڈینز' کو 1850 کے شروع تک برطانیہ جانا پڑا۔ زیادہ تر لوگ کام کی تلاش میں گئے خاص طور پر لاکھوں 'لشکر' (بحریہ سے متعلق مرد) مرد اور عورتیں جن کی حیثیت نوکروں کی سی تھی ہر سال وہاں پہنچے۔ ان مردوں میں سے کچھ وہیں پر مکین ہو گئے۔ جیسے کہ برطانویوں کی بیویاں، اور مختلف انڈین ٹھیکیدار (تاجر) اور اساتذہ، دوسرے بشمول طالب علموں اور سیاحوں کے جو محض عارضی طور پر ایک ایسی سوسائٹی اور ثقافت کو سیکھنے کے لئے آئے تھے جس نے انڈیا کو اتنی تیزی سے اور وسعت سے زیر کر لیا تھا۔ بہت سے دوسرے بشمول تاجر، زمیندار (زمین کے مالک) شہزادے اور برطانیہ کے ملازمین جن کی اپنی شکایات کا برطانوی نو آبادیاتی عہدے داروں یا افسروں کے ہاتھوں، ازالہ نہیں ہوا تھا، اس یقین کے ساتھ آئے تھے کہ اگر وہ برطانوی بادشاہت یا پارلیمنٹ، منصفی نظام یا ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں کے بورڈ کے سامنے ذاتی طور پر حاضر ہو کر درخواست دائر کریں گے تو اُن کی شنوائی ہو سکے گی۔ ان میں بہت سے درخواست گذاروں کی واقعی دادرسی ہوئی بھی یا انہیں آگے بڑھنے کے مواقع (یا کم از کم ایسے وعدے وعید) ضرور ملے کہ مزید 'انڈینز' کو ایسے سفر کرنے کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ کچھ لوگوں کو زمینداروں، مشاورتی عہدے، نوکروں یا بعد ازاں آنے والے انڈینز کے لئے ترجمہ کرنے والوں کی حیثیت سے ملازمتیں بھی مل

گئیں۔ سب نے اپنے ذاتی تجربے سے وہاں رہتے ہوئے، وسیع برطانوی سوسائٹی، نوآبادیاتی نظام کے عالمی قرینے (پس منظر) اور عمل کے امکانات کے بارے میں سیکھا۔ تمام ایسے پس منظر نوآبادیاتی انڈیا کی حدود و قیود میں رہتے ہوئے اتنے واضح دکھائی نہیں دے سکتے تھے۔

سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں برطانوی سوسائٹی میں کسی انڈین کی پوزیشن اور استقبال کا بہت حد تک دارومدار اُس کی یا اُس کے پس منظر (بیک گراؤنڈ) یعنی دونوں اجتماعی (سماجی و معاشی طبقے، مذہبی گروہ بندی، جنس، اور علاقائی جڑوں) اور انفرادی (انجلیقن (Anglicisation) ہونے کے درجے پر، ظاہری خدوخال، اور اُس کے مخصوص ذاتی تعلقات اور حالات) پر منحصر تھا۔ بہت سارے برطانوی اُن انڈینز کے ساتھ آسانی تعلقات بنا لیتے تھے جو اُن کے اپنے سماجی و معاشی طبقے سے ملتے جلتے دکھائی دیتے تھے۔ اور انڈیا کے امراء (اشرافیہ) کو یورپ کے ہم مرتبگان کے برابر دیکھتے تھے۔ برطانوی، 'انڈینز' کے لئے وسیع اور غیر درست اصطلاحات اور زمروں کی حدیں استعمال کرتے تھے۔ بشمول 'ایشیا والے' یورپی، مشرق کی طرف رہنے والا، مشرقی انڈین، 'انڈین' اور 'سیاہ فام' اور کبھی کبھی اُنہیں افریقین، غرب الہند افریقہ، اور عمومی طور پر غیر ملکیوں کے ساتھ اکٹھے ایک درجے میں رکھ دیتے تھے۔ برطانیوں کا اس بارے میں انتہائی ابہام کہ 'انڈینز' ہونے کے معنی کیا ہیں، اُس نے شروع میں آنے والے تمام انڈینز کے لئے موقع فراہم کیا کہ وہ کسی حد تک ایسی ماہیت کو فروغ دے سکیں کہ ان کے اردگرد کے برطانوی اُن کا استقبال کیسے (کیونکر) کریں۔ کچھ انڈینز نے یہ سوچ کر برطانوی سماج میں خود کو مدغم کر لیا۔ کیونکہ نوآبادیاتی انڈیا میں نسلی طور پر زیادہ منقسم صورتحال کی نسبت برطانوی مقابلتاً اُنہیں اپنے طبقے کے ہم عصر سمجھ کر زیادہ آسانی سے قبول کر لیتے تھے۔ 1844 میں لندن میں ایک فاضل سفارتکار نے مقابلتاً خوش آمدید کہنے والے برطانوی سماج کا موازنہ انڈیا مین (موجود) برطانیوں کے ملتفت یا حقارت کنندہ رویوں سے کچھ یوں کیا ''حقیقت یہ ہے کہ آپ جتنا انگلستان کی جانب بڑھتے ہیں اتنا ہی آپ کو انگریزوں میں شائستگی اور تعظیم و تکریم دیکھنے کو ملے گی۔'' (لطف اللہ 1857) بہت سارے 'انڈینز' نے بشمول تمام انڈینز جو مستقل مقیم ہیں اپنے لباس کو انجلیقی بنا لیا ہے، اخلاقیات اور ناموں کو تبدیل کر دیا ہے (کم از کم نام کی حد تک عیسائیت میں بدل لیا ہے) اور برطانوی سے شادی کر لی ہے۔ برطانویوں کا انڈینز کی قبولیت کی علامت انڈین عورتوں اور مردوں کی مقامی

برطانوی لوگوں سے (اونچے درجے کی) زیادہ تعداد میں باہمی شادیاں ہیں بہت سے انڈین سیاحوں اور مقیموں نے بہت پہلے برطانیہ میں برطانوی خاتون کے ساتھ مقابلتاً اپنی آسان واقفیت کے ذریعے خود کو بااختیار گردانا شروع کر دیا۔ بہت سے انڈین مرد مصنفین نے یا تو مشورہ (تجویز) دیا ہے یا واضح طور پر اس مظہر پہ بحث کی ہے (ٹاواکولی۔ٹارگی نے جسے ''یورپین عاشقانہ پن/ دیوانگی'' کا نام دیا ہے۔۔۔ٹاواکولی۔ٹارگی 1993)

یقیناً راجدھانی میں صورتحال پر زور طریقے سے انڈیا کے برعکس تھی جہاں برطانوی نوآبادکاروں نے اپنی نسلی برتری اور علیحدگی پر بھرپور زور دیا تھا۔اور برطانوی عورت اور انڈین مرد کے درمیان سماجی اور جنسی تعلقات پر پابندی قائم رکھی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ برطانیہ میں داخل ہونے کے بعد بہت سارے انڈین مردوں نے برطانوی عورتوں سے اپنے تعلقات کو نہ صرف اس لئے گرانقدر جانا کہ وہ اُن کی ذاتی جنسی طمانیت اور اُن کی ذاتی انا کو بڑھانے کا سبب تھے بلکہ برطانوی سوسائٹی میں داخلہ ملنے اور انڈین جنسی (مردانہ) اخلاقیات کی برطانوی جنسی ڈھیلے ڈھالے پن پر قدرشناسی کے باعث بھی اسے گرانقدر سمجھتے تھے۔تاہم بالآخر برطانیہ کی ایشیا پر فوجی فتوحات اور بڑھتی ہوئی نوآبادیاتی ایمپائر نے بہت سے برطانویوں کو اپنی ثقافت اور نسل کی جبلی برتری کا قائل کر دیا۔

مشنریوں اور اصلاح پسندوں نے مفتوح ایشین لوگوں پہ عیسائیت اور برطانوی قدروں کی تسلسل سے عظمت پر زور دینا شروع کر دیا۔غیر سفید فاموں کے خلاف غیر متبدل (لکیر کے فقیر) گورے برطانوی نوآبادیات سے راجدھانی سماج میں کہیں کہیں مگر تیزی سے داخل ہوئے اور برطانوی سماج میں بسنے والے بہت سے انڈینز کے لئے کہیں مشکل بنا دیا کہ وہ کس ماہیت میں قابلِ قبول ہو سکتے ہیں۔

اس کے برعکس جب برطانوی ثقافتی اثرات نوآبادیاتی انڈیا پہ غلبہ حاصل کرنے لگے تو اُن لوگوں کی توقعات جو انڈیا کو انگلینڈ کے لئے چھوڑنے والے تھے تبدیل ہو گئیں۔ جیسے 'پراتھا چیٹرجی' وضاحت کرتا ہے ''اٹھارہویں صدی کے مقابلے میں جب (جن دنوں) انڈین سیاح کے دماغ پر کسی ذہنی نقشے کے نقوش نہیں ہوتے تھے جو کہ اُسے بتاتا کہ انگلینڈ کو کیسے دیکھا جانا چاہئے۔''انیسویں صدی کے آخر میں ہر کوئی پہلے ہی سے جانتا تھا کہ اُسے وہاں کیا ملے گا؟ اُسے

کوئی شک نہیں تھا کہ وہ کیا دیکھ رہا ہے اور اُسے اپنے ہموطنوں کو ملک واپس جا کر کیا پیغام دینا ہے۔ وہ (پیغام) تھا اخلاقی اور تہذیبی احساس جن کا اظہار جدید انگریزوں میں بحیثیت آزادی کی روح، عزتِ نفس، نظم وضبط، آرٹ، لٹریچر اور کھیلوں سے اُن کی محبت اور اس سے بالاتر علم کی برتری جیسی خوبیوں سے ہوتا تھا۔ (چیٹر جی 1998)

1857 کی جانب بڑھتے ہوئے عشروں میں برطانیہ میں بہت سے 'انڈینز' نے ایک دوسرے کے ساتھ طبقاتی اور دوسری یک جہتیوں کو فروغ دے لیا تا کہ وہ اس اجنبی ماحول میں ایک دوسرے کی مدد کر سکیں۔ محنت کش 'انڈینز' کی عظیم ترین جمعیتیں (کمیونٹیاں) بندرگاہ کے علاقوں میں لندن کے مشرقی جانب وجود میں آئیں۔ 1790 سے 1834 تک ایسٹ انڈیا کمپنی نے برطانوی ٹھیکیداروں سے عارضی طور پر مقیم انڈین مچھیروں یا بحریہ کے لوگوں کے ٹھہرنے کے لئے بیرکیں فراہم کرنے کا معاہدہ کیا، تاوقتیکہ اُن انڈین کو بحری راستے سے واپس انڈیا لوٹا نہیں دیا جاتا۔ بالخصوص 'ریٹ کلف ہائی وے' کی بہت بڑی بیرکیں جو کہ مشرقی لندن کی بندرگاہوں سے کچھ زیادہ دور نہیں تھیں انڈین محنت کش طبقے (کمیونٹی) کے بڑے حصے کا مرکز تھیں اور اُن میں نہ صرف یہ کہ انڈین ملاح (لشکرز) بلکہ ملازمت سے نکالے گئے نوکر اور بعض مفلوک الحال ڈپلومیٹ بھی شامل تھے۔ 1834 میں پارلیمنٹ نے جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے انڈیا میں 20 سالہ تجارتی معاہدے کو ختم کر دیا تو ان بیرکیوں کا معاہدہ بھی تمام ہو گیا۔ ملاحوں (لشکرز) کی کمیونٹی اور دوسرے انڈینز نے لندن کے 'پوپلر' اور 'لائم ہاؤس' علاقوں سے تھوڑا سا مشرق کی جانب حرکت کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ ایسٹ انڈیا بندرگاہوں کے قریب تر آ گئے۔ اس کے باعث (نجی) پرائیویٹ ٹھکانوں، گھروں کے ایک سلسلے کا آغاز ہو گیا۔ جو کہ انڈین ٹھیکیداروں کے زیرِ انتظام تھا جن کی دیکھ بھال اُن کی برطانوی بیویاں یا منتظمہ جو ملازمت پیشہ اور انڈین مرکزی کمیونٹی کی حفاظت کرتی تھیں اور جنہیں (علاقوں کو) عام طور پر ''ایشیائی کوارٹر'' کہا جاتا تھا۔ یہ ہمسائیگی کی جگہ فراہم کرتی تھی جہاں 1850 سے پہلے اندازاً تین ہزار سے چھتیس سو لوگ سالانہ پہنچا کرتے تھے (ورسام 1986 : 52) دوسرے 'انڈینز' اگر چہ وہ کہیں بھی قیام پذیر تھے بشمول ڈپلومیٹک وفود کے نوکروں سمیت وہ بھی اس ہمسائے میں ضرور آتے تھے۔ خاص طور پر انڈین دوستی کی خاطر، کھانے پینے، موج مستی اور دوسرے دستیاب مزوں کے باعث۔

شاہی دارالخلافہ میں خود انحصاری پہ (خود سے منظم شدہ) ان ایشین کوارٹر نے بڑھتی ہوئی برطانوی بداعتمادی کو منعکس کرنا شروع کر دیا۔ عیسائی مشنریوں اور دوسرے سماجی اصلاح پسندوں نے اس کا ایک متبادل قائم کیا۔ ایک ایسا ادارہ جو اُن کے اپنے کنٹرول میں تھا۔ 1842 میں چرچ (گرجا) مشنری سوسائٹی نے ''لندن میں لشکر (ملاحوں) کی ریاست' کا جائزہ (سروے کیا) لیا اور رپورٹ پیش کی، ایونجلیکل (عیسائیوں کا ایک فرقہ) نے خیراتی گھر کی تجویز دی۔ اور اُس کے لئے 15000 پاونڈ اکٹھے کیے (بشمول اُن 5000 پاونڈز کے عطیات کے جو انڈین لوگوں نے دیئے تھے) تا کہ اس کی مدد کی جا سکے۔ ایشیا کے لوگوں اور افریقین اور جنوبی سمندر کے جزیروں میں رہنے والوں کے لئے ''اجنبیوں کا گھر'' 'لائم ہاؤس' کمرشل روڈ پر کھولا گیا جو ایک سابقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج کے لیفٹیننٹ کرنل 'ر۔ مارشل۔ ہیوز' کے زیر انتظام تھا جو اُس کا سکریٹری اور منیجر تھا۔ اس ادارے کا نام مختلف محنت کش تنظیموں کی مختلف نسلوں کے ساتھ اجتماعی طور پر بحثیت ''اجنبی'' کے جڑا ہوا تھا۔ جو موجودہ برطانوی رویے کا عکس تھا، اس گھر نے (جو 1927 تک جاری (کھلا) رہا۔ برطانیہ میں موجود محنت کشوں انڈینز کے لئے پدرانہ شفقت کے کام سرانجام دیئے۔ بشمول اُن کا خیال رکھنے، اُن پہ قیود لگانے اور گھر (ملک) تک پہنچنے کے دوران اُن کی ملازمت کا بندوبست کرنے تک۔

19 ویں صدی کے آغاز تک بھی لندن میں بڑھتے ہوئے بے شمار انڈین 'ڈپلومیٹک' اور سیاسی سفارت کار وہاں مخصوص انڈین سماجی زندگی کے مراکز مہیا کرتے رہے۔ تقریباً 30 (کے قریب) معزول شدہ یا چتاونی دیئے گئے انڈین شہزادے یا اُن کے سفارت خانے، یا شہزادے خود 1857 تک لندن پہنچ گئے تھے۔ ایک مرتبہ برطانیہ میں داخل ہونے کے بعد ان سفارت کاروں میں سے سب سے زیادہ موثر۔۔۔ بشمول راجہ رام موہن رائے جو اپنی زندگی کے آخری تین سال وہیں رہا (33-1831) اور مغل شہنشاہ محمد اکبر دوئم کی نمائندگی (کا فرض) انجام دیتا رہا۔۔۔ (اُنہوں نے) برطانوی سیاست کو جاننے کے بعد اور اُس کو استعمال کرتے ہوئے اکثر اوقات برطانوی اپوزیشن کے سیاست دانوں کے ساتھ مل کر برطانوی حکومت یا ایسٹ انڈیا کمپنی کی انڈیا میں موجود انتظامیہ پر نہ صرف تنقید کی بلکہ اُنہیں خفت زدہ بھی کیا۔ کچھ نے کامیابی سے پنشن میں اضافہ اور برطانوی سماج (سوسائٹی) میں بشمول برطانوی بادشاہ کے اثر ورسوخ حاصل

کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ جبکہ انڈیا میں ان انڈین وفود کو رشوتوں اور تعلقات کے باوجود برطانوی پالیسی میں ہرگز کوئی لچک (تبدیلی) نظر نہ آئی۔ نوآبادیاتی عہدہ داروں نے خود کو کسی حد تک (کسی بھی) مخصوص (اشد) الحاق یا شاہانہ بیانات سے اس علم کے باعث بھی دور رکھا کہ اُن کے اعمال کو لندن میں دشمنی سے بھرپور کسوٹی پہ پرکھا جائے گا۔ ان میں سے کچھ سفارت کار یا ایلچیوں میں کثیر تعداد میں تمام طبقوں سے تعلق رکھنے والے مرد اور خواتین شامل تھیں۔ مثال کے طور پر 'اودھ' کا وفد جس کی قیادت ملکہ ماں' جنابِ اولیاء تاجرا بیگم' کر رہی تھیں، اُن کے پاس سو سے زیادہ اعلیٰ عہدے دار، لکھنے والے، نوکر اور غلام تھے۔ انہیں لندن میں اور بہت سے مختلف انڈین پیروکار ملے جو آزادانہ طور پر وہاں ملازمتیں تلاش کرنے کے لئے گئے ہوئے تھے۔ 1850 سے 1857 کے درمیان وہاں بہاولپور، جودھ پور، ناگ پور، نیپال، رام پور، ساتارا، سندھ، سورت سے آنے والے وفود اور جلاوطن مرہٹا پیشوا شامل تھے۔ علاوہ ازیں اُن سالوں میں لندن میں اشرافیہ کے مختلف افراد بھی موجود تھے بشمول پرنس غلام محمد جو ٹیپو سلطان کا بیٹا تھا، پنجاب کا راجہ دلیپ سنگھ، کرناٹک کے شہزادے پرنس حافظ لارو، اور حیدر جنگ، 'کورگ' کا مہاراجہ ویراجندر، واڈایار اور اس کی بیٹی ''گوری اما'' اور ''ڈیوڈ ارچ ٹریونی ڈائس سومبر'' (جو برطانوی پارلیمنٹ کے لئے منتخب شدہ انڈین ممبر تھے 42-1841) اور اُن میں ساردھانا کی معزول شدہ بیگم سومرو بھی شامل تھیں۔

شاہی راجدھانی کے سب سے زیادہ فیشن زدہ حصے میں بکھرے ہوئے انڈین 'ڈپلومیٹوں' اور دوسرے نوابوں (اشرافیہ) کے کرائے پر حاصل شدہ محلات نے بہت سے مختلف انڈین سیاحوں اور لندن میں مقیم انڈین لوگوں اور اُن کے ساتھ چپکے ہوؤں (چمچوں) کے درمیان پیرشاہی (پروہتائی) سماجی تعلق کی گنجائش پیدا کر دی۔ انڈین اشرافیہ (امراء) عمدہ ترین کمروں میں مل بیٹھتے اور برطانوی سماج اور سیاست کے بارے میں اپنے تجربات کے بارے میں تبادلہ خیال کرتے تھے۔ انڈین اور برطانوی دونوں کے وسائل کے ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ ان عورتوں اور مردوں کے درمیان بہت سی ملاقاتیں ہوئیں (جو کہ جنسی اور زیادہ تر مذہبی کمیونٹی کے باعث جدا جدا ہوتی تھیں)۔ مختلف صورتوں میں کھانے کھائے جاتے، ایک دوسرے کی چھٹیوں کو منایا جاتا اور برطانوی سوسائٹی (سماج) اور اتھارٹی کے ساتھ معاملات میں بالترتیب کامیابیوں اور

ناکامیوں پر ہمدردی جتائی جاتی، ہمہ وقت بہت سے لکھنے والے اور دوسرے موجود لوگ جوان ایلچیوں کے ساتھ منسلک تھے نہ صرف ایک دوسرے کے ساتھ بلکہ اپنے مخصوص طبقات کے ساتھ بھی اپنے کوارٹرز (مکانات) اور خیالات کو بانٹتے تھے۔ ان میں عالم، اساتذہ، مترجم اور برطانوی سماج میں بسنے والے دوسرے لوگ بھی شامل تھے۔ اکثر اوقات باورچی خانوں میں مختلف سفارتکاروں کے نوکر ایک دوسرے کی تواضع خوراک، موسیقی اور دوسرے مشاغل سے کرتے اور اس کے ساتھ ساتھ لندن کی زندگی کے بارے میں ایک دوسرے کو آگاہ کرتے تھے۔ برطانوی شمولیت کنندگان ایسے سماجی اجتماعات کو جیسے کہ محل کے باورچی خانے میں ملازمین کے درمیان ہوتے تھے (15 -واروک روڈ پیڈنگ ٹن) جہاں سورت کے نواب کے سفارتکار رہتے تھے۔(57-1853) کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

''ڈنر کے بعد جو کہ عموماً 7 بجے ہوتا تھا، میز پر تاش (کے پتے) اور چائے ہمیشہ رکھی جاتی تھی۔ دوسرے خاندانوں کے ملنے ملانے والے آتے...... ڈھول یا مقامی ڈرم آگے لایا جاتا۔ مقامی گانوں کا ایک سلسلہ گایا جاتا۔ ایک لمبی میز جس پر تقریباً پندرہ افراد کی نشست گاہ فراہم ہوسکتی تھی، تاش کھیلنے والوں سے بھری ہوتی تھی۔ وقفوں میں عموماً یہ چائے، کافی پینے والوں اور سگریٹ نوشی کرنے والوں سے بھر جایا کرتی تھیں۔ (سبالٹر 1873 صفحہ 56-55)

اس شاہد نے ہمت افزائی کرتے ہوئے یہ دکھایا ہے کہ دوسرے وفود کے ممبران اور دوسرے محنت کش انڈین اس اجتماع میں کیونکر شامل ہوتے تھے۔

ہارلے ہاؤس میں رہنے والوں (اودھ خاندان کا وہ وفد جو 1856 میں پہنچا) کو یہ دریافت کرنے میں زیادہ عرصہ نہ لگا کہ لندن میں پہلے ہی سے ایشین کی ایک نوآبادی قائم ہوچکی تھی اور اُس کی تعداد میں بحری جہاز سے مفرور لوگوں اور ایشیا کے راجدھانی کے آوارہ گردوں کے ذریعے اضافہ ہوگیا۔ اور اُن تمام لوگوں نے جلد ہی سورت کے نواب کے مصاحب کے ساتھ تعلقات بنا لئے، کچھ لوگ نواب کے باورچی خانے میں آباد ہوگئے۔ اُس وقت تک سردی آنے کا موسم آنے والا تھا اور خزاں کی سرد ہوا نے دورہ کرنے والوں (ملنے والوں) کی ننگی ٹانگوں پہ دہشت ناک اثرات چھوڑے۔ نواب کے ملازمین نے انگریزی بوٹ اور جرابیں مہیا کیں۔ بوٹوں (جوتوں) کا معائنہ کیا گیا اور اُن کی منظوری دے دی گئی۔ لیکن جرابوں نے ایک

عجیب قسم کی دلچسپی کو جنم دیا۔ اور جب اُنہیں (جرابوں کو) معائنہ کے لئے پیش کیا گیا تو وہ ہر جگہ موضوعِ بحث تھیں۔

چنانچہ لندن کے حالات کے ساتھ معاملات کرتے ہوئے حاصل شدہ تقسیم کئے گئے تجربے نے مختلف علاقوں اور ثقافتوں سے آئے ہوئے انڈین لوگوں کو یک جہتی کے رشتے میں باندھ دیا۔ اور پہلے سے آئے ہوئے سیاحوں کے جمع شدہ علم کو زبانی طور پر اگلوں (اگلی نسلوں) میں پہنچا دیا۔

برطانوی پبلک کی رائے ان رنگین انڈین وفود کے بارے میں ملی جلی ثابت ہوئی۔ اور انیسویں صدی کے پہلے نصف حصے میں بری طرح تبدیل ہوگئی۔ ایک طرف تو یہ عجیب وغریب دکھائی دینے والے سفارتکار اور اُن کے ہمسفر شاہی دارالخلافے کی حیثیت سے لندن کے لئے مختلف (تہذیبی) رنگ اور مکمل زرہ بکتر (Panoply) لے کر آئے، جب کہ دوسری طرف بڑھتا ہوا برطانوی سامراجی اعتماد اِن انڈین سفارتکاروں کی اہمیت کو کمتر کرتا ہوا دکھائی دیتا۔ جبکہ ایشیائی ظلم و بربریت کے خلاف مذمت انہیں (انڈین سفارتکاروں کو) برطانیہ کی جدیدیت اور ترقی کے برعکس انڈین قدامت (Backwardness) کے متروک مظاہر بنا کر پیش کرتی۔ مثال کے طور پر 1856 میں The Times نے اودھ وفد کے درمیان امارت کی ایک عجیب وغریب نمود و نمائش پہ غور کیا۔ لیکن اُن کے ہمرکاب (نوکروں کو) لوگوں کو غلیظ، ادویات کے عادی، لوفروں سے تعبیر کیا جنہوں نے برطانیہ کی خلا کو بیگانہ کر دیا تھا جس پر وہ قبضہ کئے بیٹھے تھے۔

''اگرچہ شہزادیاں اور اُن کی اہم (اعلیٰ) خدمتگاریں ظاہراً انتہائی قیمتی اور جان فشانی سے تیار کردہ ملبوسات کے باعث جنہیں وہ زیب تن کئے ہوتی ہیں، انتہائی شاندار دکھائی دیتی ہیں (لیکن) کم تر ملازمین کا لباس ایک غیر معمولی غلیظ اور نا قابلِ دید گروپ کو پیش کرتا ہے۔ ہوٹل کے تہہ خانے کے فرش پہ انتہائی بڑی تعداد میں پھیلے ہوئے وقفے وقفے سے ایسے لوگ (ملازمین) انتہائی غیر ذمہ دارانہ طریقے سے رہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں یا یہ آلتی پالتی مار کر کسی چارکول کی آگ پر کھانے کی کوئی چیز بناتے ہوئے یا کسی گندے افیم کے پائپ سے حاصل شدہ دھویں کے بادل میں گھرے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ ہوٹل کے فرش کا یہ تمام حصہ ان رہائشیوں کے بکھرے ہوئے کپڑوں سے بھرا ہوا ملتا ہے۔ اور ظاہر میں کسی بڑے چیتھڑے (بیچنے) والے سوداگر کے پچھلے

قصیوں سے ملتا جلتا نظر آتا ہے۔ وہ تمام وجود اُس مٹی کی مقدار سے کہیں زیادہ ناخوشگوار بنا دیا گیا ہے جو کپڑوں کی ہر شئے میں بظاہر موجود ہے۔ (ٹائمز، 28 اگست 1856)

بیک وقت ٹائمز بہکائے گئے برطانویوں پہ تنقید کرتا ہے کہ وہ اس غیر اہم ایشیائی عیاشی اور مخفی جنسیات سے چندھیا گئے ہیں (ششدر رہ گئے ہیں)

اس وقت ہجوم کی دلچسپی کو محض ایک غلیظ تجسس برانگیختہ کئے ہوئے ہے جس کی تمنا/خواہش صرف نوکروں اور اُن کے پیروکاروں کے ملبوسات اور ساز و سامان کو دیکھنے تک اور شاہی پارٹی کی ملکیت میں موجود بے تحاشا دولت اور جواہرات کی احمقانہ داستانوں کے نام پر حریصانہ طور پر پینے تک محدود ہیں (وہ کہانیاں) جو بہت محنت سے پھیلائی گئی ہیں۔ لڑکوں کے اُس اژدھام کے معمول کے علاوہ جو نتیجتاً ایسے موقعوں پہ موجود ہوتے ہیں، بہت سے شریفانہ (عزت دارانہ) لباس پہنے ہوئے لوگ، ابھی اور کچھ عرصے کے بعد ایک گاڑی میں جوان مکینوں سے بھری ہوتی ہے رائل پارک ہوٹل کے باہر کی جانب پرشوق طریقے سے دیکھتے ہیں جہاں یہ شاندار پارٹی منعقد ہو رہی ہوتی ہے۔ اور اکثر اوقات بہت سی تکلیف (محض اس لئے) اٹھائی جاتی ہے تاکہ رائل پارٹی میں موجود خواتین کو لمحہ بھر کے لئے دیکھا جا سکے۔ جو کہ اپنے اوپر والے اپارٹمنٹس سے نیچے گلی/ بازار میں جمع شدہ ہجوم پہ عیارانہ طریقے سے جھانکتی ہیں۔ چنانچہ کچھ برطانوی اخباروں نے گنوار برطانویوں اور اجنبی انڈینز کو ایک دوسرے کا مشاہدہ (تعلق بناتے ہوئے) کرتے ہوئے دیکھا۔

پیسے خرچ کرنے میں اُن کی ہچکچاہٹ کے علاوہ اخباروں نے اُن سے ایک علیحدہ نسل کی بنیاد پر ایک ناقابلِ برداشت 'بو' بھی منسوب کر دی۔ فی الحقیقت وہ ہوٹل جو اُنہوں نے کرائے پر حاصل کئے اُن پر یہ الزام لگایا جا سکتا ہے کہ کچھ عرصے سے وہ معزز لوگوں (یعنی یورپین لوگوں) کے ٹھہرنے کے لائق نہیں تھے۔ ''مسٹر وائٹ (جو اُس) ہوٹل کے مالک نے 100 پونڈ کی رقم اپنی رہائش گاہ (ہوٹل) کے 10 روزہ استعمال کے لئے وصول کی۔ ہمیں یقین ہے کہ انتظامیہ کو کسی بھی یورپین کی رہائش گاہ کی حیثیت سے اسے قابل استعمال بنانے کے لئے اتنے ہی دن درکار ہوں گے۔ (ٹائمز، 1 ستمبر 1856) چنانچہ 1857 کے واقعات کی خبر پہنچنے سے قبل ہی برطانوی نسلی تعصب بڑھ رہا تھا۔

برطانیہ میں بسنے والے بہت سارے انڈینز 1857 تک کے عشروں میں یہ تسلیم کر چکے تھے کہ انڈینز کے خلاف بڑھتے ہوئے برطانوی نوآبادیاتی نظام اور نسلی تعصب کے باعث 'انڈینز' کو ایک رشتے میں پیوست کر دینا چاہئے تھا۔ بہت سے دوسرے انڈین علاقوں سے لندن آنے والے لوگوں نے روایتی ثقافت اور سیاسی تفاوت پر ان لمحات میں انڈیا میں بسنے والوں کی نسبت زیادہ احسن طریقے سے غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ برطانوی تفریق (امتیاز) اور برطانوی جارحیت کے خلاف اجتماعی جواب کی ضرورت کو بالخصوص مرہٹا سفارتکار ''رنگو باپو جی'' نے جنہوں نے 13 سال (53-1839) لندن میں گذارے، دونوں (عوامل) کے بارے میں صاف لہجے میں اظہارِ خیال کیا۔

رنگو باپو جی نے تحریر کی صورت میں نہ صرف اپنے خلاف ہونے والی توہین (ہتک) کے بارے میں بلکہ ''ہماری نسل اور رنگ'' کے خلاف پیدا کردہ دباؤ (استحصال) کے بارے میں بھی لکھا جسے اجتماعی طور پر متعصب برطانویوں نے شروع کیا تھا۔ (باپو جی کے خطوط 24 جنوری 1842، اور 12 مارچ 1842، ایسٹ انڈیا کمپنی میں 1843-1841۔ جلد دوئم صفحہ 1301-02، جلد سوئم صفحہ 30-28، دوبارہ اشاعت) 'باپو جی' نے لندن میں عوامی تقاریر بھی کیں اور اپنا پربصیرت تجزیہ جو کہ عالمی برطانوی سامراج کے بارے میں تھا اُس کی اشاعت بھی کی۔ وہ ''اپنے 15 کروڑ ہموطنوں'' کی جانب سے ایک آواز اٹھانے کا دعویدار ہے۔ (باپو جی 1846 صفحہ 2) 'باپو جی' نے ''پروانہ برائے شہزادگان اور سربراہان انڈیا'' کو مجتمع کرنے کی خاطر لکھا جو اُس نے انڈیا میں موجود تمام حکمرانوں کو بھیجا، جس میں اُس نے برطانیہ کی ٹکڑوں میں قبضہ کرنے کی حکمتِ عملی کے بارے میں تنبیہ کی جو کہ برطانوی پس منظر کے لحاظ سے بالکل واضح تھی۔ برطانوی حکمرانوں (اتھارٹی) اور بالخصوص برطانوی عوام کے نسل پرست ممبران دونوں کے ہاتھ بری طرح سے بدسلوکی کے بعد دل برداشتہ ہو کر برطانیہ کو چھوڑتے وقت 'باپو جی' نے ان سخت کاوشوں سے حاصل شدہ تجربات کو نئے پہنچنے والے سفارتکاروں بشمول عظیم اللہ خان، جو محمد علی خان کے ساتھ تھے اور ملک بدر مرہٹا پیشوا دھندو ہانت ''نانا صاحب'' کی لندن میں نمائندگی کرنے کی غرض سے آئے تھے، تک پہنچایا۔

عظیم اللہ نے نہ صرف یہ کہ برطانیہ میں سفارتکار کی حیثیت سے اپنے پڑاؤ کے تین سالوں

کے علاوہ بعدازاں 1857 میں لڑائی کے دوران خاص طور پر برطانوی ثقافت کے رویے کی ہندوستانی مردوں کی جانب تبدیلیوں کو مجسم بنادیا ہے۔ اگرچہ کچھ امراء کے دیوان خانوں میں اُس کا خیرمقدم/ استقبال کسی 'ہم مرتبہ' کی طرح کیا جاتا تھا لیکن بظاہر وہ ایک نچلے طبقے سے اوپر اٹھا تھا۔ ایک بچے کی حیثیت سے اپنے والد کو کھونے کے بعد اُسے 'یوپی' کان پور میں اُن برطانوی مشنریوں نے جو غیرملکی (باہر کے) حصوں میں کلام الٰہی کو پھیلانے والی سوسائٹی سے متعلق تھے اُنہوں نے اُس کی پرورش کی۔ جبکہ اُس کی والدہ پر الزام تھا کہ وہ اُس کی (مشنریوں کی) 'آیا' کے طور پر کام کرتی تھی۔ ان مشنریوں نے اُسے انگلش اور فرانسیسی زبان پڑھائی اور بعدازاں اسے ''کان پور فری سکول' میں بحیثیت استاد استعمال کیا۔ 'دھندوپانت' کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اُس کے شاگردوں میں سے ایک تھا۔ عظیم اللہ نے برطانوی جرنیلوں (Gernal) کے منشی کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں لیکن جب اُسے رشوت کے الزام میں نوکری سے فارغ کردیا گیا تو وہ 1851 میں 'دھندوپانت' کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ 1853 میں عظیم اللہ ترقی کرتے ہوئے برطانیہ میں 'دھندوپانت' کے سفارتکار کی حیثیت تک پہنچ گیا۔

برطانیہ میں عظیم اللہ کی شہرت بحیثیت وہمی/ قیاسی (Putative) شہزادے کی تھی جس کا تعلق ''عجیب وغریب/ انوکھے مشرق'' سے تھا، جس کے سبب نہ صرف یہ کہ اُسے توجہ ملی بلکہ (امراء) اشرافیہ سے تعلق رکھنے والی خواتین کی چاہت بھی حاصل ہوگئی، بالخصوص وہ (عظیم اللہ) لیڈی لوسی ڈف گارڈن کا منظورِنظر اور طویل مدت کے لئے اُس کا گھریلو مہمان بن گیا۔ (گورڈن 1886)۔ ایک مصنفہ اور سیاح جس نے وزیراعظم کے کزن الیگزینڈر ڈف۔ گارڈن شادی کی، ایک شریف انسان جو ملکہ کے لئے ملاقاتی کے فرائض انجام دیتا تھا۔ (فرینک 1994) حالانکہ لوسی اُس (عظیم اللہ) سے محض دس سال بڑی تھی لیکن اُس نے عظیم اللہ کی جانب مادرانہ رویہ اختیار کیا۔ اُس کا دعویٰ ہے کہ اُس نے عظیم اللہ کو برطانوی ثقافت اور سیاست کی تعلیم دی۔ اور وہ غلط طور پر اس پر یقین رکھتی تھی کہ اُس نے (لوسی نے) اُس (عظیم اللہ) کو خالص برطانوی جذبات کو اپنانے پہ قائل کرلیا ہے۔ اُس نے اپنے ایک دوست 'لارڈ زلینڈز ڈونی' کو لکھا۔

میرے پاس یہاں ایک مسلمان 'خان' نامی دوست قیام پذیر ہے۔ اور وہ برف کے حسن پہ اپنی مسرت سے مجھے لبھاتا ہے۔ تم اُن سوالات کی مسلسل تکرار سے لطف اندوز ہوگے جو کہ جاری

رہتے ہیں۔ مجھے سیاسی حیثیت اور تمام سماجی سائنسوں کے نصاب سے شبانہ روز گذرنا پڑتا ہے اور مجھے اپنے شاگرد کے ہاضمے کے لئے اتنی کتابیں حاصل کرنا ہوتی ہیں کہ مجھے محسوس ہونے لگا ہے کہ میں بہت زیادہ صالح اور عالم ہوگئی ہوں۔ (عظیم اللہ) جو کہ انگریز کے خلاف شدید نفرت لے کر آیا تھا۔ اب ایک جوشیلا انگریز بن گیا ہے اور وہ واپس اپنے لوگوں کے پاس ان انتہائی اصلاحی خیالات کے ساتھ جائے گا (اُس کے خطوط کے لئے دیکھئے فرینک 1994)۔

یہاں تک کہ واپسی کے بعد بھی وہ (لوسی) خطوط میں اپنے دستخطوں میں اُسے 'تمہاری محبت بھری ماں' کے الفاظ سے مخاطب کرتی رہی اور وہ (عظیم اللہ) اُسے جواباً 'یورپین ماں' کے نام سے (مخاطب کرتا رہا)۔

اس کے علاوہ عظیم اللہ نے شادی کے قابل برطانوی خواتین میں شہرت حاصل کر لی۔ وہ انتہائی ریاکاری کے ساتھ بہت گھمنڈ سے محبت کرنے والی گھڑسوار خواتین کے ہجوم میں گھرا ہوا، 'برگٹن ڈاون' میں گھوما کرتا۔ بالخصوص اُن میں سے ایک کے ساتھ اس کے انتہائی قریبی تعلقات استوار ہو گئے تھے۔ اس (خاتون) کی عزت کی حفاظت کی خاطر برطانوی مبصرین اُسے ''مس A'' کے نام سے پکارتے تھے۔ عظیم اللہ کے انڈیا واپس آنے کے بعد بھی اُس کے (خاتون کے) محبت آمیز نامے/خطوط اُس کے (عظیم اللہ) کے نام آتے رہے جو کسی قدر فرانسیسی زبان میں ہوتے جس میں وہ اُس سے بارہا شادی رچانے کا اظہار کرتی رہی۔

تمام برطانویوں نے خاص طور پر وہ جنہیں انڈیا کا تجربہ تھا عظیم اللہ کے تعلقات کو تسلیم یا پسند نہیں کیا۔ تاہم 'جان لینگ' ایک برطانوی صحافی اور وکیل جس نے انڈیا میں پہلے پہل بہت سے سال گذارے تھے ''ایشیائی عورت'' تک بشمول جھانسی کی رانی لکشمی بائی کے ساتھ اپنے قریبی رسائی کی تشہیر کرتا ہے 'لینگ' تفصیلاً یہ خبر دیتا ہے کہ کیسے 'رانی' نے جھانسی کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے اُسے اپنا مختار/اٹارنی بنانے کے لئے اُس کی منت سماجت کی۔ یہاں تک کہ اُسے اپنی نمائندگی پر اکسانے کی خاطر اُس نے (رانی نے) نہ صرف اُسے دام میں پھنسانے کی کوشش کی بلکہ اپنے (بہت ڈھکے ہوئے) جسم کو اُس پر عیاں بھی کیا۔ (لینگ 1861)۔ واپس برطانیہ میں 'لینگ' نے اپنے ایشیائی رجحانات کو برقرار رکھا۔ جب برطانیہ کی اونچی سوسائٹی میں اُسے عظیم اللہ سے بطور 'ایک شہزادے' کی حیثیت سے متعارف کروایا گیا تو لینگ نے کہا: ''فی الحقیقت ایک

شہزادہ''اس شخص نے انڈیا میں (ایک میز کے ملازم کی حیثیت سے)50 مرتبہ میری پلیٹ (تھالی) کو بدلا ہے۔(کین 1897 صفحہ 162)۔تاہم وہ گرمجوشی سماجی استقبال جو عظیم اللہ کو برطانوی خواتین سے حاصل ہوا۔اُس کے برعکس اُس کے مقصد کو خنک سرکاری لہجے کا سامنا کرنا پڑا۔اُس نے اور محمد علی خان نے جب 'دندوپانت' کے کاغذات پیش کئے جسے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں نے مسترد کرتے ہوئے اُن سے بات چیت کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ برطانیہ میں اپنی ڈپلومیسی سے مایوس ہوکر وہ جون 1855 میں گھر کی جانب لوٹے۔اہمیت کی بات یہ ہے کہ اُنہوں نے جان بوجھ کر کرائمین جنگ کی خندقوں کے راستے سے سفر کیا (56-1853) جہاں اُنہوں نے ذاتی طور پر برطانوی فوج کی روسیوں کے خلاف غیر موثر جنگ کا مشاہدہ کیا۔اس جنگ نے اُن پر واضح کر دیا کہ برطانوی ناقابلِ شکست نہیں ہیں۔ (رسل 1860 باب I صفحہ 67-165)

بہت سے دوسرے انڈینز کو برطانیہ میں ایسا ہی خیر مقدم ملا۔ اُنہیں کچھ برطانویوں سے۔۔۔بشمول امیر برطانویوں اور خصوصاً امیر خواتین سے عزت بھرا استقبال ملا۔جنہوں نے اُن کی انوکھی وضع/قوتِ واہمہ کو اُن (کی نسبت) سے نمایاں کیا اور لندن کے دیوان خانوں میں تاجداروں کی حیثیت میں اُن کی آؤ بھگت کی۔حالانکہ یہ انوکھی وضع/قوتِ واہمہ درست نہیں تھی لیکن بسااوقات پھسلاوے (خوشامدانہ) ثابت ہوئے اور سیاسی اور سماجی طور پر اُن انڈین سیاحوں کے لئے ،جنہیں برطانیہ میں 'امراء' سمجھا جاتا تھا، بہت سودمند ثابت ہوئے۔اس کے برعکس دوسرے برطانوی جنہیں نوآبادیوں کا تجربہ حاصل تھا، جہاں نسلی تعصب اور علیحدگی طویل عرصے سے نوآبادیاتی نظام کے مرکزی ستون بن چکے تھے۔وہ (برطانوی) برطانیہ میں اوپر کی جانب بڑھتے ہوئے اِن انڈینز کو (جو لندن میں مقیم تھے) اُن انڈینز سے کہیں زیادہ اس ستون کے لئے خطرناک تصور کرتے تھے (جو انڈیا میں مقیم تھے)۔

مزید برآں، انڈیا میں واپس لوٹ کر آنے پر بہت سے ان 'انڈینز' کو برطانوی نوآبادکاروں کے ہاتھوں دوگنے تعصب کا سامنا کرنا پڑتا تھا جنہیں یہ خوف تھا کہ وہ باعزت استقبال جو انہیں برطانیہ میں ملا ہے انہیں (انڈینز کو) متکبر اور حکم عدولی کرنے والا بنا دے گا۔مثال کے طور پر ایک برطانوی رپورٹر اس بات پر بہت سیخ پا تھا جب عظیم اللہ نے انڈیا واپس لوٹ کر لندن سوسائٹی میں

اپنی کامیابی کی بہت زیادہ لاف زنی کی اور (اونچے) مرتبے کے لوگوں کے نام بہت آزادی سے لئے جس نے اُس کے بیانات کے لب و لہجے سے مل کر مجھے اُس کے بارے میں شکوک میں مبتلا کر دیا اور اس اضافے کے ساتھ مجھے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اس میں ناپسندیدگی بھی شامل تھی۔''
(رسل 1860 باب I صفحہ 67-165)

1857 کے اثرات

جب برطانیہ میں موجود 'انڈینز' تک 1857 کا لفظ پہنچا تو تقریباً سبھی کو یہ اندازہ ہوگیا کہ اُنہیں ایک واضح انتخاب کا اقرار کرنا ہوگا۔ خواہ اُن کے (اس کے بارے میں) ذاتی جذبات و احساسات کچھ بھی ہوں۔ بہت سے ایسے (لوگ) جو بغاوت کے حق میں تھے یکسانیت کے ساتھ دشمن، برطانوی سوسائٹی کے خلاف جرأت اظہار نہیں کر پائے۔ کچھ لوگوں نے عوام میں (کھلے کھلے انداز میں) ''باغیوں'' کی مخالفت اور برطانیہ کے ساتھ اپنی وفاداری کا اعلان کیا، اس توقع کے ساتھ کہ اس بحران کو وہ اپنے سیاسی یا ذاتی مقاصد کے لئے یا کم از کم اُس کے (بغاوت کے) نقصانات کو کم کرنے کے لئے استعمال کر سکتے تھے۔ اُن میں سے جو (برطانیہ سے) سے واپس انڈیا چلے گئے کچھ پر سازش کا الزام لگا، اور اُنہیں برطانوی اتھارٹی کی جانب سے تفتیش اور گرفتاری کا سامنا کرنا پڑا۔ فی الحقیقت اُن میں سے وہ (لوگ) جو انڈیا میں برطانیہ کے خلاف لڑائی میں سب سے نمایاں تھے اُن میں سے کچھ کو برطانیہ اپنے قیام کے عرصے میں براہ راست (برطانوی) تعصب اور ناانصافیوں کا سامنا کرنا پڑا، تلخی سے لبریز تھے۔ تمثیلاً / خاص طور پر عظیم اللہ، محمد علی خان 'رنگو باپو جی' بظاہر تمام 1857 میں برطانیہ کے خلاف لڑے تھے۔ محمد علی خان اور 'باپو جی' کے بیٹوں کو بغیر مقدمہ چلائے (کسی مقدمے کے بغیر) جلد بازی میں پھانسی دے دی گئی۔ 'باپو جی' کے سر کی قیمت 50 پاؤنڈ مقرر کرنے اور عظیم اللہ کی بے تحاشا تلاش کے باوجود یہ دونوں گرفتاری سے بچ نکلے اور غائب ہو گئے چنانچہ برطانیہ میں رہنے کے طویل تجربے نے ان لوگوں کی نوآبادیاتی نظام کے بارے میں آگاہی اور انڈیا کے بارے میں حب الوطنی کی حس کو اجاگر کیا۔

مزید یہ کہ 1857 کی لڑائی کے پھوٹنے کی کبھی کبھار آنے والی خبروں نے اُس وقت وہاں پہ (برطانیہ میں) موجود انڈین سفارتکاروں کے بارے میں باقیماندہ عوامی اور سرکاری ہمدردی کو بھی

ختم کر دیا۔ تاہم بہت سی کارندگی (مشن) جاری رہی۔ تاہم اپنی کامیابی کی کسی بھی اُمید کی خاطر اُنہیں برطانیہ سے اپنی وفاداری کا اور بھی زیادہ اعتراف کرنا ہوتا تھا۔ مثلاً اودھ کے سفیروں نے ہاؤس آف لارڈز کو درخواست بھیجی جس میں اُنہوں نے ''انڈیا کے مقامی فوجیوں میں موجود بے مہری جو کہ برطانوی بادشاہت کے لئے مشکلات کا باعث بنی، اُس پر انہوں نے اپنے مخلصانہ پچھتاوے کا اظہار کیا اُنہوں نے برطانوی حکومت کو یقین دلایا کہ ان کا اپنا تعلق شاہانہ نسل سے ہے، وہ برطانوی قوم کے ہمیشہ وفادار اور حقیقی دوست رہیں گے۔'' (عظیم برطانیہ، پارلیمنٹ 1858 ہاؤس آف لارڈز بحث 6 اگست 1858، سلسلہ 3، باب 147، صفحات 22-1119، ٹائمز، 8 اگست 1857)

تاہم لارڈز نے اُن کی اس درخواست کو تکنیکی بنیادوں پر مسترد کر دیا کیونکہ اس میں (درخواست میں) بہت سی جگہوں پر جہاں پروٹوکول کے تحت ''خاکسار/ عاجز'' کی اصطلاح کی ضرورت تھی اسے استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ پٹیشن کے کفیل (Sponsor) لارڈ کیمبل نے بھی اسے پیش کرنے پر معذرت کر دی، جو اس کے مطابق اس نے محض ایک فریضے کے طور پر انجام دی تھی۔ پھر نومبر 1857 میں اودھ کے وفد نے ملکہ وکٹوریا کے لئے انڈیا کو دوبارہ فتح کرنے اور اُس پر حکومت کرنے کی غیر حقیقت پسندانہ پیشکش کی۔ ''ہم تجویز پیش کرتے ہیں کہ پرنس 'میرزا حامد علی بہادر' جو کہ اوودھ (Oude) کے بادشاہ کے ولی عہد ہیں اور فی الحال انگلینڈ میں رہائش پذیر ہیں برطانوی افواج کی مدد کے ساتھ فوری طور پر انڈیا کو روانہ ہو جائیں اور شاہ اوودھ کے نام پر ملک کی حکومت کو سنبھال لیں اور لوگوں کو باغی سپاہیوں کے خلاف خودمختاروں کے علَم کے (نیچے) گرد اکٹھا کریں'' (خط 28 اکتوبر 1857، پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ ہوم کورس پونڈنس (خط و کتابت) ڈائریکٹروں کی عدالت کے مِنٹ نومبر۔ دسمبر 1857) ''انہوں نے افغانستان کے فرمانروا دوست محمد کی پہلے سے قائم کردہ (مثال) کا حوالہ دیا، جسے برطانیہ نے ایک مرتبہ کلکتہ میں قید کر دیا تھا لیکن 1857 میں وہ اُن کی (برطانوی فوج کی) حمایت کر رہا تھا۔ اس تجویز کو برطانویوں نے کوئی اہمیت نہ دی۔

لندن میں دوسرے انڈین ڈپلومیٹس کو غیر یقینی برطانوی عوام کے ساتھ وفاداری کے اعتراف کے لئے ایسی ہی صورتیں اپنانا ہوئیں۔ مثال کے طور پر 'رامپور' کے مہدی علی خان بہادر کو

جو کہ 1856 میں لندن اس لئے گئے تھے کہ وہ اپنے مرحوم سسر کے خطاب اور زمینوں کو بحال کروا سکیں۔آغاز میں وہ پارلیمنٹ کے بہت سے ممبران کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے، تاہم 1857 کے واقعات کی خبر نے اُن کے امکانات کو معدوم کر دیا اور اُنہیں مشکل میں گرفتار کر دیا۔انڈیا کی جانب واپسی برطانیہ سے اُن کی وفاداری کو مشکوک بنا سکتی تھی چنانچہ اُن کے اپنے جو بھی خیالات تھے اُنہوں نے ڈائریکٹروں کو اپنی فرمانبرداری (نمک حلالی) کا یقین دلایا اور اُن سے التجا کی کہ وہ اُن کی واپسی کی غلط توضیح نہ کریں کیونکہ اس کی وجہ صرف اُن کی ''صحت'' (کی خرابی) تھی۔(ڈائریکٹروں کی عدالت کے منٹ 16 اکتوبر 1857 سے 14 اپریل 1858)

فی الحقیقت برطانوی حکومت اور ڈائریکٹروں نے انڈین سیاسی وفود کی واپسی کے لئے اُن پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔اُنہوں نے سندھ کے مراد علی کو خودمختاری کی بحالی کی مہم کو بند کرنے کو کہا اور اُسے واپس انڈیا جا کر برطانوی حکومت کی خدمت میں اپنی وفاداری اور ولولے کے اظہار (کا دم بھرنے) کے لئے کہا۔(19 اگست 1857، پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ ہوم کورس پوئنڈنس) اُسی طرح سید اکبر علی اور جودھ پور کے خیرات علی خان بنگش، جو کہ لندن میں 1851 سے راجہ تکت سنگھ کی نمائندگی کر رہے تھے۔اُنہوں نے ستمبر 1857 میں کمپنی کے ڈائریکٹروں اور 'ہاؤس آف کامنز' کو درخواستیں پیش کیں جن میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ ''میرے آقا 'پرنس' نے ان پر تاسف واقعات کے پھوٹ پڑنے کے بعد جو انڈیا کے اُن حصوں کو تشنج میں مبتلا کئے دے رہے ہیں جو کہ اُس کے (پرنس کے) تصرف میں ہیں، اپنی جانثارانہ دوستی اور ولولے کا اظہار اُس مستعدی سے کیا ہے (جیسا کہ میں نے پبلک پریس/اخبارات میں پڑھا ہے) کہ اُس نے برطانوی حکومت کی مدد کے لئے اپنی مستقل مزاجی پہ مبنی ناقابلِ شکست وفاداری کا اظہار کرتے ہوئے پچاس ہزار سپاہی روانہ کئے ہیں تاکہ وہ برطانیہ کی حمایت کر سکیں۔'' (ڈائریکٹروں کی عدالت کے منٹ، ایسٹ انڈیا کمپنی، برٹش لائبریری 9 اپریل 1857 سے 14 اکتوبر 1857 تک)

جیسے کہ کچھ انڈین، بشمول سفیروں اور اُن کے خدمتگاروں نے، انڈیا کے لئے لندن کو چھوڑا تو وہ (انڈیا میں) وہاں برطانویوں کے لئے بہت بڑے پیمانے پر شک کا مرکز بنے۔مثلاً بمبئی پہنچنے پر جودھ پور کے سفیران، اُن کے نوکروں اور اُن کے انگریز اٹارنی (وکیل) تمام کو بغاوت کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔برطانوی جہاز کے کپتان نے اُن کے خلاف گواہی دی۔

''محمڈن سکریٹری (جودھ پور کے خیرات علی خان) نے میری اور مسافروں کی موجودگی میں یہ کہا کہ وہ (گورنر جنرل) لارڈ ڈلہوزی کو بغیر کسی پچھتاوے کے قتل کر سکتا ہے۔ اور اُس کے جسم کو گِدھوں کے آگے پھینک سکتا ہے یا اِسی قسم کا کچھ اور (کر سکتا ہے)۔۔۔اُس نے اکثر اوقات اپنی ہمدردی باغیوں اور مفسدین کے ساتھ جتائی اور اُن کی کامیابی کی تمنا کی۔ اُس نے بسا اوقات کہا کہ ملک انگریزوں کی بجائے مقامی شہزادوں اور حکمرانوں کے زیر اثر بہتر طور پر چلایا جا سکتا ہے۔''

(عظیم برطانیہ پارلیمنٹ 1859، کامنز، باب 18 صفحہ 73 نمبر 125 واپسی 4 مارچ 1859)

جہاز کے کپتان نے اچھے قوائد کی خاطر یہ اضافہ کیا کہ نوکروں میں سے ایک 'میر جان' غیر اخلاقی طور پر اپنی انگریز بیوی کو لندن میں چھوڑ آیا ہے۔

وہ تمام لوگ جو لندن میں 1857 میں آئے، لندن والے اُن سب کے خلاف نہیں ہوئے۔ نیپال کا جنرل جنگ بہادر رانا 1850 میں لندن میں آیا۔ جہاں اُس کا شاہانہ استقبال ہوا۔ وہ برطانیہ کی فوجی اور انڈسٹری کی قوت سے بہت مرعوب تھا۔ 1857 میں وہ برطانیہ کا سب سے پکا سیاسی اور فوجی حمایتی ثابت ہوا۔

مجموعی طور پر 1857 کے واقعات کی اچانک اور صدمہ پہنچانے والی خبروں نے خاص طور پر انڈین مردوں کے بارے میں برطانوی رویے کو پہلے سے کہیں زیادہ پرزور انداز سے مرکوز اور سخت کر دیا۔

برطانوی عورتوں اور بچوں کے خلاف انڈین سپاہیوں اور خدمتگاروں کے مظالم کی وحشت ناک افواہوں بشمول عوامی سطح پر زنا بالجبر، اور قتل عام نے نسلی شناخت کی جنسی تفریق کو نمایاں کر کے پیش کیا اور برطانوی قومی دیوانگی کو ہوا دی۔ زیادہ تر برطانویوں نے اچانک تمام انڈین مردوں کو خاص طور پر برطانوی عورتوں کے لئے خطرناک سمجھنا شروع کر دیا۔ چنانچہ برطانیہ میں اپنے طبقے کی برطانوی عورتوں کے ساتھ انڈین مردوں کے مقابلتاً آسان تعلقات/رشتوں پر بہت سارے برطانویوں نے نسلی اور جنسی تجاوز کا الزام لگایا۔ البتہ انڈیا میں انڈین عورت کو 'اودھ کی بیگم حضرت محل' اور 'جھانسی کی رانی لکشمی بائی' کے نمایاں ہونے کے باوجود بظاہر اِس قدر بدظنی کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ یہ خواتین یا تو رومانوی ہیروئنوں یا مردانہ جدوجہد کی حیثیت سے منظر عام پر آئیں۔ برطانوی پریس (اخبارات) نے نہ صرف برطانوی فوجیوں کے ہاتھوں انڈین عورتوں پہ ہونے والے جنسی

تشدد پر کوئی تبصرہ کیا، بلکہ بہت سارے مظالم میں مرد حلیفوں یا سرغنوں کو مغلوب برطانوی عورتوں پر ظلم ڈھانے کا ملزم ٹھہرایا وہ یا تو انڈین مرد کا (برطانوی عورتوں کو) دق/ پریشان کرنا تھا یا برطانوی مردوں کے انتقام کی صورت میں تھا۔

محض چند برطانویوں نے برداشت کا اظہار کیا، یہ کہتے ہوئے کہ انڈین مرد (آدمی) جیسا کہ وہ جانتے ہیں اتنے برے نہیں ہو سکتے جتنا کہ افواہوں نے اُن کی تصویر کشی کی ہے۔ مثال کے طور پر جب نانا صاحب کے ہاتھوں برطانوی قیدیوں کے 'کان پور' میں قتل عام میں عظیم اللہ کی شمولیت کی افواہ اُس کی سرپرست اور نامزد ''ماں'' لیڈی 'ڈف گارڈن' تک پہنچی تو اُس نے لکھا ''میں بالکل بھی یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ وہ (عظیم اللہ) کیئے جانے والے مظالم کو پسند یا برداشت کر سکتا ہے، (لیکن) میں دو سنگِ میلوں کے درمیان (پھنسے ہوئے) مقامی لوگوں کے ساتھ ہمدردی کرنے والی۔۔۔ واحد ہوں۔۔۔ وہ جو پہلے سپاہیوں کے ہاتھ تشدد کا نشانہ بنے اور بعد میں انگریزوں (کے ہاتھوں) سے پائمال ہوئے۔ مظلوم انگریز کم از کم انتقام اور چندہ وغیرہ حاصل کرلیں گے لیکن اُن بے یار و مددگار اور غریب لوگوں پہ رحم کون کھائے گا جو سیاہ جلد والے اور اپنے ہی مذہب سے تعلق رکھنے والوں کے تشدد کا نشانہ بنے ہیں؟ ہمارے اور اُن کے سامنے تباہی اور نفرت کا یہ کیسا منظر ہے۔''

(1994، فرینک میں بیان کیا گیا، صفحات 91-190)

یہاں تک کہ نمایاں طور پر ہمدرد برطانوی بھی تمام انڈین آدمیوں کو شبہ اور دھوکے کی نظر سے دیکھنے لگے۔ بہت سے برطانوی اپنے انڈین واقف کاروں سے توقع رکھتے تھے کہ وہ (انڈین) اپنی وفاداری کا ثبوت ''باغیوں'' کے خلاف بولنے اور عمل کرنے سے فراہم کریں۔

یہاں تک کہ لندن میں محنت کش طبقے کے انڈین لوگوں کو بھی اچانک 'دشمن' دکھائی دیئے جانے کی تحقیر برداشت کرنا پڑی۔ مثال کے طور پر ایک بنگالی 'جوعلیکا' جو ٹیپو سلطان کے سب سے چھوٹے بیٹے شہزادہ غلام محمد کے ساتھ 1854 میں لندن آیا تھا اپنے ملازمت دینے والے کے ساتھ واپس انڈیا جانے کی بجائے (جوعلیکا) لندن میں ٹھہر گیا، اور اُس نے انگریز اور آئرش عورتوں کے ایک سلسلے کے ساتھ رہنا شروع کر دیا اور اُن سے کم از کم پانچ بچے پیدا کیئے، اور محض نام کے طور پر عیسائیت قبول کر لی، (حالانکہ اُس نے یہ بیان دیا کہ ''چنانچہ میں عیسائی ہو گیا ہوں،

میں نہیں جانتا کہ اس کے معنی کیا ہیں، لیکن میں ایک عیسائی ہوں، اور بہت سالوں سے ہوں'') (ہالی ڈے میں بیان شدہ 1862 صفحہ 424)۔ دوسرے انڈینز کی توضیح کر کے روزی کمانے، برطانویوں سے بھیک مانگنے اور گھٹیا کام کرنے کے ساتھ ساتھ سال ہا سال لندن میں رہنے کے باوجود برطانویوں کا اُس کے ساتھ رویہ 1857 کی لڑائی کے دوران انقلابی طور پر بدل گیا، ''بغاوت کے بعد۔۔۔ میں بہت بری طرح سے رہا۔۔۔اُس کو کچھ دینا تو دور کی بات تھی تب کوئی بھی مفلوک الحال انڈین کی جانب دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔۔۔وہ تمام جو مجھے جانتے تھے اس کے متعلق (1857 کے متعلق) مجھ پہ ٹھٹھا کرتے تھے۔ (پھبتی کستے تھے) اور مجھے 'جونی' سپاہی کہتے تھے۔ (ہالی ڈے میں بیان شدہ 1862، صفحہ 425)

اُسی وقت لندن کے اخبارات جیسے کہ 'سٹی مشن میگزین' (اگست 1857) نے ایشین مردوں اور برطانوی عورتوں کے درمیان مخلوط تعلق کے بارے میں برطانوی تفکرات (خطرات) کا کھلا اظہار کیا، خاص طور پر (وہ جو کہ) ایشیائی کوارٹر کی کمیونٹی میں (بس رہے) تھے۔ ''تمام رنگوں کے لوگ، قوموں کے حساب سے نصف (درجے کے) (half a Score of notions) بہت سی (سفید) خواتین کے ساتھ ہوتے ہیں، بہت سوں نے شراب پی ہوتی ہے، اور تمام دنگے/فساد پہ تلے ہوتے ہیں، عورتوں نے سروں پر جہاز رانوں کے ٹوپ پہنے ہوتے ہیں اور اپنی کمروں کے گرد جہاز رانوں کے بیلٹ باندھے ہوتے ہیں، وہ آپس میں لڑ رہے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کو اِدھر اُدھر کھینچ رہے ہوتے ہیں۔ کچھ کو لوٹ لیا جاتا ہے، اور اُس میں پولیس بھی شامل ہے (لٹنے والوں میں)، زبان ایسی کہ صرف شیطان ہی اُسے بولنے کا مشورہ دے سکتا ہے۔ اور یہ تمام تر منظر دیکھنے والے کے ذہن کو جہنم کے جنون کے خیال کی جانب بلاتا ہے (سالٹر میں لکھا گیا، 1873، صفحہ 34)

چنانچہ 1857 میں برطانیہ میں تمام طبقوں کے انڈین آدمیوں کو انتہائی کٹھن حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ برطانوی مرد انڈیا میں برطانوی عورتوں کے خلاف روا رکھے گئے مظالم کے الزام کا بدلہ لینے کے لئے بھی غصے سے آگ بگولہ تھے۔ اس تحقیر کے لئے عظیم اللہ پر بالخصوص انگلی اٹھائی گئی۔ لارڈ فریڈرک رابرٹ نے دسمبر 1857 میں اُن خطوط کے دستیاب ہونے پر دکھ اور خوف کا اظہار کیا تھا جو اُس شیطان عظیم اللہ نے لکھے تھے۔۔۔ ایسی خرافات میں نے پہلے کبھی نہیں پڑھی، جو کہ کچھ (آدھی) فرانسیسی (زبان) میں ہے، یہ بدمعاش سمجھتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ انگریز

خواتین کو کیسے فریفتہ کیا جا سکتا ہے۔ مس...... عظیم اللہ سے شادی کرنے والی تھی۔ اور مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اب بھی ایسا کرنا چاہتی ہے۔ حالانکہ وہ 'کان پور' کے قتل عام میں سب سے بڑا بھڑ کانے والا تھا۔'' (رابرٹ 1924 صفحہ 121-120) بعدازاں برطانوی مبصرین نے ان بہتانوں کو 1857 میں دوہرایا اور عظیم اللہ کو 'گلِ بلاس' یا 'کیسانوا' قسم کے ''ایک کامل بدمعاش کا نام دیا''۔ جس نے جبکہ وہ برطانیہ میں تھا برطانوی عورتوں کو اس طرح اپنی جانب کھینچا جیسے 'شمع کے گرد پروانے' جوا ڑتے ہیں اور جل بجھتے ہیں۔ (کین 1883، صفحہ 69) مس A کے دوستوں نے مداخلت کر کے اسے اِس بہت سی شادیاں رچانے والے (محمڈن) کے حرم کی ایک شئے بننے سے بچالیا۔ سو ہم انجام کی جانب آتے ہیں، 'بل گریوا' کو تنبیہہ کرتے ہوئے کہ وہ پہلے سے ہی محتاط رہے۔ کیونکہ وہ ڈرائنگ روم کو ایشیائی مہمانوں سے سجاتی ہے۔'' (تھامسن 1859 صفحہ 59-55) کسی انڈین آدمی کے ساتھ برطانوی عورت کے قریبی تعلقات پہ خوف کا امکان 1857 کے دوران اور بعد میں برطانوی لکھاریوں میں طاقتور ترین استعارات کی حیثیت سے داخل ہوا۔

1857 کے (بعدازاں) نتائج

1857 کے بحران کے فوراً بعد برطانیہ میں انڈین کی طرف برطانوی رویوں میں کسی قدر نرمی آئی۔ لیکن یہ (رویے) مکمل طور پر پہلے طریقوں کی جانب نہیں لوٹے۔ بعد میں برطانوی لکیر کے فقیروں (غیر متبدل) نے تمام انڈینز کو زیادہ تر ناقابلِ تغیر (تبدل) اجنبی قرار دیا، ان لکیر کے فقیروں کو مزید قوت ڈارون ازم کی حیاتیاتی وراثت، جعلی/مصنوعی سائنسی سماجی ڈارون ازم کی مشہور فہم اور 'جمیکا' میں 1865 میں 'نسل' پہ مبنی تصادموں اور نیوزی لینڈ میں 1872 تک جاری رہنے والی ماا وری' (Maori) جنگوں نے دی۔ اس کے باوجود برطانوی راج کی (اُن) پالیسیوں (کی بدولت) جو کہ انڈین شہزادوں کی انڈیا کے ''فطرتی لیڈروں/ راہنماؤں'' کی حیثیت میں حمایت کرتی تھیں نے فی الحقیقت اُنہیں (انڈین شہزادوں کو) برطانوی ملکہ کی قربت تک پہنچنے کی رسائی دی اور برطانوی حکومت کی جانب سے زیادہ موافق پالیسیاں (بھی) دیں۔

چنانچہ وہ انڈینز جو برطانیہ میں رکے رہے یا بعد میں پہنچے اُن کی بعدازاں زندگیاں 1857

کی بازگشت سے متاثر ہوتی رہیں۔ برطانویوں اور انڈینز کے درمیان جنس کے تعلقات میں 1857 کے باعث آنے والی تبدیلیاں ایک مخصوص نمایاں موضوع تھا۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا، 1857 سے پہلے بھی بہت سے برطانویوں نے ایشیائی کوارٹرز کو شاہی دارالخلافہ میں ایک اجنبی کی موجودگی سے تعبیر کرنا شروع کر دیا تھا۔ سماجی اصلاح پسندوں اور مذہبی ایوانجلیقوں نے خاص طور پر انڈین اور برطانوی ثقافتوں کے لوگوں اور جسموں کے میلاپ کو برطانوی اخلاقیات کے لئے خطرہ سمجھ لیا تھا۔ 1873 میں ایک مشنری 'سالٹر' نے ایک انگلش پبلک ہاؤس 'رائل سوئرن' (12 بلیوگیٹ فیلڈ) کی لندن کے ایشیائی کوارٹر میں تبدیل ہونے پر گوشمالی کی تھی، جوکہ لشکرز اور برطانوی نچلے طبقے کی خواتین کے لئے حفاظت گاہ بن گیا تھا۔

''ایک خاص قسم کا کھیل (Skittler) سکٹلر بہت عرصہ ہوا غائب ہو گیا ہے۔ اور کھردری دیواروں اور چھت نے تند و تیز یورپین آوازوں کی بازگشت کو تمام کر دیا ہے۔۔۔ کیونکہ ایشین لوگوں نے اس پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور لشکر کے آرام کے لئے بیس بستر بچھائے (پھیلائے) گئے ہیں جو کہ (لشکر) (سکٹلر کے میدان میں) پناہ گزیر ہے Jagree سٹی، بنکی حقے، اور گندے لوٹے اس کے آزادانہ استعمال کا ثبوت ہیں۔ لیکن۔ سنو۔ اونچی آواز میں چیختی ہوئی ناموافق ایشین اور یورپین کی ملی جلی آوازیں کیا ہیں؟ یہ ترغیب زدہ مردوں اور عورتوں کی اکٹھی آوازیں۔۔۔ محض لشکر کی ہمسایہ (برطانوی) خواتین کے ساتھ بادہ نوشی اور رنگ رلیاں ہیں۔۔۔ (سالٹر 1873 صفحات 32-31، 69)

یہ گھر 1873 میں بھی ایک برطانوی آدمی کی ملکیت تھا، لیکن ایک غنڈہ انڈین فرانسس کا ڈیری اُسے سالٹر کی مایوسی کے باوجود چلا رہا تھا۔

برطانیہ کے مشہور (معروف) مصنفوں نے بھی جنس کے بدلے ہوئے رویے کی نمائندگی کی۔ مثال کے طور پر 1857 سے قبل 'سر والٹر سکاٹ' کی (تصنیف) ''سرجن کی بیٹی'' ہی شاید ایک مشہور کتاب تھی جو انڈین مردوں کی برطانوی نسوانیت کی خواہش کا پتہ دیتی تھی (اور یہ ناول ایک سکاٹش دوشیزہ کے سکاٹش دغاباز بھڑوے کے کردار کو نمایاں کرتا ہے جو (دوشیزہ) بدنام ٹیپو سلطان سے متعلق تھی) 1857 کے دوران اور اُس کے بعد تاہم انڈین آدمی (مرد) کے برطانوی خاتون کے تعاقب یا (اُس پہ) حملے کی ایسی برطانوی حکایات کی سرگذشتیں اور اس کے ساتھ ''بغاوت'' کا

لٹریچر عموماً فی الحقیقت طرز نقاشی کی صورت اختیار کر گیا ہے جو آج بھی جاری ہے چنانچہ 1857 کے واقعات نے سفید برطانوی نسوانیت کو برطانوی پاکیزگی کی علامت بنا دیا جسے تحفظ کی ضرورت تھی اور جس نے انڈین آدمی (مرد) کے خلاف برطانیہ اور انڈیا میں برطانوی پبلک اور (برطانوی) سرکاری دشمنی تخلیق کر دی۔

بعدازاں انڈین اور پاکستانی تاریخ دانوں نے بالکل مختلف طریقے سے کچھ 'انڈینز' کو نمایاں کیا ہے جو 1857 کے دوران برطانیہ سے واپس انڈیا لوٹے تاکہ وہ برطانیہ کی مخالفت کر سکیں۔ لیکن (انگریزوں کے برعکس) اُنہیں قوم پرست آزادی کی جنگ لڑنے والے ہیروز کی حیثیت دی ہے۔ باسو دلیل دیتا ہے کہ ''رنگو باپو جی کو انگلینڈ میں انڈیا کا پہلا اور ہادی انڈین شورشی کہنا چاہئے۔'' (باسو 1922 صفحہ 142)

بہت سارے مصنفین نے عظیم اللہ کو پہلی آزادی کی جنگ میں قیادت کرتے ہوئے انڈین محبّ الوطن کی حیثیت سے (توجہ کا) مرکز بنایا ہے۔ (مثال کے طور پر سن 1957: مسرا 1961)

پاکستانی قوم پرست تاریخ دانوں نے اپنے طور پر بھی عظیم اللہ کے بارے میں بحیثیت ایک اعلیٰ دماغ شخصیت ہونے کا دعویٰ کیا ہے جس نے مسلمانوں میں آگاہی پیدا کی اور اُنہیں اپنی آخری عظمت کو عظیم نو آبادیاتی قوت کے جڑوں سے بحال کرانے کے لئے میدانِ کارزار تک لے گیا۔ یہ عظیم اللہ خان کا ارفع دماغ تھا، جو کہ 1857 کی جنگ آزادی کے پیچھے ایک عظیم شخصیت کی حیثیت سے تاریخ میں ہمیشہ قائم رہنے والے نشانات چھوڑ گیا ہے جو کہ پاکستان کی شکل میں ہیں۔ (لطف اللہ 1970 صفحہ 6، 31 اصل پہ زور) خواہ وہ ''پرانے محبّ الوطن'' ہوں یا جدید قوم پرست، ان انسانوں کا برطانیہ میں براہ راست زندگی کا تجربہ انہیں برطانوی نو آبادیاتی نظام کے عالمی امکان، اور قوت سے خاص طور پر آگاہ کر گیا۔ (س، ف، بیلے 1998)

1857 کے بحران کے بعد برطانیہ میں مختلف طبقات کے انڈینز نے ''غیر سفید فام'' (لوگوں) کی جانب تبدیل شدہ برطانوی رویے سے داؤ/تدبیر کے ذریعے (کامیاب ہونے) راستہ بنانا سیکھ لیا۔ انڈیا کے تاجدار، بشمول دلیپ سنگھ اور نواب کرناٹک کی پیڑی کے دو (دعویدار) لوگ حافظ لودھرو اسلام خان اور حیدر جنگ، برطانیہ میں رہے اور بالآخر برطانیہ کی حمایت حاصل کرنے میں دوسروں کی طرح کامیاب ہو گئے۔ 'کورگ' کے سابق

مہاراجہ غلام محمد نے 1857 انڈیا میں گذارا لیکن ایک مرتبہ جب لڑائی بند ہو گئی تو اپنے بیٹے اور پوتے کے ساتھ لندن لوٹ کر آیا، اور اُسے بڑھی ہوئی پنشن، اور فوائد اور لندن کے اعلیٰ سوسائٹی کے مزے (چکھنے) کو ملے۔ تمام وہ انڈین شہزادے جنہوں نے برطانیہ کی شدت سے مخالفت نہیں کی تھی بعد ازاں (برطانوی) راج کے ستون شہزادگان ٹھہرے اور بسا اوقات انگلینڈ میں اُنہیں خوش آمدید کہا گیا۔

اس بحران کے دوران برطانیہ میں درمیانے طبقے کے انڈینز بشمول پارسی عالم اور بمبئی کے سوداگر دادا بھائی نے اودو جی، جو برطانوی پارلیمنٹ میں دوسرے منتخب انڈین تھے اور انڈین نیشنل کانگریس کے ''عظیم بوڑھے آدمی'' کہلاتے تھے۔ واقعی بہت سے آئندہ آنے والے انڈین قوم پرستوں نے بھی آنے والے عشروں میں برطانیہ میں تعلیم حاصل کی، اور برطانوی نوآبادیاتی نظام کے بہت بڑے طریق کار (انداز) کے بارے میں سیکھا، کچھ قوم پرست سیاسی لیڈر بن گئے، بشمول بی۔ آر۔ امبیڈکر، ایس۔ سی۔ بوس، موہن داس گاندھی، اوروبندا گھوس، ایم۔ اے۔ جناح، جواہر لال نہرو، اور وی۔ ڈی۔ سوارکر کے، جیسا کہ انہوں نے بہت زیادہ تعلیم حاصل کی، ان تمام لوگوں نے اعلیٰ نوآبادیاتی برطانیہ میں اپنے تجربات کو حاصل کیا، جس سے اُن کو اپنا سیاسی، اور ثقافتی قومیت پرستی بنانے میں مدد ملی۔ اس کے علاوہ انڈین، مرد اور خواتین سماجی قائدین جن میں بہرام جی مالاباری، سارس وتی راما بھائی، اور کورنیلا سوراب جی بھی شامل تھے۔ تنقیدی اعتبار سے برطانوی سوسائٹی میں (سرگرمیوں میں) مصروف ہو گئے جو کہ برطانیہ کی اُن کوششوں کی مخالفت کرتے ہوئے کہ وہ (برطانیہ) اُن کی زندگیوں اور نشانات پہ قابو حاصل کر سکے۔ تمام انڈینز نے ایک ہی طریقے پہ عمل کیا، کچھ بشمول سر مان مہر جی مروان جی بھوان نگری، ایم۔ پی۔ شدت سے ٹوری (قدامت پسند پارٹی) رہے۔ چنانچہ 1857 کے واقعات نے برطانیہ میں موجود انڈینز کے تجربات میں ایک تغیر پیدا کیا، اور بہت سے لوگوں نے بڑھتے ہوئے برطانوی سامراج اور نسل پرستی کے خلاف اجتماعی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس کے باوجود 1857 مکمل طور پر ایک اچانک تبدیلی نہیں تھا۔ ان تبدیلیوں کے پیش رو (نقیب) انڈین اور برطانوی رویوں دونوں میں موجود تھے۔ بہت سے انڈین نے وہاں طبقاتی یک جہتی کی فہم/حس پیدا کر لی۔ اُسی قدر خواہ وہ ایشیائی کوارٹرز کی کمیونٹی

میں رہتے ہوئے یا انڈین سفارتکاروں کے وفود کے فراہم کردہ سماجی مرکزوں میں رہتے ہوئے پیدا ہوئی۔ مزید یہ کہ برطانیہ کے منظرنامے میں رہتے ہوئے اُن میں سے کچھ کو ایک فاصلے سے عالمی نوآبادیاتی نظام کے بڑے طریق کار کو سمجھنے میں مدد ملی جو ایسی چیز تھی جو انڈیا میں رہتے ہوئے ناممکن تھی۔ باوجودیکہ اُن کی بنیاد (تعلق) مختلف علاقوں سے تھی یا مختلف مذہبی کمیونٹیوں سے مجموعی طور پر اُن میں خود کو اجتماعی حیثیت میں انڈین سمجھنے (کا شعور) بیدار ہوا اور اُن میں سے بہت ساروں میں ابتدائی نوعیت کی حب الوطنی پیدا ہوئی۔ برطانیہ کے متعصب لکیر کے فقیر یکساں نہیں تھے اور نہ ہی انڈینز کے تمام طبقات کے ساتھ وہ اس کا برابر کا اطلاق کرتے تھے۔ 1857 کے بعد انڈین مرد اور برطانوی عورت کا جنس کا رشتہ خاص طور پہ بدل گیا، اور اُس کا اظہار پیچیدہ اور بدلتے ہوئے طریق کار سے ہوتا تھا۔ چنانچہ 1857 کے واقعات نے برطانیہ میں رہنے والے انڈینز کی زندگیوں میں بہت بڑی تبدیلی کے بالخصوص طاقتور لمحے کا عندیہ/اشارہ دیا، خاص طور پر انڈین مردوں کے بارے میں۔ بعد کی انڈین نسلیں بھی برطانیہ میں 1857 کے سائے تلے زندہ رہیں، اگرچہ اُن کے ذاتی تجربات بہت حد تک مختلف تھے۔

❁❁❁❁❁

تاریخ بحیثیت انتقام اور مکافات

ساورکر' کی ''1857 کی جنگ آزادی'' کی دوبارہ خواندگی

جیوتر میا شرما/ترجمہ: ڈاکٹر صولت ناگی

'سوارکر' کے 1857 کے بیان نے ہندو قومیت پرستی کے نام پر کیے جانے والے مکافاتی تشدد کو (قانونی طور پر) جائز قرار دینے کا فریضہ انجام دیا ہے۔اس کی بنیاد اُس تصور پر ہے کہ ''ہندو راشٹرا'' کی تاریخ کو کس طرح سے لکھا جائے جب کہ دوستوں اور دشمنوں کے درمیان مخالفت کی بنیاد سیاست کے نمونے کی تشہیر ہو۔

'سوارکر' کی 1857 کے بیان کی کسی بھی معاصر خواندگی کا پہلا قدم از خود کتاب کا عنوان (سرنامہ) ہونا چاہیے۔ 1857 کو اکثر و بیشتر انڈین آزادی کی پہلی جنگ کہا جاتا ہے۔تمام تر بیانات کی رو سے لفظ 'پہلی' کا داخل کیا جانا بعد کا اضافہ/اندراج ہے۔'سوارکر سا گرا' اس کا ذکر 1857 کی جنگ آزادی کی حیثیت سے کرتا ہے۔

'وساناتھ کرشنا وارد پانڈے' (جو کہ) 'سوارکر' کا ایک مداح ہے اسے 1857 کی انڈین آزادی کی جنگ کہتا ہے۔'ہراندرا سری واستیوا' سالوں کا تفصیلی بیان دیتا ہے جو 'سوارکر' کو 1857 کی تاریخ کی اشاعت تک لے گئے۔اور اُس کے عنوان کا واضح ذکر 1857 کی انڈین جنگِ آزادی کی حیثیت سے کرتا ہے۔'واراد پانڈے' اور 'سری واستیوا' کے معاملے میں (کے مطابق)

لفظ ''انڈین'' عنوان میں کیا گیا اضافہ ہے۔'دھنجان جیا کر' جو 'سوارکر' کے حالاتِ زندگی کا مصنف ہے جس میں اُس کا تذکرہ ولی کی حیثیت سے کیا گیا ہے، صفحہ 67 پر عنوان، کو پہلی انڈین جنگ آزادی 1857 کا نام دیتا ہے۔ لیکن صفحہ 74 پر اس کا ذکر 1857 کی جنگ آزادی کے عنوان سے کرتا ہے۔ اصلی عنوان کے مطابق 'سوارکر' کی سماگرا کے میراٹھی اور ہندی میں دیئے گئے بیانات سے یہ فرض کر لینا ہی زیادہ بہتر (محفوظ) ہوگا کہ ''1857 کی جنگ آزادی'' ہی (اصل) عنوان ہے۔

'سوارکر' کے 1857 کی تاریخ پہ غور کرنے سے پہلے ایک اور انتہائی اہم (بات) یہ ہے کہ سوارکر کے ایک اور مضمون میں جس کا عنوان ہے ''وہ جو ہندو اجتماع کے لئے کام کر رہے ہیں۔ اُنہیں اپنی قوم کی تاریخ کو کیسے لکھنا اور پڑھنا چاہئے'' (کی خواندگی کرنی چاہئے) 'سوارکر' ہندو راشٹرا کی موجودگی کا آغاز اس دلیل سے کرتا ہے کہ جال کو مہیب اور طاقتور بنایا جانا چاہئے۔ ایسا کرنے کے لئے ماضی کا علم بہت ہی اہم ہے۔ ہندوؤں کی تاریخ، تاہم ''بھارتیہ سنسکرتی'' میں سے ایک کا ظہور ہے۔ جو کہ تمام تفاوتوں، اختلافات اور اژدھام کو قومی اتحاد کے مفہوم میں اکٹھے باندگی کے عمل کے ذریعے سے ممکن ہوا۔

لیکن 'سوارکر' کے لئے ہندو تاریخ کی خواندگی غیر ملکی جارحیت اور اثرات کی بھی تاریخ ہے۔ وہ طریقہ جس کے ذریعے سے ان کا مقابلہ کیا گیا اور انہیں ہندو ثقافت اور تہذیبی قالب میں ڈھالا گیا۔ اس داستان کا شروع کا حصہ ہندو ثقافت کی فتوحات (کامیابیوں) میں سے ایک ہے کہ وہ ان غیر ملکی دھاوں اور اثرات پر غالب آ گئی۔ بعدازاں مسلمانوں کے حملے ایک بالکل مختلف معاملہ ہیں۔ 'سوارکر' دلیل دیتا ہے کہ یہ ایک بیان ہے مسلمانوں کے خلاف جدوجہد کا، اور بالآخر مسلمانوں کی فرماں روائی کی ''چترا پاتی شیواجی'' کے ہاتھوں شکست ہوئی، جس نے نتیجتاً 'ہندو پادشاہی' یا ہندو ایمپائر کو قائم کیا۔

'سوارکر' کے لئے تاریخ کو تب دو مختلف طریقوں سے لکھا جانا چاہئے تھا۔ ہندو قوم کی ایک تاریخ ہونی چاہئے تھی اور مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کے مقابلوں کی تاریخ بھی ہونا چاہئے تھی۔ جبکہ وہ ہندو قوم کے تاریخ لکھنے والوں (مورخوں) تاریخ کے مصنفین کو نصیحت کرتا ہے کہ وہ معروض اور سچائی پہ مبنی رہیں، تاریخ کے نقائص زدہ لمحات کو لکھنے کے لئے (کہتا ہے) اور حقیقتاً ایسا

کرنے کے لئے وہ ہندوؤں اور دوسری قوموں کی تاریخ لکھنے کے لئے مختلف قوائد کے طریقے قائم کرتا ہے۔قومی مفہوم میں آریاؤں اور غیر آریاؤں، برہموں اور شودروں، ویدک اور اویدک، کیستا یا دراڑوں، جین اور بدھا، شیوا اور وشنوا کے درمیان امتاز 'سوارکر' کے نزدیک فالتو ہیں۔ آخری تجزیے میں اصل حیثیت/فرق یہ تھا کہ ہماری اجتماعی زندگیاں محض ایک لفظ (کے ذریعے) سے بیان کی جاسکتی ہیں۔۔۔اور وہ یکتا لفظ ہے۔ ہندو، جبکہ 'سوارکر' کے لئے تاریخ شاندار کامیابیوں اور الجھا دینے والے اور غیر آرام دہ لمحات کی آمیزش ہے، اسے آریاؤں اور غیر آریاؤں کی تاریخ میں تقسیم نہیں کیا جانا چاہئے بلکہ اسے ہندو راشٹرا کی تاریخ کی حیثیت سے لکھا جانا چاہئے۔

'سوارکر' کی ہندو تاریخ لکھنے کا طریق کار چنانچہ آگے آنے والے خطِ حرکت (متدیر) پہ مشتمل ہے۔مثلاً ہندو تاریخ دانوں کو ہندوازم اور بدھ ازم کے درمیان مخالفت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔'جین' کے واقع کو جب اُنہوں نے اپنے دفاع کے لئے ہتھیار اٹھا لئے تھے۔اور شیوا اور وشنو کے ماننے والوں کے درمیان رخنے کو (نظر انداز نہیں کرنا چاہئے) اس کے باوجود مخالفتوں اور تفاوتوں کو ''تمام ہندو نسل'' کی تاریخ کی حیثیت سے پڑھا جانا چاہئے جو کہ متحد اور ایک وجود/ہستی تھی۔'سوارکر' مشورہ دیتا ہے کہ ماضی کی مخالفتوں اور تفاوتوں کو اب ہندوؤں کی عام اور شراکتی سماجی تاریخ کی طرح پیش کرنا چاہئے۔مضمون کے آغاز میں 'سوارکر' آج/حال کو مضبوط کرنے اور باندھنے کے لئے ماضی کی مناسب تعلیم پہ زور دیتا ہے۔لیکن اُس طریقے/انداز کا خاکہ اتارتے ہوئے جس میں ہندو قوم کی متحد تاریخ کو لکھا جانا چاہئے، 'سوارکر' ایک نئے عنصر کو متعارف کرواتا ہے۔وہ کہتا ہے۔

> ''جو کچھ بھی (ہندو تاریخ میں) ماضی میں ہوا، حقیقت پر مبنی اور معروضی طور پر لکھا گیا ہے۔ وہ جوابات کہ آج کیا ہونا چاہئے۔ ماضی سے (کے ذریعے) نہیں دیئے جاسکتے، ان جوابات کو حال میں تلاش کرنا ہوگا۔''

نہ صرف یہ کہ ''معروضی'' ہندو تاریخ کے پاس حال کو دینے کے لئے زیادہ کچھ نہیں ہے بلکہ 'سوارکر' کے تصور کے مطابق معاصر ہندو تاریخ دانوں کو بھی ہندو ماضی کی اُس کی ('سوارکر' کی) خواندگی کے لئے بھی کچھ اصولوں پہ کاربند ہونا ہوگا۔

ماضی پہ حال کے مراکزِ شعاع سے (bifocals) تنقید نہیں کرنی چاہئے۔ ایک خاص عرصے میں جو یکتا/ بے نظیر واقعات ہوئے وہ ایک مختلف سماج اور مختلف حالت کا نتیجہ تھے۔ 'سوارکر' یہاں اختتام کرتا ہے، ہندو تاریخ ایک قوم کے ظہور کی تاریخ تھی جسے ہندوستان کہا گیا۔ (جو کہ) مختلف علاقوں اور چھوٹی قومیتوں کا ادغام (تھا)۔ یہ ناقابل تقسیم اکھنڈ بھارت تھا۔ چنانچہ ہندو تاریخ تمام قومیتوں اور شناختوں کی تاریخ تھی جو ایک دوسرے سے مل کر ایک واحد نامیاتی اتحاد میں سما گئی۔

'سوارکر' کے لئے ''تاریخ لکھنے کی ایک اور مزاحیہ قسم بھی ہے جو سچائی کی فطرت کو چھپا لیتی ہے'' کانگریسی جو گاندھی جی کے سَنکی دنیاوی منظر اور سمت پہ کاربند تھے، اُنہوں نے یہ تاریخ لکھی۔ یہ تاریخ اُن مظالم کو نظر انداز کر دیتی ہے جو اورنگ زیب اور علاؤالدین خلجی جیسے مسلمان حکمرانوں نے، جن چند کا ذکر کیا گیا ہے، ہندوؤں پہ توڑے۔ تاریخ کی اس شکل (ہیئت) میں 'سوارکر' کو اس ہیئت میں مسلمانوں کی مذہبی اذیت رسانی کے ارتکاب کی تاریخ نہیں ملتی۔ اس کے برعکس اُسے یہ تاریخِ اسلام مسلمانوں کی حکومت اور اُن کی تہذیب کی توصیف سے بھرپور ملتی ہے۔ یہ اُس کی ناراضگی کا باعث ہے کہ ہندو اور مسلمانوں کے مذاہب کے درمیان اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی اقوام کے درمیان تا مرگ صدیوں کی لڑائی کا سچ اور یہ کہ بالآخر ہندوؤں نے مسلمانوں کی فرمانروائی کا تیا پانچا کر دیا اور اُسے توڑ کر ٹکڑوں میں بکھیر دیا، نظر انداز کر دیا گیا ہے''۔ 'سوارکر' زور دے کر کہتا ہے کہ یہ صرف ہندو قوم ہی تھی جس نے مسلمانوں کی یورش کا مقابلہ کیا اور اُن کے ''زہریلے حملوں'' کو روک دیا۔ ماضی کے سایوں سے انحراف کرتے ہوئے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اکٹھے رہنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ مسلمان ہندوؤں کی قوت اور برتری کو تسلیم کر لیں۔

سوادھرا اور سوارا جیا

جب 1909 میں سوارکر کی تصنیف ''1857ء کی جنگِ آزادی'' شائع ہوئی (جو کہ اُس نے 1907 میں لکھنا شروع کی تھی) تو اُس وقت تک جیسا کہ 'سوارکر' نے اسے نام دیا ہے گاندھی اور اُس کے پیروکاروں کا دنیا کا 'سَنکی' نقطہ نظر ابھی بہت حد تک قائم نہیں ہوا تھا۔ درحقیقت گاندھی کی

'ہند سواراج' اسی سال شائع ہوئی تھی۔ یہ دونوں ('سوارکر' اور گاندھی) 1906 میں لندن میں انڈیا ہاؤس میں اس سے قبل ملاقات کر چکے تھے۔ 'پنڈت پارمانند' جو 'سوارکر' اور 'گاندھی' دونوں کو جانتا تھا۔ گاندھی کی 'سوارکر' سے لندن میں انڈیا ہاؤس میں ہونے والی ملاقات کو بیان کرتا ہے۔ گاندھی جب اندر داخل ہوا اُس وقت 'سوارکر' جھینگا مچھلی کو بھون رہا تھا۔ گاندھی نے سیاسی مسئلے کو اٹھایا۔ 'سوارکر' نے اُس کی بات کاٹ کر (اس سوال کا جواب دینے کی بجائے) گاندھی کو عشائیے کی دعوت دی۔ گاندھی نے کہا کہ وہ سبزی خور ہے۔ 'سوارکر' نے جواباً کہا کہ اگر گاندھی اُس کے ساتھ (کھانا) نہیں کھا سکتا تو وہ (گاندھی) اُس کے ساتھ کام کیونکر کر پائے گا۔ تب 'سوارکر' نے یہ کہا کہ اُسے ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو انگریزوں (برطانویوں) کو زندہ کچا چبا جانے پہ تیار ہوں نہ کہ (وہ) جو مچھلی کھانے پہ جھگڑا کریں۔

'سوارکر' کا 1857 کا بیان ''سفید فام گوشت'' کو ذبح کرنے کے واقعات سے بھرا ہوا ہے۔ یہ وہ موضوع ہے جو کہ تمام تر نصاب (تحریر) میں ایک مسلسل ترجیح ہے۔ اس پر غور کرنا اہم ہے کہ 'سوارکر' کی سیاست ایسی ہے جو دنیا کو 'دوستوں' اور 'دشمنوں' میں تقسیم کرتی ہے جب تک کہ ایک دشمن ہر وقت/ لمحے دستیاب ہو سکتا تھا یہ غیر اہم تھا کہ دشمن کون تھا۔

اس مضمون میں کہ ہندوؤں کو اُن کی قوم کی تاریخ کو کس طریقے سے لکھنا چاہئے۔ مسلمان واضح طور پر دشمن (قرار دیئے گئے) ہیں۔ لیکن 1857 کے بیان میں دشمن برطانوی تھے۔ 'سوارکر' کا خود ساختہ تمام دنیا کا نقطہ نظر بھرپور طور پر ناقابلِ تغیر، ناقابل گفت وشنید، دوہری مخالفت کی اصطلاح پہ مبنی ہے۔ کبھی غیر معمولی سا ایدویتک (Advaitic) موڈ/ مزاج میں 'سوارکر' کے پاس ہندوازم کے فلسفیانہ مکاتیب کے لئے بہت کم وقت تھا (یعنی وہ انہیں اہمیت نہیں دیتا تھا۔ مترجم) اور وہ 'ایدوتیا' کو بھی شبہہ کی نظر سے دیکھتا تھا۔۔۔ وہ ''ذات'' کی فطرت کی بات ایسے کرتا ہے جیسے کہ وہ خود کو ناقابل تغیر طور پر جانتی ہو۔ اور وہ (بھی) بغیر کسی نام اور یہاں تک کہ کسی ماہیت کے بغیر۔ یہ 'ذات' کا تجریدی بیان اُسی لمحے تبدیل ہو جاتا ہے جیسے ہی وہ کسی ''ناذات'' کے ساتھ رابطے یا تنازعے میں آتا ہے۔ تب 'ذات' 'ناذات' کے ساتھ رابطہ کرنے کی خاطر ایک نام اور شناخت حاصل کر لیتی ہے۔ 'سوارکر' کی اشیاء کی تدبیر کے مطابق جتنا زیادہ وہ اپنی 'ہندوتا' کے اپنے آئیڈیل کے خدوخال کو بنانے اور اُسے سیاسی رنگ دینے میں مصروف ہوا۔ 'ناذات' کا اتنا

ہی عظیم پھیلاؤ ہوا۔ اسلام اور مسلمان 'ناذات' کی 'اولین تعریف' بناتے (میں آتے) ہیں، لیکن برطانوی، عیسائیت، بدھا اور بدھ ازم گاندھی اور آہمسا ایک یا دوسرے نقطے پر اُس کی گللو نہ غلام گردش میں 'ناذاتوں' کی حیثیت سے شامل ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات 'ناذات، ذات' کی نئی تعریف کی جانب لے جاتا ہے۔ جبکہ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں 'سوارکر' کی فہم کی بنیاد ہجو/ خاکہ اڑانے پہ ہے۔ لیکن اس فہم کے اندر سے ہی اُسے بہت سے عناصر ''ناقابلِ مزاحمت'' ملے اور وہ 'ذات' کو دوبارہ ڈھالنے کی خاطر بہت سے 'ناذات' کو جذب کرنے کی بات کرتا ہے۔

'دوستوں' اور 'دشمنوں'، 'ہمارے' اور 'اُنکے' درمیان منقسم اس دنیا میں دشمنوں سے معاملہ کرتے وقت نہ تو شرافت وفضیلت کے کوئی قوائد ہیں اور نہ ہی اخلاقیات کے ضابطے۔ 'سوارکر' کا 1857 کی جنگ آزادی کا مقولہ عبرت انگیز ہے۔ یہ چتراپتی شیواجی' کے گرو سوامی رام داس کا مقولہ ہے جسے یوں پڑھا جاتا ہے ''اپنے دھرم کے لئے مرجاؤ اور مرتے وقت سب کو ماردو، مارنے میں تمہاری فتح ہے، تمہاری اپنی حکمرانی۔'' جبکہ ماردینا منتخب شدہ ذریعہ تھا۔ وہ نچوڑ (اساس) جس نے 'سوارکر' کے 1857 کے بیان کو محدود کیا تھا، وہ تھا 'سوادھرما' یا اپنے مذہب کو قائم کرنا۔ اور 'سواراجیا' یعنی اپنی فرمانروائی۔ مزید یہ کہ 'میزانی' کی تحریریں اور اٹلی کے اتحاد میں اُس کا کردار 'سوارکر' کے یقین کے پیچھے وہ تخلیقی تحریک تھی کہ (جس کے مطابق) ہر انقلاب کی ایک اساس (ضرور) ہونی چاہئے۔ یہاں پر یہ اشارہ (عیاں) کرنا ضروری ہے کہ اس موقعے پر 'دھرما' کے معنی مذہب کے ہیں۔ اور اس کے علاوہ کوئی اور فلسفیانہ تعبیریں (منسلک) نہیں ہیں جو کہ اس اصطلاح کے ساتھ وابستہ کردی جاتی ہیں۔ ہندوازم اور 'ہندووتا' کے درمیان فرق (تفاوت) کے حوالے سے بہت سے مبصرین 'سوارکر' کی غلط توضیح کرتے ہیں جو اکثر اوقات اس نتیجے تک لے جاتی ہے کہ 'سوارکر' کا مذہب سے بہت کم تعلق تھا۔

'سوارکر' کی دلیل ہے کہ 'سوادھرما' اور سواراجیا کے درمیان ایک پیچیدہ تعلق ہے۔ زمانہ سابق کے دانشور اس تعلق پہ یقین رکھتے تھے اور 'میزانی' بھی گردوں اور دنیا کے درمیان ناقابلِ تقسیم تعلق کو دیکھتا (مانتا) تھا۔ وہ اس تعلق کو مزید شستہ کرتے ہوئے حجت کرتا ہے کہ ''سواراجیا، سوادھرما'' کے بغیر بے وقعت ہے، اور 'سوادھرما' 'سواراجیا' کے بغیر بے قوت۔ ایک مرتبہ جب مذہب اور اپنی فرمانروائی کے درمیان تعلق استوار ہو جائے تو واحد معنی خیز چیز اساس/ جوہر کی

جانب قریب قریب جانے کی خاطر، برطانویوں (انگریزوں) کا قتل ہے۔اس موقعے پر برطانوی ''دشمن'' تھے۔ یہاں بھی 'سوارکر' برطانویوں اور عیسائیت میں کوئی فرق نہیں کرتا۔اس کے لئے انڈیا کا برطانوی راج کے سامنے ہار مان لینا یسوع مسیح کی رحم دلی کے سامنے زانو ادب طے کرنا تھا۔ 1857 میں ہندو اور مسلمان ۔۔۔ایک مشترک دشمن برطانیہ کے خلاف حلیف تھے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پہ 'سوارکر' مسلسل ضرور دیتا ہے۔اُن واقعات میں جو 1857 کی جانب لے گئے سوارکر کا ادراک یہ ہے کہ یہ ایک موقعہ تھا جب ہندوؤں اور مسلمانوں نے عیسائیت کی پشت پہ ناچ کیا تھا۔ جہاد کی اصطلاح کو بیدار کرنا، 'سوارکر' اُن طریقوں کی تعریف کرتا ہے جس کے ذریعے مولویوں اور پنڈتوں نے برطانوی/عیسائیت کے خلاف 1857 میں جہاد کی تبلیغ کی۔ ہر اُس موقعے پر 'سوارکر' کے بیان میں خوشی جھلکتی ہے جب کوئی گرجا مسمار کیا جاتا ہے یا کسی صلیب کو برباد کیا جاتا ہے اور ہر عیسائی کے ٹکڑے کئے جاتے ہیں۔

اگر مذہب کی برتری کو قائم کرنا، اور اپنی فرمانروائی کو حاصل کرنا لازم تھا تو اس مقصد کا حصول قتل عام کی منظوری دیتا تھا۔بغیر ذریعے اور انجام کے سوال کے متعلق کسی شبہے کو خاطر میں لائے بغیر قتل کرنا 'سوامی رام داس' کی نصیحت تھی۔ یہ مختلف قسم کی جنگ تھی۔ جو پرانے ضابطوں اور اصولوں سے عاری تھی۔اُس کی 1857 کی خواندگی میں 'سوارکر' اَن گنت برطانوی عورتوں اور بچوں کے مارے جانے کا عذر اس استعارے سے کرتا ہے جسے وہ ''مرہٹا جنگ کے طریق کار کی چالیں'' کہتا ہے۔ مطمع نظر یہ تھا کہ ہر قربانی اور بہادری کے ہر عمل کو کامیابی سے ہمکنار ہونا چاہیئے۔ ہر وہ چیز جو تمنا کے حصول کے انجام تک نہ پہنچ سکے، خودکشی تھی۔ چنانچہ 'سوارکر' باغیوں کی بڑھتی ہوئی خوشی اور جوشیلے پن کے بارے میں لکھتا ہے، (وہ جنوں کی حد تک تجاوز کرتا تھا) جب وہ (باغی) برطانوی خون کو زیادہ سے زیادہ بہتا ہوا دیکھتے تھے۔ میرٹھ میں یہ خوشی بہت سی عورتوں اور بچوں کو زندہ جلا دینے کی وجہ سے تھی جبکہ ان کے گھروں کو پہلے (ہی) نذر آتش کر دیا گیا تھا۔ دہلی میں باغی 'ریوجیتنگ' کے گھر کی طرف 'ہیبت ناک عفریتوں' کی مانند گئے، نہ صرف اُسے بلکہ اُس کی جوان بیٹی اور ایک اور مہمان خاتون کو بھی قتل کر دیا۔

16 مئی 1857 کو بہت سے برطانوی آدمی قتل/مار دیئے گئے۔ 'سوارکر' اُن عورتوں اور بچوں کو جو مار دیئے گئے، کی تقدیر کے بارے میں بتاتا ہے۔

’’اگر کسی عورت یا بچے نے رحم کی وکالت (درخواست) کی تو لوگ چلائے: میرٹھ کی زنجیروں کے لئے انتقام، غلامی کے لئے انتقام، اسلحہ جو بکھیرا گیا اُس کے لئے انتقام، تب انتقام بھری تلوار نے وکالت کرتے ہوئے کا سر قلم کر دیا۔‘‘

باغی سپاہیوں نے انگریزوں کا لہو چکھنے کا خوفناک عہد کیا، بالکل ویسے ہی جیسا کہ بھیم سن نے کیا۔ ’’کسی بھی انگریز مرد یا عورت کو ذرا سی بھی رعایت نہیں دی گئی۔ یہاں تک کہ اُن کو بھی نہیں جو بہت نرم (رحم) دل تھے۔ ایک بوڑھا ڈپٹی کلکٹر بھاگتا ہوا دیکھا گیا، حالانکہ جون پور میں کچھ لوگوں کو یہ بحث کرتے ہوئے دیکھا گیا کہ وہ ایک اچھا آدمی (انسان) تھا۔ (لیکن) اُسے مار دیا گیا۔ ’سوارکر‘ نے مندرجہ ذیل بات چیت باغی سپاہیوں سے کہلوائی۔۔۔ (یعنی اُن سے منسوب کی۔ لفظی ترجمہ ہے ’باغی سپاہیوں کے منہ میں ڈالی۔ مترجم) ’’اس طرح کی کوئی چیز نہیں ہے (یعنی اچھائی۔ مترجم) یہ یورپین ہے اور اسے مرنا ہوگا۔‘‘ ایک اور واقعے کو لیجئے، کان پور میں کرنل ایوارٹ مارا گیا ہے۔ یہاں ’سوارکر‘ اُس کی بیوی کی تقدیر کے بارے میں بیان کرتا ہے۔

کرنل کی بیوی قریب ہی کھڑی تھی، کچھ لوگوں نے اُسے کہنا شروع کر دیا ’’تم عورت ہو اس لئے تمہاری زندگی بخشی جا رہی ہے‘‘، لیکن اُن کے ظالم دوستوں میں سے ایک چلایا ’’کیا عورت؟، کیا یہ سفید فام عورت نہیں ہے؟ اگر ایسا ہے تو اسے ٹکڑوں میں کاٹ ڈالو۔‘‘ اس فقرے کے ختم ہونے سے قبل ہی اس کا خوفناک مفہوم ظاہر ہو چکا تھا۔

علیحدہ/جدا حیثیت میں ’سوارکر‘ منکر ہے کہ کسی ایک برطانوی عورت سے بھی بدفعلی کی گئی تھی، باوجودیکہ دعوے اس کے برعکس ہیں۔ ایک فقرے (جملے) میں، جو کہ کسی بھی ماہر نفسیات کے لئے شادمانی کا باعث ہوگا، ’سوارکر‘ ثابت قدم (قائم) ہے کہ 1857 (کا واقعہ) اس لئے نہیں ہوا تھا کہ انڈینز کو ’’سفید فام عورت‘‘ نہیں ملی تھی۔ یہ اس لئے ہوا تھا تا کہ ’’ہمارے گھر‘‘ سے منحوس ’’سفید پاؤں‘‘ کو تمام (ختم) کر دیا جائے۔

جون میں میجر جنرل ویلر نے باغیوں کے سربراہ نانا صاحب کے ساتھ مردوں، عورتوں اور بچوں کو بحفاظت گنگا کے ذریعے کان پور بھیجے جانے کا معاہدہ کیا۔ اس طرح ’سوارکر‘ اُس مقدر کا حال بیان کرتا ہے جو اُن کا نصیب ہوا، جبکہ اُن کی کشتیاں دریا کے ساتھ حرکت کر رہی تھیں، وہ اسے ’پلاسی‘ کی برسی (سالگرہ) کے جشن کے طور پر دیکھتا ہے۔ ’’اسی دوران کشتیاں جلنے لگیں۔

انگریز آدمیوں، عورتوں اور بچوں نے گنگا میں چھلانگیں لگانا شروع کر دیں، کچھ نے تیرنا شروع کر دیا، کچھ ڈوب گئے، کچھ نذرِ آتش ہوئے، اور تمام کے تمام جلد یا بدیر گولیوں سے ہلاک کر دیئے گئے۔ گوشت کے ٹکڑے، کٹے ہوئے سر، بالوں کے لڑ، الگ کئے ہوئے ہاتھ، ٹوٹی ہوئی ٹانگیں، ایک خون کا دریا، گنگا سرخی میں بدل گئی، اس طرح سے 'پلاسی' کی برسی (سالگرہ؟) منائی گئی۔''

جھانسی میں 'سوارکر' 75 مردوں، 12 عورتوں اور 23 بچوں کے ایک زیادہ وحشیانہ قتلِ عام کو مذہبی اصطلاح میں 'بالی' یا 'مقدس قربانی' کہہ کر بیان کرتا ہے۔

''عورتوں کی گودیوں (دامنوں) میں چھوٹے بچے تھے اور یہ بچے اپنی ماؤں سے چمٹے ہوئے تھے۔ یہ عورتیں، نومولود (بچے)، اور بڑے بچے جو اپنی ماؤں کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے، سفید فام ہونے کے گنہگار تھے۔ اور سیاہ تلوار سے اُن کی گردنیں قلم کر دی گئیں۔''

سوارکر غور کرتا ہے کہ بچوں اور عورتوں کے ہر ایک ایسے قتلِ عام کے ساتھ 1857 کے باغیوں نے سفید فام انگریزوں کا لہو ''انتہائی لذت'' سے بہایا۔

ابھی اور آنا باقی تھا۔ یہاں 'سوارکر' کا غیر جذباتی بیان ہے کہ بابی گڑھ، (اور) کان پور میں کیا ہوا۔ یہ ایک وہ منظر ہے کہ جب جیل کے محافظ نے انگریزوں کا قتلِ عام کرنے سے انکار کر دیا۔ 'بیگم صاحب' جو بابی گڑھ کی چیف (بڑی) افسر تھی، جو کہ باغیوں کے کنٹرول میں تھا، نے کان پور میں قصایوں کی بستی میں ایک پیغام بھیجا:

تھوڑی ہی دیر میں شام کے وقت قصائی ننگی تلواروں اور تیز چاقوں کے ساتھ 'بابی گڑھ' میں داخل ہوئے، اور رات گئے باہر نکلے، اُن کے آنے اور جانے کے درمیان تمام جگہ سفید فام خون کا سمندر پھیل گیا۔ جیسے ہی وہ اپنی تلواروں اور چاقوں کے ساتھ داخل ہوئے، اُنہوں نے 150 عورتوں اور بچوں کو ذبح کر دیا۔ خون کا ایک ڈھیر اکٹھا ہو گیا اور جسمانی اعضاء اُس میں تیرنے لگے۔ اندر جاتے وقت قصائی زمین پر چل کر گئے تھے، اور جب وہ باہر نکلے تو اُنہیں خون کے سفر سے گذرنا پڑا۔

اور تب اگلی صبح یہ ہوا۔۔۔

جیسے ہی صبح ہوئی، اس غریب مخلوق کو (وہ جو ادھ موئے تھے یا مر رہے تھے) کو گھسیٹ کر باہر نکالا گیا، اور قریب ترین کنویں میں دھکیل دیا گیا، دو بچوں نے لاشوں کے وزن تلے سے نکل کر

کنویں کے کنارے کے گرد دوڑنا شروع کر دیا، لیکن اُنہیں کنویں میں دھکیل دیا گیا اور وہ لاشوں کے اوپر جا گرے۔

سوارکر تبصرہ کرتا ہے کہ دونسلوں کے درمیان جمع شدہ حساب (کھاتہ) اس طریقے سے برابر ہو گیا۔ مزید یہ کہ ایک موقع پر جب انگریزوں نے باغی سپاہیوں کو پکڑ لیا، اور اُنہیں پھانسی دینے سے قبل انگریزوں نے (اُن سے) پوچھا کہ اُنہوں نے اُن کے (انگریزوں کے) بچوں اور عورتوں کو کیوں قتل کیا؟ تو سپاہیوں نے جواب دیا، ''جناب کیا کوئی (شخص) سانپ کو مارنے کے بعد اُس کے بچھونے (نواری) کو بھی چھوڑتا ہے؟''

کہانی یہاں ختم نہیں ہو جاتی۔ انتقام، بدلے اور مکافات کے عذر کو سوارکر کی 1857 کی حکایت میں انتہائی احتیاط سے تیار کیا گیا ہے۔ ایک قتلِ عام۔۔۔ وہ کہتا ہے۔۔۔ ایک خوفناک شئے ہے۔ تاہم یہ ہوتا ہے کیونکہ انسانیت فطری انصاف، امن، برابری، اور عالمی بھائی چارے کے بلند بانگ آدرشوں کو قریب لانے میں ناکام رہی ہے۔ اس دن اور عہد میں ''آستیا'' غیر سچائی (جھوٹ) ''ستیا'' سچائی پر غالب ہے۔ ہم محض ایک عہد کے طلوع ہونے کا انتظار کر سکتے ہیں جب سچ ہر دل پہ حکومت کرے گا۔ اور اُس عہد میں اگر کوئی خون بہانے یا لفظ 'پرے ٹشوڈا' یعنی انتقام کا نام بھی لے گا، وہ (مرد/عورت) خود بخود پاجی، بدنصیب، اور کمینہ تصور کیا جائے گا۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں عدم تشدد اور انصاف کی حکومت ہوگی، انتقام کے افعال کو گناہ گردانا جائے گا۔

'سوارکر' تاسف سے کہتا ہے کہ ایسی الوہی تاریخ سازی ابھی شرمندہ تعبیر ہونے سے بہت دور ہے۔ چنانچہ غدر، انقلاب، بغاوت اور انتقام جیسے الفاظ (قانوناً) جائز ہیں، تاکہ ناانصافی کا خاتمہ کیا جا سکے اور برابری اور انصاف کو لایا جائے۔ بغاوت، خون ریزی، اور انتقام ایک دم ناانصافی اور فطری انصاف لانے کے آلات ہیں۔ اسی وجہ سے شیوا جی کے پنجے مقدس تھے، یہی وجہ ہے کہ بروٹس کا خنجر مقدس تھا، اور اسی باعث اٹلی کے انقلاب کی خون ریزی بے داغ تھی۔ خوف ناانصافی پہ قابو رکھتا ہے۔ 'سوارکر' طنزاً کہتا ہے ''ہر ہرینیا کاشی پاپو' کے لئے ایک نرسیمہا ضروری ہے۔ ہر دھوشنسا کے لئے ایک بھیم۔'' انتقام چنانچہ فطری قانون اور انصاف کا قیام ہے۔ اس تقریر سے 'سوارکر' قومیت پرستی کے اصول کو اخذ کرتا ہے۔ اُس کا دعویٰ ہے کہ جہاں ناانصافی بڑھی، اور قوم شعلوں میں گھر گئی، جہاں کہیں قومیت کی جنگیں لڑی گئیں، ایسی جگہوں پر ناانصافیاں

جو اُس قوم کو برداشت کرنا ہوئیں، اُن کا انتقام دوسری قوم کے ناانصافی کرنے والوں کو (مارے جانے) قتل کر دیئے جانے سے لیا گیا۔ چنانچہ 1857 کی کوئی بھی دوبارہ جانچ، انڈین سیاسی ذخیرہ الفاظ/لغت میں 'سوارکر' کے متعارف شدہ قضیوں کے خوفناک حصوں کی تشخیص کا ایک موقعہ بھی ہے۔ یہاں تک کہ جو اُس کے 'ہندووتا' کے تصور سے اختلاف بھی کرتے ہیں اُس کی قومیت پرستی حب الوطنی اور انڈیا کی آزادی کے مقصد سے اُس کی وابستگی کو تسلیم کرتے ہیں، اکثر اوقات اُس کے مکافاتی تشدد کے نمونے اور اُس کے فلسفیانہ عذر کو جو اُس کی حب الوطنی اور قومیت پرستی کے تصور کے بارے میں بہت کچھ بتاتا ہے، نظر انداز کرتے ہوئے 'سوارکر' کے تنقیدی نظریے کے ساتھ، قومیت اور حب الوطنی جیسی اصطلاحات کے مواد کی جانچ (امتحان/تجزیہ) کی بھی ضرورت ہے جو کہ (اصطلاحات) ان دنوں جذبات کی مشتعل حالتوں (کیفیات) اور تجزید کے نام پر تشدد کے عذر کے طور پر عموماً استعمال کی جارہی ہیں۔

❁❁❁❁❁

1857 کی باغی فوج

جنگِ آزادی کے ہراول یا ہتھیاروں کا استبداد

سبھائے ایس جی داس گپتا/ترجمہ: ڈاکٹر صولت ناگی

1857 کے واقعات میں کمپنی کے سپاہیوں کے کردار پہ جاری مباحثہ

بہت سی رجمنٹیں ایسی تھیں جو برطانیہ کے خلاف جدوجہد میں پیش پیش تھیں لیکن جیسے کہ یہ مضمون دلیل دیتا ہے کہ بہت سے موقعوں پر اُن کی (باغیوں) مزاحمت کسی طبقے اور ذات (پات) کے مفاد کی نمائندگی نہیں کرتی تھی۔ بغاوت (جنگِ آزادی) کے بہت سے مراکز کے آر پار کی خواندگی عیاں کرتی ہے کہ سپاہیوں کی مزاحمت حالانکہ بہت زیادہ حد تک (نہ صرف یہ کہ) کسی (بھی) منصوبہ بندی کے بغیر تھی بلکہ یہاں تک کہ خودرد بھی تھی لیکن اس کے باوجود نہ تو وہ اشیاء کے روایتی قوائد کو مسلط کرنے کی خواہش کا اظہار تھی اور نہ ہی وہ اُس پرانے دہقانی معاشرے کے مفادات کی حمایت کرتی تھی، جس کے ساتھ اُن (باغیوں) میں سے بیشتر کا بالخصوص جن کا تعلق بنگال فوج کے ساتھ تھا، واسطہ تھا۔ علاوہ ازیں ایسی علامات بھی موجود تھیں کہ وہ ادارے یا ابتدائی حکم/طریق کار جو سپاہی دہلی یا گوالیار میں قائم کرنا چاہتے تھے زیادہ جمہوری اور خصوصیت کے اعتبار سے مساوات پہ مبنی تھے۔

یہ مضمون دلیل دیتا ہے کہ سپاہیوں کی ''بغاوت'' نہ صرف ایسٹ انڈیا کمپنی بلکہ انڈین سوسائٹی کے روایتی حکمران طبقے کے خلاف روگشی کا عمل تھا۔ یہ خودمختار قوت کا ایک دعویٰ تھا، ایک طاقت جس نے شمالی انڈیا میں نوآبادیاتی قوت کی علامات کو سمیٹ دینے کی دھمکی دی۔ اس نے

دیسی سماج میں قوت کی روایتی مساوات کو تبدیل کرنے کی دھمکی بھی دی۔ اس بغاوت کے دورانیے میں (بغاوت کے) پھوٹ پڑنے کی فطرت اور تیزی سے ظاہر ہونے والی سیاسی حرکیات، دیسی سماج میں قائم شدہ (مستحکم) پروہتائیت (hierarchy) پیرشاہی کے لئے شدید خطرے کا اظہار تھی۔ سپاہیوں نے قوت کی پروہتائیت (hierarchy) کے اندر تیزی سے اپنے لئے ایک خودمختار جگہ/گنجائش تراشنے کی سعی کی۔

یہ دلیل بھی تھی کہ سپاہیوں کا دعویٰ لوگوں کی قوت کے ساتھ مترادف (ہم معنی) نہیں تھا (اور یہ) کہ سپاہیوں کی خودمختاری لوگوں کی خودمختاری کو ظاہر نہیں کرتی تھی۔ یہ مضمون ان معروضات/گذارشات کے ساتھ اختلاف کرتا ہے اور سپاہیوں کو عوام کی بغاوت کے ہراول کی (جگہ) طرح پیش کرتا ہے۔ مورخین نے دلیل دی ہے کہ سپاہیوں کی شکایات لوگوں یا کسانوں کے (شکووں) کے ساتھ مدغم ہو گئیں۔ کچھ لوگوں نے تو اس حد تک کہا کہ سپاہی یونیفارم میں (درحقیقت) کسان تھے۔

میری دلیل یہ ہے کہ سپاہی اپنے اصل/مخرج سماج کے ساتھ مضبوط تعلقات رکھنے کے باوجود ایک خاص شناخت کے حامل تھے۔ اور خود کو دیسی سماج سے جدا سمجھتے تھے۔ کمپنی کی نوکری جسے وہ 1857 میں شدت سے رد کرتے تھے (اُس نے) اس کے برعکس اُنہیں اختیار کی حس (شعور) دی۔ سپاہیوں کو نئی اشرافیہ بننے کی تمنا تھی اور اس کوشش میں وہ پرانی اشرافیہ اور عام کسانوں کی جگہ لینے کو تیار تھے۔ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ بنگال کا سپاہی، جو کہ اونچی (اعلیٰ) ذات سے تعلق رکھتا تھا ایک درمیانی دہقانی پس منظر سے آیا تھا اور بمشکل دیسی سماج کی اشرافیہ سے (متعلق تھا) اُس کا تعلق تھا۔ بنگال کے طبقے اور ذات کی بنیاد کا سراغ اس نقطے کی وضاحت کرنے میں زیادہ مددگار ہوگا۔

بنگالی فوج کی ذات اور طبقات کی ساخت

بنگال کی فوج اور بالخصوص اُس کی انفنٹری کے یونٹ زیادہ تر اودھ اور بہار کی اعلیٰ/برتر ذات مردوں پر مشتمل تھے۔ وہ علاقہ جہاں سے کمپنی کے بیشتر لوگ (سپاہی) لئے جاتے تھے وہ جدید عہد کے مشرقی اترپردیش اور آج کے بہار کے علاقے 'بھوج پور' سے موافقت کا حامل تھا۔ بنگال کی فوج کی بھرتی کی پالیسی کی تحریک اس مضبوط اور دیرپا یقین پہ تھی کہ اعلیٰ ذات کے سپاہی جن

کا تعلق زمیندارانہ کسانی پس منظر سے ہو فطری طور پر زیادہ فرمانبردار، بھروسہ مند، بہادر ہوتے ہیں اور عموماً شاندار (ارفع) سپاہیانہ مواد سے بنے ہوتے ہیں۔ حالانکہ 1830 اور 1840 میں بنگالی فوج میں گورکھوں اور سکھوں کی بڑھتی ہوئی نمائندگی دیکھنے میں آئی۔ اونچی (اعلیٰ) ذات کی برتری 1857 تک بیتتے ہوئے سالوں میں موجود رہی۔ 1857 سے قبل اگر چونتیسویں انفنٹری رجمنٹ جو کہ میرٹھ میں ٹھہرائی گئی تھی کو بنگال کی فوج میں عمومی بھرتی کے طریق (طرز) کی نمائندگی کی حیثیت سے دیکھا جائے (تو) اعلیٰ ذاتیں ابھی تک بنگال کی فوج کے پچاس فیصد پر مشتمل تھیں۔

بھرتی کا عمومی طریق کار یہ تھا کہ خدمات انجام دیتے ہوئے سپاہیوں اور افسروں کو اُن کے مقامی گاؤں جانے کی رخصت کے وقت کہا جاتا کہ وہ اپنے رشتہ داروں اور ہمسایوں میں سے اعلیٰ ذات کے رنگروٹ لے کر آئیں۔ بنگال کی فوج میں 'سیتارام' کا داخلہ ایک راغب مثال ہے۔ 'سیتارام' اس عہد کے (گذشتہ) اودھ (Oudh) کے گاؤں 'تل اوی' جو کہ 1797 میں جدید یو۔ پی کہلایا میں پیدا ہوا۔ اُس کا والد ایک زمیندار کسان تھا جو 150 ایکٹر زمین کا مالک تھا۔ سیتا رام نے 1812 میں اپنے چچا کے باعث جو کہ بنگال کی فوج میں جمعدار تھا، فوج میں شمولیت اختیار کی۔ اُس کے چچا کو چھ ماہ کی چھٹی دی گئی اور گھر جاتے ہوئے وہ کچھ دنوں کے لئے سیتارام کے خاندان کے ساتھ رہائش پذیر ہوا۔ وہ جلد ہی ہر شام ششدر لوگوں کے ہجوم کو جن میں اُس کا بھانجا بھی شامل تھا اُن زمینوں کے بارے میں حیران کن داستانیں سنانے کے معمول میں مصروف ہو گیا، جہاں 'کمپنی' نوکری کے دوران اُسے لے کر گئی تھی، اور (اس کے علاوہ) 'کمپنی' کی بے تحاشا آسودہ حالی کے بارے میں (بیان کرنے میں محو ہو گیا)۔ سیتارام ان کہانیوں کے باعث متحیر ہو کر رہ گیا۔ اور اُس وقت کا شدت سے انتظار کرنے لگا جب وہ کمپنی کی فوج میں ایک سپاہی بن سکتا تھا۔ جیسا کہ سیتارام کہتا ہے:

''جمعدار کے عہدے کو میں، غازی الدین حیدر جو اودھ (Oudh) کا بادشاہ تھا، کے بالکل برابر دیکھتا (سمجھتا) تھا (بلکہ) درحقیقت اُس سے زیادہ اہمیت کا حامل (گردانتا تھا)۔ اُس کے پاس سونے کے موتیوں کا شاندار ہار تھا اور اُس سے بالا یہ کہ بظاہر اُس کے پاس سونے کی مہروں کی لاتعداد رسد ہے۔ اور مجھے بہت شدت سے اُس وقت کی تمنا تھی جب بالکل یہی (ہو بہو) میرے پاس بھی ہو گا، جس کے بارے میں میں نے تب یہ سوچا تھا کہ اگر میں کمپنی بہادر کا ملازم ہو گیا تو

یہ (سب کچھ مال ومتاع) بلاواسطہ (بلاشرکت غیرے) میرا ہوگا۔

اُس کے چچا نے اُس کی محویت سے بھرپور توجہ کو بھانپتے ہوئے جس (دلچسپی) کے ساتھ 'سیتارام' نے اُس کی کہانیوں کو سنا تھا، اُس کے سامنے فوج میں شمولیت کے امکان کو رکھا۔ سیتارام فوج میں بھرتی ہونے کی توقع پر جھپٹا باوجودیکہ اُسے علم تھا کہ اُس کی ماں جو اُسے راہب بنانا چاہتی ہے اس پر شدت سے معترض ہوگی۔ چچا یہ کہتے ہوئے اپنے آبائی گاؤں جو کہ پچاس میل دور تھا کی جانب روانہ ہوگیا کہ وہ اپنی رخصت کے اختتام پر واپسی کے دوران سیتارام سے اُس کی (چچا کی) رجمنٹ میں شمولیت کے بارے میں معلوم کرے گا۔ اگر سیتارام اپنے ارادے پر صدق دل سے قائم رہا تو وہ لڑکے کو اپنی رجمنٹ میں بھرتی کروانے کی نیت سے اپنے ساتھ لے جائے گا۔

سیتارام کی سرگذشت اسے کافی حد تک واضح کرتی ہے کہ بنگال کی فوج کچھ لحاظ سے ایک بند ادارہ تھی جہاں ذات، برادری اور رہائش کے بندھن فوقیت رکھتے تھے۔ گاؤں کی زندگی (کے اطوار) اور بندھن کسی حد تک فوج میں بھی دوہرائے گئے تھے، کیونکہ بھرتی ہونے والے آبائی (رنگروٹوں) نے اپنے رہنے کے انتظامات کے لئے اس انداز سے گھروندے تعمیر کئے جو کہ اُن کے آبائی گاؤں (کی رہائشوں) سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھے۔ یہ سب اسے یقینی بناتا ہے کہ سپاہیوں نے اپنے آبائی گھروں کے ساتھ مضبوط تعلقات برقرار رکھے۔ اپنے خاندان جنہیں وہ پیچھے چھوڑ آئے تھے رخصت کے دوران اُن سے ملاقات (اور) باقاعدگی سے گھر کے دوروں نے آبائی سماج کے ساتھ اُن کے رابطے اور تعلق کی گردشی تخلیقِ (تعمیر) نو کو یقینی بنادیا۔

سپاہی: یونیفارم میں ایک کسان؟

سپاہیوں کے اپنے آبائی سماج کے ساتھ مضبوط تعلقات اور اُس سے وابستہ اُن کی درمیانے طبقے کے کسان کی بنیاد (اصل یا جڑ) 'رڈرنگشو مکرجی' جیسے مورخین کو اس دلیل کی جانب لے جاتی ہے (یہ دلیل دینے پر مجبور کردیتی ہے) کہ سپاہی بنیادی طور پر یونیفارم میں کسان تھے۔ 'مکرجی' کا دعویٰ ہے کہ 1857 میں کسانوں کی شمولیت (اس لئے) زیادہ اہمیت کی حامل ہو جاتی ہے کیونکہ سپاہی بہرحال کسان تھے جن کے گاؤں میں اُن کے خونی رشتوں کے ساتھ قریبی بندھن تھے۔ اُس کے مطابق اس نے اسے یقینی بنادیا کہ کسانوں نے ماتحت حیثیت کو اتار پھینکتے ہوئے آزادانہ

ابتدا کی۔ اُس کی دلیل یہ ہے کہ یہی اسی باعث مثال کے طور پر 'نبی مادھو' جیسے مقتدر زمیندار کو سپاہیوں اور اُس کے قبیلے کے لوگوں نے لڑائی جاری رکھنے پر مجبور کر دیا۔

'مکرجی' کا بیان ایک آسان توضیح معلوم ہوتا ہے۔ یہ بلاشبہ درست ہے کہ سپاہی کے اپنے آبائی سماج کے ساتھ (کافی حد تک) اہمیت کے حامل تعلقات تھے، لیکن وہ (مکرجی) اس حقیقت کو خاطر میں نہیں لاتا کہ فوج کی زندگی اور تربیت نے لازماً کسی حد تک اُس کی ذہنیت کو (سانچے میں) ڈھال دیا ہوگا۔ یہ تمام پیشہ ور فوجوں کے لئے درست (سچ) ہے۔ اور بنگال کی فوج کوئی استثنیٰ نہیں تھی۔ مثال کے طور پر 'ھنٹنگٹن' دلیل دیتا ہے کہ ایک ہی پیشے کے ممبران نامیاتی وحدت کے تصور کا اظہار کرتے ہیں۔ اور جاہل آدمیوں (انسان) کی نسبت جو اس معاملے میں سویلین (شہری) ہیں خود کو ایک علیحدہ گروپ خیال کرتے ہیں۔ وحدت کی حس/فہم اس کا یقین دلاتی ہے کہ پیشہ وارانہ مہارت اور ذمہ داری کی علامت تخلیق ہو چکی ہے۔ مختصراً یہ کہ 'ھنٹنگٹن'' جماعتی حیثیت'' کی تعریف کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک منفرد سپاہیانہ شناخت کی تخلیق کی یا جس کی عموماً تعریف بحیثیت'' جماعتی شناخت'' کے کی جاتی ہے۔

میں یہاں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ بنگال کی فوج کی بھرتی کی پالیسی نے یہ بات یقینی بنا دی کہ بنگال کا سپاہی ایک مخلوط النسل شناخت کو پروان چڑھالے۔ آبائی سماج سے اُس کی علیحدگی ناخالص ہوگی۔ نہ تو وہ یونیفارم میں (موجود) کوئی کسان تھا اور نہ ہی اُس نے خود کو آبائی سماج سے مکمل طور پر مختلف یا کٹا ہوا (قطع شدہ) محسوس کیا تھا۔ اُس کی بہت سی شناختیں تھیں، اور یہ صورتحال کی یکتائیت تھی جس نے اُسے اپنی شناخت کے ایک مخصوص پہلو پر زور دینے پر مجبور کیا۔ آخر کار اُس کا جھگڑا محض نوآبادیاتی حکومت کے ساتھ ہی نہیں تھا۔ وہ اپنے آبائی سماج میں بھی قوت (حاصل کرنے) کے لئے بھی کوششیں کر رہا تھا۔ اور جب وہ اس کی دسترس میں آئی، تو اس نے اس حقیقت پہ زور دیا کہ وہ کمپنی کا سپاہی تھا۔ ایک سچائی جس نے (نہ صرف یہ کہ) اُسے منفرد بنا دیا بلکہ اپنے سماج کے ساتھ اپنے مضبوط تعلقات کے باوجود (اُسے اُس کے) مخالف بھی کر دیا۔

اس مخالفت کا اظہار غیر مراعات یافتہ کسانوں اور مقامی اشرافیہ دونوں کے ساتھ موثر عداوت سے ہوا ہوگا۔ سپاہی سماج کے تمام حصوں (طبقوں) کے لئے ہیبت کا باعث تھے۔ وہ لکھنو کے برطانوی ریذیڈنٹ تک اپنی رسائی کے جعلسازی پہ مبنی دعووں کو ثابت کرنے کی نیت سے اکثر

غلط استعمال کرتے تھے۔ سلیمان ایک جھوٹے (معذور) صوبیدار شیخ محبوب علی کا ذکر کرتا ہے جس نے ایک بہت بڑے زمیندار سے، ریذیڈنٹ پہ دباؤ ڈال کر ایک گاؤں پہ اپنا دعویٰ ثابت کر کے اُسے ہتھیالیا۔ چنانچہ کمپنی کی نوکری نے اُسے بغلی راستہ مقام اور شکتی عطا کی، وگرنہ اس کی وہ آرزو بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی جگہ پر ہر سپاہی کمپنی کی فراہم کردہ تمام مراعات/فوائد کا ممکن ترین استعمال کرنے پر تلا ہوا تھا۔

'سیتارام' کی خودنوشت ہمیں سپاہیوں کو کمپنی کی فراہم کردہ خدمات (مراعات) کی قوت کی روشن تصویر بھی پیش کرتی ہے۔ 'سیتارام' اُن حالات کے بارے میں بیان کرتے ہوئے جو اُسے بنگال کی فوج میں شامل ہونے کی جانب لے گئے، کہتا ہے کہ اُس کا والد اس خیال (فوج میں بھرتی کے خیال) کے متعلق شاید ہی خلاف تھا (اس خیال کا شاید ہی مخالف تھا) اگرچہ اُس کی والدہ سیتارام کے فوج میں داخل کئے جانے کی پیش اندیشی (نتیجے) پہ خوفناک حد تک پریشان تھی۔ اُس کا والد (البتہ) آموں کے ایک جھنڈ پر جو خاندان کی ملکیت تھا متوقع قانونی کارروائی کی پیش بینی کر رہا تھا۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ اودھ (Oudh) سے تعلق رکھنے والا خدمتگار سپاہی، لکھنو میں (تعینات) برطانوی ریذیڈنٹ کے اعلیٰ دفاتر تک رسائی کو یقینی بنا سکتا تھا جہاں وہ مقدمات جس میں وہ (سپاہی اور اُس کے عزیز و اقارب) اور اُن کے اہل خاندان ملوث/شامل ہوں عدالت میں فوراً سماعت پذیر ہو سکتے تھے۔ (یہ) ایک ایسی مراعات تھی جس سے دیسی سماج کے عام ممبران کو محروم رکھا گیا تھا۔

سپاہی: ایک نئی اشرافیہ

سپاہی چنانچہ ایک نئی اشرافیہ بننے کی تلاش میں سرگرداں ہوئے۔ کمپنی کی نوکری نے اُس کی ہمت بندھائی اور اُسے بااختیار کیا۔ وہ ایک متحرک قوت کی نمائندگی کرنے لگا، جس کے باعث وہ اپنے دیسی سماج پہ برتری/فوقیت تلاش کرنے لگا جہاں سے اس کی نمود ہوئی تھی اور جس سے وہ ملحق تھا۔ اس کے باوجود کہ اپنے آبائی سماج سے اُس کے تعلقات بسا اوقات تلخ ہوتے تھے۔ چنانچہ سپاہیوں کے غدر کو لوگوں (عوام) کی بغاوت کے مترادف/ہم معنی نہ تو ٹھہرایا جا سکتا ہے اور نہ ہی سمجھا جا سکتا ہے جیسا کہ بعض مورخین نے تصویر کشی کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر 'راجت رے' کہتا ہے کہ سپاہیوں کا غدر لوگوں کی بغاوت کے دل کے بہت قریب تھا۔ اور بغاوت

کا سب سے زیادہ جمہوری حصہ تھا۔ 'رے' کی دلیل یہ ہے کہ سپاہی محض یونیفارم میں (ملبوس) کسان نہیں تھے۔ فوج کی نوکری نے اُسے چھوٹی دنیا کے اوسط دہقان کی نسبت ایک وسیع تناظر بخشا۔ 'رے' دلیل دیتا ہے کہ 1857 سے پہلے اور 1920 تک اوسط دہقانی بغاوت محدود اور (اپنی) فطرت میں مقامی تھی۔ اور اپنی بنیاد کو خونی رشتوں میں تلاش کرتی تھی۔ 'رے' وضع (یا فرض) کرتا ہے کہ کسان، جن کی قیادت سپاہی کر رہے تھے حکومت کی ہیتوں (اشکال) کی جانب پیش قدمی کی سعی تھی۔ جس کی روح جمہوری اور ریپبلکن تھی، اور جس کے اندر اُس کے (رے کے) مطابق پیر شاہی اور شہزادگان پہ مبنی ڈھانچہ تھا۔

'رے' یہ وضع (فرض) کرتا ہے کہ یہ سپاہی اُن علاقوں میں جنہیں برطانوی فرمانروائی سے نجات حاصل ہوگئی تھی، دیسی حکمرانی کی بحالی میں فیصلہ کن آواز کی حیثیت کے ذریعے لوگوں کے لئے قوت کے ایک خودمختار حصے (علاقے) پر زور دیتے تھے۔ 'رے' کہتا ہے کہ سپاہی خود کو حکومت کی جگہ (خود کو) دینے کے خیال کو بھی ذہن میں نہیں لاتے تھے۔ لیکن وہ اپنے کہے کو حرفِ آخر تسلیم کئے جانے پر اصرار کرتے تھے۔ 'رے' (یہ) دکھاتا ہے کہ کیسے 'باندا' کے سابقہ نواب کو باغیوں کو شانت کرنا پڑا جب اُس نے سرسری طور پر اقتدار سنبھالا۔ نواب نے اُنہیں (باغیوں کو) دعوت پر بلایا اور تمام معاملات میں اُن کے حرفِ آخر کے استحقاق کو تسلیم کر کے اُن کی تشفی کی۔ بالکل اسی طرح 'رے' کہتا ہے کہ سپاہیوں نے جھانسی میں لکشمی بائی کی بحالی کے لئے انتہائی نازک (اہم) کردار ادا کیا۔ لکشمی بائی کے وفود سے اختلاف کے بعد دراصل سپاہیوں کا ذہن دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ 'سادا شیوراؤ' جو لکشمی بائی کے آنجہانی خاوند کا بھائی بند تھا، وہ بھی جھانسی کے تخت کا دعویدار تھا اور سپاہی اس مطمع نظر سے الجھ رہے تھے کہ اُس کے دعوے کو رانی پہ ترجیح دیں۔ 'رے' جتلاتا ہے کہ موخرالذکر نے بالآخر سپاہیوں کو ایک بڑی رقم ادا کر کے اپنے دعوے کو حاصل کیا۔ 'رے' یہ بھی بتاتا ہے کہ سپاہیوں نے کونسلیں قائم کی ہوئی تھیں جن کے ذریعے وہ اپنی قوت کے مراکز جیسے کہ لکھنو اور دہلی وغیرہ میں اپنی طاقت کا اظہار کرتے تھے۔

میرا کہنا یہ ہے کہ لوگوں کی بغاوت کو اصطلاحی طور پر لوگوں کی (وہ) بغاوت نہیں کہا جا سکتا جس کے علم بردار سپاہی تھے۔ 1857 کے دوران سپاہی ازخود ایک قوت تھے۔ نہ تو وہ لوگوں کے ساتھ تھے اور نہ ہی وہ طاقت کی پرانی علامات کو واقعی بحال کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ کمپنی کی

نوکری کے کئی سالوں نے اُنہیں وہ اعتماد دیا تھا جس کی بدولت وہ روایتی غلامی (کے جوئے) کو اتار پھینک کر باہمت اور موثر بیانات دینے کے قابل ہو چکے تھے۔

اُنہیں (اپنے آپ پر) پرانے نظام (قائدے) کی مکمل تردید کرنے کا اعتماد نہیں تھا۔ ممکن ہے کہ انہوں نے یہ محسوس کیا ہو کہ لوگوں کی نظروں میں (لوگوں کے نزدیک) اُنہیں ایسا کرنے کی جواز جائز (قانونی) حیثیت حاصل نہیں ہے۔ لیکن اب وہ کسی روایتی شخصیت یا اتھارٹی/قوت کے رعب تلے (دبے ہوئے) نہیں تھے۔ ان سپاہیوں کو کچھ عرصے کے لئے لوگوں اور روایتی حکمران طبقوں کی حمایت کی ضرورت تھی۔ لیکن اُس کے ساتھ ساتھ (اُسی وقت) اُن کے یہاں دونوں حصوں کے لئے توہین کا پیمانہ موجود تھا۔

اس کی مثال عوام الناس کی طرف اُن کے رویے سے ملتی ہے۔ دہلی میں باغی اکثر اوقات دہلی کے لوگوں کے ساتھ سر پھٹول کرتے تھے۔ وہ بالخصوص سوداگروں، پیسہ ادھار دینے والوں، اور بنک والوں کے ساتھ سختی برتتے، اور عام لوگوں کو بھی معاف نہیں کرتے تھے۔ ان کا استحصال بالجبر اس ناقابل تصور حد تک تجاوز کر گیا کہ لوگوں نے باغیوں کے خلاف اپنی حفاظت کا عہد کر لیا۔ دوکانداروں نے سپاہیوں کی اس دست درازی سے عاجز آ کر دوکانیں کھولنے سے انکار کر دیا اور شہنشاہ کو شکایتوں کے دفتر پہنچا دیئے گئے۔ شہنشاہ کو دوکانداروں کی دوکانیں کھولنے کے لئے منت سماجت کرنا پڑی۔ اس کے باوجود دوکاندار بمشکل دکانیں کھولنے کی ہمت کو مجتمع کر سکے۔ فضا ایک خوف کی سی تھی، لوگ بڑے (عظیم) اور عام (عوام) سپاہیوں کی مایوسی اور اوندھی عقل کے ہاتھوں وصول کنندگی (نقصان اٹھانے) کے خوف کی حالت میں رہ رہے تھے۔

جیون لال اپنی ڈائری میں ایک ایسا واقعہ بیان کرتا ہے کہ جب سپاہیوں نے برطانویوں کے ہاتھ تباہ کن ہزیمت اٹھانے کے بعد اپنی ناکامی کا بدلہ بہادر شاہ کے طبیب (فزیشن) احسان اللہ خان سے لیا، جس پر وہ عرصے سے برطانویوں کی رفاقت کا شبہ کر رہے تھے۔ محل کو گھیر لیا گیا اور امان اللہ کے سر کے لئے (ہجوم میں سے) چیخیں پھیلنے لگیں۔ سپاہیوں کے طریق کار سے چوکنا ہو کر دوکانداروں نے اپنی دکانیں بند کر دیں۔ جیون لال کہتا ہے کہ شہر کا مسلمان حصہ خوف زدہ تھا کہ سپاہی بہادر شاہ ظفر کو قتل کر دیں گے اور قتل عام میں ملوث ہو جائیں گے ایسے خوف کسی بھی طور بے بنیاد نہ تھے کیونکہ سپاہی ذرا سا اکسانے پر تشدد کرنے پہ مائل ہو جاتے تھے۔ 21 مئی جہاں

تک دہلی میں باغیوں کی موجودگی کا تعلق تھا تو یہ ابھی اوائل کے دن تھے جب (دہلی نے) شہر کے معصوم شہریوں کے قتل عام کی گواہی دی (قتلِ عام دیکھا)۔ ظاہری تحریک (کی وجہ) بدمعاشوں یا شہر کے برے لوگوں کے ہاتھوں سپاہیوں کی قیمتی اشیاء کی چوری تھی جنہوں نے اُنہیں (سپاہیوں کو) دہلی کے ایک مخصوص محلے میں لوٹا تھا۔ سپاہیوں نے لٹنے پر زود رنج ہو کر آبادی کے معصوم لوگوں پر غصہ اتارا اور بڑے پیمانے پر قتل عام میں ملوث ہوئے۔ چنانچہ وقت آ گیا تھا کہ لوگوں کی بغاوت کے ہراول کے طور پر سپاہیوں کے رومانوی تذکرے کو جھٹک دیا جائے۔ سپاہیوں کا دارومدار خود اپنے آپ پر تھا اور اُن کا اپنا ایک ایجنڈا (مقصد) تھا۔ اگرچہ تکنیکی وجوہات کی بنا پر وہ لوگوں یا دوسرے روایتی علامتی سربراہوں کی حمایت (مدد) کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اُنہیں ایک ایسے سماج پر قناعت کرنا تھی جو قوت (اتھارٹی) کی روایتی علامتوں کے لئے انتہائی احترام کا حامل تھا۔ لیکن جہاں تک فیصلے کرنے کا تعلق تھا تو وہ فیصلہ کن قوت یا حتمی طاقت (اتھارٹی) کی حیثیت رکھتے تھے۔ جس کے نتیجے میں باغیوں کی قوت کے مراکز جیسے کہ دہلی اور لکھنو میں، سپاہیوں کی کونسلیں پھوٹ پڑیں (بن گئیں)۔ سپاہی ان کونسلوں کے ذریعے فیصلہ کن قوت کا استعمال کرتے، اگرچہ کاغذی حیثیت میں دہلی میں بہادر شاہ ظفر اور لکھنو میں بیگم حضرت محل قطعی قوت (اتھارٹی) کے مالک تھے۔ مثال کے طور پر دہلی میں جسے عدالت کہا جاتا تھا۔ (وہ) بخت خان کے دارالخلافہ میں پہنچنے کے بعد تشکیل دی گئی۔ اُسے دس ممبران پر مشتمل ہونا تھا، (جس میں سے) چھ فوج میں سے تھے اور چار کا تعلق شہریوں (سویلین) سے تھا۔ فوج کی تمام تین برانچوں (شاخوں) کی برابر نمائندگی ہوتی تھی۔ ممبران کو بہ ذریعہ اکثریت سے منتخب ہونا تھا۔ جس کی کسوٹی مفروضاتی طور پر ذہانت، قابلیت اور تجربے پر تھی۔ ان دس ممبران میں سے ایک کو اکثریتی ووٹ کے ذریعے صدر منتخب ہونا تھا۔ عدالت کے انفرادی ممبران کو یا بالترتیب جس ڈیپارٹمنٹ سے وہ منتخب ہوئے تھے، جو ابدہ ہونا تھا۔ اُن کی باری پر اُن کی مدد کے لئے کونسلیں تھیں۔ عدالت روزانہ بلاناغہ سرخ قلعے میں 5 گھنٹے کی نشست کرتی جبکہ غیر معمولی نشستیں دن اور رات کے کسی بھی وقت میں بلائی جا سکتی تھیں۔ تمام فیصلے اکثریتی ووٹ کی بنیاد پر ہوتے تھے۔ عدالت کی دسترس مالی، عدالتی اور بلاشبہ فوجی معاملات تک پھیلی ہوئی تھی۔ عدالت کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ ٹیکس (نافذ کرے) لگائے یا قانونی عدالتوں کو قائم کرے، ججوں اور پولیس کے افسروں کی تقرری کرے، تمام فیصلوں کے لئے شہنشاہ کی

توثیق ضروری تھی۔ اور اُس کی رضامندی بھی حاصل ہونی چاہئے تھی۔ اگر شہنشاہ کسی فیصلے سے اختلاف کرتا تو وہ اُسے عدالت کو دوبارہ غور کرنے کے لئے واپس بھجوا سکتا تھا۔

حقیقت میں یہ سپاہی تھے جو (جن کا کہا) حرف آخر تھے۔ شہنشاہ کو بسا اوقات ان نئی قائم شدہ عدالتوں کے فیصلوں پہ دستخط کرنے اور اُن کی توثیق کرنے پہ مجبور کیا جاتا تھا۔ بہادر شاہ نے اپنے خلاف مقدمے کی سماعت کے دوران تحقیقات کرنے والوں کے سامنے اپنے دفاع میں سپاہیوں کی خواہش کے آگے اپنی مطلق بیچارگی کا اقرار کیا تھا۔ سپاہی بظاہر خالی لفافوں پر اُس کی مہر ثبت کرنے کے عادی تھے، جس کے مواد سے وہ (شہنشاہ) مطلق لاعلم ہوتا تھا۔ جبکہ (ممکن ہے کہ) شہنشاہ تکنیکی بنیادوں پر سپاہیوں کے سامنے اپنی ناطاقتی (بیچارگی) کو بڑھا (چڑھا) کر بیان کر رہا ہو۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ سپاہی اُس وقت خود کو اتنے باہمت محسوس کر رہے تھے کہ وہ کسی سے بھی اپنی شرائط منوا سکیں۔ یہ ممکن ہے کہ یک مشت ہو کر اٹھنے اور حقیقتاً خوفزدہ کر دینے والی کمپنی کی حکمرانی کو شمالی ہندوستان کے بہت بڑے حصوں سے ملیا میٹ کرنے کی بے میل سرمستی (خوشی) نے اُنہیں نفسیاتی اٹھان دی ہوگی۔ اُنہوں نے ایک اہم نفسیاتی رکاوٹ کو عبور کر لیا تھا۔ یہ پہلی مرتبہ نہیں تھی جب سپاہیوں نے بغاوت کی تھی۔ کمپنی کی فوجوں میں بالکل ایسی ہی ثقافت بہت پہلے سے رواں (رائج) تھی۔ سپاہیوں کی مشروط فرمانبرداری یا فرمان کی بجا آوری (اُن کے کچھ جذبات کی توقیر (عزت افزائی) اور اُن کی جانب (اُن سے وابستہ) کچھ قول واقرار اور شرائط کے پورا کئے جانے کے بدلے میں تھی۔ ان شرائط کی عدم پیروی یا اُن کے جذبات کو نظر انداز کرنے کے معنی یہ تھے کہ وہ معاہدے کا لحاظ (مان) رکھنے کی ضرورت سے آزاد تھے چنانچہ سپاہی مخصوص حالات میں بغاوت کو جائز سمجھتے تھے اور اُسے غیر تنظیمی نہیں گردانتے تھے۔ لیکن 1857 مختلف تھا۔ پہلی بغاوتیں ارادے اور بصیرت کے لحاظ سے مقامی اور محدود تھیں۔ وہ برطانوی حکمرانی کی قانونی حیثیت کو للکارتی ہوئی دکھائی نہیں دیتی تھیں ماسوائے 'ویلور' بغاوت کے ممکنہ استثنیٰ کے۔ لیکن یہ مختلف تھا۔ یہ کم از کم انڈیا کے شمالی حصوں میں برطانوی حکمرانی کی زیریں بنیادوں کے لئے چیلنج تھا۔ کامیابی کے پہلے بہاؤ میں گرفتار (اسیر) سپاہی جنوں کی حالت میں تھے اور کسی مخالفت کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ مدافعت اور اصرار کا مضبوط خط (لکیر) سپاہیوں میں جنہوں نے بغاوت کی تھی، عیاں تھا۔ یہ بہت ساری سطحوں پر آشکار ہوا۔ مثال کے طور پر اُس کا

اظہار اُس طریقے میں ہوا جس میں سپاہیوں نے اپنے افسروں کے انتخاب کے حق پر اصرار کیا۔ سپاہیوں نے پرانی عادات (پریکٹسوں۔ مشقوں) کو جیسے کہ پنچ یا پنچایت کو دوبارہ سے بحال کر دیا۔ یہ جمہوری ادارے تھے جہاں فیصلوں پر اتفاق رائے سے پہنچا جاتا تھا جو ہر رجمنٹ کے راستے کے انتخاب سے متعلق تھے مثلاً گوالیار کی فوج، جس نے 14 جون کو بغاوت کی، اُس نے پہلی رجمنٹ کے ایک صوبیدار میجر کو اپنا جنرل منتخب کیا۔ ان فوجیوں نے مقامی افسروں کی رضامندی حاصل کرنے کی تکلیف گوارا کیے بغیر گوالیار کی طرف روانگی اختیار کی۔ جہاں اُنہوں نے 'سکینڈیا' (Scindia) سے مستقبل کے (حوالے سے) عمل کے راستے (طریق کار) کے مطابق منصوبے کا مطالبہ کیا۔ ان سپاہیوں نے یقیناً اپنا وقت پنچایتوں اور عدالتوں کی مجلس بلانے اور 'سکینڈیا' کو بھیجنے کے لئے وفود ترتیب کرنے میں گزارا ہوگا، (وہ وفود) جن کی تواضع کرنے کے علاوہ اُس کے پاس (سکینڈیا کے پاس) کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ بالآخر 7 جولائی کو سپاہیوں اور افسروں کا ایک بڑے حصے نے 'سکینڈیا' سے محل کے باغ میں ملاقات کی۔ اور اُس سے یقین دہانیوں کا مطالبہ کیا، جب 'سکینڈیا' نے اُن سے اُن کی خواہشات کے بارے میں پوچھا تو افسروں نے جواب دینے میں تامل کیا، لیکن سپاہیوں نے دخل اندازی کرتے ہوئے، راجہ سے کہا کہ اُنہوں نے آگرہ پہ قبضہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور وہ مزید اُس کے (سکینڈیا کے) احکامات کا انتظار نہیں کریں گے۔

سپاہیوں کی بغاوت اپنی بصارت میں کسی خاص نقطہ نظر پہ غور کرتی ہوئی محسوس ہوتی تھی (اُن میں) اپنے مقامی افسروں کے خلاف ناراضگی بھی شامل تھی جو کہ بظاہر سپاہیوں کے رحم و کرم پر تھے۔ یہ ممکن ہے کہ سپاہی اس حقیقت پہ ناراض ہوں کہ مقامی افسروں نے روزمرہ کی حکم عدولی کے معاملات پر پابندی لگانے (نمٹنے) میں ہمیشہ یورپین افسروں کا ساتھ دیا تھا۔ مقامی افسروں کا عجیب طور سے (انوکھا) دورخہ رویہ تھا۔ سابقہ مقامی بغاوتوں میں مقامی افسروں کو باغی سپاہیوں کی حمایت کرتے ہوئے پایا گیا، یا بعض موقعوں پر انہیں بغاوت کو قیادت فراہم کرتے ہوئے بھی پایا گیا جبکہ سپاہیوں کی روزمرہ کی حکم عدولی کے معاملات میں انہیں اتھارٹی کے ساتھ مل کر اُن کو (حکم عدولی کے معاملات کو) مکمل طور پر جڑ سے اکھیڑ کر تمام کرتے ہوئے پایا گیا۔ 1857 اس مفہوم میں مختلف ہے کہ یہاں ایک اوسط درجے کا سپاہی آگے بڑھا تھا۔ بغاوت اُس کی بہت ساری ناراضگیوں کا مظہر تھی۔ جس نے پیر شاہی کی بہت سی تہوں کو اپنے غصے میں لپیٹ لیا تھا۔ کوئی بھی شخصیت اُن کے

لئے مقدس نہیں تھی۔ سپاہیوں کا غصہ اور تکبر شہنشاہ کو بھی معاف کرنے والا نہیں تھا۔

ایسی رپورٹیں (خبریں) موجود ہیں کہ تنخواہ کے لئے شور وغل کرنے والے سپاہیوں نے مغل شہنشاہ کو بھی نا قابل تکریم (احترام) اصطلاحات سے مخاطب کیا (اری بادشادہ اور یہاں تک کہ اری بڈھا) کچھ اس قدر شوخ چشم تھے کہ اُنہوں نے اُسے (شہنشاہ) ہاتھ سے کھینچا۔ ایک نے بظاہر اُس کی داڑھی کو کھینچا کہ وہ (شہنشاہ) اُس کی جانب متوجہ ہو کر (بات کر) سکے۔ سپاہیوں میں اس قدر جرات بھی تھی کہ اُنہوں نے ملکہ زینت محل کو بطور یرغمال حاصل کرنے کا مطالبہ بھی کیا۔ کیونکہ اُنہیں شبہ تھا کہ وہ (زینت محل) اور بہادر شاہ ظفر کا طبیب (فزیشن) امان اللہ خان، برطانیہ کے رفیق ہیں۔ جہاں تک امان اللہ خان کا تعلق ہے اُن کا اُس کے خلاف غصہ پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے۔ ایک موقعے پر سپاہی اُس کے اپارٹمنٹ میں داخل ہو گئے اور اُسے لوٹ لیا۔ امان اللہ خان کی خوش نصیبی یہ تھی کہ وہ اُس وقت وہاں موجود نہیں تھا۔

باغی جیسا کہ ہم نے دیکھا 'سکینڈیا' کی جانب اپنے رویے میں شاید ہی مودب تھے۔ اُس کی جانب اُن کا لہجہ سخت (اٹل/قطعی) تھا۔ وہ اُس سے اپنی شرائط حکماً منوانا چاہتے تھے۔ جب کہ اُنہوں نے اُس کی حاکمیت کو مکمل طور پر مسترد کرنے کی کوشش نہیں کی، لیکن وہ اُس کی معمولی سی خود مختاری کو بھی محض اپنی شرائط پر تسلیم کرنے کو تیار تھے۔ حالات (اوقات) بدل چکے تھے۔ کم از کم عارضی طور پر۔

روایتی اشرافیہ اپنی قوت پر اٹھائے گئے سوالات اور چیلنجوں (اعتراضات) کا سامنا کئے بغیر اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کی امید نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ایک ایسی قوت کا سامنا کر رہے تھے۔ جس میں اُن کے لئے بے ادبی پروان پا چکی تھی۔ روایتی اتھارٹی (قوت) کے خلاف باغیوں کے رویے کی توہین آمیزی 'برجیس قادر' کے لکھنو کے کونسرٹ (ملکہ کے خاوند) کی حیثیت سے تاجپوشی کے دوران زیادہ نمایاں ہوئی۔ سپاہی ہجوم کی صورت محل میں جمع ہو گئے اور بظاہر خود کو عمومی طور پر وبال جان بنا دیا۔ اُنہوں نے برجیس قادر کے سامنے آنے پر شور وغل سے تبصرہ کیا، کچھ نے اُسے دیوتا کرشنا کے ساتھ متوازی ٹھہرایا۔ دوسروں نے اُس سے درخواست کی کہ وہ عورت اور شراب کی لذت کے سامنے گھٹنے نہ ٹیکے۔ کچھ ایسے تھے جنہوں نے اُس کی بزدلانہ اور ڈرپوک شباہت پر اُس کی بہت زیادہ تضحیک کی۔ ایک سپاہی پہ جذبات اتنے غالب آ گئے کہ وہ اُس سے (برجیس قادر سے) بغلگیر ہو گیا اور اُس نے

(سپاہی نے) اُسے کرشنا کہہ کر مخاطب کیا۔ ایک روایتوں سے بندھے ہوئے سماج میں تکبر اور میل ملاپ کے یہ مظاہر نا قابل تصور (سوچ کے احاطے سے باہر) ہوں گے۔ لیکن یہ سپاہیوں کی فوج تھی جس کی زنجیریں ٹوٹ چکی تھیں۔ کمپنی کی برس ہا برس کی نوکری نے دیسی سماج میں ایک ایسی قوت بنا دیا تھا جسے تسلیم کیا جاتا تھا۔ بغاوت نے عارضی طور پر اُنہیں صورتحال کا مالک بنا دیا۔ اُن کی لگن سنجیدہ کا یہ پلٹ (کے باوجود) سے ابھی تک کم نہیں ہوئی تھی۔ یہ سر کو چڑھ جانے والی فتوحات کے ابتدائی لمحات تھے۔ سپاہیوں نے محسوس کیا کہ وہ اپنی شرائط کسی سے بھی حکماً منوا سکتے ہیں۔

اختتامیہ

اختتام کرتے ہوئے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ بغاوت کی اہمیت کیا تھی؟ اگر باغی سپاہی عوام کی بغاوت کی نمائندگی نہیں کرتے تھے تو پھر اس نے (غدر نے) کس کی نمائندگی کی؟ ہم بغاوت کا جشن پہلی جنگ آزادی کے طور پر کیوں مناتے ہیں؟ ہم، یوں کہیے کہ سینتھال اور موپلا کی بغاوتوں یا اسی طرح بہت سی دوسری اور بغاوتوں کا جشن کیوں نہیں مناتے؟ اُن کی ایک سو پچاسویں برسی (سالگرہ) کو یاد کیوں نہیں کیا جاتا؟ مثال کے طور پر 2006 ویلور کی بغاوت کی دوسویں برسی (سالگرہ) تھی۔ ایک ایسی بغاوت جس نے مدراس کی 'پریذی ڈینسی' کے بہت سے حصوں میں ہنگامہ آرائی پھیلا دی۔ 1857 کے برعکس انگریز اس ہنگامہ آرائی کو جڑ سے اکھیڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ عجیب بات یہ ہے کہ 'ویلور' کی بغاوت کی تقریبات بہت دبی ہوئی رہیں۔ اُس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ 'ویلور' کی بغاوت مقامی رہی۔ اور مدراس کی 'پریذیڈینسی' کے دوسرے حصوں میں نہ پھیل سکی کیونکہ انگریز دوسرے مراکز میں اس بڑھتی ہوئی ہنگامہ آرائی پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس سے قبل کہ وہ قوتِ رفتار حاصل کر پاتی۔ نقطہ یہاں ٹھہرتا ہے (پانی یہاں مرتا ہے)، 1857 اپنے ارادے، بصارت اور حجم کے اعتبار سے نا قابلِ مقابلہ تھی۔ علاقے کی خالص چوڑائی، تنازعے کا نپٹ وحشیانہ پن بے مثال تھے۔ بغاوت شمالی انڈیا میں برطانوی حکمرانی کے لئے بنیادی چیلنج بن سکتی تھی۔ اور ایک رومانویت کو پیدا کر سکتی تھی اور اس کے علاوہ سوفسطہ کا ایک عمل (بھی جاری کر سکتی تھی) جو آج کے دن تک برقرار ہے۔

تاہم سوال جو اُٹھتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا ہمیں یہ فرض کر لینا چاہئے کہ سپاہیوں کی بغاوت کی

اہمیت محض اس حقیقت میں تھی کہ یہ اپنی وسعت اور تصور کے لحاظ سے بے مثال تھی؟ اس کے برعکس بھی دلیل دی جا سکتی ہے۔ باغی سپاہیوں کے کچھ ترقی پسند خدوخال بھی تھے باوجودیکہ لوگوں سے اُن کے تعلقات اکثر اوقات مخالفت پر مبنی تھے۔ یہی انتہائی حقیقت کہ اُنھوں نے ایک پرانی جاگیردارانہ اشرافیہ کو للکارنے کی نمائندگی کی ازخود ترقی پسندانہ خدوخال کی وکالت کرتا ہے۔ سپاہی ایک متبادل پیش کرنے کی کوشش میں حکومت (کرنے کی) کی متبادل مثال بھی تجویز کر رہے تھے۔ اُنہوں نے امکانی طور پر محسوس کر لیا تھا اگر وہ ایک معتبر چیلنج کو پیش کرنے کی خواہش رکھتے تھے تو وہ حکومت (کرنے کی) پرانی اشکال/ ماہیتوں کو دوہرانے کی امید نہیں کر سکتے تھے۔ طبعاً بھی سال ہا سال ایک فوج میں خدمت سرانجام دینے کے بعد، جہاں اُنہیں ذہنی طور پر کسی قدر آزادی کی اجازت تھی، اُنہیں موثر اور پراعتماد بنا دیا تھا۔ اب وہ مزید محض فرمان لینے کے عادی نہیں رہے تھے۔ یہ اُس عمومی اعتماد سے علیحدہ تھا جو فوج کی نوکری نے اُنہیں دیا تھا۔ چنانچہ سپاہی اگرچہ لوگوں کے ساتھ اپنے رویوں میں بمشکل صلح پسند تھے، اپنے خودمختار دائرہ کار یا عمل داری کے علاقے میں جمہوری تھے۔ سپاہیوں کی بغاوت کا اہم ترین حصہ اس میں موجود ہے۔ اگر ہم ایک ایسے منظر کا تصور کریں جہاں سپاہی کامیابی سے ہمکنار ہو گئے ہوں یہ شبہہ کیا جا سکتا ہے کہ پرانی مقامی ماہیت کی حکومت کی جانب اُن کی واپسی یا کایہ پلٹ ہو گی۔ لیکن کامیابی کی انتہائی فطرت، اور سپاہیوں کا ادا کردہ بہت بڑا کردار اس کے خلاف یقین دہانی ہوتی۔ جبکہ پارلیمانی جمہوریت کے جدید تصورات کی اصطلاحات کی بات کرنا لاحاصل ہے لیکن یہ ممکن ہے کہ ایک نیا قائدہ یا قانون ظہور پذیر ہوتا۔ نیا قائدہ/ قانون/ نظام سپاہیوں کی لوگوں پر اور کسی قدر کم حد تک پرانی اشرافیہ پر آمریت کی نمائندگی کرتا، سپاہیوں کی اندرونی دنیا میں مضمر مساواتی تار ایک تضاد کی وکالت کرتے۔ یہ ممکن ہے کہ یہ تضاد ایک (ایسے) نظام کی تشکیل کا نتیجہ (باعث) بنتا، جو مساواتی تھا۔ اور اگر میں اصطلاح کے درست ترین مفہوم میں لفظ جمہوریت کو استعمال کر سکوں (تو یہ جمہوری بھی تھا)۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ 1857 کی درست/ سچی اہمیت یہاں دھری ہوئی ہے۔ (موجود ہے)۔

❁❁❁❁❁

بغاوت پہ لکھے گئے ناول

(سلطنت میں شامل کرنے کی اخلاقی کاوش)

ایشوریا لکشمی/ترجمہ: پروفیسر طفیل ڈھانہ

1857 کی بغاوت نے ہندوستان کی حکومت مغل شہنشاہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو منتقل کر دی۔اس دور میں ہندوستان سے باہر لکھے جانے والے ادب میں ایسی تحریک کی نشاندہی ہوتی ہے جس میں ہندوستان کو مہم جوئی کی تجربہ گاہ کی بجائے پرامن ملک بنا کر پیش کرنے کی کوشش ہوتی۔ یہ مضمون دو ناولوں کا حاصل مطالعہ پیش کرتا ہے، جو ہندوستان کو رومانوی اور تخیلاتی تصورات سے نکال کر ایسے ملک کے طور پر پیش کرتے ہیں جس کو عورت کی طرح اپنایا گیا جو اپنے گورے آقاؤں کے ساتھ خوشی کے ساتھ وابستہ ہے۔

ایشوریہ لکشمی

1897 میں بلیک ووڈ نے ایڈن برا میگزین میں صدی کے تمام بڑے واقعات کا احاطہ کیا جو فکشن کی صورت مین پیش کئے گئے تھے۔ان میں ہندوستانی بغاوت نے لوگوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا(Anon:218)،اپنے داخلی مزاج میں یہ ایک سلطنت تھی جسے نگلا جا رہا تھا۔اس مقالے میں موقف پیش کیا گیا ہے کہ اگرچہ ایڈونچر ناول علامتی طور پر سلطنت کا نکتہ نظر پیش کرتا ہے، سلطنت کی جانب سے ایک ناول، مگر نصف صدی کے بعد سے ملکہ کے حامی انگریز حلقے ہندوستان کو اپنا حصہ تصور کرتے تھے۔ جو اگرچہ مختلف حالت میں تھا لیکن سلطنت کے ساتھ اس کے سیاسی

اور اخلاقی تعلقات معقول اور مناسب تھے۔ اس تصویر کشی نے بالآخر کالونیل ازم کے جواز میں اخلاقی نکتہ نظر تخلیق کر دیا اور بیسویں صدی کے ابتدائی ماہ و سال تک اس تصور کو مستحکم کرنے کی کوشش جاری رہی۔ جیسا کہ اس ترقی یافتہ دور میں لکھے گئے ناول Kim سے ظاہر ہوتا ہے۔ رجحان کی اس تبدیلی میں کلیدی کردار واقع 1857 کی قیادت ہے۔ جس نے حکومت مغل شہنشاہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو منتقل کر دی، جو تاج برطانیہ کی محافظ تھی۔ بغاوت پر لکھے گئے ناول ہندوستان سے باہر رجحان کی اس تبدیلی کو ایسی تحریک کے طور پر پیش کرتے ہیں، جس میں ہندوستان کو، جو کہ مہم جوئی کی ایک تجربہ گاہ تھی، سلطنت کا حصہ سمجھتے ہوئے پر امن ملک بنانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ بغاوت پر دو ناولوں کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے، جن میں ایک میڈوس ٹیلر ''سیتا'' (1876) ہے اور دوسرا فلور۔ اے۔ سٹیل کا On the Face of Waters (1896) ہے، میری رائے میں ہندوستان کو جنسی تشخص دے کر پرعزم ساتھی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے میرا موقف یہ ہے کہ اس تصویر کشی میں انیسویں صدی کے ابتدائی دور کے ہندوستان کو ''نسوانی تشخص'' میں پیش کیا گیا ہے۔ اور لازمی اخلاقی رشتے کی بنیاد پر اس کو برطانیہ کا ضرورت مند قرار دیا گیا ہے۔ اس میں مغرب کو مردوں کی طرح قوی اور مشرق کو عورتوں کی طرح نازک ثابت کرنے کے قدیم تصور پر انحصار کرتے ہوئے بے جوڑ شادی کہا گیا ہے۔

ادبی ناقدین نے بغاوت پر ناولوں کا تجزیہ کرتے ہوئے قدیم روایات کو اہم مرکزی نکتہ قرار دیا ہے۔ دہشت اور خوف و ہراس کی سماجی روایت اور شدید نسل پرستی کی فضا میں انگریز اور ہندوستانی عورت کی سماجی حیثیت کو علامتوں کے حوالہ سے پیش کرتے ہوئے موقف اختیار کیا گیا ہے کہ ایک لائسنس شدہ ہے جبکہ دوسرا محض تشدد کا شکار ہے۔ لہٰذا دونوں کو آزادی حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہندوستان کو جنسی علامت اور بعد از 1858 کے دور میں سلطنت کا حصہ فرض کرتے ہوئے زیر بحث لایا گیا ہے۔ ان ناولوں میں ہندوستان کی علامتی نمائندگی ہندوستانی عورت کرتی ہے، جس کو اخلاقی اور سماجی طور پر آزادی حاصل کرنے کے لئے مدد کی ضرورت ہے (اس کے برعکس انگریز عورت سلطنت کی نمائندگی کرتی ہے جس کو عسکری تشدد کا رویہ ترک کرنے کی ضرورت کا احساس دلایا گیا ہے) اور اس سلطنت میں نسلی تقسیم کے مختلف سماجی دائروں کو تسلیم کرنے کا نکتہ نظر پیش کیا گیا ہے۔ میری رائے میں سلطنت کے جغرافیائی سٹرکچر کو جنسی حوالے میں پرعزم قرار

دیا گیا ہے۔جس میں ہندوستان کو بیوی اور برطانیہ کو خاوند کے کردار میں پیش کیا گیا ہے اور یہی سماجی طور پر لازمی رشتہ ہے جو مختلف سماجی دائروں کو ایک دائرے کے ساتھ وابستہ کرتا ہے۔ 1857 کے بعد ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان تعلقات کی یہی نوعیت تھی۔

یہ مقالہ اینٹی برٹن کے نکتہ نظر کو بھی پیش کرتا ہے۔ جس نے نصف صدی کے بعد نسوانیت کے موضوع پر کام کیا تھا۔ اس نے موقف پیش کیا کہ ملکہ کے پیروکار برطانیہ اور ہندوستان کو ایک دوسرے سے مختلف تسلیم کرنے کی بجائے دونوں سماجوں کے ایک مشترک نکتے کے گرد دائروں میں تصور کرتے تھے۔(Buston:35)۔ برٹن رائے دیتا ہے کہ برطانوی نسوانی تحریک، سلطنت کا اخلاقی جواز مستحکم کرنے کے لئے ہندوستانی عورتوں کی سماجی ترقی کو بڑا کام سمجھتی تھی۔ ان کی نظر میں عوام کا قومی کردار سلطنت کے قومی مفادات کے مترادف تھا۔ اس بنیاد پر ان کا موقف تھا کہ سلطنت میں عوامی کردار کو بڑھاتے ہوئے ہندوستانی عورت کو بھی اس میں شامل کر لیا جائے (لیکن ایک روایت پرست عورت کے روپ میں)۔ یوں برٹن قرار دیتا ہے کہ برطانیہ نے قومی دائرہ میں توسیع کر کے ہندوستان کو اس میں شامل کر لیا۔ جبکہ میں برٹن سے اتفاق کرتا ہوں کہ ہندوستان کو قومی کردار میں توسیعی حیثیت دی گئی تھی۔ جس کو حقیقی اعتبار سے امپیریل قوم کا توسیعی حصہ سمجھا گیا تھا۔ البتہ میری رائے میں یہ اسٹیٹس تمام سلطنت کے لئے برابر نہیں تھا۔ جس میں مرکزیت برطانیہ کو حاصل تھی۔ اس حوالے سے برٹن کا ارتقائی نکتہ نظر درست نہ تھا۔ اس کے برعکس قومی اسٹیٹس واضح دو حصوں پر مشتمل تھا۔ جس میں برطانوی حصے کی حیثیت مردانہ بالادستی کی نمائندہ تھی جبکہ ہندوستان اس کا نسوانی ساتھی ہونے کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ ایسا رشتہ تھا جس نے دونوں فریقوں کو سرگرمی کا مرکز فراہم کر دیا تھا۔

لہٰذا جس طرح ہندوستانی عورت کی مفعولیت نے نسوانیت کے موضوع پر بحث میں سرگرمی پیدا کی۔ اسی طرح ہندوستان کی سماجی تشخیص میں اس علاقے کے لئے نسوانی کردار نے 1860 کے بعد نوآبادیات کے موضوع پر سرگرم بحث کا آغاز کیا۔ یہ خطہ جس کو نسوانی کردار میں پیش کیا گیا اٹھارہویں صدی کے اختتام اور انیسویں صدی کے آغاز میں اس اسٹیٹس سے انحراف کا مظہر رویہ پیش کرتا ہے جو رومانوی اور تخیلاتی حسن کے ضمن میں اس کی ذات کا حصہ بتایا گیا تھا۔ اس ضمن میں نسوانی مشرق نے مختلف حوالوں سے مزاحمت کا مظاہرہ کیا اور مردانہ کردار کے حامل مغرب

سے اس کی توسیع پسندی پر نقطہ اعتراز اٹھایا۔ اٹھارہویں صدی کے آخری اور انیسویں صدی کے ابتدائی ہندوستان کے سماجی حسن میں تخیلاتی رنگ نے ہندوستان کو نسوانی، غیر مزاحمتی اور غیر مہذب زمین کے طور پر پیش کیا تھا۔ جس میں روایتی شان وشوکت کے تصورات تبدیل ہو رہے تھے اور ہندوستان دور حاضر کی چپقلشوں کے زیر اثر نئے حقائق کو تسلیم کر رہا تھا۔ لیکن یہ دوسرے فریق کی حیثیت سے بالادست اور وسعت پذیر برطانیہ کو اپنے وجود کا احساس بھی دلاتا تھا۔ اگرچہ یہ بہت غیر مؤثر مخالفت تھی۔ رومانوی تصویر کشی جولیڈی مارگن کے 1811 میں شائع ہونے والے ناول ''مشنری'' میں بہت خوبصورت انداز میں پیش کی گئی۔ اس میں نسوانی مشرق اپنے دونوں کرداروں یعنی ایک ہندوستانی راہبہ لکسیما اور کشمیری نژاد مقامی باشندہ مزاحمتی حوالہ پیش کرتے ہیں (اگرچہ یہ رویہ فریب دہی تھی) جو مغرب کی مردانہ بالادستی کے خلاف احتجاج کرتے ہیں کہ ان کی آزادی طاقت کے ساتھ کچل کر ان کو ماتحت بنایا جا رہا ہے۔ بغاوت پر لکھے گئے ناول دونوں مخالف فریقوں کو ایک ساتھ باندھ کر (برطانیہ کی مردانہ بالادستی اور نسوانی ہندوستان میں رومانس) اور نام نہاد مزاحمت (برطانیہ کی طاقت کے ساتھ وسعت پذیری اور ہندوستانی روایتی شان و شوکت کے خاتمے کا تخیلاتی تصور) جو کہ ہندوستان کے اندر شوری رویئوں میں پائی جاتی تھی کے باعث نہ صرف یہ کہ مشرق کو مغرب کے ثقافتی نظریات کے ساتھ زبردستی باندھا گیا بلکہ ایک فریق کو ماتحت اور مفعول بنایا گیا۔ مزید برآں نسوانی کردار میں پیش کئے گئے ہندوستان میں کس نوعیت کی مزاحمتی قوت کو ریگ مال کرنے کی غرض سے ہندوستان کی جمالیاتی تصویر کشی میں بیرونی قوتوں کے باعث نمودار ہونے والے حسن کو اس سرزمین کی خوبی شمار کرنے کی بجائے برطانیہ کا حسن فن قرار دیا گیا۔ بغاوت کے بعد نسوانی کردار میں پیش کیا گیا ہندوستان ابتدائی دور کی رومانوی اور جمالیاتی حسن کی حامل سرزمین کے برعکس ایک غیر فعال جسم قرار دے کر اپنے حال میں بند سماج بتایا گیا۔

سلطنت کے اس حصے، ہندوستان پر بعد میں مہماتی ناول لکھے گئے، جس کے لئے نسوانی کردار وضع کیا گیا تھا۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں کی فکشن میں ہندوستان دوبارہ سے مہم جوئی کا سماج بن کر سامنے آیا۔ جیسا کہ کم Kim جیسے ناول اور جی اے ہینٹی کی ابتدائی نوعیت کی فکشن میں ظاہر ہوتا ہے (Boyd-66-68)۔ ادبی تاریخ میں ہندوستان

کے اس مہماتی کردار کو جوان ناولوں میں بیان کیا گیا ہے، اٹھارہویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز کی مہماتی کہانیوں کے تسلسل میں دیکھتا ہے۔ جو تاجروں اور رضا کار فوجیوں کے بارے میں لکھی گئی تھیں۔ میرے خیال میں یہ دونوں حوالے مختلف نوعیت کے حامل ہیں۔ مہم جوئی جس میں ہیرو شعوری اعتبار سے ابھی بچے تھے برطانوی سورماؤں کے ساتھ کوئی مماثلت نہیں رکھتے جو کہ انیسویں صدی کے ابتدائی دور میں نمودار ہوئے۔ جن کے بارے میں ہینری لارنس، جیمس سکنز اور کسی حد تک میڈوس ٹیلر نے بھی لکھا ہے۔ البتہ یہ مہم جوئیاں ہندوستان کی ایسی سرزمین پر نمودار ہوئیں جو مقبوضہ اور زیر نگرانی تھا۔ جیسا کہ بغاوت پر ناولوں میں اس نکتہ نظر کو پیش کیا گیا تھا۔ یہ مقالہ ادبی تاریخ کو نئے انداز میں دیکھتا ہے، جو بغاوت پر ناول اور اینگلو انڈین فکشن میں انیسویں صدی کے دوسرے نصف کو نظر انداز کرتے ہوئے سلطنت کو اٹھارہویں صدی سے بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں تک مہم جوئی کا میدان قرار دیتی ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ بغاوت کے بعد سلطنت کی داخلی پالیسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے انیسویں صدی کے اختتامی ایام میں لکھے گئے ایڈونچر ناول کا دوبارہ سے مطالعہ کر کے سلطنت کی تصویر کشی میں نیا تصور شامل کیا جائے۔

سماجی اور نسوانی تصور کی تخلیق

10 مئی 1857 کو بنگال آرمی کے سپاہیوں نے میرٹھ، ہندوستان میں بغاوت کی اور اپنے کمان افسروں کو ہلاک کر دیا۔ سپاہیوں نے دہلی کی جانب مارچ کیا اور بہادر شاہ ظفر، جو اس وقت ایک نام نہاد بادشاہ تھا، سے کہا کہ وہ انگریزوں کے خلاف بغاوت کی قیادت کرے۔ باغیوں کی اس اپیل پر شمالی ہندوستان میں کئی مقامی رجمنٹوں نے علم بغاوت بلند کر دیا، اور باغی دہلی کے علاوہ دیگر شاہی درباروں میں جمع ہوئے جیسا کہ لکھنو میں اودھ کے نواب کا دربار (جس کو حال ہی میں معزول کیا گیا تھا)۔ انگریز جن کو غیر متوقع طور پر اچانک بغاوت کا سامنا کرنا پڑا جلد ہی سنبھل گئے اور طویل محاصرے کے بعد ستمبر 1857 دہلی پر دوبارہ قبضہ کر لیا گیا۔ سقوط دہلی سے باغیوں کو فیصلہ کن دھچکا لگا لیکن لڑائی 1859 تک جاری رہی۔ کیونکہ کسانوں نے مقامی زمینداروں اور باغی لیڈروں کی قیادت میں جدوجہد جاری رکھی۔

مارچ 1858 میں بہادر شاہ ظفر کے خلاف مقدمہ کی کارروائی ہوئی، اس کو ہندوستان میں

برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے اور تباہ کرنے کی سازش کا مرتکب قرار دیا گیا اور اس جرم کی پاداش میں ملک بدر کر کے برما بھیج دیا گیا۔(Noorani:19)۔نومبر 1858 میں ملکہ وکٹوریہ کے اعلامیہ کے ذریعے حکومت مغل شہنشاہ سے تاج برطانیہ کو منتقل کر دی گئی (ہندوستان میں جس کی محافظ ایسٹ انڈیا کمپنی تھی) اور ہتھیار ڈالنے والے ان باغیوں کے لئے عام معافی کا اعلان کر دیا گیا جنہوں نے کسی انگریز آدمی یا عورت کو ہلاک نہیں کیا تھا۔ اس دستاویز میں شفقت مادری کی اصطلاح استعمال کی گئی جس میں ملکہ کو ماں کے روپ میں پیش کیا گیا جو رحم کرتے ہوئے اپنے منحرف بیٹوں کو معاف کرنا چاہتی تھی۔ بیگم حضرت محل (ملکہ جس نے اودھ میں برطانیہ کے خلاف مزاحمت جاری رکھی) نے اس اعلامیہ کو رد کیا اور ہتھیار ڈالنے کی پیشکش مسترد کر دی۔ اس نے نشاندہی کی کہ ملکہ کی ''مادریت'' انتہائی گمراہ کن اور خلوص سے مکمل طور پر خالی ہے۔ نہ صرف یہ کہ یہاں انصاف کا کوئی امکان نہیں تھا بلکہ (یا کئی واقعات میں ہرگز سماعت ہوئی نہیں) جنہوں نے ہتھیار ڈال دیئے اس پیشکش نے ان باغیوں سے سب کچھ چھین لیا۔ علاوہ ازیں ہندوستان کو سلطنت کا داخلی حصہ بنانے کے لئے جو راستہ کھولا گیا اس کی بنیاد تمام فوج اور عوام کے لئے سزا پر استوار تھی۔ جس نے ایسی حکومت کے خلاف بغاوت کی اس سے قبل جس کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

ماضی اور حال دونوں کے پیش نظر عدالتی کارروائی اور اعلامیہ سلطنت کی داخلی تعمیر سے پہلے زیر عمل آئے۔ ہماری حکومت عدالتی کارروائی اور اعلامیہ کی بنیاد پر بغاوت سے بعد کی بجائے قبل کی ظاہر ہوئی۔ ان اصولوں کو بغاوت سے قبل عرصے سے موثر کرنے کا مقصد بادشاہ کے خلاف بغاوت کا مقدمہ چلانے کا قانونی جواز پیدا کرنا تھا۔ اس کے علاوہ اس کا مقصد بادشاہ کو صرف اقتدار سے محروم کرنا نہیں تھا بلکہ اس کو بغاوت کے الزام میں عدالت میں پیش کرنا بھی تھا۔ ماضی میں طاقت کے نمائندوں کے خلاف عدالتی کارروائی کا مقصد نئی حکومت کو قانونی جواز فراہم کرنا تھا اور حکمرانوں کی تبدیلی کا اعلان کرتے ہوئے قوت کے بل قائم حکومت کو ایک قانونی حکومت میں تبدیل کرنا تھا۔ لہٰذا جب برطانیہ کی جانب سے ردِ بغاوت کارروائیاں ہوئیں جن میں باغیوں کو توپوں سے اڑایا گیا اور ان کو درختوں پر پھانسیاں دی گئیں، جب دیہاتوں کو جلایا گیا۔ یہ قکالڈی طریقہ کار کا مظاہرہ تھا۔ جس میں برطانوی قوت کی ہیبت کا مظاہرہ کرنے کے لئے تشدد کے نشانات عوام کے دیکھنے کے لئے چھوڑے جاتے تھے۔ جبکہ قانون، سیاست اور فکشن پر بحثوں میں

ایک مختلف نوعیت کی یادداشت تشکیل کرنے پر کام ہوا۔ یہ تشدد کے نشانات مٹانے اور ماضی کو غیر اخلاقی قرار دینے کی کوشش تھی۔ چونکہ ردِ بغاوت تشدد کی کارروائی، خودمختار مغل ہندوستان کے خلاف تھی۔ لہٰذا اس کو بحث میں درست قرار دینے کا جواز نہیں تھا۔ جب تک پرانے سماجی نظام کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر کے اس کو ناواجب قرار نہ دیا جاتا۔ یوں بحث کا واحد مقصد تھا کہ تشدد کو قانون کی شکل دی جائے۔ جو ماضی اور حال پر نظریاتی کام کو سابقہ دور سے موثر کر سکتا تھا۔ بالآخر اس بحث نے جو شہادت پیش کی تشدد کے ساتھ تسلط اور الفاظ کا نیا بندوبست تھا جو ان کے خلاف استعمال کیا گیا جو پہلے خود ان الفاظ کو استعمال کرتے رہے تھے۔

یہ مقالہ اس بحث کے ایک نکتہ پر توجہ مرکوز کرتا ہے، یعنی بغاوت کے حوالے سے لکھی گئی فکشن، اور دو ناولوں کا تجزیہ کرتا ہے جو سیتا (Seeta) اور نقش برآب (on the Face of Waters) کے عنوان سے لکھے گئے تھے۔ یہ ناول اس نظریاتی کام کو سامنے لاتے ہیں جو سلطنت کے لئے کیا گیا تھا۔ میری رائے ہے کہ ان ناولوں نے ہندوستان کو سلطنت کے داخلی حصہ کے طور پر اپناتے ہوئے اس کو جنسی علامت میں پیش کیا۔ یہ وہی تحریک تھی جو ملکہ نے اعلامیہ کے ساتھ شروع کی تھی۔ جس کا مقصد بغاوت کی انقلابی کیفیت کو دھندلا کر کے سلطنت کی اصول پسندی کو اجاگر کرنا تھا۔ یہ مقصد دو طریقوں سے حاصل کیا گیا، یعنی ناولوں کے پلاٹ میں ہندوستان کو غیر منظم اور مہم جوئی میں الجھا ہوا ملک قرار دیتے ہوئے اس کو منظم اور مہذب بنانے کی ضرورت سامنے لائی گئی اور بغاوت کو ایک تاریخی قانون سامنے لانے کے لئے استعمال کیا گیا (یعنی ہندوستانیوں کو تاریخی حوالہ سے انگریزوں کی ضرورت تھی)۔ دوسرے مقصد کو جواز فراہم کرنے کے لئے جمالیاتی تصورات اور علاقے کو نسلی بنیادوں پر تقسیم کرنے کا اہتمام ہوا۔ اس کے لئے دونوں تصورات تاریخی قانون کی دریافت میں اصولی شہادت قرار پاتے ہیں۔ اعلامیہ کے مقصد کی طرح یہ ناول بغاوت کو آزادی کی جنگ کی بجائے ایک ایسا شفاف واقع بناتے ہیں جو انکشاف کرتا ہے کہ ہندوستان کو برطانیہ کی ضرورت ہے۔

سیتا (1872)

فلپ میڈوس ٹیلر (1876-1808) لیور پول میں پیدا ہوا، اور 1824 میں 15 برس کی عمر

میں ہندوستان کے لئے روانہ ہوا۔ وہ نظام حیدر آباد کے دربار کے ساتھ منسلک ہوا اور مختلف عہدوں پر کام کیا۔ اس نے فوجی ادارے میں ترجمان، اسسٹنٹ پولیس سپرنٹنڈنٹ، فوج میں مجسٹریٹ کے طور پر اور کولیکٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں (Taylor 1986)۔ سکنز اور لارنس کی طرح ٹیلر پرانے مکتبہ فکر کا آدمی تھا، جو مقابلے پر یقین رکھنے والوں اور انڈین سول سروس (ICS) کے آفیسروں کے برعکس ہندوستانی لوگوں کے ساتھ قریبی تعلق پیدا کرتے تھے اور کسی حد تک ان کا طرزِ حیات اختیار کر لیتے تھے۔ نظریاتی طور پر بھی وہ افادیت پسندی کی اصلاحی تحریک سے اتفاق کرتا تھا جو 1830 میں شروع ہوئی تھی۔ سیتا تین ایسے ناولوں میں تیسرا ہے۔ اس سے قبل تارا (Tara) اور رالف ڈیمل (Ralph Damell) شائع ہوئے تھے۔ پہلا ناول 1657 کے حالات پیش کرتا ہے جب مرہٹوں نے عروج حاصل کیا (جس نے کسی حد تک ہندوستان میں مغلوں کی حکومت کمزور کی)۔ دوسرا 1757 کے حالات میں جنگ پلاسی کی تصویر کشی کرتا ہے۔ سیتا 1857 کی جنگ آزادی کا تجزیہ کرتے ہوئے ہندوستان میں انگریزوں کی کامیابی کی کہانی مکمل کرتا ہے۔ سیتا جس کی پہلی اشاعت 1872 میں ہوئی اگرچہ بعداز بغاوت کا ناول ہے لیکن ایسے تناظر میں لکھا گیا جو کہ بڑی حد تک غیر مروج تھا بلکہ بعداز بغاوت کے حالات میں اس کی مذمت کی گئی تھی۔ بہت واضح طور پر ناول مختلف نسلی گروہوں کے درمیان شادی کو موضوع بناتا ہے۔ جو کہ اگرچہ انیسویں صدی کے ابتدائی عشروں تک قابل قبول تھی لیکن بغاوت کے بعد تو ایک قابل نفرت بات تھی۔ ناول کے پلاٹ میں شادی مرکزی نکتہ ہے جو کہ حسب ذیل ہے: نور پور میں تعینات نوجوان مجسٹریٹ، سیرل برانڈن، سیتا کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے، جب وہ اپنے خاوند کے قاتل عزرائیل کی شناخت کرنے کے لئے عدالت میں آتی ہے۔ روایت سے انحراف کرتے ہوئے سیرل اور سیتا شادی کر لیتے ہیں۔ شادی کے بعد جلد ہی سیرل کو اندازہ ہوتا ہے کہ اگرچہ ان کی شادی خوشگوار ہے اور سیتا سگھڑ خاتون ہے (ہندوستانی مورتی) لیکن وہ اس طرح کا ساتھی نہ بن پائے گی جس طرح کہ انگریز عورت بن سکتی تھی۔ وہ اپنے دوست کی سالی گریس موسٹن میں کشش محسوس کرنے لگتا ہے۔ سیتا بھی مشکلات محسوس کرتی ہے جیسا کہ برادری سے خارج کر دیا جانا، سیرل کی انگریزی تہذیب اور اس کے دوستوں سے بیگانگی، عیسائی مذہب اختیار کرنے کا دباؤ اور بالآخر یہ احساس کہ انگریزی قانون کے مطابق اس کی شادی جائز نہیں ٹھہرے

گی۔اس شادی سے پیدا ہونے والا بچہ سیرل کی وراثت میں حصہ دار نہ بن سکے گا۔گھریلو مشکلات کے بعد بغاوت کے واقعات بھی پریشانی میں اضافہ کرتے ہیں، اور ایک دن جب باغی عزرائیل پانڈے کی قیادت میں سیرل کے گھر حملہ کرتے ہیں تو سیتا اپنے خاوند کو بچاتے ہوئے ہلاک ہو جاتی ہے۔سیرل اور گریس واپس انگلینڈ جا کر شادی کر لیتے ہیں اور یوں سیرل کو اپنے والدین کی جائیداد وراثت میں مل جاتی ہے۔

ناول ہندوستان کی تصویر کشی میں تخیلاتی حسن پیدا کرتے ہوئے ہندوستان کو سلطنت کا داخلی حصہ قرار دیتے ہیں اور ہندوستانیوں اور برطانوی باشندوں میں ایک تفریق اجاگر کرتے ہیں۔جس کا مقصد مادر وطن پر ہندوستانیوں کا دعویٰ نامناسب خیال ثابت کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔

تصویری خاکہ ہندوستانیوں کے مقدس خیالات کے مدِ مقابل آ جاتا ہے کیونکہ ہندوستانی اپنی آزادی کی جدوجہد میں مقدس تصورات کو استعمال کرتے ہیں۔اٹھارہویں صدی کی ابتدا سے ہندوستانی لینڈ سکیپ میں تقدس کا عنصر برطانوی اور ہندوستانی مصوروں میں غالب جمالیاتی تصور تھا۔منظر کشی جس میں دیکھنے والا اپنی زمین کو اس طرح دیکھتا تھا جیسے منظر میں پیش کی جاتی تھی اور وہ اس سے فرحت محسوس کرتا تھا۔ان مناظر کو جریدوں میں تصویروں اور خاکوں کے ذریعے پیش کیا جاتا تھا۔لیکن عملاً یہ ہندوستان پر گرفت مضبوط کرنے کے لئے برطانوی دانشوروں کا اہم طریقہ تھا جو اٹھارہویں صدی کے آخر سے انیسویں صدی کے ابتدائی عشروں تک کارفرما رہا۔مقدس لینڈ سکیپ جمالیات، ایک مناسب اصطلاح ہے، جو اس دور میں ہندوستانیوں نے بھی اختیار کی کئی ایک اقسام پر مشتمل تھی (جیسا کہ مغل حکمران جو شرافت کے نمائندہ تھے) لیکن ہندوستان کے اس سماجی منظر نامے میں غیر حقیقی اور وراثتی ملکیت کا تصور پیش کیا جاتا رہا۔ناول میں لینڈ سکیپ کی خصوصیات کو کسی حد تک جمالیاتی طور پر اختیار کیا گیا۔لیکن مقدس لینڈ سکیپ جمالیات صرف تقدس میں تبدیل ہو جاتی ہے، جس میں مادرِ وطن کے لئے تصادم کا تصور نہیں کیا جاتا ہے۔یعنی مذہبی عبادات کی بنیاد پر بغاوت کا اصول (جس کے پیچھے محرک قوت مذہب کو بنایا گیا تھا) البتہ ناول دونوں جمالیاتی تصورات کو تاریخی اور نسلی وابستگی فراہم کرتا ہے۔لہٰذا یہ رویئے درست تصورات پیش کرنے، گفتگو کا ذریعہ بننے اور راہنمائی فراہم کرنے کی بجائے، تہذیبوں میں تفریق

کی نشاندہی کرنے کا کردار ادا کرتے ہیں۔ ایک جانب یہ منظر کشی جدید اور مہذب تصور اجاگر کرتی ہے جبکہ دوسرے مکتبہ فکر کو پسماندہ اور منجمد خیالات کا نمائندہ قرار دیتی ہے۔ ناول کے اختتامیہ پر فیصلہ کن موقف سامنے آجاتا ہے، جو مقدمے کی سماعت کا منظر ہے، جہاں منظر کشی کا تخیلاتی حسن اور تقدیس ایک دوسرے کے مدِ مقابل کھڑے کئے جاتے ہیں اور تقدیس کو شکست ہوتی ہے۔ البتہ بادشاہ کے مقدمہ کی طرح، یہ سلسلہ بھی صرف دیکھاوا تھا جس میں ایک فریق عدالت میں جانے سے قبل ہی اپنا مقدمہ ہار چکا تھا۔

ناول کے پہلے پیراگراف سے ہی مقدس تصور اور عمومی منظر نامے میں مخاصمت پیدا ہو جاتی ہے۔ ناول ایک منظر نامے سے آغاز لیتا ہے جس کا بیان کرتے ہوئے ناول ایسا رخ اختیار کرتا ہے جس میں بتایا جاتا ہے کہ ہندوستان تہہ در تہہ مختلف تہذیبوں کی تاریخ کی حامل سرزمین ہے جس میں قدیم یادداشتیں محفوظ پاتی ہیں:

''کوئی آدھی رات کا وقت تھا۔ گذرتے ہوئے بادلوں سے ہلکی بارش ہوگئی تھی، اور چاند جو تقریباً پورا روشن تھا، اپنی مدھر روشنی سے ایسے ایک منظر کو نمایاں کر رہا تھا جو انتہائی دلپذیر اور متاثر کن تھا۔ ایک طویل وادی جو وسطی ہندوستان کی سطح مرتفع سے مغرب کی طرف بڑھتی ہے، کے بالکل آغاز پر واحد ہموار جگہ تھی۔ اس کے ایک جانب جو الامکھی پہاڑیوں کی دیوار تھی اور ہموار جگہ پر، مختلف پہاڑی ندیوں کے ملاپ سے وجود پانے والی آبشار گرتی تھی۔ جو بارش کے موسم میں قدرے طاقتور ہو جاتی تھی تو اس سے گرتے ہوئے پانی سے ایک شور پیدا ہوتا تھا۔ جو مسلسل جاری رہتا تھا۔ پانی گرنے کے مقام پر ایک تالاب بن گیا تھا جس کے کنارے پر واقع قطعہ زمیں خوبصورت ہری بھری نرم گھاس کا قالین بچھا تھا۔ یہ چند میل طویل وادی پر واحد ہموار جگہ تھی۔ جہاں برس میں ایک بار پورے علاقے کے لوگ میلا سجاتے تھے۔ وہ تالاب میں نہاتے تھے اور اپنے دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے جن کی وجہ سے یہ مقام مقدس تھا۔ اس کے بعد عرصہ میں البتہ یہ جگہ ممنوعہ مقام کی حیثیت حاصل کر لیتی تھی اور لوگ اس جانب جانے سے گریز کرتے تھے۔

اس ہموار جگہ کے پیچھے کا ایک قد آور درخت کھڑا تھا اور یہ اپنی مخصوص نوعیت میں قابل ذکر منظر پیش کرتا تھا۔ مذکورہ بالا درخت اور منظر کی وضاحت میں اس کو نبیوں کا پیپل کہا جا سکتا ہے، یعنی ہندوؤں کے لئے پوجا کا دیوتا۔ لیکن اس کی تقدیس ماضی بعید تک چلی جاتی ہے جب اس کی

پوجا شروع ہوگئی تھی اور اس کے ساتھ ہی عام نوعیت کی سانپوں کی تشبیہات میں جو پیپل کے قدموں میں بل کھاتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔اس منظر سے لگتا ہے کہ قدیم قبیلوں نے یہاں عبادت کی تھی جو سانپ اور پرانے درختوں کی پوجا کرتے تھے۔سانپ کی شبیہہ کے ایک جانب پتھروں کا ایک ڈھیر پڑا تھا جن کو سرخ اور سیاہ رنگ دیا گیا تھا۔ یہ بہت قدیم دور کے موجودات تھے حتیٰ کہ سانپ کی پوجا کرنے والوں کے دور سے بھی قدیم۔

یہ مقام قدیم مذہبی جتھوں کے لئے بھی غیر موزوں نہیں رہا تھا۔ دو ہزار برس قبل شاید بدھ بھکشوؤں نے اس مقام کو اپنی عبادت کے لئے منتخب کیا تھا، جیسا کہ انہوں نے سینکڑوں دیگر مقامات کو پوجا کے لئے موزوں پایا تھا۔ کیونکہ یہ فطرت کا انتہائی خوبصورت مقام تھا اور یہاں کا ماحول بے حد پرسکون تھا۔ انہوں نے تھکا دینے والی تکلیف دہ محنت کے بعد پہاڑی کے اندر سے ایک عبادت گاہ تلاش کی تھی۔ یہ ایک چکور ہال تھا جس کی آخری دیوار میں کچھ جگہ کھود بدھا کی مورتی رکھی گئی تھی۔ جس میں مہاتما بیٹھے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ خوشگوار مہاتما، جس کے چہرے کے خطوط نہایت پرسکون کیفیت کو ظاہر کرتے تھے، ہمیشہ وادی کے حسن کا نظارہ کرتے تھے اور ندی میں چاند کی روشنی کو محبت سے دیکھتے رہتے تھے۔

دوسرا پیراگراف پہلے سے مختلف تناظر میں سامنے آتا ہے کیونکہ یہ ایک ماورائی مقام سے نیچے اترتے ہوئے منظر کی معروضی وضاحت پیش کرتا ہے۔ یہ داخلی حوالے سے کہانی لکھنے والے کی دلچسپی کا اظہار کرتا ہے (درخت کے نیچے کیا ہے اور اس کے پیچھے کیا ہے) اور اس میں یہ تفریق بھی سامنے آتی ہے جو ہندوستان کے بارے میں مقامی لوگوں اور کہانی کار کے ذہن میں پائی جاتی ہے۔

پہلا پیراگراف ایک خوبصورت ارضی منظر پیش کرتا ہے اور دوسرا اس احساس کو سامنے لاتا ہے کہ کس طرح مختلف مذہبی سرگرمیوں کے ذریعے اپنی زمین سے استفادہ کیا جاتا تھا، جس میں تاریخ کے مختلف مروج مذاہب کا حوالہ ملتا ہے (قبائلی، ہندو، بدھ کے پیروکار)۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خطے میں مذاہب کی جڑیں گہرائی تک پیوست ہیں، لیکن دیہاتی اپنے طریقہ عبادت کے ذریعے زمین کو جس طرح استعمال کرتے ہیں وہ جامد نوعیت کا نمائندہ ہے۔ یہ ایسی حقیقت ہے جو بدھا کی مورتی بیان کرتی ہے۔ وادی کے منظر میں دکھائی دینے والے تمام دیوتاؤں یعنی نبیوں کے

درخت، سانپوں اور بدھوں کی جماعت میں صرف بدھا کی مورتی ہے جو گہری نظر رکھتی ہے۔ بدھا اس منظر پر حاکمیت کا تاثر دیتا ہے، وہ وادی کے اندر اور آبشار کو مہربان نظر سے دیکھتا ہے اور منظر نامے میں آبشار کی تخلیق کرتا ہے (جیسا کہ مورتی کے خوشگوار تاثر اور چہرے پر سنجیدہ خدوخال کے ساتھ وہ خوبصورت وادی کے حسن کا نظارہ کرتی ہے اور ندی میں چمکتے پانی سے مسرت حاصل کرتی ہے)۔ بدھا کی مورتی جس گہری دلچسپی سے حالات کا نظارہ کرتی ہے، کہانی کا ابتدائی پیراگراف میں وہی منظر پیش کرتا ہے اور یہ اتفاق ایسا ہے جو درحقیقت لکھاری کے اندر کی کہانی سامنے لاتا ہے۔ بدھا یہاں دراصل ڈبلیو۔ جے۔ ٹی مشل (W.J.T. Mitchell) کے مطابق پہلا ذریعہ ہے، جو پس منظر میں بیٹھتا ہے، لکھاری (آرٹسٹ) کی رائے میں اور مقامی تاریخ کو سمجھنے میں ہماری راہنمائی کرتا ہے۔ مشل نے دلیل پیش کی ہے کہ کسی تہذیب کے دروازے پر وہ شخصیت براجمان ہوتی ہے جو کسی تہذیب کو سمجھنے میں بنیادی کردار کی حامل ہوتی ہے۔ کیونکہ حقائق کا متلاشی کسی تہذیب کو اسی نظر سے دیکھتا ہے جس سے دیوتا ہماری منتخب شخصیت۔

یہ لکھاری کے زاویہ نگاہ کی تصدیق کرتا ہے، جو حقیقت کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور خطے کے سیاسی استعمال کی درست نشاندہی کرتا ہے۔ لکھاری کا حالات کو سمجھنے کا انداز (اور بدھا کی نام نہاد نظر) اس کے سامنے علاقے کا ایسا منظر پیش کرتا ہے جو کہ مکمل طور پر مشکلات سے پاک اور غیر جانبدارانہ نوعیت کا حامل ہے۔ آبشار کے منظر کے علاوہ (جو بدھا کے سامنے ہے) اور طویل وادی کے منظر کے علاوہ (جو لکھاری کے سامنے ہے) دیگر تمام اشیاء اور قطعات دوجہتی نوعیت کے ہیں۔ نبیوں کا درخت جس کا سایہ ماورائی اشکال میں ظاہر ہوتا ہے، پتھر جن کو نظر انداز کر دیا جائے تو بیماری کی تکلیف دہ سزا کا موجب بن سکتے ہیں۔ اور وادی جو بذات خود میلے کے بعد برے اثرات کی حامل بن جاتی ہے۔ خطے کی زمین کا دوسرا استعمال جو دیہاتی مقامی دیوتاؤں کے ساتھ کرتے ہیں، وہ بھی زمین سے استفادہ کے عمل کو دوجہتی شکل عطا کرتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور سرگرمی باغیوں کی شکل میں دکھائی دیتی ہے۔ ہمارے لئے پہلے تعارف کے طور پر سامنے آتی ہے۔ 20 آدمی جو وحشی نظر آتے ہیں اور اس تاثر سے غیر انسانی غیر قانونی اور سخت گیر معمولات زندگی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ ایک غار میں آگ کے الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے ہیں اور جب شعلے بلند ہو کہ چھت تک پہنچتے تھے تو اردگرد بیٹھے لوگوں کے سخت چہرے نمایاں

ہو جاتے تھے، لیکن دیواروں پر پڑنے والے ان کے بڑے بڑے سائے نرم مزاج اور سنجیدہ خو ہونے کا اظہار کرتے تھے اور ان دونوں اشکال میں متضاد خوبی نظر آتی تھی۔ جیسا کہ بدھا کی مورتی لکھاری کے خیالات سے ہم آہنگ تھی، لیکن اب شبیہات ان لوگوں کی وجودی حقیقت کے متضاد کھڑی تھیں۔ یہ لوگ ڈاکو ہیں (جو بالآخر باغی بن جائیں گے) اور ان کی شبیہات بدھا کی سنجیدہ مورتی کے ساتھ ہم آہنگی ظاہر کرتی ہے۔ مگر ان کی داخلی کیفیت لینڈ سکیپ کے ساتھ تضاد کی کیفیت رکھتی ہے۔ ڈاکو باغی اس ابتدائی تصور سے مختلف ہیں جو بدھا کی مورتی سے نمودار ہوتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ وہ حالات کو لکھاری کی نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ وہ تو بالکل متضاد سمت میں کھڑے نظر آتے ہیں اور ہندوستان کا لینڈ سکیپ ان کو قبول نہیں کرتا (جس کے لئے وہ بعد میں جنگ لڑیں گے)۔ جب وہ سماجی بدن کا حصہ بنتے ہیں یعنی شاہ گنج گاؤں میں داخل ہوتے ہیں، جس پر ناول لکھا گیا ہے، تو ان کو بیماری کے جراثیموں کی طرح خطرہ ہی سمجھا جاتا ہے۔ جس سے نجات صرف اس طرح ملتی ہے کہ سیرل اور موسٹائن ان کو ہلاک کر دیتے ہیں۔ اس طرح آبادی دوبارہ سے پر امن ہو جاتی ہے اور سکون کا ماحول لوٹ آتا ہے۔

اگلی صبح گاؤں میں میلے کا سماں تھا۔ ارد گرد کے دیہاتوں سے لوگ پھولوں کے ہار لے کر آئے جو انہوں نے مندر کے دروازے پر لٹکائے اور مورتیوں کو پہنائے۔ شاہ گنج کی بچیوں نے اپنے خوبصورت لباس زیب تن کر کے رقص میں حصہ لیا۔ انہوں نے چوک میں دریاں بچھا کر رقص کیا اور سیرل کی تعریف میں گیت گائے۔ پھر خوشی کے نعروں کی گونج میں انگریزی پرچم دوبارہ لہرا دیا گیا اور انگریزی اہلکاروں کے گلے میں ہار ڈالے اور پھول ان کے قدموں پر نچھاور کئے گئے۔ سب نے یہ محسوس کیا کہ انگریز دوبارہ حکمران بن گئے تھے اور اب وہاں امن رہے گا۔ (PP.397-98)

1857-58 کے دوران خوشیوں کے ایسے منظر دیکھنے میں نہیں آئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ برطانوی سرکار نے جہاں بھی دوبارہ اتھارٹی قائم کی وہاں انفرادی سطح پر شہر اور گاؤں کے لوگوں کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی اور وہ خوف کے سائے میں اپنے گھروں کو واپس آئے۔ یہاں البتہ صرف مارکیٹ میں نہیں بلکہ پورے شاہ گنج میں میلہ ہے اور یہاں ایسی خوشیاں منائی جارہی ہیں جو پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئیں (Seeta 398)۔ یوں ایک قصباتی علاقے میں

امن کی بحالی یادداشتوں میں ایسی تبدیلی پیدا کرتی ہے۔ جس طرح کہ پورے خطے میں ردِ بغاوت کارروائیوں نے حالات کو تبدیل کیا۔

جس کا مقصد پرانے حکمرانوں اور نظام حکومت کے ساتھ وابستہ یادوں کو ذہنوں سے نکالنا تھا (Seeta 425)۔ ناول پرانی یادوں کو غیر واضح بناتا ہے اور اس مقصد کے لئے یہ بغاوت کو معاشرتی عمل کا حصہ تسلیم کرنے سے بالکل انکار کرتا ہے۔ باغی بیماری تھے اور بغاوت ایک برا سال تھا جس کو جیسے تیسے گزرنا تھا کیونکہ ان حالات میں اچھی امیدوں اور اعلیٰ خواہشات کی تکمیل کا کوئی امکان نہ تھا۔ بغاوت کے بارے میں قابل ذکر بات یہ تھی کہ یہ فطری طور پر مختلف علاقوں تک محدود تھی۔ ایک مشترکہ مقصد کی عدم موجودگی میں اور یونٹوں کی تنظیم کے بغیر یہ کیسے ممکن تھا، لوگوں کے بکھرے ہوئے گروہوں نے بغاوت شروع کی اور خاموش رہ کر اندازہ کرنے والوں نے اس سے امیدیں وابستہ کیں۔ جس طرح کانٹ فرانسیسی انقلاب پر بحث میں نشاندہی کرتا ہے کہ تاریخ کی انقلابی قوت سرگرم لوگوں میں نہیں بلکہ عوام کے ردِعمل میں ہوتی ہے۔ ٹیلر اس بات کی نفی کرتا ہے کہ بغاوت عوامی ردِعمل کی کوئی جہت رکھتی تھی، حتیٰ کہ یہ کسی اعتبار سے اہم سماجی رابطہ رکھتی تھی، بلکہ یہ گمراہ لوگوں کی ذاتی انتقامی کارروائی تھی۔ یہ موقف اس واقع کو ہندوستانیوں کی تاریخی قوت سے کاٹ کر علیحدہ کر دیتا ہے۔

نہ صرف یہ کہ بغاوت کے واقع میں خاموش ردِعمل کا پہلو تسلیم نہیں کیا گیا بلکہ ہندوستانی اس وصف سے محروم نظر آتے ہیں۔ ہم نے ابتدائی منظر میں دیکھا جس میں لکھاری اور بدھا کی غیر حاضر شخصیت ہی کسی نقطہ نظر کے حامل تھے باغیوں کا کوئی نقطہ نظر نہیں تھا۔ جانوروں کی طرح بھی نہیں جو کچھ نہ کچھ مسئلہ پیدا کر دیتے ہیں (جیسا کہ مثال کے طور پر ہم) ایسا رویہ نہ صرف ناپسندیدہ ہے بلکہ وہ ایسے ماتحت ہیں کہ جو کسی واقعے پر خاص نظر رکھنے کے قابل بھی نہیں ہیں۔ سیتا ایک مثالی ماتحت ہے۔ وہ اپنے طور پر سگھڑ اور مہذب ہے، لیکن وہ بھی حالات کے بارے میں خاص نقطہ نظر اپنانے کی اہل نہیں ہے اور بالآخر اس حقیقت کو سامنے لاتی ہے کہ ہندوستانی نہیں بلکہ برطانوی ہیں جو مالک ہونے کے دعویدار ہیں۔ ناول کے اختتامیہ پر مقدمہ کی سماعت کے منظر میں ایک واقعہ عمومی خریداری اور حقیقی ملکیت کے دعوے میں پائے جانے والے تعلق کی نمائندگی کرتا ہے۔ سیتا، سیرل اور گریس سب پہاڑی پر واقع ایک مندر، جس کے پاس سے دریا گذرتا ہے، میں

اکٹھے ہوتے ہیں۔ سیتا پوجا میں مشغول ہو جاتی ہے اور سیرل اور گریس اس منظر کی تصویر بناتے ہوئے سیتا کے اس رویئے کی تعریف کرتے ہیں۔ یہ صرف ثانی الذکر دو افراد ہیں جو خطہ ارض کو مناسب طور پر سمجھنے کے قابل ہیں۔ سیتا بذات خود ایک دوسرے عمل میں مگن ہے اور جب وہ پوجا سے فارغ ہوتی ہے، وہ گریس کی تصویر کا حصہ بن چکی ہوتی ہے، جس کو سیرل مکمل کرتا ہے۔

ایک منظر نارتھ اینگر چرچ کے بارے میں ہے جو ہلکے انداز میں ایسا ہی تاثر پیدا کرتا ہے۔ اس میں ہینری ٹلنے اور کیتھرائن مور لینڈ سمندر کنارے پہاڑی چوٹی پر بیٹھے شہر مقدس کو دیکھ رہے ہیں اور ہینری کیتھرائن کو لینڈ سکیپ میں پائے جانے والے سبق کو سمجھنے پر لیکچر دے رہا ہے (Austen 86-88)۔ اگرچہ آسٹین مذکورہ بالا منظر میں لینڈ سکیپ سمجھنے کے بارے میں مضحکہ خیز انداز کرتا ہے، لیکن منظر جو تاثر قائم کرتا ہے یہی ہے کہ دونوں میں شادی کا رشتہ کس نوعیت کا ہوگا، جو فکری سطح پر بالکل برابر نہیں ہیں۔ لیکن ایک جو بہت خواہش مند ہے سیکھنے کی صلاحیت کا حامل ضرور ہے اور اس کو تعلیم دے کر مناسب ساتھی کی سطح پر لایا جا سکتا ہے۔ سیتا میں پہاڑی پر پیش کیے گئے منظر میں لینڈ سکیپ ایک معقول جوڑے اور مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والے افراد کی شادی سے پیدا ہونے والے مسائل کی نشاندہی بھی کرتی ہے۔ یہ سیرل اور گریس کو ملاتا ہے، چونکہ وہ مشاہدہ اور تجزیہ کی خوشگوار اہلیت کے حامل ہیں اور نشاندہی کرتا ہے کہ وہ معقول جوڑا قرار پاتے ہیں۔ یہ سیتا کو غیر معقول ثابت کر کے علیحدہ کرتا ہے کیونکہ رائے اپنائی جاتی ہے کہ وہ اس قابل نہیں ہے کہ اس کو تعلیم سے مہذب بنایا جا سکے (تمام ناول ایسی مسلسل کوششوں کا تاثر پیش کرتا ہے جو سیرل کی جانب سے اس کو انگریزی بیوی بنانے کے لئے کی جاتی رہیں)۔ یہ صرف جنسی فرحت نہیں ہے اور تعلقات میں برابری کا رویہ جس کی لینڈ سکیپ نشاندہی کرتی ہے لیکن شہریت کی نوعیت بھی ہے اور یہ تینوں اہم خوبیاں ہیں جو سیرل اور گریس میں موجود ہیں اس لئے وہ لینڈ سکیپ میں پائے جانے والے تاثر کو پہچان سکتے ہیں اور ملک کے بارے میں ان کا موقف سیتا سے بہت مختلف ہے۔ وہ اپنے طور پر حالات کا گہرائی سے مشاہدہ کرنے کی اہلیت سے محروم ہے اور ٹیلر کی منطق کے مطابق وہ جدید تہذیب کے معیار سے آگاہ نہیں ہے۔ یہاں اس سے مراد علاقے کے بارے میں ذہنی بصارت ہے جو کہ جدید شہری ہونے کے واسطے پہلی شرط ہے۔ پراپرٹی کی حقیقی ملکیت اور مالکانہ مزاج میں رائے کی تبدیلی جو لینڈ سکیپ کو دیکھنے کے لئے

19ویں صدی کے آغاز تک انگلینڈ میں رونما ہوئی تھی، جس کی نشاندہی ہیلسنگر نے کی ہے(Helsinger 103-25)،اس کی رو سے دیکھیں تو اگرچہ سیتا معقول جائیداد کی مالک ہے لیکن اس میں مالکانہ احساس کی ناپیدگی ہے (جس طرح کہ لینڈ سکیپ کا آئیڈیا اجاگر کرتا ہے) لہٰذا وہ ایسے شہری رویوں کا اظہار کرنے میں ناکام رہتی ہے جو سلطنت کے شہری جوڑے میں پائے جاتے ہیں۔اس کی عبادت اور ذات لینڈ سکیپ اور خاکے کا موضوع بن سکتی ہے لیکن ابتدائی پیراگراف میں بتوں کی طرح وہ محض وطن میں آباد ہونے تک محدود ہے، ملک اور لینڈ میں مالکانہ حقوق کا مظاہرہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔

ٹیلر لینڈ سکیپ کو استعمال کرتے ہوئے زمین کو پسندیدہ بنانے کی کوشش کرتا ہے اور وہ اس حوالے سے ہندوستانی باشندوں کی عدم دلچسپی اور غیر فعالیت کو اجاگر کرتا ہے۔ وہ ہندوستانیوں کو ارضی وسائل سے استفادہ کرنے کی صلاحیت سے محروم قرار دیتا ہے اور سماجی ہیئت کو جنسی شناخت عطا کرتا ہے اور اس کی اندرونی ساخت میں تبدیلی کی تحریک کو خارج از امکان قرار دیتا ہے۔ بالآخر پہاڑی پر منظر ہے جس میں لینڈ سکیپ کا جدید تصور اور مقدس تصور مدِ مقابل آجاتے ہیں۔ ایک لمحہ ایسا آجاتا ہے جس میں حقیقی تفریق واضح ہو جاتی ہے۔ یوں کہ تخلیقی جمالیات اور مقدس جمالیات واضح حیثیت میں تاریخی حقائق کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں اور وہ سماج جو مقدس جمالیات سے وابستہ ہے اس کا انجام طے ہو جاتا ہے۔ لینڈ سکیپ کو جدید احساس کے مترادف قرار دیتے ہوئے شہریت کے قابل سمجھتے ہوئے، ٹیلر لبرل اصلاح پسند جے ایس مل کے نظریئے کو حوالہ بناتا ہے۔ جو سیاسی اخلاقیات کو جدیدیت کے اداروں کے ماتحت سمجھتا ہے اور شہریت کی اہلیت کو جدیدیت کے احساس کے ساتھ منسلک کرتا ہے۔ لیکن وہ بیان کرتا ہے کہ اس اہلیت کو سبق کی طرح پڑھانے سے موثر نہیں کیا جاسکتا (لہٰذا ہندوستان وہاں واقع ہے جہاں تربیت کے ذریعے تہذیب اور جدیدیت کو فروغ دینے والی سڑک کا خاتمہ ہوتا ہے) اور اس کی نظر میں عمیق مشاہدہ کرنے کی اہلیت کی کمی ہندوستانیوں کی جبلت کا حصہ ہے۔

دوسرے ناول میں لینڈ سکیپ کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہوا ہے اور اس میں بیان کیا گیا تاثر بھی سیتا سے مختلف نوعیت کا ہے۔ خطہ ارضی کو پسندیدہ بنا کر پیش کرتے ہوئے ذہن میں نمودار ہونے والے خیال کو ملک کے ساتھ جوڑنے کی بجائے لینڈ سکیپ (جب ہندوستانی زمین اور

عمارتوں کو پیش کرتا ہے) اخلاقی اور شعوری پسماندگی کو اجاگر کرتا ہے۔ سٹیل معمولی نوعیت کی مذہبی، اخلاقی جمالیاتی فہم پر کام کرتا ہے۔ جس میں آرٹ اور آرکیٹکچر نہ صرف تہذیب کی مختلف پرتوں کو سامنے لاتے ہیں بلکہ اخلاقی اور فکری صلاحیتوں کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ہندوستانی سرزمین اور دوسری اشیاء کے مطالعے میں نسلی تقسیم کی حقیقت سے آگاہ ہوتی ہے۔ یہ مطالعہ جو اس کو نتیجہ اخذ کرنے پر مائل کرتا ہے کہ ہندوستان کو ایک طاقتور نوآبادیاتی آقا کی ضرورت ہے۔ لبرل اور اصلاحی طریقہ کار جو سیتا میں دکھائی دیتا ہے (اگرچہ وہ مصنوعی ہے) وہ ایک آمرانہ کالونیل سسٹم میں تبدیل ہو جاتا ہے جو کہ ''نقش برآب'' میں پیش کیا گیا ہے۔

نقش برآب (On the Face of Waters-1896)

نقش برآب جس کی پہلی اشاعت 1896 میں ہوئی فلورا اینا سٹیل نے تحریر کیا تھا (1847-1929) ٹیلر کی طرح سٹیل نے بھی ہندوستان میں طویل عرصہ قیام کیا تھا (22 برس) اور اس ملک کے ساتھ گہرا تعلق محسوس کیا۔ سٹیل پیدائشی طور پر سکاٹ تھی اور وہ ایک برطانوی آفیسر، ہینری سٹیل کی بیوی ہونے کے ناطے 1867 میں ہندوستان آئی اور 1887 تک یہاں قیام پذیر رہی۔ ہینری ہندوستان میں ICS آفیسر تھا۔ وہ اپنے ناول پر تحقیق کی غرض سے 1894 میں واپس انگلینڈ چلی گئی۔ اس نے یہاں سرکاری دستاویزات کے ریکارڈ کی چھان بین کی اور اپنی ہیروئن کیٹ ارلٹن کی طرح ایک گھر کی چھت پر قیام کیا تاکہ وہ محسوس کر سکے اس طرح رہنا کیسا لگتا ہے (Steel 1930:15)۔ ٹیلر کی طرح سٹیل بھی سامراج کی پکی حامی تھی اور حقیقی طور پر نسل پرستی کی بھی حامی تھی جو کہ ٹیلر میں نہیں تھی۔ سٹیل نے ہندوستان کے بارے میں کئی ناول لکھے، افسانے تحریر کیے اور اس کے علاوہ اس نے ہندوستانی لوک داستانوں کا مجموعہ بھی شائع کیا۔ البتہ اس کی شہرت بغاوت پر ناول اور اینگلوانڈین گھریلو بیویوں کے لئے لکھے گئے ایک کتابچہ سے ہوئی جو ''مکمل گھریلو ملازمہ اور باورچی'' (Complete House Keeper and Cook) کے عنوان میں شائع ہوا (1888)۔ جو 19 ویں اور 20 صدیوں میں نوجوان ''میم صاحب'' کے لئے بائبل کی حیثیت رکھتا تھا۔ (Sen:33)

ہندوستان میں برطانوی سامراج کے عروج کے زمانے میں نقش برآب کو تنقیدی تحسین

میسر آتی، جب اس کی پہلی اشاعت سامنے آئی۔ یہ ناول بہت مقبول ہوا اور اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ کچھ ادیبوں نے سٹیل کو معروف ادیب کپلنگ (Kipling) کے ہم پلہ قرار دیا اور اس ناول کو بغاوت پر پہلی سنجیدہ ادبی تخلیق قرار دیتے ہوئے خوش آمدید کہا (Patwardhan:41)۔ ناول کی کہانی کیٹ ارلٹن (Kate Erlton) کے گرد گھومتی ہے، جس کی میجر ارلٹن کے ساتھ شادی ناخوشگوار ہے جو مسز ایلس گسنگ کے عشق میں مبتلا ہے۔ ہیرو، جم ڈگلس (ایلس جیمس گرے مین) کیٹ کی زندگی میں داخل ہوتا ہے جب وہ اپنے شوہر کی عادتیں درست کرنے کے لئے کارروائی کی خاطر اس کو رشوت پیش کرتی ہے، بغاوت کی وجہ سے ان کی زندگی ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ قریبی تعلقات میں تبدیل ہو جاتی ہے کیونکہ غدر کے باعث کیٹ کو ڈگلس کے ساتھ فرار ہونا پڑا۔ کچھ دیر کے لئے وہ بھیس بدل کر سفر کرتے ہیں، دہلی میں چھپ کر رہتے ہیں اور بالآخر جب ستمبر 1857 میں برطانوی فوج نے دہلی فتح کر لی تو ان کی زندگی محفوظ ہو جاتی ہے۔ ناول کے ذیلی پلاٹ میں ہندوستانی کہانی بھی موجود ہے۔ جو بیوہ شہزادی فرخندہ زمانی، جو دہلی کی مفتی سٹریٹ میں رہائش پذیر ہے اور شہزادہ ابوبکر جو بادشاہ (بہادر شاہ ظفر) کے چھوٹے بیٹے کے درمیان روحانی قسم کے عشق پر ہے۔ دونوں کہانیاں ایک دوسری کو چھو کر گزرتی ہیں جب فرخندہ کیٹ کو پناہ دیتی ہے۔ لیکن اختتام بڑے مختلف انداز میں ہوتا ہے۔ ناول کے اختتام پر کیٹ اور جم کا ملاپ ہو جاتا ہے (کیونکہ میجر رالٹن جنگ میں ہلاک ہو جاتا ہے)، جب ابوبکر کے ہتھیار ڈال دینے پر میجر ہڈسن اس کو دھوکے سے قتل کر دیتا ہے (آخری دونوں کردار تاریخی اعتبار سے حقیقی ہیں اور اس واقع میں بھی حقیقی ہے)۔ اور فرخندہ باقی زندگی غربت میں دہلی میں گذارتی ہے۔ وہ اپنا گذارا معمولی تنخواہ پر کرتی ہے جو اس کو تدریس کے بدلے ایک سکول سے ملتی ہے۔ پس ایک خاکہ بہادر شاہ کے محل کی زندگی کے بارے میں بھی ملتا ہے جو بادشاہ اور اس کی بیوی زینت محل کے حالات بیان کرتا ہے (یہ دونوں کردار بھی حقیقی ہیں) جب تک فتح نہیں کیا گیا دہلی بغاوت کا مرکز تھا اور بادشاہ اور اس کی بیگمات (شہزادے قتل کر دیئے گئے تھے) کو ملک بدر کر کے برما بھیج دیا گیا تھا۔

سٹیل لینڈ سکیپ بہت کم استعمال کرتی ہے اور ان میں دہلی کے محلات اور عمارتیں منتخب کرتی ہے، لیکن حسن کو رسکن (Ruskin) کے انداز میں پیش کرتی ہے۔ جس میں وہ نشاندہی کرتی

ہے کہ اگرچہ یہ عمارتیں اپنی تہذیب کا حسن پیش کرتی ہیں مگر یہ فطرت کی ناپسندیدہ چیزیں ہیں۔اور اس طرح وہ ان کے ہندوستانی تخلیق کاروں کی شعوری گہرائی اور اخلاقی بنیاد کی تباہی پر بات کرتی ہے (Ruskin:10)۔رسکن کے طریقہ کار میں ہندوستانی جمالیاتی تخلیقات کی تکمیل ہندوستان میں آنے والی ہر تبدیلی کی تفہیم سے ہوتی ہے یہاں رسکن کی تخلیق میں (ہیت، جو تعبیری اور نقلی ہے، جو اپنی تکمیل میں بھرپور ہونے کے ناطے اپنی ہیت کو بطور ماڈل کے استعمال میں لاتی ہے) وہ نئی صورت میں تبدیل ہوتی ہے جو کہ ہیت اور خیال پر مشتمل ہے۔یہ ایسی اصطلاحیں ہیں جو اخلاقی اور غیر اخلاقی کی تفریق کرتی ہیں۔سٹیل ایسے اہم ہندوستانی مناظر کو اجاگر کرتی ہے جو مغرب کی نظر میں خوشگوار نہیں بلکہ ظلم کی نشاندہی کرتے ہیں۔ایسا ظلم جو ان میں دو عناصر کی کمی کی وجہ سے سامنے آتا ہے۔یعنی اخلاقیات اور ہیت۔ان دونوں کو بنیاد بنا کر سٹیل دلیل پیش کرتی ہے اخلاقی معیار اور سماجی زندگی کو سنوارنے کے لئے یہاں انگریزوں کی ضرورت ہے۔دونوں کی کمی نہایت واضح طور پر درج ذیل بیان میں سامنے لائی گئی ہے جو ایک گاؤں کے بارے میں ہے۔

''سردی کی بارشیں آئیں اور برس گئیں اور پیچھے سونے جیسی قیمتی چیز چھوڑ گئیں۔مستقبل کا یقین سونا یعنی گندم کے سبز کھیت اور سونے جیسی حاضر دولت، زرد پھولوں سے بھرے سرسوں کے کھیت جن میں پھول پودوں پر جھکے ہوئے ہیں جس طرح کہ تیز ہوا میں شمالی سمندر کی لہروں کی بلندیاں۔دور اور نزدیک چاروں اطراف جہاں تک نظر دیکھتی ہے اس دولت کو سنبھالنے کا کوئی انتظام نہیں، جس میں لہراتی سبز گندم اور زرد پھولوں سے لدی سرسوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔لیکن اس کے مرکز میں جب بھی دیکھا، انسانی چیونٹیوں کی بنائی ہوئی مٹی کی ٹیلا نما بستی دیکھی جاسکتی تھی۔کیونکہ تنگ گلیوں والے مٹی کے گھروں کی آبادی جس میں مکان کی دیواریں اور چھتیں مٹی سے بنی ہوتی ہیں۔یہ ایک گاؤں ہے۔

تھوڑے فاصلے سے دیکھیں تو یہ گاؤں چیونٹیوں کے بھٹ سے زیادہ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ وسیع تناظر میں یوں لگتا ہے کہ مٹی کو پلاسٹک میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔تعمیر کرنے والوں نے پانی میں مٹی گوندھ کر اس کو سورج کی دھوپ میں خشک کر لیا اور یوں یہ تین عناصر ملا کر مشقت کرنے والی آبادی کو رہائش فراہم کر دی گئی۔

یہ وہ منظر ہے جو مہذب دنیا میں اکثریت کی نظر میں مایوس کن ہے۔جس میں ہندوستانی

گاؤں دوسرے علاقوں سے منقطع بستی ہے جو تاریخ کے پسماندہ دور کی نمائندہ ہے۔اس کمیونٹی کی تنہائی خودمختاری، خود کفالت اور قدامت پسندی ایسی نوعیت کی ہے کہ اس کو اپنی حدود سے باہر دنیا سے کوئی دلچسپی اور تعلق نہیں ہے۔

اس منظر میں تعمیر کو ایسی شکل فراہم کرنے کی قوت انسانی دماغ سے بڑھ کر پانی ہے۔ یہ پانی ہی کا وصف ہے جس نے تعمیر کی یہ شکل تخلیق کرنے میں مدد کی ہے اور یوں رہائش نے ایسی صورت اختیار کی ہے۔اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ یہ منظر مغرب کی نظر میں استبدادی ہے۔ کیونکہ فطری عنایت پانی کے علاوہ، اس مٹی کے وسائل کو متحرک کر کے نئی شکل دینے میں، انسان کی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کا کوئی اصولی عمل دخل نظر نہیں آتا۔ درحقیقت ہندوستانی باشندے جب نئی شکل میں کچھ تخلیق کرتے ہیں تو وہ چیونٹیوں کے بھٹ سے زیادہ کچھ تعمیر نہیں کر پاتے اور اس حوالے سے ان کا کردار مکمل طور پر فطری قسم کی محنت ہے جو کہ چار عناصر یعنی پانی، مٹی اور دھوپ میں چوتھا عنصر ہے۔ان حالات کے پیش نظر مہذب مغربی ذہن میں ردِعمل کے طور پر جو موقف تشکیل پاتا ہے حقیقی طور پر اس نتیجہ کو تقویت دیتا ہے کہ مدِ مقابل نکتہ نظر دراصل کوئی نیا موقف نہیں ہے بلکہ یہ ایک نکتہ نظر کی عدم موجودگی کا اظہار ہے، جو یہ بیان کرتا ہے کہ دیہاتی بیرونی دنیا سے کوئی دلچسپی رکھتے ہیں اور نہ ہی اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

بغاوت اس منجمد اور استبدادی تصویر میں تحریک پیدا کرتی ہے اور سماجی ہیت میں تبدیلی کا باعث قوت ثابت ہوتی ہے۔ جب ڈگلس ایک جاسوس کی رپورٹ سنتا ہے کہ مولوی، ایک باغی، مطلوب ہے کیونکہ وہ اعلان کرنے والا ہے کہ بغاوت شروع کی جائے۔

جم ڈگلس نے زبردست قسم کا تحرک محسوس کیا۔اس نے کبھی ایسا سوچا بھی نہ تھا۔ کسی ایک کو بیشک اعلان کرنا چاہیئے، ایک تقریر جس میں تقریر سے زیادہ کچھ کہا جائے۔ یہ کہا ہوتا؟ ایسا کچھ جو روح کو تڑپا دے، بیشک، کیونکہ انسانیت کا یہ نظریہ رہا ہے کہ فرشتے کو پانی میں ہلچل پیدا کرنی چاہیئے اور اس طرح برائی کو کچلنے کے لئے نیچے اترنے کا جواز پیدا کرنا چاہیئے۔(P-162)

بغاوت جس رنگ میں یہاں بیان کی گئی ہے سادہ نوعیت کا اندھا اور حیوانی انتقام نہیں تھا بلکہ اعلان کے ساتھ وابستہ عمل تھا۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس واقع کے پیچھے نہ صرف ایک معقول تنظیم موجود تھی بلکہ ایسی سرگرم ایجنسی تھی جس کو خدا کی روحانی مدد اور راہنمائی میسر تھی جو سماج اور

تاریخ کو متحرک کرسکتی تھی۔ ثانی الذکر بائبل کے حوالے سے، تبدیلی کے عمل کے دوران نمودار ہوتی ہے۔ کتاب پیدائش کے مطابق ''جہاں آواز اور خدا کی روح سمندر کی سطح پر سفر کرتی ہے'' (Gen1.2) اور بے آب و گیاہ زمین پر مختلف اشیاء کی تخلیق کرتی ہے، اور جہاں پیغمبر علیشاہ پاؤں کی ٹھوکر مار کر پانی کو دولخت کرتا ہے اور پھر اس کو دوبارہ ملانے کے لئے اس میں نمک پھینکتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں ''اب زمین پر کوئی موت واقع نہیں ہوگی اور زمین بے آباد نہیں ہوگی'' (2 Kings 2.21)۔

تاریخی طور پر بھی بغاوت کو روحانی واقع کی صورت میں لیا گیا تھا۔ اس کے پیچھے روحانی پیش گوئی کا جواز تھا جس کے مطابق 100 برس بعد ہندوستان سے انگریزی اقتدار کے خاتمے کی نوید سنائی گئی تھی یعنی جنگ پلاسی کے 100 برس بعد (Kaye 356-57) لہٰذا مولوی کی جانب سے کئے جانے والے اعلان کے مطابق مذکورہ بالا کلیہ کی رو سے اس کی پیروی کی جاسکتی تھی کیونکہ اگرچہ یہ انسانی سرگرمی تھی مگر اس کو خدا کی تائید حاصل تھی۔ یہ کلیہ سیکولر معاشرے میں استعمال ہوسکتا تھا، جہاں اعلان میں تاریخ سازی کا امکان ہوسکتا تھا۔ مغربی تاریخ دانی کے اعتبار سے پختہ عزم کے ساتھ اٹھایا جانے والا ایسا اقدام جو کسی چیز کو یقینی طور پر حرکت میں لاسکتا ہے۔ اعلان تاریخ اور حقیقت کو واضح طور پر سامنے لاتا ہے اور اس میں مخفی اور غیر واضح انداز میں اچھے مستقبل کا وعدہ موجود ہوتا ہے۔ یہ ایسے مستقبل کی امید دلاتا ہے جس کا تصور ممکن نہیں ہوتا جیسا کہ درج ذیل کلیہ میں دستووسکی نے بیان کیا ہے۔ حقیقت اپنی اصل میں صرف اتنی ہی نہیں ہے جو کہ آپ نے فوری طور پر حاصل کرلیا ہے۔ کیونکہ حقیقت کا زیادہ بڑا حصہ مخفی شکل میں وجود رکھتا ہے جو کہ غیر واضح مستقبل میں پایا جاتا ہے (Morris 100)۔

البتہ ان میں ایسا کوئی وعدہ نہیں جو باغی کرتا ہے۔ یہ ہندوستانی جاسوس نہیں بلکہ جم ہے جو تاریخ بنانے کے عمل میں اعلان کی اہمیت دیکھتا ہے اور اس میں ایک جوش محسوس کرتا ہے۔ یہ اس کی اپنی تفہیم ہے۔ ہندوستانی مزاج میں اس لفظ کی فہم عمومی ہے جس کی کوئی مضبوط بنیاد نہیں اور یہ نعرہ روح کو گرما دیتا ہے مگر جذبات کو عارضی طور پر مشتعل کرنے کے کام آتا ہے۔ جبکہ باغی روحانی نعرے کی بنیاد پر اچھی لڑائی لڑ سکتے تھے، روحانی پیش گوئی کا لفظ صرف ایک نعرہ ہے لیکن یہی بنیاد ہے۔ بالآخر وہ اتنی صلاحیت نہیں رکھتے کہ روحانی پیش گوئی کے نعرے کو ذہانت کے ساتھ استعمال

کر سکتے جو جم کی طرح ان کو تاریخ میں اس نعرہ کی اہمیت سے آگاہ کر سکتا تھا۔ اگر چہ اس نعرے نے بغاوت کی قوت میں اضافہ کیا لیکن عملی جدوجہد میں اس نعرہ کی اہمیت صرف ایک لفظ سے زیادہ نہیں تھی، لہٰذا یہ نعرہ ایسا نہیں تھا کہ حال کو سامنے لاتے ہوئے مستقبل کا خواب دکھاتا بلکہ یہ صرف ایک عمومی نوعیت کی روایتی بات تھی۔ اس کی بجائے یہ ایسی ہلچل تھی جو زحمت کے فرشتے نے پیدا کر دی تھی اور فرشتہ شاہی خاندان کی پکار پر نیچے اترا تھا۔ جدوجہد میں اس نعرے کی یہی تفہیم تھی۔ جدوجہد کی تحریک ایک تاریخی عمل کو سرگرم کرتی ہے (بغاوت) جو برطانوی سرکار کی مداخلت کی ضرورت پیدا کرتی ہے اور برطانوی یہ فریضہ دیوتا کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے بطور معمار کے ادا کرتے ہیں۔ یہ نعرہ البتہ اگر چہ حال کی حقیقت بیان کرتا ہے مگر بغاوت کو کچل دیتا ہے کیونکہ اس میں مستقبل کا لائحہ عمل اور منصوبہ موجود ہے۔ حال کا واضح تجزیہ، لہٰذا دستووسکی کے حوالے سے اہمیت رکھتا ہے، جو دونوں صورتوں یعنی عملی جدوجہد اور ناول کی بیان کردہ کہانی میں حقیقت کا درجہ رکھتا ہے، نقش برآب میں لڑائیوں کے تسلسل کو بیان کرتا ہے۔ البتہ جدوجہد کے عمل میں مخفی قوت کا تحرک نقلی نوعیت اختیار کرتا ہے اور داخلی اعتبار سے کالونیل ازم کا روحانی تحرک تخلیق کرتا ہے۔

چیونٹیوں کے بھٹ کا استبدادی منظر سامنے لانے کی بجائے بغاوت اپنی فکری پسماندگی کو یوں تقویت دیتی ہے کہ اس میں موقف اختیار کیا جاتا ہے کہ ہندوستانی روایت میں جدوجہد کو تاریخ کے ساتھ منسلک نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا احساس ہیت کو تبدیل کرنے کی اہلیت سے محروم ہے۔ بغاوت کو کسی نظریہ کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے تو وہ فرشتہ ہے، جس کے بارے میں سٹیل نے بتایا کہ وہ بادشاہ یا دنیا کے خالق خدا کا نمائندہ ہے۔ جس کا واحد مقصد پانی میں ایک عارضی تحرک پیدا کر کے زمین کو دشمنوں سے پاک کرتا ہے۔ البتہ بغاوت استبدادیت کو ایک دوسری طرح سے ضرب لگاتی ہے۔ مغرب کی نظر میں یہ خطہ وسائل اور پیداواری ذرائع سے محروم نہیں البتہ اس کی ترقی کے لئے مغربی شعور کی ضرورت ہے۔ بغاوت کا پہلا اہم اقدام، دہلی سے برطانوی حکومت کا خاتمہ اور شہر پر قبضہ کے بعد باغیوں کا بہادر شاہ ظفر کی بادشاہت کو بحال کرنے کا اعلان، اس حقیقت کو واضح کر دیتا ہے۔

''اور پرندے ایک گرتے ہوئے سائے کو دیکھ کر، خوف کے عالم میں گھونسلوں سے باہر نکل آئے (ایک شرابی سیاہی) انہوں نے پھڑ پھڑائے پروں کے ساتھ درخت کی آخری شاخوں کے

اوپر اس کے گذر جانے کا انتظار کیا یا اونچی شاخوں میں وقت گزرنے کے لئے دبک کر بیٹھ گئے اور انہوں نے ڈوبتے سورج کو دیکھ کر قطع و برید ہ آواز میں شب بخیر کا گیت گایا، کیونکہ سورج دہلی کی شمالی دیوار کے اوپر گرد کی تہہ کو سرخ روشنی کی آخری کرنیں فراہم کرنے کی غرض سے غروب کی جانب تیز رفتار سفر سے گریزاں تھا۔ یہ خاموش احتجاج تھا جو بغاوت کے خلاف قدرت کی جانب سے ہوا اور اس کے بعد شہر کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ باغی سب کچھ کرنے میں آزاد تھے جو وہ پسند کرتے تھے (P-235)۔

بالآخر یہ زمین مہذب دنیا کی خواہش اور محبت کو قبول کرتی ہے اور ایسی علامت بنتی ہے جو خود اس حقیقت کا اشارہ بنتی ہے کہ اس کو مغربی شعور کی ضرورت ہے۔ وہی سورج تھا جس نے باغیوں کے گھوڑوں کے سموں سے اڑائی ہوئی دھول میں سرخ رنگ کا گولا بننے کو ناپسند کیا اور یہ ایک طرح دہلی کو خالی چھوڑ جانے والے برطانوی آقاؤں کے رویئے پر احتجاج تھا۔ پرندے، سورج اور تمام دیگر امور بددلی سے اپنے فرائض سرانجام دینے لگتے ہیں اور آقا کے قدموں کی آواز سننے کا انتظار کرتے ہیں اور جب برطانوی شہر کو فتح کرتے ہیں تو اس کو یوں بیان کیا جاتا ہے کہ آقا کی واپسی کو خوش آمدید کہا جاتا ہے اور شہر کے باشندے، جنہوں نے گھروں کی دیواروں سے تجسس کے ساتھ جھانک کر باہر دیکھا، ان کو فوری اندازہ ہو گیا کہ باغیوں کے مورچوں میں آگ اور دھویں کے بادل ان کی شکست کا اعلان کر رہے تھے۔ بلاشک وہاں کوئی تماشائی نہیں تھے جب برطانوی شہر میں داخل ہوئے۔ درحقیقت ان کو گلی گلی میں لڑائی لڑ کر شہر کو فتح کرنا پڑا، کیونکہ سپاہیوں اور عوام نے گلی گلی جنگ لڑ کر سخت مزاحمت کی تھی۔ جیسا کہ مفتی سٹریٹ میں زبردست لڑائی ہوئی جوان کے لئے مضبوط مورچے کی حیثیت رکھتی تھی۔ ٹیلر کی طرح یہاں سٹیل بھی ان تکلیف دہ مشاہدات کو بیان نہیں کرتی جو بغاوت کے باعث ہندوستانیوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کو سامنے لاتے ہیں۔ لیکن یہ خیال کہ ہندوستانیوں نے برطانوی حکومت کی بحالی کو خوش آمدید کہا ایک نئی صورت حال کو سامنے لاتا ہے۔ کیونکہ اس طرح ہندوستانی نہ صرف یہ کہ اپنے لئے بہتر کا انتخاب کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں بلکہ وہ سخت مزاج اور پدرانہ شفقت کی نمائندہ حکومت کو قبول کرتے ہیں۔

ہندوستان کے خطے اور لوگوں کے بارے میں برطانوی نکتہ نظر میں تبدیلی کے نتیجہ میں بالآخر

مقامی لوگوں اور برطانوی حکمرانوں میں آقا اور غلام کا جدلی تعلق قائم ہوا۔ یہ تعلق ایک جسم کی علامتی صورت میں یوں ہے کہ اس میں برطانیہ کی حیثیت روح اور ہندوستانیوں کی حیثیت جسم کے مترادف تھی اور نہ صرف یہ کہ دونوں میں ایسا تعلق پیدا ہوتا ہے جو روحانی طور پر ضروری تھا بلکہ اس تعلق کو جو انجماد کی صورت میں استبدادی نوعیت کا حامل تھا اس کو صوفیانہ جہت کے سرگرم باہمی تعلق میں بدل دیا گیا۔ اس میں ہندوستانیوں کو، سیتا کی نسبت گہرے مشاہداتی وصف سے محروم ظاہر کیا گیا ہے (اعلیٰ اور ادنیٰ دونوں درجوں پر)۔ ہندوستانی جبلی طور پر تاریخ کو متحرک کرنے والے وصف سے محروم ہیں۔ ان کا طرز عمل صرف فطری نوعیت کا ہے۔ وہ جسمانی محنت مشقت کر سکتے ہیں (اور وہ بغاوت میں اس سے آگے نہیں جاتے) اور وہ کبھی عقلی مشاہداتی موقف اختیار کرنے کے اہل نہ ہوں گے، جو کہ نظریہ تاریخ کے بارے میں رکھتا ہے کہ تاریخ کو بدلنے کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ کوئی معقول ماڈل سامنے ہو۔

ہندوستان کی بدلتی ہوئی تعبیریں

دونوں ناول ہندوستان کو برطانوی سلطنت کا داخلی حصہ بناتے ہیں اور اس کو نسوانی تشخص دیتے ہیں۔ یہ نکتہ نظر میں تبدیلی ہے (ملکیت کے جذبے کے علاوہ) جس نے 19 ویں صدی کے رومانوی اور جمالیاتی ہندوستان کے تصور میں تبدیلی پیدا کی اور اس خطے کو نیا تشخص دیا گیا جو نسوانی پہچان رکھتا تھا، یہ ماضی میں ہندوستان کے بارے میں تصور رہا تھا۔ نئے تصور میں ہندوستان کو پرعزم اور آقا کے ساتھ وابستہ قرار دیا گیا۔ سلطنت کے بارے میں تصور لوگوں میں عام ہوا، جیسا کہ 19 ویں صدی کے دوسرے حصے میں شائع ہونے والے بغاوت کے موضوع پر شائع ہونے والے ناولوں سے ہوتا ہے جن کی تعداد چالیس تھی۔ ان ناولوں سے اینگلو انڈین ناول نے ہیت مستعار لی۔ جس میں رومانس کو مرکزی اہمیت حاصل ہوئی۔ کہانی کی اس صنف نے یہاں جنم لیا اور 19 ویں صدی کے دوسرے نصف میں غالب حیثیت پائی۔ البتہ اس میں ایک خوش فہمی بھی تھی، جس میں ہندوستان کی بغاوت سے تاریخی انقلابی صلاحیت کا خاتمہ کرنے کی کوشش شامل تھی اور بعد از 1858 ایسے نکتہ نظر کو فروغ دینے کی خواہش موجود تھی جس میں ماضی کے حقائق کا کوئی عنصر دکھائی نہ دے سکتا تھا۔

اس حوالے سے ادب بھی اس وقت کی ایسی کاوشوں میں شامل ہو جاتا ہے، جن کا مقصد جذباتی اور رومانوی انداز میں، ہندوستان کا ماضی سے تعلق کورا کاغذ ثابت کرنا تھا۔ اس کو ہم ایک مختصر سی مثال کی روشنی میں دیکھ سکتے ہیں۔ 1858 میں لارڈ کیننگ جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا آخری گورنر جنرل اور تاج برطانیہ کا پہلا وائسرائے تھا، نے ایک حکم کے ذریعے اودھ میں اراضی کے مالکانہ حقوق کا خاتمہ کر دیا۔ اس طرح اس سرزمین پر تمام سابقہ اشرافیہ کا خاتمہ ہو گیا۔ اب یہ زمینیں آسانی کے ساتھ نئے لوگوں کو الاٹ کی جاسکتی تھی۔ جو کہ تاج برطانیہ کی جانب سے بلا معاوضہ اور جنگ وجدل کے بغیر حاصل ہونے والی عنایت کی شکل میں تھی (Metcalf-147)۔ حقیقت میں ماضی کا خاتمہ کرنے کے لئے کیننگ کی یہ بے بنیاد خواہش قابل عمل نہیں ہو سکتی تھی۔ اودھ کا کمشنر جیمس روٹرن اس بات سے آگاہ تھا کہ ایسی تحریک بغاوت کو طول دینے کا باعث ہو گی اور اس حقیقت کے پیش نظر کہ پرانے تعلقہ داروں (لینڈ لارڈز) کی معاونت حاصل کئے بغیر ملک میں امن کا قیام ممکن نہیں ہوسکتا تھا، اس نے تفصیلی خط کے ساتھ، جس میں بتایا کہ کس سے زمین واپس لے کر کس کو عطا کی گئی، کیننگ کا اعلان نامہ تاج برطانیہ کو ارسال کر دیا۔ یوں اس نے کیننگ کے اس اقدام کو سبوتاژ کر دیا۔ بالآخر کیننگ نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا اور اس نے ہنرمندی کے ساتھ تعلقہ داروں کی ایک بااثر تنظیم بنائی۔ جن کو اودھ میں زمینوں پر زیادہ اختیارات سے نوازا گیا۔ ان تعلقہ داروں نے سلطنت کے لئے باغی کسانوں کے خلاف دفاعی دیوار کا کردار ادا کیا۔

یادداشتوں میں محفوظ تصورات تبدیل ہوئے حتیٰ کہ کئی ایک ختم بھی ہو گئے، مگر ابتدائی طور پر تاریخ کا پوری طرح خاتمہ عمل میں نہ آیا۔ کیننگ کی کوشش یا بغاوت پر ناولوں نے ہندوستان کی تاریخ کو ذہنوں سے مکمل طور پر نکال دینے میں موثر کردار ادا کیا۔ تعلقہ داروں کو دوبارہ بحال کر دیا گیا لیکن اس عمل میں ان تمام حقوق کو نظر انداز کر دیا گیا جو روایتی طور پر کسانوں کو میسر چلے آ رہے تھے۔ اس بندوبست میں کسان تعلقہ داروں سے مذاکرات کی پوزیشن میں ہوتے تھے۔ لہٰذا تعلقہ داروں کی حیثیت حسب سابق قائم رہی۔ جس سے وہ نہ صرف مغل بادشاہ یا اودھ کی اشرافیہ ریونیو جمع کرتے تھے بلکہ لینڈ لارڈ ہونے کے علاوہ مجسٹریٹ بھی وہی تھے۔ یوں تمام تر اختیارات ان کو مل گئے تھے۔(Metcalf:150-54)۔ لہٰذا ماضی کا تسلسل جس نوعیت میں قائم رہا، وہ تعلقہ داری نظام سے مشابہت رکھتا تھا۔ لیکن اس نظام کے پردے میں بہت ساری تبدیلیوں کو چھپا دیا

گیا تھا۔ جو کچھ ضائع کر دیا گیا یا ختم کر دیا گیا تھا وہ نئے نظام اور قانونی بحث میں شامل نہ ہو سکا۔ البتہ بعض اوقات کسانوں کے حقوق کے برطانوی اور ہندوستانی چیمپئن اس پر اپنی پریشانی کا اظہار کر دیا کرتے تھے۔ برطانیہ کی بعد از 1857 پالیسی عملی طور پر کیننگ کے تبدیل شدہ بندوبست کے اصولوں پر قائم رہی اور اس میں مرکزی نکتہ یہ تھا کہ عدم مداخلت پر کاربند رہتے ہوئے روایتی نظام کو تحفظ دیا جائے۔ یہ روایت، البتہ کالونیل ازم کی تخلیق تھی۔ اس کے تحفظ کی پالیسی نے سابقہ اداروں میں پائی جانے والی لچکدار نوعیت کو بدل کر سخت بنا دیا۔

اس طرح بغاوت پر ناولوں نے لینڈ سکیپ اور مقدس جمالیات کی تاریخ کو غیر یقینی صورت میں تبدیل کیا۔ مقصد کے حصول کی خاطر اس صنف کو استعمال میں رکھا گیا مگر تاثرات کو تبدیل کر کے تاریخ کی شکل میں بدل دیا گیا۔ تاریخ پر حاصل لینڈ سکیپ اور مقدس جمالیات، نہ صرف قبل بلکہ جنگ کے بعد کے ناول میں بھی، تعلقہ داری نظام کی مانند یہ تجرید بھی ماضی سے ماخوذ دکھائی دیتی ہے۔ جس میں ابتدائی 19 ویں صدی کے مقاصد کو غیر یقینی بنا دیا جاتا ہے بلکہ یہ ایک طرح سے شہادت فراہم کرنے لگتے ہیں کہ جنگ میں برطانیہ کی فتح اور ہندوستانیوں کی شکست ایک ناگزیر ضرورت تھی۔ تاریخیت نے ان جمالیاتی تخلیقات کو تاریخی طور پر فاتح اور تاریخی طور پر شکست خوردہ کے حوالہ سے پیش کیا اور اس نکتہ نظر کو 19 ویں صدی کے آخری عشروں میں فروغ حاصل ہوا اور سامراج سے آزادی کے بعد بھی ہندوستانیوں کو یہی پیغام ملتا رہا۔ 1880 کی دہائیوں میں جب ہندوستان میں نیم قوم پرستانہ خیالات کی شکل نمودار ہونے لگی۔ یہ لینڈ سکیپ تھا جس کو استعمال کرتے ہوئے ہندوستان کو دیومالائی اور مقدس شکل میں پیش کیا گیا۔ پوسٹ کالونیل ہندوستان میں، بغاوت کو دوسرے رنگ میں بیان کرتے ہوئے، مقدس کو یوں بیان کیا گیا کہ یہ تصورات کو محدود کرنے کی علامت ہے اور اس میں تاریخ کی جانب مشاہداتی اور ترقی پسندانہ رویہ اختیار کرنے کی استطاعت نہیں ہے۔ جبکہ لبرل لینڈ سکیپ، ایک بار پھر قوم پرستانہ جذبات کو منظم کرنے میں معاونت فراہم کرتا ہے۔ لہٰذا اگرچہ ناول کیننگ کے اعلامیہ کی طرح، بغاوت کا انقلابی کردار ختم کرنے میں کامیاب نہ ہوا اور ہندوستانیوں کے لئے تاریخ کا خاتمہ ممکن نہ ہوا۔ البتہ تاریخیت نے مزاحمت کا طریقہ کار تبدیل کر دیا اور اس کے اظہار نے نئی شکلیں اختیار کر لیں۔

❀❀❀❀❀

1857ء کے سپاہی کون تھے؟

امریش مسرا/ترجمہ: ظفر علی خان

1857ء کا سال لاتعداد طریقوں سے پڑھا گیا ہے۔ نئی تحقیق اسے کسان بغاوت قرار دیتی ہے۔ اور اس دور کی اقتصادی تاریخ تجویز کرتی لگتی ہے کہ ایسا ہی تھا۔ اتنی دیر تک جیسے 1750ء کی دہائی، ہندوستان کے پاس برآمدی زائد تھا، اس کے حق میں تجارتی توازن کا مقابلہ صرف سونے کی درآمد سے تھا، اس لئے کہ دنیا کے پاس ہندوستان کو اس کی عمدہ ٹیکسٹائل کے بدلے میں دینے کو اور کچھ نہ تھا۔

برطانوی کالونی گیری نے یہ سلسلہ الٹ دیا پہلے تجارت کی اجارہ داری کے ذریعے پھر۔۔۔ 19 ویں صدی کے اوائل میں۔۔۔ ہندوستانی صنعت تباہ کر کے۔ اس دور کے دوران جب برطانوی تجارت نے برتری قائم کی، ہندوستان کی طرف سے اشیاء برآمد ہوتی تھیں لیکن سونا کبھی ملک میں نہ پہنچتا تھا۔ برطانوی تاجر ہندوستان میں اشیاء روپوں کی رسیدوں میں خریدتے اور ان کا تبادلہ بیرون ملک سونے میں کرتے۔ دادا بھائی باؤ روجی اور نام نہاد ''جدید قوم پرست'' مکتبہ فکر کے ہندوستانی دولت کی نکاسی کے اعداد و شمار منظر عام پر لانے سے بہت سے مغل وقائع نگاروں نے اسے 100,000 پاؤنڈ سٹرلنگ سالانہ سے زیادہ قرار دیا تھا۔ دراصل وہ سونا جو ہندوستان کو قابل ادائیگی تھا نے انگلینڈ کے صنعتی انقلاب کی مالی معاونت کی۔ پھر ہندوستانی منڈی کو یورپی اشیاء سے بھرنے کے لئے ہندوستان کو بے صنعت کر دیا گیا۔ تعیشی اشیاء کے فراہم کنندہ سے اسے خام مال برآمد کرنے والے ملک میں تبدیل کر دیا گیا۔

1820 اور 1840 کے درمیان بے صنعت کرنے کے عمل نے 12,000 سے زیادہ

منڈیاں بند کر دیں جنہیں کسان اور شمالی ہند کے چھوٹے کاروباری کنٹرول کرتے اور چلاتے تھے۔ یورپ کے برعکس ہندوستانی سرمایہ داری کو شہری یا ''زمیندار'' نہیں چلاتا تھا۔ کسان گروہ، زمین کو کنٹرول اور کاشت بطور ''مشترک سٹاک مالکان'' کرنے والے، مقامی چیزیں تیار کرتے اور ان کی تجارت کرتے۔ یوں مثال کے طور پر اودھ کے بیسوار راجپوت، ہتھیار بند ہونے کے علاوہ حقیقت میں پٹے دار یا حصہ دار تھے (''ٹینیور فارمز'') معین عرصہ کی ہندوستانی شکلیں جو روسی کمیون اور مغربی یورپ کے (ہیومین) کسان دونوں کے خدوخال رکھتی تھیں۔ ایسی ہی حالت اُناؤ اور کانپور کے کانیوکبجا براہمنوں ماہا کاؤشل روہیل کھنڈ اور اودھ (آج کے مدھیا پردیش) کے کرمیز اور لودھوں کی بہار کے بھومیہار اور یوپی کے دوآب کے آہیر یادارز کی تھی۔

اس اقتصادی نظام کی مطابقت میں کیونکہ اٹھارہویں صدی کے ہندوستان میں ذات پات کا نظام کٹر نہ تھا۔ بہت سے لوگ کچھ دیر پہلے کے ''نچلی ذات'' کے جیسے گیریز اور گوسائنز نے براہمنوں کا لیبل حاصل کر لیا جس سے نظام کا کھلا ہونا صحیح ہوتا ہے۔ مستقل بندوبست اور رعیت داری نظام دونوں کے ذریعے برطانوی سماجی انجینئروں نے ہندوستان کا سماجی نقشہ زمین میں نجی ملکیت ''ایجاد'' کر کے بدل دیا۔ مستقل بندوبست نے ''جاگیرداری'' اوپر سے تخلیق کی، جبکہ رعیت داری۔۔۔ بظاہر مستقل بندوبست کے مسائل درست کرنے کے لئے وضع کی گئی تھی۔ مفروضیت اور نیچے سے جاگیرداری کی تخلیق پر منتج ہوئی۔ اس نے نتیجتاً پٹے داری اور حصے داری نظام کو جس نے ہندوستانی کسان کو ایک برادری نظام میں جوڑا ہوا تھا توڑ پھوڑ دیا۔

برطانویوں نے ایک پروپیگنڈہ مہم شروع کی جس میں ان برادریوں کو ''پس ماندہ'' قرار دیتے ہوئے ترقی میں رکاوٹ بتایا جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ وہ علاقے جو مستقل بندوبست اور رعیت داری کے تحت تھے حقیقت میں پس ماندہ رہ گئے جبکہ پٹے داری علاقے، یوپی اور ایم پی اور بہار نے لچک اور آگے بڑھنے اور ترقی کی صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ برطانویوں کے لئے یقیناً یہ ایک مسئلہ تھا۔

1857 ایک تصادم نہیں تھا۔ جیسا کہ بہت سے برطانوی اور ہندوستانی عالم ہمیں یقین دلاتے ہیں۔۔۔ ''نئے'' اور ''پرانے'' میں تصادم۔ یہ ''کالونیائی نئے'' اور ''مقامی نئے'' میں تصادم تھا۔ وہ علاقے جو اعلیٰ برطانوی فوجیوں اور توپخانے کے خلاف 1860 تک سب سے زیادہ

بڑے ٹھیک پٹے داری برادریوں سے آئے تھے۔ کیونکہ اکثر بنگال فوج کے سپاہی پٹہ داری علاقوں سے آئے تھے وہ ایک ''جدید قومیت'' کی بصیرت رکھ سکتے تھے۔ صرف وہی ''دہلی اعلانیہ'' جاری کر سکتے تھے، جو ایک نجی جمہوری کسان ہندوستانی سرمایہ داری جس میں ریاست صرف معائنہ کار ہو جو زیریں ڈھانچے کی دیکھ بھال کرنے کا مطالبہ کر سکتے تھے۔

ایسا نہیں تھا کہ بنگالی یا مدراسی کسان اپنے یو پی/ بہار کے نصف ثانی سے کم قوم پرست تھے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ مستقل بندوبست کے اور رعیت داری کے ذریعے برطانویوں کی بنگال اور جنوب پر گرفت زیادہ مضبوط تھی۔ اس کے باوجود پٹے داری کی سابقہ دور کی حالت مشرق مغرب اور جنوبی ہند میں معتد بہ بغاوتوں کو انگیخت کرنے میں کامیاب ہوئی۔ یہ کوئی اتفاق نہیں ہے کہ 1858 تک 1857 کی لہر ایک زمیندار مخالف، تاجر مخالف تحریک میں بدل گئی کیونکہ 1857 کے طوفان سے دلالوں اور درمیانی آدمیوں کا ایک طبقہ ابھرا جنھوں نے برطانویوں کا ساتھ دیا۔ باقی تاریخ ہے۔

❁❁❁❁❁

ہماری تاریخ میں 1857ء

پی۔سی۔جوشی

1۔فوجی غدر یا قومی بغاوت؟

اس سال ہندوستان 1857ء کی قومی بغاوت کی صد سالہ یادگار منا رہا ہے۔ یہ ہمارے قومی ارتقاء میں ایک عہد آفریں واقعہ ہے۔ یہ ایک عظیم واقعہ ہے جسے وطن پرست ہندوستانی جدید قومی تحریکِ آزادی کی بنیاد تصور کرتے ہیں۔ پھر بھی یہی واقعہ اس بحث کا شکار ہے کہ آیا یہ محض ''فوجی غدر'' تھا یا ''قومی بغاوت''!

داستان کا صحیح ہندوستانی پہلو پوری طرح معلوم نہیں۔ اس کی وجہ صرف یہی نہیں کہ تاریخی ریکارڈ چھوڑ جانا ہندوستانیوں کی روایت نہیں رہی بلکہ اس وقت برطانوی عہدِ حکومت میں ایسے حالات تھے کہ اگر کوئی ایسی کوشش کرتا تو اپنی جان خطرے میں ڈالتا۔ چند ہمعصر ہندوستانیوں نے اگر 1857ء سے متعلق کچھ لکھا تو یہ انگریزوں کی حمایت میں تھا۔ ''بنگالی پریس سے کیسے نپٹا جائے'' ''The Bengali Press: How to deal with it'' اس عنوان کے ایک مقالے سے جابرانہ برطانوی رویہ ظاہر ہے۔ یہ مقالہ 9۔ اگست 1896ء کو اس وقت کے ایک بہت مقتدر برطانوی رسالے ''Pioneer'' میں شائع ہوا تھا۔

''جہاں تک موجود پشت کو یاد ہے ہم جانتے ہیں کہ انگریز خود اپنے اخبار نویسوں کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھتے تھے۔ اگر کوئی شریف النفس اور خوش طبع صحافی بھول کر پرنس ریجنٹ (نائب السلطنت) کو چالیس سالہ بانکا کہہ دیتا تو اسے دو سال کی قید با مشقت کی سزا دی جاتی۔ اگر کوئی پادری انقلابِ فرانس کی تعریف کرتا اور پارلیمانی اصلاح اور منصفانہ نیابت کی حمایت کر دیتا تو

اسے لوہے کی بیڑیاں پہن کر کام کرنے اور حقیر ترین مجرموں کے ساتھ دلدل میں پیدل چلنے کی سزا دی جاتی۔

''مصنف نے وہی سزا اس ہندوستانی کو دینے کی حمایت کی جو 1857ء کے غدر کے بارے میں کچھ لکھنے کی جرأت کرے۔''(1)

پس ہندوستانیوں کو اس مباحثے میں کسی رائے کے اظہار کی مجال نہ تھی لیکن ہمارے باغی بزرگ بہادری کے کارنامے انجام دے کر اور اپنا گرم خون بہا کر ایسی داستان چھوڑ گئے جس کا بیان الفاظ کا محتاج نہیں ہے۔ یہ افسوس کا مقام ہے کہ 1857ء کی صد سالہ یادگار کے اہم سال میں بلند پایہ ہندوستانی مورخین پرانی بحث کو چھیڑیں اور نئی کتابیں لکھ کر برطانوی شہنشاہیت پرستوں کے نقطۂ نظر کی حمایت میں زور عایت سے کام لیں۔ اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستانی عالموں پر برطانوی فنِ تاریخ نگاری کا کتنا گہرا اثر ہے اور ہندوستان کے قومی اندازِ فکر میں کتنے بڑے نقائص ہیں جنہیں دور کرنا ہے۔

یہ بحث پہلے خود برطانوی حکمران طبقے میں چھڑی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حامیوں نے ہندوستانی بغاوت کو محض فوجی غدر قرار دے کر اس کی وقعت کو گھٹایا تا کہ کمپنی کی حکومت کی کمزوریوں کو چھپایا جائے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مخالفوں یعنی برطانیہ کے صنعتی، شہری متوسط طبقے کے نمائندوں نے مذکورہ بالا نقطۂ نظر کی خامیوں کو فاش کیا اور دعویٰ کیا کہ یہ ایک قومی بغاوت تھی نتیجہ انہوں نے یہ اخذ کیا کہ کمپنی کی حکومت کو ختم کر دیا جائے اور برطانوی حکومت ہندوستان کو اپنے تحت کر لے۔ لارڈ کیننگ نے غیر جانبداری کا رویہ اختیار کیا تا کہ کوئی فریق ناراض نہ ہو۔

1857ء کی بغاوت کے برطانوی مورخ کے کا بیان ہے کہ کیننگ نے اپنے دل میں کہا ''کیا یہ محض فوجی غدر ہے جس کا میں مقابلہ کر رہا ہوں؟ ایسا نہیں لگتا تھا کہ ایسے ہنگامے کی ابتدا بلا کسی بیرونی تحریک کے صرف فوجیوں کے جذبات سے ہوئی ہو۔ ہوسکتا ہے کہ جو سرگرمیاں اس وقت رونما ہوئیں وہ خالص فوجی شورش کا نتیجہ رہی ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایسے خارجی اثرات کام نہیں کر رہے تھے جن سے ایسی ذہنی کیفیت پیدا ہوئی جو بڑھ کر خوفناک نتائج کا موجب ہوئی۔''

''اس نے جلد ہی غدر کا ذکر کرنا ترک کر دیا اور اسے ایک شورش اور ایک بغاوت کا نام

دیا۔ سال کے شروع میں وہ سیاسی اسباب کے خیال کو کچھ اہمیت دینے پر مائل تھا۔۔۔ جیسا کہ اس نے متعدد بار لکھا،۔۔۔ لیکن اب اس معاملے کے بارے میں اس کا شک رفع ہونے لگا۔ اُس نے برطانیہ کے وزیرِ ہند کو لکھا کہ مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بغاوت برہمنوں نے مذہبی حیلوں بہانوں اور دوسروں نے سیاسی مقاصد کی بنا پر بپا کی ہے۔ سلطنتِ ہندوستان میں آگ لگی ہوئی ہے۔'' (2)

کارل مارکس ''دی نیویارک ڈیلی ٹریبیون'' The New York Daily Tribune کے نام اپنے ایک بلا دستخط مراسلے میں مخالف پارٹی کے رہنما ڈسرائیلی کی تقریر مورخہ 27- جولائی 1857ء کا حوالہ دیتا ہے اور اس پر یوں رائے زنی کرتا ہے:

''پچھلے دس سال تک ڈسرائیلی اس حقیقت کا قائل تھا کہ ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی بنیاد پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو' کے پرانے اصول پر قائم تھی۔۔۔ لیکن اس اصول پر عمل کرتے وقت ہندوستان کی مختلف قوموں کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ ان کے مذہب میں مداخلت سے احتراز کیا جاتا تھا۔ اور زمیندار شرفا کی حفاظت کی جاتی تھی۔ دیسی فوج ملک کی شورش پسند ذہنیتوں کو جذب کرنے کا ایک وسیلہ تھی لیکن پچھلے کچھ سالوں سے حکومتِ ہند نے ایک نیا اصول اختیار کیا ہے یعنی قومیت کو تباہ کرنے کا اصول۔ اس اصول کو والیانِ ریاست کی جبری بربادی، جاگیروں کے بندوبست میں خلل اندازی اور لوگوں کے مذہب میں مداخلت کے ذریعے عمل میں لایا گیا ہے۔''

''ڈسرائیلی اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ موجودہ ہندوستانی شورش کوئی فوجی غدر نہیں ہے بلکہ ایک قومی بغاوت ہے جس کے ہندوستانی سپاہی سرگرم آلہء کار ہیں۔ وہ اپنے خطبے کے آخر میں برطانوی سرکار کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ موجودہ ظلم وستم کی راہ اختیار کرنے کے بجائے ہندوستان کی اندرونی حالت کو سنوارنے پر اپنی توجہ مبذول کرے۔'' (3)

اب ہم ہمعصر برطانوی مورخوں اور وقائع نگاروں کے خیالات کا ذکر کرتے ہیں۔ اس زمانہ میں وہ صاف گوئی سے کام لیتے تھے اور بعد کے انگریز ماہرین کی طرح ریاکاری سے اپنی راستبازی اور پارسائی کا دعویٰ نہیں کرتے تھے۔

جوسٹن میکارتھی کا بیان ہے: ''حقیقت یہ تھی کہ ہندوستانی جزیرہ نما کے شمالی اور شمال مغربی صوبوں کے بیشتر حصے میں برطانوی اقتدار کے خلاف دیسی قوموں کی بغاوت پھیلی ہوئی تھی۔ اس

میں صرف سپاہی ہی نہیں شامل تھے۔ کسی بھی لحاظ سے یہ محض فوجی غدر نہ تھا۔ یہ فوجیوں کی شکایات، قومی نفرت، مذہبی تعصب اور ہندوستان پر برطانوی قبضے کے خلاف غم وغصہ کا مِلا جُلا اظہار تھا۔ اس میں ہندوستانی والیانِ ریاست بھی شامل تھے اور ہندوستانی فوجی بھی۔ مسلمان اور ہندو، عیسائیوں کے خلاف متحد ہونے کے لئے اپنی گذشتہ مذہبی کدورتوں کو بھول گئے۔"(4)

چارلس بال نے لکھا ہے"بالآخر پانی سر سے گزر گیا اور ہندوستانیوں کی رگ رگ میں نفرت سما گئی۔ اس وقت یہ توقع تھی کہ یہ سیلاب امنڈ کر فرنگی عنصر کو نیست ونابود کر دے گا اور جب بغاوت کا طوفان تھم کر مناسب حدود کے اندر سمٹ جائے گا تو وطن پرست ہندوستانی غیر ملکی حکمرانوں کے پنجے سے نجات پا کر کسی والیِ ریاست کے عصائے حکومت کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں گے بہر حال اس تحریک نے اب ایک زیادہ اہم رنگ اختیار کیا۔ یہ تمام قوم کی بغاوت بن گئی جسے من گھڑت زیادتیوں کو بیان کر کے بھڑکایا گیا اور نفرت اور تعصب کے بل بوتے پر اس کی خام خیالیوں کو برقرار رکھا گیا۔"(5)

"دی لندن ٹائمز" The London Times کے مشہور نامہ نگار سر ڈبلیو رسل نے لکھا:

"یہاں نہ صرف غلاموں کی جنگ اور کسانوں کی بغاوت یکجا ہوگئی بلکہ اجنبی حکومت کا جُوا اُتار پھینکنے، ہندوستانی والیانِ ریاست کے کامل اقتدار کو بحال کرنے اور ملکی مذہب کا پورا غلبہ قائم کرنے کی غرض سے یہ ایک مذہب کی جنگ، نسل کی جنگ، انتقام کی جنگ، امید کی جنگ اور قومی عزم کی جنگ تھی۔"(6)

کرنل مالیسن نے"فوجی غدر" کے نظریے کی بنیاد پر بغاوت سے متعلق تین جلدوں پر مشتمل ایک تاریخ لکھی۔ بغاوت دبنے کے آٹھ سال بعد وہ پھر ہندوستان آیا۔ 1857ء کی بغاوت کے واقعات کے بارے میں زندگی کے مختلف شعبوں کے لوگوں کے ساتھ بات چیت کی اور اپنی بعد کی نسبتاً کم ضخامت کی تصنیف "دی انڈین میوٹنی آف 1857ء" (The Indian Mutiny of 1857) میں تسلیم کیا کہ بغاوت کی پشت پر قومی عنصر کا غلبہ تھا۔ یہ تصنیف 1891ء میں شائع ہوئی۔ اس نے لکھا:"حالات نے مجھ پر یہ ثابت کر دیا کہ ان لوگوں کے دلوں میں، جو سو سال تک ہمارے نہایت مخلص اور وفادار خادم رہے، عداوت اور نفرت کی آگ بھڑکانے میں خارجی اسباب بروئے کار تھے۔ یہ عداوت اور نفرت ذاتی نہیں بلکہ ایک قومی جذبہ تھا۔"(7)

اب ہم 1857ء کی بغاوت کے گڑھ یعنی اودھ کی شورش سے متعلق برطانوی مورخین کے بعض معنی خیز خیالات کا ذکر کرتے ہیں۔ میکلوڈانس کا بیان ہے کہ ''کم سے کم اہلِ اودھ کی جدوجہد کو جنگِ آزادی قرار دینا چاہئے۔'' (8) گورنر جنرل کے نام کورٹ آف ڈائرکٹرس کی خفیہ کمیٹی کے ایک خط مورخہ 19-اپریل 1858ء میں لکھا ہے: ''جنگِ اودھ کے عوامی جنگ کا رنگ اختیار کرنے کی وجہ بادشاہ کی ناگہانی معزولی اور لگان کا سرسری تصفیہ ہے جس نے زمینداروں کی ایک بڑی تعداد کو اپنی زمینوں سے محروم کر دیا ہے۔ ان حالات میں جو معرکہ آرائیاں اودھ میں ہوئیں ان کی حیثیت ایک جائز جنگ کی ہے نہ کہ بغاوت کی۔'' (9)

اودھ کی جدوجہد کمال عروج پر تھی۔ اس کی بنیاد بہت ہی وسیع اور اس کی جڑیں نہایت گہری تھیں۔ اس کے سامنے ہر چیز خس و خاشاک کی مانند بہہ گئی لیکن ماہیت کے اعتبار سے یہ دوسرے مقامات کی جدوجہد سے مختلف نہ تھی۔ فرق صرف شدّت کا تھا۔ دشمن، مشکلات، مسائل، شورش کرنے والے اور راہنما وہی تھے۔ ایسے حالات میں اگر ہم یہ کہیں کہ اودھ میں یہ ایک جنگِ آزادی تھی لیکن باقی صوبوں میں نہیں تو اُسے نہ تو عقلِ سلیم تسلیم کرتی ہے اور نہ تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے۔ اس کے برعکس سائنٹیفک طریقہ تحقیق کا تقاضا ہے کہ اگر 1857ء جیسے عبوری دور میں بغاوت کی اصل ماہیت کا مطالعہ کرنا ہے تو اودھ جیسے علاقے میں کرنا چاہئے جو شورش کے معاملے میں بہت آگے تھا۔

بغاوت کی خصوصیت کو پرکھنے کے لئے ایک اور کسوٹی یہ ہے کہ ہم یہ معلوم کریں کہ کتنے لوگ برطانوی سرکار کے وفادار رہے اور ان لوگوں کے بارے میں اکثریت کا کیا رویہ تھا۔

اگر ان ہندوستانی افسروں کی فہرست تیار کی جائے جو بغاوت زدہ ضلعوں میں ملازم تھے اور جو برطانوی حکومت کے وفادار رہے تو ہمیں پتہ چلے گا کہ ان میں سے اکثر باغیوں کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ ان کی تصدیق ان اطلاعات سے ہوتی ہے جو ضلع مجسٹریٹوں نے بغاوت کی کیفیت کا جائزہ لیتے ہوئے گورنر جنرل کو بھیجیں۔

ضلع مجسٹریٹ جے۔ ڈبلیو۔ شیرر نے 3-جنوری 1859ء کو کانپور کے بارے میں لکھا:

''ہندوستانی عملہ کی غداری کا بھی بے شک ضلع میں بہت بُرا اثر پڑا۔ ڈپٹی کلکٹر کی سرکردگی میں سبھی آدمی چپکے سے دشمنوں سے مل گئے اور انہوں نے نئے نظامِ حکومت کو تسلیم کر لیا۔ ڈپٹی کلکٹر رام لعل

نے نانا صاحب کی حکومت کو منظم کرنے میں بہت سرگرم حصہ لیا۔ جب میں پہلی بار یہاں پہنچا تو میں نے اس غداری کے جرم میں جس نے تمام عملہ کو بگاڑ دیا تھا اس کو موت کی سزا دی۔''(10)

کمشنر جے۔ ڈبلیو۔ پنکنے نے 20- نومبر 1858ء کو جھانسی کے متعلق لکھا: ''عملہ اور ماتحت دیسی ملازمین کا رویہ عام طور پر بُرا یا غیر جانبدار تھا۔''(11)

کمشنر ایف۔ ولیمس نے 15- نومبر 1858ء کو شمال مغربی صوبجات کی حکومت کے سیکریٹری ولیم میور کی خدمت میں سہارن پور سے متعلق یہ رپورٹ بھیجی: ''پولیس نے کامل غفلت اختیار کی اور سارے عرصے میں ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ایسا دکھائی دیتا تھا گویا انہوں نے لوگوں کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا ہے کہ کوئی ایک دوسرے کے کام میں دخل نہ دے گا۔ اور یہ کہ اگر دیہات کے لوگ پولیس کو تھانوں میں ان کے حال پر چھوڑ دیں اور انہیں تنخواہ لینے دیں تو دیہاتی جو بھی جُرم چاہیں کر سکتے ہیں اور پولیس کی طرف سے انہیں روکنے کی کوئی کوشش نہ کی جائے گی۔''(12)

پادری کنیڈی نے بیان کیا: ''بغاوت نے بیشتر معاملات میں ذاتی مفاد کے خیال کو اور سابق آقا کے ساتھ وفاداری کے خیال کو بالکل مٹا دیا۔ ایسے حالات میں حکومت کا وفادار رہنے کی تہمت نا قابلِ برداشت تھی۔ یہ سبھی جانتے ہیں کہ جو چند سپاہی ہماری ملازمت میں ڈٹے رہے ان کو نہ صرف ان کے ساتھی بلکہ عام طور پر ان کی ذات کے لوگ بھی برادری سے خارج تصور کرتے ہیں۔ وہ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ اپنے گھروں کو جانے کی جرأت بھی نہیں کر سکتے کیوں کہ نہ صرف انہیں لعن طعن کی جائے گی اور برادرانہ عنایات سے محروم رکھا جائے گا بلکہ ان کی جان کے بھی لالے پڑ جائیں گے۔''(13)

اگر سپاہیوں اور دوسرے لوگوں کا جو انگریزوں کی ملازمت میں تھے اس کامیابی کے ساتھ حقہ پانی بند کیا جا سکتا ہے تو کیا یہ اس بات کی قطعی شہادت نہیں کہ 1857ء کی شورش ماہیت کے اعتبار سے ایک قومی انقلاب اور عوامی بغاوت تھی!

اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر آر۔ سی۔ موز مدار لکھتے ہیں کہ ''شورش کی ناکامی کا سبب یہ بھی تھا کہ رہنماؤں، سپاہیوں اور عوام کے سامنے کوئی بلند نصب العین نہیں تھا۔''(14)

اب ہم مشہور مثالوں کی بجائے ایسی مثالیں لیں گے جن کے بارے میں لوگوں کو بہت کم معلوم ہے۔ یہ مثالیں بغاوت کے اہم مراکز کی نہیں ہیں بلکہ دور افتادہ علاقوں کی ہیں، نہ ایسے

وقت کی ہیں جب بغاوت کی لہر زوروں پر تھی اور بہادری کے جوہر دکھانا آسان تھا بلکہ اس وقت کی ہیں جب بغاوت ٹھنڈی پڑ رہی تھی۔

دہلی اور لکھنو کے فتح ہونے کے بعد برطانوی کمانڈر انچیف سر کولن کیمپ بیل نے یہ منصوبہ باندھا کہ تین بڑی افواج اودھ اور دوآب کے باغیوں کو گھیر کر فتح گڑھ کی جانب دھکیل دیں اور پھر انہیں ختم کر دیں۔ جنرل وال پول نے کانپور سے کوچ کیا لیکن "باغیوں کے ایک چھوٹے سے دستے نے اُسے اٹاوہ میں رکنے پر مجبور کر دیا۔ ''ان کی تعداد قلیل تھی اور وہ دستی بندوقوں سے مسلح تھے لیکن ناامیدی نے ان کے اندر نئی روح پھونک دی تھی اور وہ نصب العین کی خاطر شہیدوں کی موت مرنے کا تہیہ کئے ہوئے تھے۔ وال پول نے اس مقام کا معائنہ کیا۔ فوج کے قیام کے اعتبار سے ہلّہ بولنے سے قیمتی جانیں تلف ہونے کا خدشہ تھا۔ غالباً اس مقصد کے حصول کے سستے اور آسان طریقے بھی ممکن تھے۔ یہی طریقے پہلے آزمائے گئے۔ دستی بم اندر پھینکے گئے۔ جلتی پیال کے دھوئیں سے محصور باغیوں کا دم گھونٹنے کی کوشش کی گئی لیکن سب کچھ بے سود ثابت ہوا۔ شگافوں میں سے باغی حملہ آوروں پر متواتر اور مؤثر فیر کرتے رہے اور تین گھنٹے تک انہیں نزدیک نہ پھٹکنے دیا۔ آخر اس جگہ کو بارود سے اڑا دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس مقصد کے لئے بورشیر نے انجینئر سیر شلے کی مدد سے کارتوسوں کے ساتھ ایک بارودی سرنگ بنائی۔ اس دھماکے نے مدافعت کرنے والوں کو وہ شرفِ شہادت بخشا جس کی وہ تمنا رکھتے تھے۔ اس سے وہ مکان کے ملبے میں ہی دفن ہو گئے۔'' (15)

25- فروری 1858ء کو زبردست نیپالی اور انگریزی فوجوں نے گھاگرا کو پار کیا اور عنبر پور کی طرف کوچ کیا۔ راستے میں ایک گھنے جنگل میں ایک مضبوط قلعہ تھا۔ جنگی اعتبار سے اس کی بڑی اہمیت تھی۔ اس میں صرف 34 باغی مقیم تھے۔ اس پر دھاوا بولا گیا ''اس قدر قوت اور عزم کے ساتھ اس کی مدافعت کی گئی کہ اس پر قابض ہونے سے پہلے حملہ آوروں کے سات جوان ہلاک ہو گئے اور 43 گھائل۔ تمام محافظینِ قلعہ نے اپنے مورچوں پر ہی جانیں قربان کیں۔'' (16)

15- دسمبر کو کولھاپور میں ایک مقامی شورش شروع ہوئی لیکن اسے دبا دیا گیا۔ جب باغیوں کو توپوں کے منہ پر رکھ کر اڑایا جا رہا تھا تو برطانوی افسر جیکب نے انہیں جان بخشی کی پیش کش کی بشرطیکہ وہ اپنے ساتھیوں کے نام بتا دیں۔ وہ ناکام رہا۔ بعد میں اس نے اپنے تجربات کا تجزیہ

کرتے ہوئے لکھا:

''لیکن یہ بیان کرنا دشوار ہے کہ کس قدر حیرت انگیز رازداری کے ساتھ سازش عمل میں لائی گئی۔ دوراندیشی کے ساتھ تدبیریں کی گئیں اور کتنی احتیاط کے ساتھ سازش کرنے والوں کے ہر گروہ نے جُدا جُدا کام کیا۔ سازش کی مختلف کڑیوں کو پوشیدہ رکھا گیا اور متعلقہ لوگوں کو صرف ضروری ہدایات کی اطلاع بہم پہنچائی جاتی رہی۔ اور پھر جس وفاداری کے ساتھ انہوں نے ایک دوسرے کا ساتھ دیا وہ بھی کم قابلِ تعریف نہیں ہے۔''(17)

جب انگریزوں نے لکھنو کو تباہ و برباد کیا تو بعض بیگمات ان کے ہاتھوں گرفتار ہوئیں۔ کپتان نے ان خواتین سے پوچھا ''کیا تم اب بھی یہ نہیں سمجھتیں کہ جدوجہد ختم ہو چکی ہے؟'' انہوں نے جواب دیا: ''نہیں بلکہ ہمیں یقین ہے کہ آخر میں تمہیں شکست ہوگی۔''(18) شکستِ فاش کے بعد بھی اس قدر خوداعتمادی اس انقلابی روح کی علامت تھی جسے فوجی بغاوت نے بیدار کیا تھا۔

جب بغاوت کی راہنمائی کا سوال اٹھتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر موزمدار کے سر پر انگریز نمائندوں اور جاگیردار باغی راہنماؤں کے درمیان ناپاک معاہدوں کا ایسا بھوت سوار ہے کہ وہ بلاامتیاز تمام باغی راہنماؤں کو ملامت کرتے ہیں۔ وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ بغاوت نے بعض ایسے بڑے راہنما پیدا کئے جن پر کوئی بھی قوم فخر کرسکتی ہے اور جنہیں برطانوی مورخوں نے بھی خراجِ تحسین ادا کیا ہے۔

- مالیسن نے فیض آباد کے مولوی احمد اللہ کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

''مولوی غضب کا آدمی تھا۔ بغاوت کے دوران بحیثیت ایک فوجی سالار کے اس نے اپنی قابلیت کے کئی ثبوت دیئے۔ کوئی بھی دوسرا آدمی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس نے سر کولن کیمپ بل کو میدانِ جنگ میں دو بار پسپا کیا۔ اگر محبِ وطن سے مراد وہ شخص ہے جو وطن کی آزادی کے لئے، جسے بے انصافی کے ساتھ سلب کرلیا گیا ہو، سازش اور جنگ کرتا ہے تو یقیناً مولوی ایک سچا محبِ وطن ہے۔ اس نے کسی کے قتل سے اپنی تلوار کو آلودہ نہیں کیا تھا۔ اس نے کسی کے قتل سے چشم پوشی نہیں کی تھی۔ اس نے ان اجنبیوں کے خلاف جنہوں نے اس کے ملک پر قبضہ کررکھا تھا، میدانِ کارزار میں بڑی جوانمردی اور ثابت قدمی کے ساتھ اور باعزت طریقے سے جنگ کی تھی۔ اس کی یاد تمام قوموں کے بہادروں اور سچے لوگوں کی عزت کی مستحق ہے۔''(19)

جھانسی کی رانی، تانتیا ٹوپے، کنور سنگھ اور بہت سے دوسرے مقامی راہنماؤں کے بارے میں خود انگریزوں کی طرف سے شاندار خراجِ تحسین کی کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

اس لئے ہمیں چاہیے کہ ہم از سرِ نو ان لوگوں اور راہنماؤں کی عزت کرنا سیکھیں جنہوں نے انگریزوں کے خلاف 1857ء کی قومی بغاوت میں اپنا فرض ادا کیا۔

1857ء کی بغاوت سے متعلق مارکس کا خیال ہمارے لئے بڑا احساس آفریں ہے۔ ہندوستانی ڈاک سے موصول ہوئیں 17- جون تک کی دہلی کی خبروں کی بنیاد پر اس نے ''نیویارک ڈیلی ٹریبیون'' کے نام 31- جولائی 1857ء کے ایک بلا دستخط مراسلے کو ان الفاظ کے ساتھ ختم کیا:

''آہستہ آہستہ ایسے راز فاش ہو جائیں گے جن کی بنا پر خود جان بُل کو اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ جسے وہ ایک فوجی غدر تصور کرتا ہے وہ درحقیقت ایک قومی بغاوت ہے۔''(20)

ہندوستان کے مورخ 1857ء کی بغاوت کی ماہیت کے بارے میں جتنی بھی بحث کریں لیکن ہندوستانی عوام تسلیم کر چکے ہیں کہ یہ ہماری قومی تحریک کا سرچشمہ ہے۔ قوم کے دل و دماغ پر 1857ء کی میراث کا اثر اس قدر غالب ہے کہ ڈاکٹر آر۔سی۔ موزمدار بھی اپنی تحقیق کو مندرجہ ذیل الفاظ کے ساتھ ختم کرتے ہیں:

''1857ء کی شورش ہندوستان میں برطانوی حکومت کے لئے وسیع پیمانے پر پہلی بڑی اور براہِ راست چنوتی کی حیثیت سے ہمیشہ تاریخ میں یادگار رہے گی۔ نصف صدی بعد شروع ہونے والی آزادی کی تحریک کو اسی تحریک سے روشنی ملی۔ 58-1857ء کی یاد نے ہماری آزادی کی تحریک کو تقویت دی، اس کے مجاہدین کے دلوں میں ہمت کی روح پھونکی، خوفناک جدوجہد کے لئے ایک تاریخی بنیاد فراہم کی۔ اور اُسے ایک ایسا اخلاقی محرک عطا کیا جس کی وقعت میں مبالغہ کرنا ممکن نہیں۔ 1857ء کی بغاوت کی یاد نے، جس کی عظمت غلط بیانیوں کے باوجود بڑھتی گئی، ہندوستان میں برطانوی حکومت کے مفاد کو جتنا نقصان پہنچایا اتنا خود بغاوت سے بھی نہ پہنچا ہوگا۔''(21)

یہ مسئلہ کہ آیا 58-1857ء کی جدوجہد ایک فوجی شورش تھی یا قومی بغاوت، اس طرح سلجھ سکتا ہے کہ اس جدوجہد سے وابستہ سیاسی، معاشی اور نظریاتی مسائل کی ماہیت اور حریفوں کے کردار کو ایمانداری کے ساتھ پیش کیا جائے اور خلوصِ دل کے ساتھ ان کا تجزیہ کیا جائے۔ مختصر یہ کہ ایک

معقول تاریخی جائزے کا تقاضا ہے کہ یہ صحیح طور پر بیان کیا جائے کہ کون کس کے ساتھ اور کس لئے لڑ رہا تھا۔ اس مقالے میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ مذکورہ بالا طریقے سے اس بحث طلب مسئلے کی تحقیق کی جائے۔

2- فرنگی راج کے خلاف

ایسٹ انڈیا کمپنی کی فتح ہند کی داستان ساری دنیا میں مشہور ہے۔ مارکس نے اسے 1853ء میں ان معنی خیز الفاظ میں مختصراً بیان کیا:

''ہندوستان میں انگریزوں کا اقتدار کس طرح قائم ہوا؟ مغلِ اعظم کے اقتدار کو مغل صوبیداروں نے، صوبیداروں کی قوت کو مرہٹوں نے اور مرہٹوں کی طاقت کو افغانوں نے نقصان پہنچایا اور جب یہ سب ایک دوسرے کے خلاف جدوجہد میں مصروف تھے تو انگریز بیچ میں آ دھمکے اور سب کو مغلوب کر لیا۔ یہ ایک ملک ہے جہاں نہ صرف ہندو اور مسلمان میں بلکہ قبیلے قبیلے اور ذات ذات میں تفرقہ ہے۔ یہ ایک سماج ہے جس کے ڈھانچے کی بنیاد ایک قسم کے توازن پر ہے جو اس کے افراد کے مابین منافرت اور آئینی علیحدگی کا نتیجہ ہے۔ ایسے ملک اور ایسے سماج کو بہرحال محکومی کا شکار ہونا تھا۔ اگر ہم ہندوستان کی گذشتہ تاریخ سے ناواقف بھی ہوں تو کیا اس بین اور ناقابلِ تردید حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں کہ اس وقت بھی ہندوستان کو ہندوستانی ہی فوج کی مدد سے جو ہندوستان ہی کی دولت پر پلتی ہے انگریزوں کی غلامی کے چنگل میں جکڑ کر رکھا گیا ہے۔ ایسی صورت میں ہندوستان محکوم ہونے سے نہیں بچ سکتا تھا۔'' (22)

عظیم بغاوت شروع ہونے کے بعد 15- جولائی 1857ء کو ''دی نیویارک ڈیلی ٹریبیون'' میں مارکس نے اپنے ایک بلا دستخط مقالے میں یوں لکھا: ''برطانیہ نے ڈیڑھ سو سال تک سلطنتِ ہند پر اپنا اقتدار قائم رکھنے کی تدبیر کی۔ مختلف نسلوں، قبیلوں، ذاتوں، مذہبوں اور مطلق العنان ریاستوں کا مجموعہ جو جغرافیائی وحدت کے اعتبار سے ہندوستان کہلاتا ہے۔ اس کے ان مختلف اجزا کا باہمی اختلاف ہی برطانوی اقتدارِ اعلیٰ کی اصل بنیاد بنی رہی۔ بعد میں اقتدارِ اعلیٰ کے حالات میں تبدیلی ہوئی ہے۔ سندھ اور پنجاب کی فتح کے ساتھ انگریزوں کی ہندوستانی سلطنت نہ صرف قدرتی حدود تک پہنچ چکی تھی، بلکہ خودمختار دیسی ریاستوں کے آخری آثار بھی مٹائے جا چکے تھے۔

''اب یہ ایک حصے کی مدد سے دوسرے حصے پر حملہ نہ کرتی تھی بلکہ یہ سب کے سر پر سوار تھی اور سارا ہندوستان اس کے قدموں پر تھا۔ فتح کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ اب یہ فاتح بن چکی تھی۔''(23)

''ایک اور مقالے میں مارکس نے ہندوستان میں کمپنی کی حکومت کو یورپی استبدادیت قرار دیا جو ایشیائی استبدادیت پر مسلط تھی۔''(24)

دیسی ریاستوں سے متعلق ایک اور مضمون میں مارکس بھرپر مغز اور معنی خیز الفاظ میں اس صورتِ حال کا تجزیہ کرتا ہے جس نے انگریزوں کو ہندوستان پر فتح حاصل کرنے کے قابل بنایا اور جو بالآخر ان کی حکومت کے خلاف بغاوت کا موجب بنی۔

''جب ناخواندہ برطانوی مہمانوں نے ہندوستان کی سرزمین پر ایک بار قدم رکھ دیئے اور اس پر قبضہ جمانے کی ٹھان لی تو اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ والیانِ ریاست کے اقتدار کو جبر سے یا سازش کے ذریعے زائل کیا جائے۔ والیانِ ریاست کے سلسلے میں انگریزوں کو اس قسم کے حالات کا سامنا تھا جیسے قدیم رومیوں کو ان کے اتحادیوں کے سلسلے میں تھا اس لئے وہ رومی سیاست دانوں کے نقشِ قدم پر چلے۔ ایک انگریز مصنف کے قول کے مطابق یہ حریفوں کو کھلا پلا کر تن ومند کرنے کا طریقہ تھا۔ جس طرح بیلوں کو پال پوس کر بڑا کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ ذبح کئے جانے کے قابل ہو جاتے ہیں، قدیم روم کے طریقے سے ان کی رفاقت حاصل کر لینے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے چینج ایلے (Change Alley) کے جدید ڈھنگ سے ان کا کام تمام کر دیا۔''(25)

''ان معاہدوں کو پورا کرنے کے لئے جو والیانِ ریاست نے کمپنی کے ساتھ کئے تھے انہیں انگریزوں سے بھاری سود پر بڑی بڑی رقمیں قرض لینی پڑتیں۔ جب پریشانی انتہا تک پہنچ جاتی تو قرض خواہ سنگدل ہو جاتے، پیچ کس دیا جاتا، اور والیانِ ریاست اس بات پر مجبور ہو جاتے کہ یا تو وہ اپنے علاقے سیدھی طرح سے کمپنی کے حوالے کر دیں یا جنگ شروع کر دیں۔ پہلی صورت میں وہ اپنے غاصبین کے وظیفہ خوار بن کر رہ جاتے اور دوسری صورت میں غداروں کی حیثیت سے گدّی سے اتار دیئے جاتے۔ اس وقت ہندوستانی ریاستوں کا رقبہ 699961 مربع میل تھا اور آبادی 52941263 تھی۔ البتہ اب وہ برطانوی حکومت کے حلیف نہیں تھے بلکہ کئی قسم کی شرائط

پر اور کئی طرح کے امدادی معاہدوں اور حفاظتی نظام کے تحت اس کے متوسل تھے۔ ان معاہدوں کی ایک مشترک بات یہ تھی کہ ہندوستانی ریاستیں دفاع، سفارتی تعلقات اور گورنر جنرل کی مداخلت کے بغیر اپنے باہمی تنازعوں کے تصفیہ کے حق سے دست بردار ہو گئیں۔

''جن شرائط کے تحت ان کی نام نہاد آزادی قائم ہے وہی ان کے مستقل انحطاط کا سبب ہیں اور ان ہی کی وجہ سے ان میں اصلاح کی اہلیت نہیں ہے۔ عفوی ضعف ان کے وجود کی سرشت ہے جیسا کہ ہر اس وجود کے ساتھ ہوتا ہے جو دوسروں کے رحم و کرم پر جیتا ہے۔'' امسدادی معاہدوں سے پیدا ہوئی برائیوں کی یہ صحیح عکاسی ہے۔ جب ہم ماضی کی طرف دیکھتے ہیں تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ موجودہ صدی کے ابتدائی بیس تیس برسوں میں ہندوستان کے مفکر جن نتائج پر پہنچے مارکس نے ان کے خدوخال کی واضح نشاندہی اس وقت کر دی تھی جب یہ عظیم تاریخی واقعات رونما ہو رہے تھے۔

ہم عصر برطانوی مصنفین میں جو زیادہ دور اندیش تھے انہوں نے بھی اس حقیقت کی جھلک دیکھ لی تھی جس کا تجزیہ مارکس نے اتنی وضاحت سے کیا۔ مثلاً ولیم ہووٹ نے لکھا:

''ہندوستانی والیانِ ریاست کو ان کے علاقوں سے محروم کرنے کا جو طریقہ سو سال سے زیادہ سے برتا جا رہا ہے اور وہ بھی حق اور مصلحت کی مقدس ترین دلائل کے ساتھ، وہ ایذا رسانی کا ایسا نظام ہے جو روحانی ایذا رسانی سے زیادہ خوشنما اور شاندار ہے جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔'' (26)

اور پھر بقول گرانٹ ڈف: ''ان کے پایہ تخت میں برطانوی ریذیڈنٹ کو لا کر بٹھا دینا ان کی بربادی کا سبب تھا کیوں کہ ان افسروں کا ایک فرض تفرقہ پیدا کرنا تھا۔'' (27)

ڈلہوزی کے عہدِ حکومت کے ساتھ بے اصول الحاق اور اونچے سے اونچے معزول شدہ والیانِ ریاست کے وظیفوں میں تخفیف کی نئی جابرانہ پالیسی کا آغاز ہوا جس کی وجہ سے سارے ہندوستان میں ایک اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ حقائق سے سبھی واقف ہیں۔ الحاقِ اودھ کی مثال اس کا نمونہ ہے اور بالخصوص اس ہلچل کو ظاہر کرتی ہے جو برطانیہ کی ناقابلِ تسکین جارحیت اور بے اصول الحاقات کی پالیسی نے سارے ملک میں پیدا کر دی تھی۔

الحاق کی پالیسی کی ماہیت اور اس کے نتائج کو دیکھنے کے لئے اودھ کو لیجئے جو ایک مثالی نمونہ ہے۔ بغاوتِ ہند کے قدامت پسند برطانوی مورّخ مالیسن کا بیان ہے: ''الحاقِ اودھ کے لئے خواہ

کوئی بھی جواز پیش کیا جائے یہ حقیقت ناقابلِ تردید ہے کہ جس طریقے سے اس پالیسی پر عمل کیا گیا اس کے پیشِ نظر یہ پالیسی نہ صرف مصالحت پیدا کرنے میں ناکام رہی بلکہ ہندوستان کا ہر طبقہ انگریزوں سے بیزار ہو گیا۔''(28)

گبنس نے جو اس وقت لکھنو میں کمشنر مالیات تھا بعد میں اس علاقے میں قومی بغاوت کی رپورٹ تیار کی اور ان ہندوستانیوں کے بیانات قلمبند کئے جن کی اس کے ساتھ راہ و رسم تھی۔ ان میں سے ایک بیان میں یہ کہا گیا: ''اسی طرح ہندوستان کے لوگ بھی کہتے ہیں کہ 'ملکِ اودھ بادشاہ' کا ہے۔ حکومت اس نے اچھے ڈھنگ سے کی ہو یا بُرے ڈھنگ سے لیکن اس نے کسی طرح بھی انگریزوں کے ساتھ وفاداری کا پیمان نہیں توڑا اور نہ ہی اس میں کوئی رخنہ ڈالا۔ اگر برطانوی سرکار اس بادشاہ کو تخت سے معزول کر سکتی ہے جو ہمیشہ اس کا وفادار رہا تو پھر کون سا خود مختار نواب یا راجہ محفوظ ہے؟''(29)

زیادہ دور اندیش اینگلو انڈین سیاستدانوں نے برطانیہ کی اس جارحانہ اور سراسر تباہ کن پالیسی کے انقلابی نتائج کو صاف طور پر بھانپ لیا۔ مثال کے طور پر سر جان میلکم نے بہت پہلے متنبہ کر دیا تھا کہ ''سرداروں کے موروثی حقوق اور ان کے پیروؤں کی وفاداری سب کا خاتمہ ہو گیا ہے وہ رابطے اور تعلقات جو پہلے مجلسی امن و امان کی مضبوط ترین کڑیاں تھے چوٹیں کھا کر ٹوٹ گئے ہیں اور بے اطمینانی اور بغاوت کے عناصر میں بدل گئے ہیں۔''(30)

کمپنی کی سرکار نہ صرف سیاسی جبر کی حکومت تھی بلکہ کٹر نسلی امتیاز کا نمونہ تھی جو ہر ہندوستانی کی آنکھ میں خار بن کر کھٹکتی تھی اور باراذیت تھی کمپنی کی حکومت کا شروع ہی سے یہ خاصہ تھا اور اس نے ناگزیر نتائج پیدا کئے۔ شور جو ہندوستان میں کمپنی کے اقتدار کے قیام کے آغاز میں لکھا کرتا تھا اس کا بیان ہے کہ: ''ہندوستانیوں کی ناپاک اور ذلیل کافروں سے زیادہ وقعت نہیں۔''(31)

1780ء میں ''سیر المتاخرین'' کے مصنف نے تلخی کے ساتھ یہ قلمبند کیا کہ ''انگریز شاذ و نادر ہی یہاں آ کر ہم میں سے کسی کے ساتھ ملتے ہیں۔''(32) ''سیر المتاخرین'' کے فرانسیسی مترجم نے لکھا کہ ''ہندوستان میں ہر انگریز میں یہ رجحان نظر آتا ہے کہ وہ ہندوستانیوں کی ساری قوم کو انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، گویا یہ ایک بے جان شے ہے جسے بلا تامل اور حسب مرضی کام میں لایا جا سکتا ہے۔''(33)

ہندوستانیوں نے ان تمام ذلتوں کو گوارا کیا جو ایسے نسلی امتیاز کے رویے سے پیدا ہوتی ہیں اور بالآخر انہوں نے نسلی امتیاز پر مبنی غیر ملکی حکومت کے خلاف اپنی جدوجہد شروع کی ''دی لندن ٹائمز'' نے رسل کو نامہ نگار کی حیثیت سے بغاوت کی خبریں فراہم کرنے کے لئے بھیجا۔ بنارس کو جاتے ہوئے راستے میں اس نے دیکھا کہ ''کسی بھی حالت میں کسی گورے کی گاڑی پر دوستانہ نگاہ نہیں ڈالی جاتی۔'' آنکھ کی زبان پر کون شبہ کرسکتا ہے اور کس کو غلط فہمی ہوسکتی ہے؟ میں نے صرف اسی سے سمجھ لیا ہے کہ بعض اوقات بہت سے لوگ ہماری قوم سے ڈرتے بھی نہیں ہیں اور نفرت تو سب ہی کرتے ہیں۔'' (34)

استبداد اور نسلی امتیاز پر مبنی برطانوی حکومت کا ایک اور براہِ راست نتیجہ ہندوستان کے باشندوں کو ذمہ داری کے تمام اعلیٰ عہدوں سے محروم کرنا تھا۔

نظامِ حکومت میں ہندوستانیوں کے تقرر کی حمایت کرتے ہوئے سر تھامس منرو نے 1818ء میں لکھا: ''غیر ملکی فاتحین نے ہندوستان کے اصلی باشندوں پر تشدد روا رکھا تھا اور اکثر جور وستم ڈھایا تھا لیکن کسی نے ان کے ساتھ ایسا حقارت آمیز سلوک نہیں کیا تھا جیسا ہم نے کیا ہے۔ کسی نے تمام لوگوں کو یہ کہہ کر رسوا نہیں کیا تھا کہ یہ اعتماد کے قابل نہیں ہیں، دیانتداری سے عاری ہیں اور صرف اس لائق ہیں کہ انہیں وہاں کام پر لگایا جائے جہاں ان کے بغیر چارہ نہ ہو۔ ایک قوم جو ہماری محکوم ہوگئی ہے اس کی تذلیل میری نگاہ میں نہ صرف کم ظرفی ہے بلکہ ناعاقبت اندیشی بھی۔'' (35)

بمبئی کونسل کے ایک رکن کی روداد میں مایوسی اور بے اطمینانی کی لہر کو اور بھی زیادہ سنجیدگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے: ''متعدد ممتاز دیسی افسر جو پرانے نظام کے درہم برہم ہونے سے بیکار ہوگئے ہیں سازشوں اور شکایتوں سے بے اطمینانی کے جذبے کو زیادہ شدت کے ساتھ قائم رکھنے اور وسیع تر علاقے میں پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔'' (36)

حکمران برطانوی طبقے کے زیادہ دانش مند لوگوں نے پہلے ہی اس صورتِ حال کے خطرے کو صاف صاف بھانپ لیا تھا۔ مثال کے طور پر ہم کچھ سوالات اور اُن کے جوابات پیش کرتے ہیں جو پارلیمنٹری کمیٹی منعقدہ 1832ء کے سامنے کئے گئے۔

سوال نمبر 138، صدر: کیا تم سمجھتے ہو کہ ہندوستان میں ہماری حیثیت کو کوئی مستقل خطرہ

درپیش ہے؟

ہنری رسل: بارودخانہ بھرا ہے۔اگرچہ فی الحال کسی چنگاری کے گرنے کی توقع نہیں ہے۔

سوال نمبر 140، ہندوستان میں ہماری داخلی حکومت کی سب سے بڑی شرارت ہندوستانیوں کے معزز طبقے کا خاتمہ ہے۔اس نے اُس طبقے کوکلیتاً نیست ونابود کردیا ہے۔(سوال نمبر143)اس وقت وہ قدرتی طور پراس سے غیر مطمئن ہیں۔ یہ آزردگی اس لئے نہیں ہے کہ یہ ایک غیر ملکی حکومت ہے، بلکہ اس لئے کہ یہ ایسی حکومت ہے جس کے ساتھ ان کا کوئی مفاد وابستہ نہیں اور جس سے انہیں کسی چیز کی امید یا توقع نہیں ہے۔"(37)

بغاوت کے دوران سرسید احمد خاں نے انگریزوں کی خدمت انجام دی اور اس کے فرو ہو جانے کے بعد اپنی مشہور کتاب The Causes of the Indian Revolt (اسباب بغاوت ہند) لکھی جس میں انہوں نے لکھا: "ہندوستان کے باشندوں بالخصوص مسلمانوں کی بے اطمینانی کا ایک اور سبب ہندوستانیوں کو اعلیٰ عہدوں سے محروم رکھنا تھا۔ابھی چند ہی سال ہوئے مسلمان اپنی حکومت کے تحت جلیل القدر عہدوں پر سرفراز تھے اور ان کی تمنا اور امید اب بھی ان کے دلوں میں باقی ہے۔ برطانوی حکومت کے تحت دنیا کی نگاہ میں وہ اپنی عزت بڑھانے کے آرزومند تھے لیکن ان کے لئے کوئی راستہ کھلا نہ تھا۔اس حکومت کے ابتدائی ایام میں بے شک بلند رتبہ ہندوستانیوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کرنے کے لئے چنا گیا لیکن آہستہ آہستہ یہ دستور جاتا رہا۔"(38)

چنانچہ اعلیٰ سرکاری ملازمتوں سے ہندوستانیوں کو محروم رکھنا ایک ہندوستان دشمن پالیسی تھی اور اس کے خلاف ہندوستان کے اعلیٰ طبقوں کی جائز بیزاری ایک اہم قومی عنصر تھا جو انگریزی حکومت کے خلاف ہندوستانیوں کی بغاوت کا سبب تھا۔

اس پر طرّہ یہ کہ جہاں تک ہندوستانی عوام کا تعلق ہے انہوں نے برطانوی نظام حکومت کو بدعنوانیوں میں مبتلا پایا کیوں کہ یہ غیر ملکی تھا۔

پرچرڈ "ہماری عدالتوں کی رشوت خوری اور ضمیر فروشی" کا شکوہ کرتا ہے اور اس نکتہ چینی میں وہ تنہا نہیں تھا۔اس کے علاوہ انگریزوں کا قانونی ضابطہ جاہل کسان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔مقدمہ کے لئے وہ وکیل نہ کرسکتا تھا۔قدیم دستور کے مطابق "عدالت کے دروازے سب پر کھلے تھے اور

غریب سے غریب کسان بھی اپنا دعویٰ بلا روک ٹوک پیش کر سکتا تھا۔'' امیروں اور عیاروں کے ہاتھ میں عدالتیں جبر و ستم کا آلہ کار بن گئیں۔ جھوٹا دعویٰ کرنے کے لئے جھوٹے گواہوں کو خریدا جا سکتا تھا اور جعلی دستاویزات تیار کی جاسکتی تھیں۔ صدر عدالت آگرہ کے ایک جج ریکس کا بیان ہے کہ ''شمال مغربی صوبہ کے لوگ ہمارے ضابطہ دیوانی کو پسند نہیں کرتے۔'' اور پسند نہ کرنے کی معقول وجہ ہے۔(39) برطانوی حکمرانوں نے پنچایت کی قسم کے مقامی اداروں کو تمام انتظامی معاملات کے دائرے سے خارج کر دیا۔ امن برقرار رکھنے، اپنے حقوق کی حفاظت کرنے اور حکومت کے تئیں اپنے فرائض انجام دینے کے لئے یہ روایتی انتظامی ادارے تھے۔ انگریزوں نے ایک الگ بھاڑے کے سپاہیوں کا پولیس محکمہ ان پر مسلط کر دیا۔

یہ مظاہرہ اسی نظام کے خلاف تھا کہ 1857ء میں ہندوستان کے لوگوں نے جب بھی ان کو موقعہ مل سکا، تھانے، کچہری، خزانے وغیرہ کو تباہ کر کے اپنی نفرت کا اظہار کیا۔

اگر اس بات کو ذہن میں رکھا جائے کہ انگریزی نظام ہندوستانی روایت کے منافی اور ہندوستانیوں کے مفاد کے لئے مضر تھا اور خود ہندوستانی اسے خصومت کی نگاہ سے دیکھتے تھے تو یہ نفرت آسانی کے ساتھ سمجھ میں آجاتی ہے۔ ہم عصر برطانوی افسر اس سے واقف تھے اور ان میں جو زیادہ سنجیدہ مزاج تھے وہ اس کیفیت پر پریشان تھے۔ انہوں نے برطانوی پارلیمنٹ کے اندر یہ معاملہ اٹھایا۔ رسل نے بڑی صاف گوئی سے کام لیا جب اس نے کہا: ''یہ نظام بنیادی طور پر انگریزی ہے، اس میں ہندوستانیت کا شائبہ بھی نہیں۔ نہ یہ ملک کے پُرانے دستور کے ساتھ کوئی مطابقت رکھتا ہے اور نہ اس کے باشندوں کے خیالات و عادات کے ساتھ۔ ہندوستان کے لوگوں کو ہمارے نظام پر کوئی اعتماد نہیں۔ ہماری حکومت کو ان کے خیالات کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں۔ اگر دوسری ریاستوں کے لوگ جنہیں یہ فوائد حاصل نہیں ہماری حکومت میں منتقل ہو جائیں تو وہ اسے عظیم ترین مصیبت خیال کریں گے جو ان پر نازل ہوسکتی ہے۔''(40) سرجان ملکم اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ ملک کے تمام طبقوں نے ''سوائے ایک ایسے نظام کے کچھ نہ دیکھا جو اُن کے فوری زوال اور بالآخر تباہی کا سبب تھا۔''(41) اس سے بہت پہلے شور نے صورتِ حال کو ان معنی خیز کلمات میں بیان کیا تھا ''ہماری سلطنت ریت کے ایک جزیرے کی مانند ہے جسے کسی سیلاب نے اُبھارا ہو۔ نہ تو کوئی بند باندھے گئے ہیں اور نہ ہی کوئی درخت لگائے گئے ہیں جن کی جڑیں نیچے پھیل کر

ایک دوسری کو جکڑ لیں۔'' (42) دیسی ریاستوں کو نیست و نابود کرنے والی ڈلہوزی کی حکومت کے دوران کرنل لو نے اپنی سرکاری یادداشتوں میں لکھا: ''ہندوستان کے باشندے ہر لحاظ سے دنیا کے تمام باشندوں کی مانند ہیں۔ وہ اپنی عادات و رسوم کو غیر ملکیوں کی عادات و رسوم کی نسبت زیادہ پسند کرتے ہیں۔'' (43)

یہ میرٹھ کے باغی سپاہیوں کی عقلِ سلیم کا کرشمہ تھا کہ انہوں نے ریاست جمنا کو پار کیا، ہمارے قدیم ملک کے روایتی دارالسلطنت کو برطانوی غلامی کے جوئے سے آزاد کیا اور اکبر کے محروم وارث بہادر شاہ کے سر پر شہنشاہِ ہندوستان کا تاج رکھا۔

اس واقعہ کی انقلابی اہمیت کو ہر جگہ تسلیم کیا گیا ہے۔ چارلس بال نے اس کی کیفیت کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے: ''میرٹھ کے سپاہیوں نے فی الفور ایک قائد، ایک علم اور ایک نصب العین پالیا۔ غدر کو ایک انقلابی جنگ میں بدل دیا گیا۔'' (44)

بہادر شاہ ایک سُست طبع اور خستہ حال ضعیف تھے لیکن اس تاریخی جدوجہد میں اس سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ دہلی کے عظیم مغل خاندان کے مطلق العنان شہنشاہوں کے طویل اور غیر منقطع سلسلے کے حقدار وارث کی حیثیت سے بہادر شاہ کو ہندوستان کے روایتی خودمختار فرماں روا کے طور پر ہندوستان کے سیاسی نظام میں ایک اہم مقام حاصل تھا۔ انگریزوں نے صورتِ حال کو اسی وقت سے سمجھا اور اس سے فائدہ اٹھایا۔ جب لارڈ لیک نے 15- ستمبر 1803ء کے دن دریائے جمنا کو پار کیا اور برطانوی فوجیں پہلی بار شہر دہلی میں داخل ہوئیں۔ اسی وقت یہ فیصلہ کیا گیا کہ مغل بادشاہ کو اسی وقار کے ساتھ برقرار رکھا جائے جو اسے حاصل ہے۔

دہلی میں برطانوی افسر مٹکاف کا بیان ہے: ''اس پالیسی کو بہتر تصور کیا گیا کہ شہر میں دو عملی کو گوارا کیا جائے اور مغل خاندان کے نام نہاد وقار کو برقرار رکھا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ بادشاہ کی معزولی سے ہندوستان کے مسلمانوں کی ساری قوم دہشت زدہ ہو جائے۔ یہ بات کند ترین ذہن پر بھی روشن تھی کہ دہلی میں حقیقی اقتدارئی قوت کے ہاتھ میں تھا اگرچہ بظاہر لوگوں کی نگاہ میں بادشاہ ہی ہندوستان کا فرماں روا تھا۔ جب تک قدیم خاندان کا سایہ باقی ہے یہ عزت و جاہ کا سرچشمہ رہے گا اور صرف اسی کا حکم قابلِ احترام ہوگا۔ شہزادے اب بھی اسی خطاب سے سرفراز تھے جو بادشاہ نے انہیں عطا کیا تھا۔ ہر قسم کے مروجہ سکّے موجودہ بادشاہ کے نام سے ہی جاری ہوتے رہے۔ چھوٹی

چھوٹی ریاستوں کی گدّی کے وارثوں کی منظوری کے لئے درخواست اب بھی اسی کی خدمت میں پیش کی جاتی اور جب وقتاً فوقتاً یہ درخواستیں رد ہو جاتیں تو ریذیڈنٹ کی خدمت میں اپلیں بھیجی جاتیں تاکہ وہ مغل بادشاہ پر اپنا اثر ورسوخ ڈال کر اپنے سائلوں کی درخواستیں منظور کرائے۔ جب خطرناک فسادات برپا ہوتے، جیسا کہ بعد میں ہوئے تو برطانوی حکام سے پناہ کے لئے وہ بادشاہ کی طرف رجوع کرتے۔

''بادشاہ ہر توہین گوارا کرتا رہا اور آہستہ آہستہ اس نے از سرِ نو اقتدارِ اعلیٰ حاصل کرتا رہا۔ اس لئے گو ہندوستانیوں نے اپنے شہنشاہ کے لئے ایک ذلیل بادشاہ کا درجہ قبول کیا لیکن یہ امکان ہمیشہ موجود تھا کہ وہ اپنا کھویا ہوا اقتدار دوبارہ حاصل کرے گا۔ اس لئے وہ انتظار کرنے پر قانع تھے۔ جب یہ معلوم ہوا کہ انگریزوں کا ارادہ حقِ وراثت کو ختم کرنے اور شاہی کنبوں کو اِدھر اُدھر منتشر کرنے کا ہے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے جذبات مشتعل ہو گئے۔

''انگریز ایک ایسے آتش فشاں پہاڑ پر ٹکے ہوئے تھے جو کسی بھی لمحہ ہلاکت خیزی کے ساتھ پھٹنے کو تیار تھا۔''(45)

انیسویں صدی کے نصف اوّل میں مغل خاندان اب بھی ہندوستان کی خود مختار فرماں روائی کی علامت تھی۔ انگریز غاصبوں نے مغل بادشاہ کو اپنی حکومت کی آڑ کے طور پر نام نہاد بادشاہِ ہند کی حیثیت میں برقرار رکھا تھا۔ باغی سپاہیوں نے مطلب براری کے برطانوی ڈھنگ اور مغل بادشاہی کی برقراری کے انگریزی حربے کو انہیں کے خلاف استعمال کیا۔ پہلا کام جو انہوں نے کیا کہ انگریزوں کو اس روایتی نشان سے محروم کر دیا اور اسے انگریزوں کے خلاف جنگ کے مقصد کی تکمیل کی غرض سے خود استعمال کیا اور اس کے آزاد ہندوستان کے تاجدار ہونے کا اعلان کیا۔

آزاد دہلی روایتی مغل بادشاہ کے تحت ایک خود مختار ریاست کی علامت بن گئی۔ اگرچہ بعض بلند پایہ ہندوستانی مورّخ اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے۔ برطانوی حکمرانوں نے اسی واقعہ کو اُس صورتِ حال کا انتہائی خطرناک پہلو سمجھا۔

ہندوستان کے قدیم پایہ تخت میں یہ نئی صورتِ حال ہی یکے بعد دیگرے آنے والے تمام برطانوی سپہ سالاروں کے نام کیننگ کے ان تاکیدی احکام کا سبب تھی کہ جتنی جلدی ممکن ہو دہلی پر فیصلہ کن حملے کی تدبیر کی جائے۔ یہی سبب تھا کہ لارنس دہلی کو فتح کرنے کے لئے پنجاب سے

تمام فوجوں، بہترین سپہ سالاروں اور افسروں کو نکال لایا۔ الگن کی اس رضامندی کی بھی یہی وجہ تھی کہ تائی پنگز کے خلاف برطانوی جنگ کے لئے جو برطانوی فوجیں مخصوص تھیں ان تمام کو کیننگ کے حوالے کر دیا جائے اور وہ خود کلکتے چلا آئے تا کہ برطانوی فوج اور افسروں میں زیادہ اعتماد پیدا ہو۔

لکھنو میں بھی ایسا ہی ایک آزاد علاقائی ریاست کا مرکز قائم کیا گیا تھا۔ اس لئے یہ دو مقامات انقلابیوں اور انگریز شہنشاہیت پرستوں کے جنگی منصوبوں میں تدبیر جنگ کے اعتبار سے اہم ترین محاذ بن گئے۔ مٹکاف کا بیان ہے کہ ''ہندوستان کے ہر اُس گوشے کی جہاں فوجی شورش ہوئی، اپنی مخصوص تاریخ تھی لیکن دہلی اور لکھنو سب سے زیادہ توجہ کے مرکز تھے۔ جب متواتر ایک رجمنٹ نے دوسری کے بعد بغاوت کی تو باغی فوجیں آہستہ آہستہ مختلف اطراف سے شمالی ہندوستان کے ان دو مراکز میں سے ایک کی جانب بڑھنے لگیں۔ فی الواقع دہلی میں ہی برطانوی اقتدارِ اعلیٰ کے سوال کا فیصلہ ہوا۔''(46)

''ریڈ پمفلٹ'' (Red Pamphlet) کا مصنف رقم طراز ہے: ''تمام اودھ ہمارے خلاف آمادۂ پیکار تھا نہ صرف باقاعدہ فوجیں بلکہ سابق بادشاہ کی فوج کے ساٹھ ہزار جوان، زمیندار اور ان کے نوکر چاکر اور دو سو پچاس قلعے جن میں سے بیشتر میں توپیں نصب تھیں، ہمارے خلاف سرگرم کار تھے۔ انہوں نے کمپنی کے راج کے مقابلے میں اپنے اپنے بادشاہ کی خودمختار متوازی حکومت قائم کر دی ہے اور اتفاقِ رائے سے اس کی حمایت کا اعلان کر دیا ہے۔ اُن پنشن خواروں نے بھی جو فوج میں ملازم رہے تھے، ہماری مخالفت کا اعلان کر دیا ہے اور ان کا ایک ایک آدمی بغاوت میں شریک ہو گیا ہے۔''(47)

چنانچہ اودھ میں انگریزوں کو جس چیز کا سامنا تھا وہ نہ صرف ایک مسلح، منظم اور عوامی بغاوت تھی بلکہ ایک ایک علاقائی حکومت تھی جس کی بنیاد قدیم خاندان کی بحالی پر تھی اور جسے لوگوں نے مسلح سپاہیوں کی سرکردگی میں دیدہ دانستہ غیر ملکی کمپنی کی ظالمانہ سرکار کے مقابلے پر قائم کیا تھا۔

غیر ملکی مضرت رساں فرنگی راج سے ہمارے اجداد کی نفرت حب وطن کے جذبے کا اظہار تھی یہ آزاد اور خودمختار ہونے کے قومی عزم کا اظہار تھا کہ انہوں نے 1857-58ء کے انقلابی

جہاد میں جان جوکھم میں ڈال کر ''فرنگی شیطان'' کے ساتھ جنگ کی۔ یہ خودمختار قومی حکومت قائم کرنے کی عوامی خواہش کا اظہار تھا کہ انہوں نے معزول شدہ شہنشاہوں اور بادشاہوں کو ان کی پرانی گدیوں پر بحال کرنے کی کوشش کی۔ چونکہ اس وقت قومی بیداری محدود تھی اس لئے ہمارے باغی بزرگوں نے ماضی کی طرف نگاہ دوڑائی اور مغل بادشاہ، مرہٹہ پیشوا اور نواب اودھ کو حکمرانوں کی حیثیت سے بحال کیا لیکن یہ سمجھنا قطعاً غلط ہے کہ وہ پس ماندہ اور رجعت پسند تھے۔ اس وقت کے حالات میں وراثت سے محروم بادشاہوں، پیشواؤں اور نوابوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کے ذریعے ہی سے برطانوی غلبے کے خلاف وسیع ترین قومی اتحاد پیدا کیا جا سکتا تھا۔ کسی اور باب میں ہم یہ ثابت کریں گے کہ نئی زندگی پانے والے ہندوستانی عوام ہندوستان میں انگریزوں سے پہلے کی جاگیردارانہ شخصی حکومت کو بحال نہیں کر رہے تھے بلکہ بہادر شاہ، نانا یا نواب اودھ کے تحت انقلابی حکومتوں پر ایک نئی جمہوری مہر ثبت کر رہے تھے۔ غیر ملکی فرماں رواؤں پر اپنے حکمرانوں کو ترجیح دینا اور اپنے حکمرانوں کی کوتاہیوں اور کمزوریوں کے ساتھ اپنے ڈھنگ سے اور اپنی قوت کے مطابق نپٹنے کی ہمت اور جسارت رکھنا ایک صحت مند قومی جذبہ تھا۔ ہو بہو یہی کام تھا جو 1857ء کے ہندوستانی باغی راہنماؤں نے کیا۔ البتہ وہ ایسے تصورات اور خیالات نہ رکھتے تھے اور نہ ہی رکھ سکتے تھے جو ہندوستان کی قومی تحریکِ آزادی اور دوسری نوآبادیاتی تحریکات کو بیسویں صدی کے دوران میں حاصل ہوئے۔ لیکن 1857ء کی قومی بغاوت کا جدید قومی آزادی کی تحریکات کے معیار سے جائزہ لینا تاریخی بے اصولی ہے اور ہر لحاظ سے سائنٹیفک طریقے کے منافی ہے۔

لکھنو میں برجیس قدر، والی لکھنو نے ایک اعلان جاری کیا جس میں یہ کہا گیا تھا: ''تمام ہندو اور مسلمان جانتے ہیں کہ ہر انسان کو چار چیزیں عزیز ہیں: مذہب، عزت، جان اور مال۔ یہ چاروں چیزیں ملکی حکومت کے تحت ہی محفوظ ہوتی ہیں۔'' (48)

غرضیکہ مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ باغی راہنما کیوں برطانوی حکومت سے نفرت کرتے تھے اور کیوں انہوں نے اپنی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔ 58-1857ء کی بغاوت کا بنیادی مقصد ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی تباہی اور اس کی جگہ ہندوستانی حکومت کا قیام تھا۔ پہلا ایک تخریبی قدم تھا اور دوسرا جدوجہد کا تعمیری جز تھا۔ اگر اس سے یہ شورش قومی بغاوت کا رنگ

اختیار نہیں کرتی تو اور کس چیز سے کرے گی۔

3-ایک معاشی نظام کی بربادی

ہندوستان میں برطانوی فتح کا مطلب صرف یہ تھا کہ اس پر غیر ملکی حکومت مسلط ہو گئی بلکہ اس سے بھی زیادہ بُری بات یہ تھی کہ خود ہندوستان کے روایتی مجلسی نظام کو تباہ کیا گیا اور ایک نئے نظام کی جانب بڑھنے کے لئے راہ مسدود کر دی گئی۔ مارکس اُس زمانے کا واحد مُفکر تھا جس نے سائنٹیفک ڈھنگ سے اس المناک واقعے کا مطالعہ کیا۔ اس نے ہندوستان میں برطانوی شہنشاہیت پرستی کے کردار کو ایسے صحیح رنگ میں پیش کیا کہ بعد میں ہندوستانی علماء کی تحقیقات سے اس کے نتائج کی تصدیق ہوئی۔ اس تجزیے سے ہندوستانی محبِ وطن کو ہندوستان کی حقیقتِ حال کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد ملی اور ہندوستان کے قومی اندازِ فکر میں ترقی پسندانہ رجحان پیدا ہوا۔

1853ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر کی تجدید کے موقع پر برٹش پارلیمنٹ میں ہندوستان کی صورتِ حال پر بحث ہو رہی تھی تو مارکس نے اپنے ایک مقالے بعنوان ''برٹش رول اِن انڈیا'' (British Rule in India) میں لکھا:

''خانہ جنگیوں، حملوں، انقلابات، فتوحات اور قحط کی جو بھی بلائیں ہندوستان کی سرزمین پر پے در پے نازل ہوئیں، وہ کتنی ہی پیچیدہ، اچانک اور تباہ کن رہی ہوں لیکن ان سب کا اثر سطحی تھا۔ انگلستان نے ہندوستان کا سماجی ڈھانچہ یکسر توڑ ڈالا ہے اور ابھی تک ازسرِ نو تعمیر کے آثار دکھائی نہیں دیتے۔ پُرانی دنیا کے کھونے اور اس کی جگہ نئی دنیا نہ پانے سے ہندوستان کی موجودہ خستہ حالی میں ایک قسم کی افسردگی کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ ہندوستان برطانیہ کے زیرِ حکومت اپنی تمام قدیم روایات اور اپنے ماضی کی تمام تاریخ سے محروم ہو گیا ہے۔ یہ برطانوی ناخواندہ مہمان ہی تھا جس نے ہندوستانی دستکاری ختم کی اور چرخہ تباہ کر دیا۔ برطانوی بھاپ اور سائنس نے ہندوستان کی سرزمین پر زراعت اور صنعت کا رشتہء اتحاد منقطع کر دیا۔'' (49)

مارکس نے اپنی ایک اور تصنیف میں اس مسئلے کو وسیع تر سطح پر پیش کیا: ''چین اور ہندوستان کے ساتھ برطانیہ کے تعلقات سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ نظامِ سرمایہ داری سے پہلے کے پیداوار کے قومی طریقوں کی اندرونی استواری اور مضبوطی نے غیر ملکی تجارت کے تباہ کن اثرات

سے کس طرح مدافعت کی۔ یہاں طریقہ پیداوار کی وسیع بنیاد چھوٹے پیمانے کی زراعت اور گھریلو صنعت کے اتحاد پر قائم ہے اس کے ساتھ ہی ہندوستان میں مشترک ملکیت پر مبنی پنچایتیں بھی ہیں۔ چین میں بھی ابتدائی نظام اسی قسم کا تھا۔ ہندوستان میں انگریزوں نے حکمرانوں اور زمینداروں کی حیثیت سے چھوٹی چھوٹی اقتصادی تنظیموں کا شیرازہ بکھیرنے کی خاطر اپنے بلاواسطہ سیاسی اور معاشی اقتدار سے کام لیا۔ برطانوی تجارت ان تنظیمات پر انقلاب انگیز اثر ڈالتی ہے اور ان کو صرف اس حد تک پاش پاش کرتی ہے کہ اپنے سستے مال کے ذریعے ان کی کتائی اور بنائی کی صنعتوں کو تباہ کردے جو اس اتحاد کا قدیم اور لازمی جُز ہیں۔'' (50)

قدیم معاشی نظامِ کی اس بربادی کا اہم ترین پہلو زرعی تعلقات کے ساتھ وابستہ تھا۔ یہ بات اہم ہے کہ ایک دور اندیش اینگلو انڈین سیاستداں سر تھامس منرو نے اپنی فراست کی بنا پر یہ پیش گوئی کی تھی: ''ہندوستان میں جن کے اختیار میں زمین کے مالیہ کی تشخیص ہوتی ہے انہیں کے ہاتھوں میں ملک کے امن و امان کی باگ ڈور ہوتی ہے۔'' (51) ہمارے بندوبستِ آراضی کی جو بربادی انگریز حکمرانوں کے ہاتھوں ہوئی اس کا بہترین بیان کارل مارکس نے اپنے لاجواب طریقے سے یوں کیا ہے: ''اگر کسی قوم کی تاریخ معاشیات میں ناکام، بیہودہ اور عملی طور پر رسوائے عالم تجربات کا پلندہ ہے تو وہ ہندوستان کے انگریزی نظام کی تاریخ ہے۔ بنگال میں انہوں نے انگریزی نظامِ آراضی کی بگڑی ہوئی نقل کی۔ جنوب مشرقی ہندوستان میں تھوڑی تھوڑی آراضی کی تقسیم کا ڈھونگ رچا۔ شمال مغرب میں انہوں نے حتی المقدور زمین کی مشترک مالک ہندوستانی گرام پنچایت کے ساتھ یہی کیا۔'' (52)

برطانوی اصلاحات کا مطلب گرام پنچایت کے نظام پر مبنی ہندوستانی زراعت کی روایتی بنیاد کو سراسر تباہ کرنا تھا۔ مارکس نے اس گرام پنچایت سسٹم کو ایک ''ایسا سماجی نظام قرار دیا جو خاص خصوصیات رکھتا تھا۔ اسے دیہاتی نظام کہہ سکتے ہیں جس سے اس قسم کی ہر چھوٹی انجمن (پنچایت) نے آزاد تنظیم اور مخصوص زندگی کا رنگ پایا۔'' ایک اور بدعت جو انگریزوں نے رائج کی وہ زمین کو نجی ملکیت قرار دینا تھا۔ دونوں بدعتوں کا مطلب ہندوستانی زراعت کی تباہی اور زمینداروں کی عام بے دخلی تھا۔

برطانوی شہنشاہیت پرستی کے نظریاتی مبلغوں نے اس اہم فرق کو جو برطانیہ کی زرعی پالیسی

سے ظاہر تھا اور اس سے پیدا ہونے والے تباہ کن نتائج کو تسلیم کیا مثلاً سر جان اسٹریچی نے اپنی کتاب ''انڈیا، اِٹس ایڈمنسٹریشن اینڈ پراگریس'' (India, Its Administration and Progress) میں جس نے اپنی ایک پوری پشت کے لئے تعلیمی نصاب کا کام دیا، بیان کیا ہے:

''ہماری پالیسی یہ رہی ہے کہ زمین کی نجی ملکیت کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ سابقہ حکومتوں نے ایسی ملکیت کے وجود کو کبھی تسلیم نہ کیا۔'' (53)

اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ ان پر قرض کا بوجھ ہماری حکومت سے پہلے کی نسبت اب زیادہ ہے کیوں کہ زمین کی نجی ملکیت کا حق دراصل ہم نے خود ہی پیدا کیا ہے۔ جب عملی طور پر ایسا کوئی حق نہ تھا تو نسبتاً کسی کی کوئی ساکھ بھی نہ تھی۔ جو کوئی زمیندار قرض لینے کا خواہاں ہوتا وہ موزوں ضمانت پیش نہ کر سکتا تھا اس لئے مقروضیت بہت کم تھی۔'' (54)

''اگر کوئی زمیندار مقررہ تاریخ پر مالیہ جمع نہیں کر پاتا تو اس سے اس کی وجہ نہیں پوچھی جاتی بلکہ اس کی جائیداد نیلام کر دی جاتی ہے۔'' (55)

ماضی کے اس زرعی نظام کے بارے میں جو انگریزوں نے رائج کیا اور جس سے عوام میں اتنی بیزاری تھی، سر سیّد احمد خاں کی رائے جاننا مفید ہوگا۔ انگریز سر سیّد احمد خاں کو بہت دانشمند اور قابل منتظم سمجھتے تھے۔ انہیں بندوبست آراضی سے متعلق زندگی بھر کا ذاتی تجربہ تھا۔ اب میں ان کی کتاب ''اسباب بغاوتِ ہند'' سے چند اقتباس پیش کرتا ہوں۔

''سابقہ حکمرانوں کے عہد میں ملکیتِ آراضی کے حقوق کی خرید و فروخت، رہن اور انتقال بذریعہ ہبہ کا بے شک رواج تھا لیکن بہت کم اور وہ بھی فریقین کی خواہش اور رضامندی کے ساتھ عمل میں آتا تھا۔''

''انگریزی حکومت کے شروع زمانے میں جائیداد آراضی کی فروخت اس کثرت کے ساتھ ہوئی کہ سارا ملک تہ و بالا ہو گیا۔''

''قرض کی ادائیگی کے لئے زمین کی فروخت کا رواج بھی نہایت قابلِ اعتراض ہے۔ ساہوکاروں اور سود خوروں نے زمینداروں کو پیشگی رقم دے کر اس سے فائدہ اٹھایا ہے اور انہیں جائیداد سے محروم کرنے کے لئے طرح طرح کی دغابازی اور شرارت سے کام لیا ہے۔ انہوں نے دیوانی عدالتوں میں لاتعداد مقدمے دائر کئے ہیں، کچھ جھوٹے کچھ سچے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہ

عام طور پر پرانے زمینداروں کے بے دخل کر کے چپکے سے ان کی جائیدادوں پر قابض ہو گئے ہیں۔اس قسم کے مصائب نے ملک کے طول وعرض میں زمینداروں کو برباد کر دیا ہے۔''

''برطانوی حکومت نے جو بندوبست مالیہ کا طریقہ نافذ کیا ہے وہ اس کے لئے نہایت قابلِ فخر ہے۔لیکن یہ سابقہ تشخیصات کی نسبت بھاری ہے۔ پہلے کاشتکار کی اصلی پیداوار کے خاص حصے کی صورت میں مالیہ وصول کیا جاتا تھا۔انگریزی سرکار نے جو لگانِ آراضی عاید کئے ہیں ان میں ناگہانی حادثات کی رعایت نہیں رکھی گئی ہے۔''(56)

یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اس زرعی انقلاب نے فی الواقع دیہات میں تمام طبقوں اور فرقوں کو بیگانہ کر دیا ہے۔ڈاکٹر سین بجا فرماتے ہیں:

''صرف زمیندار اور تعلقدار ہی اپنے آبائی پیشوں سے محروم نہیں ہوئے، نئے قانون بیچ نے کسان کو بھی یکساں طور سے پریشان کر دیا۔وہ دائمی طور پر مقروض رہتا اور بنیا جو گاؤں کا ساہوکار تھا دیانتدار قرض خواہ نہ تھا۔وہ بھاری سود وصول کرتا اور دغا بازی سے ہرگز دریغ نہ کرتا۔ پہلے قرض دار اپنے جاگیردار آقاؤں کے زیرِ سایہ محفوظ تھے لیکن نئے قانون نے غیر ادا شدہ قرضوں کے عوض زمین کی فروخت کی اجازت دے دی اور کسان زمین کے ساتھ اپنا پیشہ بھی کھو بیٹھتا۔نہ صرف مشترکہ مصیبت کی وجہ سے بلکہ سرپرستی اور وفاداری کے روایتی تعلقات نے بھی زمین سے بے دخل کئے گئے زمیندار اور کسان کو متحد کر دیا۔زمیندار اپنے گاؤں میں رہتا تھا اور اگرچہ کسان اکثر اس کے ہاتھوں سختی جھیلتا لیکن پھر بھی مشکل کے وقت وہ اپنے آقا کی امداد اور ہمدردی پر بھروسہ رکھ سکتا تھا۔بنیا البتہ باہر کا آدمی تھا۔وہ کسان کے حقوقِ ملکیت اور اس کا قطعہ زمین مالی منافع کی خاطر خرید لیتا۔اس لئے بنیے اور کسان کے درمیان عام طور پر محبت یا وفاداری کا جذباتی رشتہ ممکن نہ تھا اور کسان اب بھی اپنے سابق جاگیردار آقا کا ساتھ دینے پر مجبور تھا۔''(57)

وسطی ہندوستان میں صورتِ حال یکساں طور پر خراب تھی۔ڈاکٹر لوجس نے وسطی ہندوستان میں سر ہیوگ روز کے ساتھ خدمت انجام دی، بیان کرتا ہے:''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جائیدادوں کے پے در پے ضبط کئے جانے کی وجہ سے ان کے مدّت سے دبے ہوئے جذبات اس حد تک بھڑک اُٹھے ہیں کہ ان پر قابو پانا مشکل ہے۔''ایک بوڑھے دیہاتی کے حوالے سے وہ مزید بیان

کرتا ہے: ''صاحب! جنگلات، درخت، دریا، کنویں تمام دیہات اور تمام مقدس شہر سرکار کی ملکیت ہیں۔ انہوں نے سب کچھ چھین لیا ہے۔ ہر چیز! بتایئے ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' (58)

اس پس منظر میں بہادر شاہ کے باغیانہ اعلان کی اہمیت نمایاں ہے:

''یہ ظاہر ہے کہ برطانوی سرکار نے لگانِ آراضی کی تشخیص کے وقت بھاری جمعات (ٹیکس) ٹھونس دیئے تھے اور پھر مالگذاری کی عدم ادائیگی کی صورت میں جاگیرداروں کی جائیدادیں نیلام کر کے انہیں رسوا اور تباہ کیا۔''

''زمینداریوں سے متعلق مقدمہ بازیاں بھاری قیمت کے اسٹامپ اور عدالت کے غیر ضروری اخراجات کی وجہ سے مقدمہ باز کنگال ہوتے جا رہے ہیں۔ عدالتوں کی بدعنوانیاں زوروں پر ہیں اور مقدمے برسوں چلتے رہتے ہیں۔''

''اس کے علاوہ زمینداروں کی جیب پر ہر سال اسکولوں، ہسپتالوں اور سڑکوں کے لئے چندوں کا بار پڑتا ہے۔ ایسی جبری وصولیاں بادشاہی حکومت میں قطعاً ممنوع تھیں بلکہ اس کے برعکس جمعات ہلکے ہوں گے۔ زمینداروں کی عزت و آبرو محفوظ تھی۔ ہر زمیندار اپنے علاقے میں خودمختار تھا۔ زمینداروں کے تنازعوں کا فیصلہ شرع اور شاستر کے مطابق جھٹ پٹ اور بلا خرچ ہو جاتا ہوگا۔ جو زمیندار اپنے آدمیوں اور روپے کے ساتھ اس جنگ میں شریک ہوں گے انہیں ہمیشہ کے لئے نصف لگان معاف کر دیا جائے گا۔ جو زمیندار صرف روپے کے ساتھ مدد کریں گے ان کا ایک چوتھائی لگان ہمیشہ کے لئے معاف کر دیا جائے گا۔ جو زمیندار انگریزوں کی حکومت کے دوران اپنی آراضی سے ناجائز طور پر محروم کیا گیا ہے اگر وہ بذاتِ خود جنگ میں شریک ہوگا تو اس کی زمینداری بحال کر دی جائے گی اور اُسے لگان کا چوتھا حصہ معاف کر دیا جائے گا۔'' (59)

بہادر شاہ کے اعلان میں صرف زمینداروں کا ذکر کیا گیا ہے، کسانوں کا نہیں۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے جس کی وضاحت ہم بعد کے کسی باب میں کریں گے۔ کسانوں کے مفاد کی حمایت مجلس کے توسط سے کی جاتی تھی جو بندوبستِ آراضی کو بدلنے اور زمین پر صرف کاشتکاروں کا حق تسلیم کرنے کا منصوبہ باندھ رہی تھی۔

اٹھارہویں صدی کے بعد ہندوستان ایک صنعتی دیش بھی تھا اور خوش حال زراعتی ملک بھی۔ کرگھے پر بُنے ہوئے ہندوستانی کپڑے اور دوسری ہندوستانی مصنوعات دنیا بھر میں مشہور تھیں

اور ہندوستان کا مال ایشیا اور یورپ کی منڈیوں کو جاتا تھا۔ انگریزوں نے ہندوستان کی صنعت و حرفت کو تباہ کر دیا اور انہیں بالکل مختلف سمت میں ڈال دیا۔ ڈاکٹر ڈی۔ آر۔ کیڈگل کا بیان ہے:

''یوں تو زوال اٹھارہویں صدی کے اختتام پر ہی شروع ہو گیا تھا لیکن انیسویں صدی کے وسط میں یہ نمایاں طور پر ظاہر ہوا۔'' (60)

انحطاط کا یہ عمل غیر ملکی حکومت کے قیام سے شروع ہوا (ہندوستان کے دیسی درباروں کے خاتمے کی وجہ سے جو مال کی مانگ کے بڑے مرکز تھے) غیر ملکی اثر و رسوخ کے زور سے تیز ہوا اور غیر ملکی مال کے مقابلے میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

''شہری صنعت کے زوال سے زمین پر دباؤ ضرور بڑھ گیا لیکن اس لئے نہیں کہ لوگ شہروں سے ہجرت کر کے گاؤں کو جا رہے تھے (ایسا بالکل نہیں ہوا) بلکہ ان لوگوں کے رہ جانے کی وجہ سے جو عام حالات میں شہری صنعتوں میں جذب ہو جاتے۔'' (61)

''بنگال کی فتح کے بعد بنگال میں اور آگے چل کر سارے ہندوستان میں ہندوستان کو لوٹنے کے لئے تجارت کے جبری اور غیر مساوی طریقوں سے کام لیا گیا اور یہ ملک کی اقتصادی تباہی کا سبب ہوا۔ آر۔ پی۔ دت کا بیان ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کے حکمراں طبقہ بن جانے کے بعد کس طرح صورتِ حال میں ماہیتی تبدیلی رونما ہوئی۔ کس طرح زرمبادلہ کے توازن کو سازگار بنانے اور کم سے کم قیمت پر زیادہ سے زیادہ مال حاصل کرنے کی غرض سے اقتدار کے ہتھکنڈوں کا روز افزوں استعمال ہونے لگا۔'' (62)

اٹھارہویں صدی کے اختتام تک اور خاص کر 33-1813ء تک ہندوستان کے بارے میں برطانوی پالیسی میں تبدیلی آ چکی تھی۔ غیر مہذب لوٹ کے ایک دور اور ہندوستانی صنعت و حرفت کی باقاعدہ تباہی کے بعد برطانیہ کے دولت مند طبقے نے جس کا صنعتی انقلاب مکمل ہو چکا تھا، ہندوستان کو اپنے مال کی کھپت، خاص کر برطانیہ کے بنے کپڑے کی منڈی کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ مارکس نے اس نمایاں تبدیلی کو محسوس کیا اور 1853ء کے دوران اپنے ایک مقالے میں لکھا:

''تجارت کی نوعیت یکسر بدل گئی ہے 1813ء تک ہندوستان زیادہ تر مال برآمد کرنے والا ملک تھا لیکن اب درآمد کرنے والا ملک بن گیا ہے اور یہ تبدیلی اتنی تیزی سے واقع ہوئی ہے کہ

روپیہ کی شرح زرِمبادلہ جو عام طور پر 2/6 فی روپیہ ہوتی تھی۔ 1823ء ہی میں گر کر 2/0 فی روپیہ ہو گئی۔ ہندوستان جو قدیم زمانے سے دنیا کے لئے سوتی کپڑے کی صنعت کا مرکز تھا، اب انگریزی دھاگوں اور موٹے سوتی کپڑوں سے پاٹ دیا گیا۔ ایک طرف ہندوستان کی پیداوار کو انگلستان جانے نہ دیا جاتا، اور اگر جانے بھی دیا جاتا تو نہایت کڑی شرطوں پر، دوسری طرف برطانوی مصنوعات برائے نام محصول پر بکثرت درآمد ہونے لگیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی سوتی ململ جو کبھی دنیا بھر میں مشہور تھی اس کی صنعت ناپید ہو گئی۔"(63)

ایسٹ انڈیا کمپنی کی پالیسی نے آزاد تاجر طبقے کو بھی تباہ کیا اور صنعت کاروں اور دستکاروں کو بھی۔ پروفیسر رام کرشن مکرجی نے اس عمل کو یوں بیان کیا ہے:

"اس مادی دنیا سے ہندوستانی کاری گروں کے اخراج کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے تاجر طبقے کی تباہی کا بھی عمل شروع ہوا۔ ہندوستان کی پیداوار کی اجارہ داری انگریزوں کے ہاتھوں میں جانے کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستانی تاجروں کا زندہ رہنا محال ہو گیا۔ صرف وہی لوگ اس پیشے کو جاری رکھ سکتے تھے جو کمپنی کی کٹھ پتلی بننے پر رضامند تھے یا اس کے ملازموں کی جو ہندوستان میں رہتے تھے ورنہ انہیں کوئی نیا ذریعہ معاش تلاش کرنا پڑتا۔ جن اشیاء کے انگریز اجارہ دار تھے ان کی براہِ راست خریداری ہندوستانی تاجروں کے لئے نہ صرف ممنوع تھی بلکہ کمپنی کے کارندے اور ملازم ایسا مال ہندوستانی تاجروں پر بازار سے زیادہ قیمت پر ٹھونستے تھے۔"(64)

آزاد تاجر طبقہ ایک حد تک صنعت کار طبقے کا بھی کام دیتا تھا لیکن اجارہ دار ایسٹ انڈیا کمپنی نے اسے نیست و نابود کر کے ہندوستانی معیشت کے ایک بہت اہم طبقے کو تباہ کر دیا جو اس کا حریف ہو سکتا تھا۔

اس واقعے کے ایک اور پہلو کا، کے۔ ایم۔ پانیکر نے یوں تجزیہ کیا ہے: "ہندوستان کے بڑے بڑے ساحلی علاقوں میں یورپی تجارتی مراکز کے قیام کے ساتھ ایک طاقتور ہندوستانی سرمایہ دار طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس کا غیر ملکی تاجروں کے ساتھ قریبی رابطہ تھا اور جو ان کے ساتھ تجارت کر کے بھاری منافع کماتا تھا۔ بنگال کے مارواڑی لکھ پتی طبقے کی وہی حیثیت تھی جو آگے چل کر شنگھائی کے یورپی تاجروں کے ایجنٹوں کو حاصل ہوئی۔ اس طاقتور طبقے کا ظہور جس کے اقتصادی مفادات غیر ملکی تاجروں کے مفادات کے ساتھ وابستہ تھے اور جنہیں مسلمانوں کی حکومت سے

پیدائشی نفرت تھی ہندوستان اور ایشیا کی تاریخ میں بنیادی اہمیت کا واقعہ تھا۔''(65) کمپنی اور برطانوی تاجروں کے یہ ہندوستانی کارندے گماشتے اور بنیے کہلاتے تھے۔ انہوں نے غیر ملکی سرمایہ داروں کے نائب گماشتوں کی حیثیت سے کام کیا اور 1857ء کی بغاوت میں انگریز دوستی کا پارٹ ادا کیا۔

مذکورہ بالا صورتِ حال اور حکومت کی پالیسیوں کے بارے میں سمجھ دار ہندوستانیوں کا ردِ عمل کیا تھا؟

اہلِ حدیث کے بلند پایہ مسلمان عالم علامہ فضل حق خیر آبادی کے بیان کا حوالہ دینا مفید ہوگا انہوں نے 1857ء کی بغاوت میں راہنما کا پارٹ ادا کیا اور عمر قید کی سزا پائی۔

''اقتدار حاصل کرنے کے بعد انگریزوں نے فیصلہ کیا کہ کھانے کی چیزوں پر پابندی لگا کر چارے اور غلّے پر قبضہ کر کے اور کاشتکاروں اور کسانوں کو حقوق کاشت سے جو من نقد روپیہ دے کر لوگوں کے مختلف طبقات کو مطیع کیا جائے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ غریب لوگوں اور دیہاتیوں کو اناج کی خرید و فروخت میں کھلی چھٹی نہ ہو۔ اپنی قوم کے آدمیوں کو ترجیح دے کر وہ نرخوں کے گرانے بڑھانے پر اختیار رکھنا چاہتے تھے تاکہ بندگانِ خدا عیسائیوں کی اجارہ داری کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں اور اپنی ضروریات کے لئے عیسائیوں پر انحصار رکھنے کے لئے مجبور ہو جائیں اور اس طرح عیسائیوں اور ان کے حامیوں کے مقاصد، ان کی دلی خواہشات اور آرزوئیں اور ان کے باطن میں پوشیدہ شرارتیں پایہ تکمیل کو پہنچیں۔''(66)

اس پس منظر میں دہلی کے باغیوں کے دوسری طرف سے بہادر شاہ کی جاری کردہ اپیل معنی خیز تھی۔ اعلان میں تاجروں سے مدد کے لئے یوں التجا کی گئی:

''ظاہر ہے کہ کافر اور دغاباز برطانوی حکومت نے تمام نظمیں اور قیمتی تجارتی اشیاء پر اجارہ داری حاصل کر لی ہے مثلاً نیل، کپڑا اور دوسری سمندر پار برآمد ہونے والی چیزیں۔ لوگوں کے ہاتھ میں صرف معمولی چیزوں کا بیوپار رہ گیا ہے اور اس میں بھی انہیں منافع کے ایک حصے سے محروم رکھا گیا ہے جو وہ محصول اور اسٹامپ کی فیسوں وغیرہ کی شکل میں وصول کر لیتے ہیں۔ غرضیکہ لوگوں کی تجارت محض نام کی ہے۔ اس کے علاوہ تاجروں کے منافع پر محصول، ڈاک، جنگ، اسکولوں وغیرہ کے لئے چندوں کا بار پڑتا ہے۔ ان تمام رعایاتِ خصوصی کے باوجود کسی شہدے کے

اشارے یا شکایت پر تاجر قید کر لئے جاتے ہیں اور رسوائی کے سزاوار ٹھہرتے ہیں۔

''جب بادشاہی حکومت قائم ہو جائے گی تو تمام مذکورہ بالا عیارانہ دستور ختم کر دیئے جائیں گے اور بلا استثنا ہر چیز کی تجارت، برّی ہو یا بحری، ہندوستان کے ملکی تاجروں پر کھول دی جائے گی اور وہ سرکاری دخانی کشتیوں اور گاڑیوں سے اپنا مال مفت لے جا سکیں گے۔ جن تاجروں کے پاس اپنا سرمایہ نہیں ہے ان کی مدد سرکاری خزانے سے کی جائے گی۔ اس لئے ہر تاجر کا فرض ہے کہ وہ جنگ میں حصہ لے اور آدمیوں اور روپے کے ساتھ بادشاہی سرکار کی کھلم کھلا یا خفیہ مدد کرے جیسا کہ اس کی حالت اور مفاد کا تقاضہ ہو اور برطانوی حکومت کے تئیں وفاداری ترک کرنے کی قسم کھائے۔'' (67)

''یہ ظاہر ہے کہ فرنگیوں نے ہندوستان میں انگریزی چیزوں کو رواج دے کر جولاہوں، روئی دھننے والوں، بڑھئیوں، لوہاروں اور موچیوں وغیرہ کو بیکار کر دیا ہے اور ان کے تمام پیشوں پر قبضہ کر لیا ہے یہاں تک کہ ہر قسم کا دستکار بھکاری بن کر رہ گیا ہے لیکن بادشاہی حکومت کے عہد میں صرف ملکی دستکار ہی بادشاہوں، راجاؤں اور امیروں کی ملازمت میں لئے جائیں گے۔ یہ یقیناً ان کی خوش حالی کی ضمانت ہو گی۔ اس لئے ان دستکاروں کو انگریزوں کی ملازمت ترک کر دینا چاہئے اور جنگ میں مصروف مجاہدین کی مدد کرنی چاہئے تاکہ وہ دنیاوی اور ابدی سعادت کے حقدار بنیں۔'' (68)

ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کے معاشی اور سیاسی عمل دخل نے ہمارے ملک کی ساری دولت نچوڑ لی۔ اسے ہندوستان کے معاشی مورخین نے اقتصادی نکاس کا نام دیا ہے۔ اب ہم 1857ء کی بغاوت سے عین پہلے کی حالت کا مشاہدہ کریں گے۔

ایک نام نہاد ''ہندوستانی قرضہ تھا جسے کمپنی نے ہندوستان میں اپنی حیثیت کو مستحکم کرنے، مہموں اور جنگوں کے ذریعے اپنے اثر و رسوخ کو اور بڑھانے، انگلستان میں حصہ داروں کو بھاری منافع دینے، 1769ء سے برطانوی سرکاری خراج ادا کرنے اور انگلستان کے مقتدر اشخاص کو رشوتیں دینے پر صرف کیا تھا۔'' (69) یہ ہندوستانی قرضہ کیوں اور کیسے وجود میں آیا اس سلسلے میں آر۔ سی۔ دت نے یہ خیال ظاہر کیا ہے: ''اس ملک (انگلستان 1903ء) میں یہ ایک عام غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ تمام ہندوستانی قرضے سے مراد وہ برطانوی سرمایہ ہے جو ہندوستان کی ترقی میں لگایا

گیا ہے۔اس کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ہندوستان کے سرکاری قرضے کی ماہیت یہ نہیں ہے۔ 1857ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا خاتمہ ہوا تو اس نے ہندوستان کے نام سات کروڑ روپے کے قرضے کی بھاری رقم نکال دی۔اس اثنا میں انہوں نے ہندوستان سے سُود کے علاوہ پندرہ کروڑ روپیہ سے زیادہ خراج وصول کرلیا تھا جو مالی نقطہء نظر سے ایک ناجائز خراج تھا۔انہوں نے جنگِ افغانستان، جنگِ چین اور ہندوستان سے باہر دوسری جنگوں کے اخراجات ہندوستان پر ڈال دیئے۔اس لئے انصاف کی رو سے ہندوستان پر کوئی قرضہ نہیں تھا جب کمپنی کی حکومت ختم ہوئی۔ اس کا سرکاری قرضہ ایک فرضی قصہ تھا۔جو رقمیں ہندوستان سے وصول کی گئیں ان میں سے دس کروڑ روپے کی کافی بڑی رقم ان کے حق میں نکلتی تھی۔"(70)

منٹگمری مارٹن نام کا ایک انگریز ہندوستانی لوگوں کے ساتھ ہمدردی رکھتا تھا۔اس نے 1838ء میں لکھا تھا:"برطانوی ہندوستان پر تیس لاکھ پونڈ کا یہ سالانہ بوجھ تیس سالوں میں بارہ فی صدی سود مرکب کی شرح سے (عام ہندوستانی شرح سود) بہتر کروڑ انتالیس لاکھ ستانوے ہزار نو سو تیرہ پونڈ کی کثیر رقم بن گئی یا کم شرح پر بیس لاکھ پونڈ پچاس سالوں میں آٹھ ارب چالیس کروڑ پونڈ بنتا ہے۔ایسے مستقل اور روز افزوں بار سے تو انگلستان بھی جلد کنگال ہو جاتا، ہندوستان پر اس کا کتنا ناگوار اثر پڑا ہوگا جہاں ایک مزدور کی روزانہ اُجرت دو تین پنس ہو۔"(71)

اس نے مزید کہا:"پچاس سال تک متواتر ہم ہندوستان سے بیس سے تیس لاکھ اور بعض اوقات چالیس لاکھ پونڈ ہر سال نکالتے رہے ہیں۔یہ کثیر رقم برطانیہ عظمیٰ کو اس لئے بھیجی گئی ہے کہ تجارتی سٹہ بازی کے خساروں کو پورا کیا جائے، قرضوں کے سود ادا کئے جائیں۔محکمہء داخلہ کے عملے کو قائم رکھا جائے اور جن انگریزوں نے ہندوستان میں زندگی بسر کی ہے ان کی جمع کی ہوئی دولت کو انگلستان میں لگایا جائے۔میرے خیال میں انسانی سوجھ بوجھ کے لئے یہ ناممکن ہے کہ ہندوستان جیسے دور دراز ملک کو تیس چالیس لاکھ پونڈ کے مستقل سالانہ نقصان کے بُرے اثرات سے کلیتاً بچا سکے جب کہ یہ رقم کسی بھی شکل میں اسے واپس نہیں دی جاتی۔"(72)

پروفیسر رام کرشن مکرجی نے اور زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ بات کہی:"اس خراج کی مکمل تصویر اس سے کہیں زیادہ رقم کو ظاہر کرتی ہے جس کا ذکر مارٹن نے 1838ء میں کیا۔اگرچہ 1855ء، 1856ء اور 1857ء تین برسوں میں چونسٹھ لاکھ چھتیس ہزار تین سو پینتالیس پونڈ کی

فاضل درآمد ظاہر ہوتی ہے (اس لئے نہیں کہ غیر ملکی حکمرانوں نے اپنی پالیسی بدل لی تھی بلکہ اس لئے کہ ہندوستان میں کچھ برطانوی سرمایہ ریلوے بنانے اور ملک کو تیار کرنے میں لگایا گیا تاکہ برطانوی صنعتی سرمایہ اس سے استفادہ کر سکے) لیکن کمپنی کی حکومت کے آخری دور کے چوبیس سالوں کے دوران یعنی 35-1834ء سے 58-1857ء تک کل خراج جو ہندوستان سے مصارف محکمہ داخلہ اور ہندوستان کے فاضل برآمد کی شکل میں وصول کیا گیا پندرہ کروڑ اٹھارہ لاکھ تیس ہزار نو سو نواسی پونڈ تک پہنچ گیا۔ اس سے تریسٹھ لاکھ پچیس ہزار آٹھ سو پچھتر پونڈ کی سالانہ اوسط نکلتی ہے جو اس مدت میں جمع کئے گئے۔ سالانہ لگانِ آراضی کے لگ بھگ نصف کے برابر ہے۔'' (73)

یہ ایک ایسی بھیانک حقیقت تھی جو ہندوستان کی صدیوں پرانی تاریخ میں کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ بقول مارکس: ''اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ جو مصیبت انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان پر نازل ہوئی ایسی انتہائی اور شدید قسم کی مصیبت ہندوستان نے پہلے کبھی نہ اٹھائی تھی۔'' (74)

انگریزوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے عہد میں ہندوستان کے معاشی نظام کو سراسر درہم برہم کر دیا۔ انہوں نے قدیم بندوبست آراضی کو تہ و بالا کر دیا۔ انہوں نے ملک کی صنعت و حرفت کو پاش پاش کر دیا۔ ہندوستان کی معیشت کے ان دو شعبوں کے درمیان رابطے کو منقطع کر دیا۔ ہمارے ملک کی دولت کو باقاعدگی کے ساتھ نکال کر اپنے ملک میں لے گئے اور ہماری معیشت کی پیداوار کے سرچشموں کو خشک کر دیا۔ ہندوستانی سماج کے ہر طبقے نے اس نئے غارت گر کے ہاتھوں سختی جھیلی۔ زمینداروں کو ان کی زمین سے بے دخل کر دیا گیا اور کسان کنگال ہو گئے۔ تاجروں کے شہری متوسط طبقے کا بحیثیت ایک آزاد جماعت کے نام و نشان مٹ گیا۔ اہلِ صنعت و حرفت اپنے تخلیقی پیشوں سے محروم ہو گئے۔ ملک کے معاشی نظام اور اس کے ہر طبقے کی بے مثال تباہی کا قدرتی نتیجہ ایک عظیم سماجی انقلاب کی صورت میں رونما ہوا اور یہ 1857ء کی قومی بغاوت تھی۔ برطانیہ کی سراسر تباہ کن پالیسی نے اس کی حکومت کے خلاف ایک وسیع عوامی بغاوت پیدا کی۔

البتہ ہندوستانی سماج کے اندر ان تخلیقی قوتوں اور طبقوں نے ابھی نشوونما نہیں پائی تھی (درحقیقت برطانیہ کی ابتدائی پالیسی نے ان کی پہلی کونپلیں ہی تباہ کر دی تھیں) جو اس انقلاب کی

فتح کے موجب ہوتے۔ 1857ء کی بغاوت اوراس کی ناکامی تاریخی طور پر دونوں ناگزیر واقعات تھے لیکن یہ بھی تاریخ کا ایک تقاضا تھا جس کے بعد نئے حالات رونما ہوئے (ان کا ہم بعد میں تجزیہ کریں گے) جن سے ہندوستانیوں کی جدید قومی تحریکِ آزادی پیدا ہوئی اور وہ نئی سماجی قوتیں ابھریں جو اس کی فتح کی موجب ہوئیں۔

3-مذہبی پہلو

1857ء کی بغاوت میں مذہب کو بڑا دخل تھا۔ برطانوی سیاستدانوں اور وقائع نگاروں نے اس پہلو کو بڑھا چڑھا کر اور غلط رنگ میں پیش کیا تاکہ وہ اپنے اس نظریے کو ثابت کر سکیں کہ 1857ء کی بغاوت رجعت پسندانہ، احیائے روایت کی حامی اور ان ترقی پسندانہ اصلاحات کے خلاف تھی جو وہ ہندوستانی سماج میں نافذ کر رہے تھے۔ انگریزی تعلیم پانے والے روشن خیال ہندوستانیوں کی پہلی پشت نے اس شہنشاہیت پرستانہ نظریے کو بلا چون و چرا قبول کر لیا کیوں کہ انہوں نے قدیم رجعت پسندانہ مذہبی اثرات کے باعث نقصان اٹھایا تھا۔ ایک صحیح تاریخی نظریے کا تقاضا ہے کہ ہم نہ اس تاریخی مرحلے کو بھولیں جس پر ہندوستانی سماج 1857ء سے عین پہلے پہنچ چکا تھا، نہ ان نظریاتی قدروں کو جو اس سماج کا معمول ہیں اور نہ ان نظریاتی صورتوں کو جو ہندوستانی لوگ اپنی آرزوؤں کو دے سکتے تھے۔

ہندوستانی جاگیردارانہ سماج کا شیرازہ انیسویں صدی کے وسط میں تیزی سے بکھر رہا تھا اور غیر ملکی فاتح ہماری کمزوریوں کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنا الو سیدھا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ ہمارے ملک پر ایک پرجوش اور منظم معاشی، سیاسی اور نظریاتی حملہ کر رہے تھے۔ سب سے بڑا مسئلہ جس سے ہندوستان کے تمام طبقے دوچار تھے، یہ تھا کہ ہندوستان کو ہندوستانیوں کے لئے محفوظ کر لیا جائے اور اسے فرنگیوں کے چوطرفہ حملوں سے بچایا جائے۔ اس وقت کی تاریخی صورت حال میں روایتی، مذہبی و تمدنی تصورات لازمی طور پر غیر ملکی حکومت کے خلاف ہندوستان کی نظریاتی جدوجہد کا اہم جز تھے، تاریخ کے اپنے مطالعے اور اپنی قسمت کو از سرِ نو بنانے کی خاطر لوگوں کی پشت ہا پشت کی جدوجہد کی بنا پر مارکس اس نتیجہ پر پہنچا تھا۔

''لوگ اپنی تاریخ بناتے ہیں لیکن اس طرح نہیں جس طرح وہ چاہتے ہیں۔ وہ اسے ایسے

حالات کے تحت نہیں بناتے جن کا انہوں نے خود انتخاب کیا ہو یا جو ماضی کی دین ہوں۔ تمام مردہ پشتوں کی روایت زندہ لوگوں کے دماغ پر بوجھ بن کر سوار رہتی ہے اور عین اس وقت جب وہ اپنے اندر اور گرد و پیش کی چیزوں میں انقلاب لانے یا کوئی ایسی چیز پیدا کرنے میں مصروف ہوتے دکھائی دیتے ہیں جس کا پہلے کوئی وجود نہ تھا تو انقلابی بحران کے عین اس دور میں وہ ماضی کی روحوں کو بے تابی کے ساتھ ملاتے ہیں اور ان سے نام، جنگ کے نعرے اور ملبوسات مستعار لیتے ہیں تا کہ وہ اس قدیم بھیس اور مانگی ہوئی زبان میں تاریخِ عالم کے نئے منظر کو پیش کریں۔" (75)

یہ کہنا بالکل صحیح نہیں کہ جو بڑی بڑی اصلاحات نافذ کی گئیں مثلاً ستی کی رسم کا انسداد، بیوہ کی دوبارہ شادی وغیرہ ان کے لئے انگریز حکمراں ذمہ دار تھے۔ صرف سیاسی پروپیگنڈے کی غرض سے ہی انگریز وقائع نگاروں نے بعد میں اس چیز کا دعویٰ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اصلاحات جن کی مدت سے ضرورت تھی جو ہندوستانی مصلحین شروع کر چکے تھے۔

انیسویں صدی کے آغاز تک برطانوی حکمران اس قدر مغرور اور اقتدار کے نشے سے مدہوش ہو گئے تھے کہ حکومت کے ضابطوں میں جان بوجھ کر ہندوستانی رسوم کو نظر انداز کرتے اور حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیتے۔ ہندوستانی عوام اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ سب کچھ انہیں آہستہ آہستہ عیسائی بنانے کا منصوبہ ہے۔ مثال کے طور پر جیلوں میں مشترک کھانا۔ زیادہ سنگین ایکٹ نمبر 31، 1850ء تھا جس کی رو سے مذہب بدلنے والے اپنی آبائی جائیداد کے وارث بن سکتے تھے۔ اس ردعمل کو جو اس قانون سے پیدا ہوا اور جس طرح اس قانون نے ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا کام آسان تر کر دیا اس کو سر سید احمد خاں نے یوں بیان کیا ہے:

"قانون ساز مجلس اس الزام سے بری نہیں ہے کہ اس نے مذہبی معاملات میں مداخلت کی ہے۔ 1850ء کے قانون نمبر 21 سے دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو یقیناً نقصان پہنچتا ہے۔ عام خیال ہے کہ یہ قانون اس مقصد سے پاس کیا گیا تھا کہ لوگوں کو بہکا کر عیسائی بنایا جائے۔ ہندو مذہب جیسا کہ معلوم ہے، دوسرے مذہب والوں کو ہندومت قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتا اس لئے اس قانون سے ہندوؤں کو کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ اگر کوئی آدمی اسلام قبول کرتا ہے تو وہ اپنے دین کی شرع کی رو سے اس جائیداد کی وراثت سے محروم ہو جاتا ہے جو دوسرے مذہب والا اس کے لئے چھوڑ مرے۔ اس لئے اس قانون سے کوئی نومسلم بھی فائدہ نہ

اٹھا سکتا تھا۔ البتہ اس سے ایسے آدمیوں کو بڑے فائدے پہنچتے جو عیسائی بنتے۔ اس لئے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ قانون نہ صرف لوگوں کے مذہب میں مداخلت کرتا ہے بلکہ تبدیلی مذہب کی زبردست ترغیب دیتا ہے۔''(76)

قدیم روایات میں یہ مداخلت فوجیوں پر بھی اثر انداز ہوئی۔ ذات پات کی نشانیوں کے استعمال کی ممانعت کر دی گئی۔ انہیں سمندر پار کرنے اور غیر ممالک میں جا کر برطانیہ کی جنگوں میں لڑنے پر مجبور کیا گیا اور سب سے زیادہ خطرناک چربی دار کارتوسوں کا استعمال تھا۔ برطانوی سپہ سالاروں اور سیاستدانوں نے اس بات سے غصے کے ساتھ انکار کیا کہ گائے یا سؤر کی چربی استعمال کی گئی ہے جس پر ہندوؤں اور مسلمانوں کو اعتراض ہے۔ بعد میں یہ ثابت ہو گیا کہ انہوں نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا تھا۔ اس مسئلے کی کئی برسوں تک پوری پوری چھان بین جاری رہی۔ کے اعتراف کرتا ہے کہ: ''اس میں کوئی شک نہیں کہ کارتوسوں کی تیاری میں گائے کی چربی استعمال کی گئی۔''(77) لارڈ رابرٹس کا بیان ہے: ''حکومتِ ہند کی دستاویزات میں مسٹر فارسٹ کی تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ کارتوسوں کی تیاری میں جو چکنا کرنے والی چیز استعمال کی گئی وہ واقعی قابلِ اعتراض اجزا یعنی گائے اور سؤر کی چربی سے مرکب تھی اور کارتوسوں کی ساخت میں فوجیوں کے مذہبی تعصبات سے ایسی لاپروائی کا اظہار کیا گیا جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔''(78)

بقول مایسن: ''چربیلا کارتوس ایک معمولی واقعہ تھا۔ یہ تو محض ایک دیا سلائی تھی جس سے سرنگ پھٹ گئی جو مدّت سے تیار ہو رہی تھی۔'' اور بھی زیادہ راز فاش کرنے والا چارلس بال ہے: ''ڈسرائیلی نے کارتوسوں کی چربی کا معاملہ یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ کسی کو بھی یقین نہیں کہ یہ شورش کا اصلی سبب ہے۔ یہی کارتوس جن کے بارے میں سپاہیوں نے اعلان کیا تھا کہ ان کے استعمال سے ان کی ذات مٹ جاتی ہے ہمارے خلاف لڑتے ہوئے انہوں نے بے تکلفی کے ساتھ استعمال کرنے میں کوئی تامل نہ کیا۔''(79)

یہ شک کہ برطانوی سرکار ہندوستانی لوگوں کو عیسائی بنانے پر تلی ہوئی ہے دور دور تک پھیل گیا۔ ہم ایک ہم عصر مسلمان مجتہد کے بیان کا حوالہ دیتے ہیں: ''انہوں نے طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے کام لے کر مختلف مذاہب (سوائے عیسائیت کے) کو نیست و نابود کرنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا اور انتہائی کوشش کی۔ انہوں نے قصبوں اور شہروں میں مدرسے قائم

کیئے تاکہ بچوں اور اَن پڑھ بالغوں کو اپنے دین اور اپنی زبان کی کتابیں پڑھائیں۔ انہوں نے علم وادب کے مراکز اور مدرسے اور پاٹھ شالائیں جو قدیم زمانے میں قائم کی گئی تھیں صفحۂ ہستی سے مٹادیں۔"(80)

ہندوستانیوں کے شکوک کلیتہً جائز تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹرس کے چیئرمین مسٹر مینگلز نے 1857ء میں پارلیمنٹ کے (House of Common) میں کہا "خدا نے انگلستان کو ہندوستان کی وسیع سلطنت عطا کی ہے تاکہ ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے تک مسیحی جھنڈا فاتحانہ انداز میں لہرائے۔ ہرایک کو ایڑی چوٹی کا زور لگانا چاہئے تاکہ ہندوستان کو عیسائی بنانے کے شاندار کام کو جاری رکھنے میں کسی بھی وجہ سے لیت ولعل نہ ہو۔"(81)

ان شہادتوں سے ظاہر ہے کہ عیسائی مبلغوں کی سرگرمیوں میں تشویشناک اضافہ ہوا۔ لندن سے مذکورہ بالا ہدایت کے ساتھ برطانوی مشنریوں نے ہندوستان میں جس جوش سے کام کیا اس کو ریورنڈ کینڈی نے صاف صاف بیان کیا ہے: "خواہ کیسی ہی مصیبتیں ہم پر نازل ہوں، جب تک ہندوستان میں ہماری سلطنت قائم ہے ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ہمارا سب سے بڑا کام ملک میں عیسائیت کی اشاعت ہے۔ جب تک کنیا کماری سے ہمالیہ تک سارا ہندوستان دین عیسوی قبول نہ کرلے اور جب تک ہندومت اور اسلام کو رد نہ کردے ہماری کوششیں استقلال کے ساتھ جاری رہنا چاہئے۔"(82)

اس مخالفانہ روش اور اس کے سبب فرنگی مشنریوں کی مخربِ اخلاق اور مخرب قومیت سرگرمیوں سے جو ہندوستانی ردِعمل پیدا ہوا اس کا ریورنڈ کینڈی خود جائزہ لیتا ہے اگرچہ اس نے جو کچھ خود سنا اور لکھا اس کی اہمیت کو نہیں سمجھا۔ "میرا ایک آشنا مولوی جس کی بظاہر میرے ساتھ گہری دوستی تھی بسترِ مرگ پر پڑا تھا۔ اس وقت میں اس کے ساتھ تھا میں نے پوچھا: "مرنے سے پہلے تمہاری آخری خواہش کیا ہے؟" اس سوال پر وہ بہت مایوس اور غمگین نظر آیا، بولا: "یقین جانیں، میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے افسوس ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں دو فرنگیوں کو بھی قتل نہ کیا۔" ایک اور موقع پر ایک معزز اور عالم ہندو نے دلیری کے ساتھ کہا "ہم چاہتے ہیں کہ تم یہاں سے چلے جاؤ اور ہماری قومی حکومت قائم ہوجائے تاکہ ہم اپنے آباواجداد کی رسوم کو جاری رکھ سکیں۔"(83)

مشنریوں کا تبلیغ کا کام نہ صرف متشدد، جارحانہ اور دور دور تک پھیلا ہوا تھا بلکہ اسے سرکاری

حمایت بھی حاصل تھی۔ سید احمد کا بیان ہے: ''بعض ضلعوں میں مشنریوں کے ساتھ تھانے کے سپاہی شامل ہو جاتے اس صورت میں مشنری صرف اپنی کتابوں کی تعلیمات کی وضاحت پر ہی قناعت نہ کرتے بلکہ دوسرے مذاہب کے پیروؤں اور مقدس مقامات پر دل آزار اور غیر موزوں زبان میں حملے کرتے اور سننے والوں کے جذبات کو اس قدر مشتعل اور مجروح کرتے کہ بیان نہیں ہوسکتا۔ اس طرح لوگوں کے دلوں کی گہرائی میں بے اطمینانی کے بیج بھی بوئے گئے۔''(84)

لارڈ کیننگ کی تبلیغی سرگرمیوں کی سرپرستی اور ان کے فنڈ میں کثیر رقموں کے چندے عام طور سے مشہور تھے اور دور دور تک ان کا چرچا تھا۔ سب سے زیادہ بدنام مسٹر ایڈمنڈ کے خط کی مشہور داستان ہے۔ اس کے بارے میں سید احمد کا بیان ہے۔

''جب یہ تمام بیزاریاں انتہا کو پہنچ چکی تھیں 1855ء میں مسٹر ایڈمنڈ کا ایک خط اچانک شائع ہوا جو علی الاعلان کلکتے سے مشتہر کیا گیا۔ اس کی نقل حکومت کے تمام بڑے بڑے افسروں کو بھیجی گئی۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ ''اب تمام ہندوستان ایک حکومت کے تحت ہے۔ ٹیلی گراف نے ملک کے تمام حصوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ملا دیا ہے گویا یک ہو گئے ہیں۔'' ریلوے نے ان کو ایک دوسرے کے اس قدر قریب کر دیا ہے کہ گویا تمام قصبات ایک ہو گئے ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ملک میں صرف ایک ہی دین ہو اس لئے مناسب ہے کہ ہم سب عیسائی بن جائیں۔ یہ کہنے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اس گشتی خط کے پہنچنے پر تمام لوگوں کی آنکھوں میں خوف سے اندھیرا چھا گیا اور آخر ایسا نظر آتا تھا گویا ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ہے۔ وہ چلا کر کہنے لگے کہ وہ گھڑی جس کا مدت سے ڈر تھا آ پہنچی۔ سب سے پہلے سرکاری ملازموں کو عیسائی بنانے کا منصوبہ تھا اور اس کے بعد عوام کو۔ کہتے ہیں کہ یہ خط سرکار کے حکم سے لکھا گیا لیکن جلد ہی بنگال کے لیفٹیننٹ گورنر نے اس کے بارے میں سنا تو اس نے ایک اعلان جاری کیا جس سے لوگوں کے دلوں کو تسکین ہوئی اور کچھ وقت کے لئے شکوک دب گئے۔ تاہم یہ عارضی تسکین تھی لوگوں کا اب بھی یہ خیال تھا کہ حکومت نے یہ سارے منصوبے عارضی طور پر ترک کئے ہیں اور جوں ہی حالت سنبھلی ان کو ازسرِ نو شروع کر دے گی۔''(85)

انگریزی تعلیم کے اجرا کا سبب بھی ہندوستان میں یورپی سائنس کو رائج کرنے اور روشن خیال طبقہ پیدا کرنے کی نیک خواہش نہ تھی بلکہ اس کا سیدھا تعلق انگریزی تعلیم کے حامیوں میں

نئے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کے مقصد کے ساتھ تھا۔ مثال کے طور پر 12-اکتوبر 1836ء کو میکالے نے اپنی ماں کے نام ایک خط میں لکھا: ''یہ میرا پختہ یقین ہے کہ اگر ہماری تعلیم کے منصوبے پر عمل کیا جائے تو بنگال میں تیس سال کے بعد ایک بھی بُت پرست نہ رہے گا۔''(86)

ڈاکٹر آر۔سی۔موزمدار کا بیان ہے: ''تینوں پریذیڈنسیوں کی اعلیٰ ترین عدالتوں نے یہ حکم جاری کیا کہ نوجوان ناتجربہ کار مذہب بدلنے والے ہندوؤں کو بجائے ان کے والدین کے زیرِسرپرستی رکھنے کے ان کی مرضی کے خلاف مع بیویوں کے جبراً انہیں مشنریوں کے حوالے کر دیا جائے۔ ایک موقع پر لوگوں نے عدالت کا محاصرہ کر لیا اور اس جج کو ہلاک کر کے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جس نے ایسا فیصلہ صادر کیا اور صورتِ حال پر قابو پانے کے لئے فوج کو بلانا پڑا۔ اس واقعے پر رائے زنی کرتے ہوئے ایک ہندوستانی نے 30-اپریل 1857ء کو ''دی ہندو پیٹریٹ''(The Hindu Patriot) کے نام اس مضمون کا ایک خط لکھا کہ ''ایسا واقعہ، نہ کہ ملکی پریس کی پھیلائی ہوئی دس ہزار افواہیں، ساری قوم کو اپنے حکمرانوں سے منحرف کرنے کو کافی ہے۔''(87)

اس لئے یہ بخوبی واضح ہے کہ برطانوی حکمران محض شہنشاہیت پسندانہ مقاصد کی خاطر 1857ء سے برسوں پہلے سے عوام کو بڑے پیمانے پر عیسائی بنا کر ہندوستان کے قومی تمدن کو مٹانے پر تلے ہوئے تھے۔ ہندوستانی عوام نے بھی اور ہندو مسلمان فوجیوں نے بھی سر پر منڈلاتے ہوئے اس خطرے کو بلا لحاظ کسی نقطہ نظر کے بھانپ لیا۔ خواہ یہ سر سید احمد خاں ہوں یا بہادر شاہ، خواہ کلکتے کا روشن خیال بنگالی یا بٹھور کا نانا صاحب۔ چنانچہ اگر 1857ء کی جدوجہد میں مذہبی پہلو کو بڑا دخل تھا تو یہ قوم پرستی کا ایک جُز تھا۔ ہندوستانی عوام نے اپنے مذاہب کی حفاظت کے لئے ہتھیار اٹھائے اور وہ نہ صرف اپنے مذہب کے تحفظ بلکہ اپنی طرزِ زندگی اور قومیت کو بچانے کے لئے بھی لڑ رہے تھے۔ البتہ ہندوستانی سماج میں کئی رجعت پسندانہ خصوصیات بھی تھیں لیکن ان کو بدلنے کا صحیح طریقہ صرف یہ تھا کہ ہندوستانی لوگ خود اس کی کوشش کریں۔

صرف اسی پر بس نہیں۔ ہمارے باغی بزرگوں نے انقلابی جدوجہد کو بڑھانے کے لئے مذہب سے کام لیا۔ مذہب کے سبب انہوں نے اپنے اوسان خطا نہ ہونے دیئے بلکہ انہوں نے فرنگیوں کے ساتھ لڑنے کے لئے مذہب سے تقویت حاصل کی۔

دہلی میں شاہی اجازت کے ساتھ ایک اعلان جاری کیا گیا جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو اکسایا گیا کہ وہ اپنے مذہب کے نام پر متحد ہو کر جہاد کریں "اس وقت دہلی اور میرٹھ میں موجود فوجی افسر تمام ہندوؤں اور مسلمانوں، ہندوستان کے شہریوں اور خادموں کو سلام دعا بھیجتے ہیں: سبھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان دنوں تمام انگریزوں نے یہ مذموم منصوبے باندھے ہیں کہ۔۔۔ پہلے تمام ہندوستانی فوج کے مذہب کو مٹایا جائے اور پھر لوگوں کو جبراً عیسائی بنایا جائے۔ اس لئے ہم اپنے مذہب کی خاطر متحد ہو گئے ہیں اور ہم نے ایک بھی کافر زندہ نہیں چھوڑا۔ اسی لئے ہم نے دہلی کے شاہی خاندان کی حکومت کو از سرِ نو قائم کر دیا ہے۔ ایک بہت بڑا خزانہ اور سینکڑوں بندوقیں ہمارے ہاتھ لگی ہیں۔ اس لئے مناسب ہے کہ جو فوجی اور جو لوگ عیسائی بننا پسند نہیں کرتے وہ متحد ہو جائیں اور جرأت سے کام لیتے ہوئے ان کافروں کا خاتمہ کر دیں۔" (88)

لکھنو کی شکست کے بعد جب اودھ میں جدوجہد ماند پڑ گئی اور باغی مدافعت میں جنگ کر رہے تھے اور اکثر لڑائیوں میں ہار رہے تھے تو انگریز گرفتار شدہ سپاہیوں سے پوچھتے تھے: "تم بغاوت میں کیوں شامل ہوئے؟" ان کا جواب یہ ہوتا تھا: "ہمارے مذہب کا تقاضا ہے کہ انگریزوں کو قتل کیا جائے۔ اس کا انجام انگریزوں اور تمام سپاہیوں کی تباہی ہوگا اور پھر واللہ اعلم!" (89)

گونڈ قبائل کا راجہ انگریزوں کے وظیفہ خوار کی حیثیت سے ناگپور میں رہتا تھا۔ اس نے ایک روایتی سنسکرت ستوتر کو جو دیوی کی پوجا میں گایا جاتا ہے انگریزوں کے خلاف ایک بھجن میں بدل دیا تھا۔ "دی لندن ٹائمز" (The London Times) مورخہ 31-اکتوبر 1857ء میں اس کا حسب ذیل ترجمہ شائع ہوا:

اے شتر وسنہارکا! (دشمن کو نیست و نابود کرنے والی دیوی کا نام)
بہتان تراشوں کا منہ بند کر دے
چغل خوروں کو ہڑپ کر جا اور پاپیوں کا ناش کر دے
اے ماتا چنڈی! انگریزوں کو ہلاک کر دے، ان کا ستیاناس کر دے
دشمنوں کو بچ کر نہ جانے دے، نا ہی ان ظالموں کے
بیوی بچوں کو، اے سنہارکا!
شنکر پر کرپا کر۔ اپنے بندوں کی مدد کر!

دھرم کی پکار سُن!
اور متھالکا! بھرشٹوں کو کھا جا
دیر نہ کر
ابھی ان کو نگل جا
اور جلدی سے
اے گھور متھالکا۔۔۔!

دہلی کے محاصرے کے دوران انگریز ایجنٹوں نے بار بار کوشش کی کہ ہندو مسلم متحدہ محاذ کو ہندو مسلم خانہ جنگی میں بدل دیں تا کہ بھائی بھائی کی جان لے۔ 1857ء کے ماہ مئی میں انگریز ایجنٹوں نے جہاد کے نام پر ہندوؤں کے خلاف مسلمانوں کے کان بھرنے شروع کر دیئے اور اس معاملے کو بہادر شاہ کے روبرو پیش کیا گیا۔'' بادشاہ نے جواب دیا ایسا جہاد ناممکن ہے اور ایسا خیال انتہائی بیہودگی ہے کیوں کہ پوربیے سپاہیوں میں اکثریت ہندوؤں کی ہے اس کے علاوہ ایسے فعل سے خانہ جنگی پیدا ہوگی اور نتیجہ افسوسناک ہوگا۔ مناسب یہ ہے کہ تمام طبقات میں باہمی ہمدردی موجود ہو، ہندو افسروں کا ایک وفد یہ شکایت کرنے کے لئے پہنچ گیا کہ ہندوؤں کے خلاف جہاد کی تلقین کی جارہی ہے۔ بادشاہ نے جواب دیا: ''جہاد انگریزوں کے خلاف ہے، میں نے ہندوؤں کے خلاف اس کی ممانعت کر دی ہے۔''(90)

اس طرح ہمارے باغی آباؤ اجداد نے غیر ملکی غلبہ کے خلاف ایک متحدہ انقلابی جدوجہد کو منظم کرنے اور جاری رکھنے کے لئے مذہب سے کام لیا۔ 1857ء کے تاریخی حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ جدوجہد کی نظریاتی صورت مذہبی رنگ اختیار کرے۔ کسی اور چیز کی توقع رکھنا مصلحت کے منافی اور غیر معقول ہوتا۔

4۔ شہنشاہیت پرستوں کی دہشت انگیزی

تاریخِ ہندوستان پر انگریزوں کی درسی کتابوں میں صرف ''باغیوں کے مظالم'' کی داستان بیان کی گئی ہے عورتوں کی بے حرمتی، بچوں کا قتل وغیرہ۔ لیکن حقیقت بالکل اس کے برعکس تھی۔ ساورکر اور دوسرے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی ابتدائی پشت نے خود برطانوی ماخذوں سے ہندوستانی

لوگوں پر انگریزوں کے بے مثال مظالم کی داستان فاش کرنی شروع کر دی۔ 21-1920ء کی تحریک عدم تعاون کے دوران 1857ء کے برطانوی دہشت انگیزی کو جلیانوالہ باغ کے ساتھ مربوط کیا گیا تا کہ لوگ بیدار ہو کر، 1857ء کے ہمارے آبا و اجداد کی نسبت زیادہ بہادری اور اتحاد کے ساتھ جدوجہد کریں۔ اس کے بعد ایڈورڈ تھامپسن کی تصنیف ''دی ادر سائڈ آف دی میڈل'' (The other side of the medal) شائع ہوئی جس میں یہ نظریہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی کہ مظالم دونوں طرف سے ڈھائے گئے جنہیں بھول جانا ہی بہتر ہے۔

سب سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ کیا طرفین کو ایک ہی سطح پر رکھا جا سکتا ہے۔ کیا لوگوں کو غلام بنانے والوں کے جرائم کو مجاہدینِ آزادی کی غلطیوں اور زیادتیوں کے برابر سمجھا جا سکتا ہے؟ دونوں معاملے مختلف ہیں۔

برطانوی اخبارات ہندوستانیوں کی وحشیانہ خباثتوں اور مظالم کی داستانوں سے بھرے پڑے تھے اور یہ اس مہم کا جزو تھیں جو ہندوستان میں زیادہ سے زیادہ برطانوی فوج بھیجنے، اسبابِ بغاوت پر سنجیدہ بحث کو روکنے اور ہندوستانی مسئلے کے مناسب حل کو ڈھونڈنے کے لئے شروع کی گئی۔ اس نامعقول فضا میں مارکس نے اس مسئلے کو صحیح تاریخی رنگ میں پیش کیا۔

انسان کی تاریخ میں مکافات بھی کوئی چیز ہے اور تاریخی مکافات کا یہ قاعدہ ہے کہ اس کا آلہ کار خود جابر کی طرف سے میسر آتا ہے نہ کہ مظلوم کی طرف سے۔ پہلی چوٹ جو فرانس کی شاہی حکومت پر پڑی وہ امراء کی طرف سے تھی نہ کہ دیہاتیوں کی طرف سے۔ ہندوستانی بغاوت کاشتکاروں کی طرف سے شروع نہیں ہوئی جنہیں انگریزوں نے شدید اذیت دی اور ننگا کر کے رکھ دیا بلکہ اُن سپاہیوں کی طرف سے جن کو ملبوس کیا گیا، کھلایا پلایا گیا، تھپکی دی گئی، موٹا تازہ کیا گیا اور لاڈ سے بگاڑا گیا۔''

''سپاہی کا کردار خواہ کتنا ہی ذلیل ہو، یہ انگلستان کے ہندوستان میں اپنے ہی کردار کا گھناؤنا عکس ہے۔ نہ صرف سلطنتِ شرقی کے قیام کے دور میں بلکہ مدّت کی مستحکم حکومت کے دوران میں بھی۔''

''چونکہ جیریکو کی مانند دہلی آندھی کے سخت جھونکوں کے سامنے سرنگوں نہیں ہوا اس لئے جان بُل کو انتقام کے نعرے بلند کرنے پڑے تا کہ وہ یہ بھول جائے کہ اس کی اپنی سرکار ہی اس فتنہ

پردازی کے لئے ذمہ دار ہے جس کو اس حد تک بڑھنے دیا گیا۔'' (91)

اس مقالے کے ابتدائی حصوں میں انگریزوں کے خلاف اس شدید نفرت کا کچھ تصور پیش کیا گیا ہے جو سو سالہ حکومت کے دوران انگریزوں نے اپنی بداعمالیوں سے ہندوستانیوں میں پیدا کی۔ وہ نفرت 1857ء کی جدوجہد میں پھوٹ پڑی۔ مسز گوپ لینڈ کی لکھی ہوئی ایک داستان میں اس جذبے کو ہندوستان کے دیہاتی محاورے میں بیان کیا گیا ہے جس نے باغی سپاہیوں میں ایک نئی روح پھونکی۔ ''ایک افسر نے جو قیدیوں کے مقدمات کی سماعت کر رہا تھا ایک سپاہی سے پوچھا: 'تم عورتوں اور بچوں کو کیوں قتل کرتے ہو؟' اس آدمی نے جواب دیا: 'جب تم کسی سانپ کو ہلاک کرتے ہو تو اس کے بچوں کو بھی مار ڈالتے ہو'۔'' (92)

باغیوں کے راہنما عورتوں اور بچوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کو پسند نہیں کرتے تھے اور مجموعی طور پر وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے۔

خیر آباد کے علامہ فضل حق جنگ سے متعلق اپنے ''رسالہ'' میں بیان کرتے ہیں ''باغی سپاہیوں میں ایسے بھی لوگ تھے جنہوں نے شرمناک حرکتیں کیں اور حد سے بڑھ کر زیادتیاں کیں اور مظالم ڈھائے، بچوں اور عورتوں کو بھی قتل کیا۔ انہوں نے عورتوں کو قتل کر کے ذلت اور رسوائی پائی اور بچوں کو ہلاک کر کے وہ بدنام اور خوار ہوئے۔'' (93)

اودھ میں بغاوت سب سے زیادہ پھیلی اور کمال عروج کو پہنچی۔ برطانوی مورخ فارسٹ لوگوں کی انسان دوستی اور ضبطِ نفس کی یوں داد دیتا ہے: ''فوجیوں نے غدر کیا اور لوگوں نے وفاداری ترک کی لیکن انتقام کسی نے نہیں لیا اور نہ ہی ظلم وستم کیا گیا۔ بہادر اور مضطرب آبادی نے حکمران طبقے کے پناہ گزینوں کے ساتھ (سوائے چند مثالوں کے) بے حد مہربانی کا سلوک کیا۔ اودھ کے جاگیرداروں نے اپنے بدبخت آقاؤں کے ساتھ برتاؤ میں بڑی خوش خلقی اور جوانمردی سے کام لیا۔'' (94)

جن انگریز عورتوں کو نانا صاحب نے کانپور میں مقیم رکھا ان کی بے حرمتی کی داستان بہت مشہور ہے۔ 1857ء کے سرکاری مورخین کے اور مالیسن نے خود اس کا بھانڈا پھوڑا ہے: ''جور وستم کی نفاستیں ناقابلِ بیان خباثت، جو اس وقت کے بعض رسائل کے مطابق المناک قتلِ عام کے ساتھ منسوب کی گئیں وہ کسی مشتعل تخیل کی من گھڑت کہانیاں تھیں جن پر بلا کسی تحقیق کے یقین کر لیا

گیا اور جن کو بغیر سوچے سمجھے مشتہر کر دیا گیا۔ نہ تو کسی کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے اور نہ کسی کی بے حرمتی کی گئی۔ یہ اُن سرکاری افسروں کا بیان ہے جنہوں نے جون اور جولائی کے قتل عام کے حالات کی انتہائی تن دہی کے ساتھ چھان بین کی ہے۔'' (95)

دہلی کے بارے میں بھی جھوٹی خبریں اڑائی گئیں مثلاً یہ کہ انگریز خواتین کو سڑکوں پر برہنہ حالت میں چلنے پر مجبور کیا گیا۔ ان کی کھلم کھلا بے حرمتی کی گئی۔ ان کی چھاتیاں کاٹ دی گئیں بلکہ کم سن لڑکیوں کو بھی نہ چھوڑا گیا وغیرہ وغیرہ۔ گورے عیسائی پادری گلا پھاڑ پھاڑ کر ان کہانیوں کا ڈھنڈورا پیٹنے ڈالے تھے۔ محکمہء جاسوسی کے افسرِ اعلیٰ سر ولیم میور کی تحریری رپورٹ ہے کہ ''خواہ کتنی ہی ستم رانی اور خونریزی ہوئی ہو، جہاں تک میرے مشاہدات اور تحقیقات کا تعلق ہے عورتوں کی بے حرمتی کی کہانیوں کا کوئی خاطر خواہ ثبوت نہیں ملا۔'' (96)

جہاں ہندوستانیوں کی دہشت انگیزی کے قصے زیادہ تر فرضی تھے وہاں انگریزوں کی درندگی نے لارڈ کیننگ کو بھی پریشان کر دیا۔ 24-دسمبر 1857ء کو گورنر جنرل کی کونسل کی کارروائی میں مذکورہ ذیل سرکاری یادداشت موجود ہے: ''...... نہ صرف تمام قسم کے مجرموں کو بلا امتیاز پھانسیاں دی گئیں بلکہ ان کو بھی جن کے جرائم نہایت مشکوک تھے۔ دیہات کی لوٹ اور آتش زنی کے عام واقعات رونما ہوئے جس کے سبب گناہ گار اور بے گناہ دونوں کے بلا لحاظ عمر و جنس اندھا دھند سزا پائی اور بعض حالتوں میں جان بھی گنوائی۔ اس سے وہ بڑے بڑے فرقے بھی بگڑ گئے جو پہلے حکومت کے مخالف نہ تھے۔ کھیتی باڑی موقوف ہوگئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قحط کا خطرہ سر پر منڈلانے لگا۔ آخر کار سرکاری افسروں کی کارروائیاں اس افواہ کا موجب ہوئیں کہ حکومت ہندوؤں اور مسلمانوں کے قتلِ عام کا منصوبہ باندھ رہی ہے۔'' (97)

1857ء کے دوران نازیوں کے سی جو ذہنیت برطانوی حلقوں میں پھیلی ہوئی تھی اُسے ''غدر کے سورما'' جنرل نکلسن کے الفاظ میں نہایت خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اپنے ایک دوست ایڈورڈس کو جس نے اس دور میں شہرت حاصل کی۔ اس نے لکھا: ''ایک ایسا قانون تجویز ہونا چاہیے جس کی رو سے دہلی میں عورتوں اور بچوں کے قاتلوں کی زندہ چمڑی ادھیڑنے، جسم میں میخیں ٹھونک کر ہلاک کرنے اور آگ کی نذر کرنے کا اہتمام ہو۔ ایسے مظالم ڈھانے والوں کو صرف پھانسی دینا دیوانگی ہے۔ کاش! میں دنیا کے اس حصے میں ہوتا اور حسبِ ضرورت قانون کو

اپنے ہاتھ میں لیتا۔'' (98)

فوجی عدالت کے قوانین اور قواعد وضوابط کو بھی نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ ''جب افسر فوجی عدالت کی کارروائی میں شرکت کے لئے جاتے تو وہ سوگند کھاتے کہ وہ قیدیوں کو پھانسی دیں گے خواہ وہ قصوروار ہوں یا بےقصور۔ اگر کوئی شخص اس اندھا دھند انتقام کے خلاف دم مارنے کی جرأت کرتا تو اس کے غضب ناک ساتھی فوراً واویلا مچا کر اسے خاموش کر دیتے۔ جن اشخاص کو سرسری سماعت کے بعد موت کی سزا دی جاتی پھانسی سے پہلے جاہل پرائیویٹ (فوجی) ان کی ہنسی اڑاتے اور ان کو اذیت دیتے جب کہ تعلیم یافتہ افسر دیکھتے رہتے اور اظہارِ تحسین کرتے۔'' (99)

دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں نے جو کچھ کیا ایک مصیبت زدہ باغی راہنما نے اپنے بیان میں اس کی یوں تصویر کھینچی ہے:

''پھر عیسائیوں نے اعلیٰ عہدیداروں اور رئیسوں کو قتل کیا جو گردونواح اور بستیوں میں رہتے تھے۔ پھر انہوں نے اُن کی آراضی، جائیداد، مکانات، محلّات، مال و دولت، اسلحہ اور سامان، گھوڑے اور ہاتھی اور اونٹ اور اونٹنیاں، سب کچھ ضبط کر لیا۔ تب انہیں مع اہل وعیال واطفال ہلاک کر دیا۔ اگرچہ وہ ان کی رعایا بن چکے تھے اور خوف اور امید کے سبب ان کی اطاعت قبول کر چکے تھے۔ پہلے انہوں نے جتنا بھی سونا چاندی قیدیوں کے قبضے میں تھا، لوٹ لیا۔ پھر بستر کی چادریں، کپڑے، تہبند اور پائجامے بھی چھین لئے۔ اس کے بعد انہیں اپنے افسروں کے پاس بھیج دیا جنہوں نے انہیں پھانسی یا گردن زدنی سے موت کی سزا دی۔ کیا جوان، کیا بیمار، کیا شریف، کیا کمین، کوئی بھی ان ہلاکت خیزیوں سے نہ بچا۔ اس طرح ان لوگوں کی تعداد جن کے سر کاٹے گئے یا پھانسی دی گئی ہزاروں تک پہنچ گئی۔'' (100)

انگریز کے ہاتھوں دہلی کی غارت گری کے بارے میں لارڈ ایلفنسٹن نے سر جان لارنس کو یوں لکھا: ''دہلی کا محاصرہ ختم ہونے کے بعد ہماری فوج نے جو ظلم وستم ڈھایا وہ حد درجہ جگر خراش ہے۔ دوست اور دشمن کی تمیز کئے بغیر ہمہ گیر انتقام لیا جا رہا ہے۔ جہاں تک لوٹ مار کا تعلق ہے ہم نے یقیناً نادر شاہ کو بھی مات کر دیا ہے۔'' (101) قیصر التواریخ کا مصنف لکھتا ہے کہ ''دہلی میں پھانسی پانے والوں کی تعداد ستائیس ہزار تھی۔'' (102)

جو کچھ دہلی میں ہوا اس کو ایک اور ہم عصر انگریز نے یوں بیان کیا ہے: ''میں نے دہلی کی

گلیوں میں چلنا پھرنا ترک کر دیا ہے کیوں کہ کل جب ایک افسر اور میں خود بیس جوانوں کے ایک دستے کو گشت کے لئے باہر لے گئے تو ہم نے چودہ مردہ عورتوں کو دیکھا۔ ان کے شوہروں نے ان کے گلے کاٹ دیئے تھے اور انہیں شالوں میں لپیٹ کر لٹا دیا تھا۔ ہم نے وہاں ایک آدمی کو پکڑا جس نے ہمیں بتایا کہ ان عورتوں کو اس ڈر سے قتل کیا گیا ہے کہ کہیں یہ انگریزوں کے چنگل میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ پھر نے ان کے خاوندوں کی لاشیں ہمیں دکھائیں جنہوں نے نیک ترین کام کیا اور بعد میں خودکشی کر لی۔'' (103)

''دی ہسٹری آف دی سیج آف دہلی'' (The History of the Saige of Delhi) میں جو ایک افسر کی تصنیف ہے جس نے محاذِ جنگ پر خدمت انجام دی تھی، تفصیل کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ انگریز افسر نے انبالہ سے دہلی آتے ہوئے راستے میں کیا کچھ کیا:
''قلیل مدّت میں سینکڑوں ہندوستانیوں کو فوجی عدالت کے روبرو پھانسی کی سزا دی گئی۔ جب ان کے لئے پھانسی کی مچانیں نصب کی جا رہی تھیں تو انہیں انتہائی وحشیانہ اور ظالمانہ طریقوں سے اذیت دی گئی۔ ان کے سروں سے بالوں کے گچھے کے گچھے نوچے گئے۔ ان کے جسموں کو سنگینوں سے چھیدا گیا۔ پھر ان کو ایسا کام کرنے پر مجبور کیا گیا جس سے بچنے کے لئے وہ موت یا اذیت کی کوئی وقعت نہ سمجھتے تھے۔ غریب اور مسکین ہندو دیہاتیوں کے منہ میں برچھیوں اور سنگینوں کے ساتھ گائے کا گوشت ٹھونسا گیا۔'' (104)

لکھنو پر قبضہ کرنے کے بعد انگریز فاتحین نے کس طرح فوجی اور غیر فوجی قصوروار اور بے قصور کو یکساں ذبح کیا ان میں سے ایک نے اسے یوں بیان کیا ہے: ''لکھنو پر قبضہ کرنے کے وقت سے اندھا دھند قتل عام کا سماں۔۔۔ کسی قسم کی تمیز روا نہ رکھی گئی۔ جو بدبخت ہماری فوج کے ہاتھ لگ جاتا اس کا کام تمام کر دیا جاتا۔ کوئی سپاہی ہو یا اودھ کا دیہاتی اس میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔ اس سے کوئی سوال پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔ اگر اس کی چمڑی کالی ہوتی تو پھر کسی ثبوت کی ضرورت نہیں تھی۔ رسی کا ایک ٹکڑا اور درخت کی شاخ یا دماغ میں سے گزرتی ہوئی بندوق کی ایک گولی بدبخت خبیث کی زندگی کو جلد ختم کر دیتی۔'' (105)

جو واقعات دیہات میں بنارس، الٰہ آباد اور کانپور کے درمیان اس علاقے پر جنرل نیل کی چڑھائی کے دوران رونما ہوئے انہیں کے اور مالیسن نے مذکورہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:

''رضا کار جلادوں کے گروہ ضلعوں میں گھومنے لگے اور اس موقعے پر شوقیہ جلادوں کی کمی نہ تھی۔ ایک بھلا مانس ڈینگ مار رہا تھا کہ اس نے ماہرِ فن کے انداز میں کتنے ہی افراد کا کام تمام کیا ہے۔ آم کے درخت سولی کا کام دیتے تھے اور ہاتھی تختہ دار کا۔ اس جنگل کے انصاف کے شکار ہندسہ 8 کی شکل میں پھانسی کی رسی سے لٹکتے رہ جاتے گویا دل لگی کا سامان ہیں۔'' (106)

انگریزوں کے مظالم اس حد تک پہنچ گئے کہ برطانیہ کی قومی زندگی میں حریت پسند عناصر کو خود برطانیہ کے خاص شہری حقوق کی فکر پڑ گئی۔ سر چارلس ڈلک نے ''گریٹر برٹین'' (Greater Britain) میں لکھا: ''جو لوگ اس حقیقت پر شک کرتے ہیں کہ ہندوستانی فوجی ملازمت فوجیوں کو انسانی زندگیوں سے لاپروا، جائیداد کے حقوق سے غافل اور انسانی شان کو خاک میں ملانے والے بنا دیتی ہے، اُن کو شاید وہ خطوط یاد نہیں جو انہیں 1857ء میں پہنچے۔ ایسے ایک خط میں ایک اعلیٰ فوجی افسر نے کانپور پر چڑھائی کے دوران یہ اطلاع بھیجی: ''آج خوب شکار ہاتھ آیا، باغیوں کی صفائی کر دی!'' اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ جن نام نہاد باغیوں کو پھانسی دی گئی یا توپوں سے اُڑایا گیا انہوں نے ہتھیار نہیں اٹھائے تھے بلکہ دیہاتیوں کو شک میں پکڑ لیا گیا تھا۔ اس فوج کشی کے دوران دیہات کو نذرِ آتش اور بیگناہوں کا قتلِ عام کرتے وقت ایسے مظالم ڈھائے گئے جن پر خود محمد تغلق بھی شرمسار ہوتا۔ یہ کہنا کہ ایسے شرمناک اعمال کا سلسلہ ہماری گھریلو آزادیوں کے حق میں زہر قاتل ثابت نہ ہوگا، تاریخ کو جھٹلانا ہے۔'' (107)

پنڈت نہرو نے نسلی برتری کے خبط کے مسئلے کو صحیح رنگ میں پیش کیا ہے۔ کیوں کہ ہمارے باغی آباواجداد کو بھی اس سے سابقہ پڑا اور بعد میں ہم بھی اپنی آزادی کی جدوجہد کے تمام عرصے میں اس سے دوچار رہے: ''ہم ہندوستانی برطانوی حکومت کے آغاز سے ہی نسلی امتیاز کی تمام صورتوں سے آشنا ہیں۔ اس حکومت کا تمام تر نظریہ سیرن واک اور آقائی نسل کا تصور تھا اور اسی پر حکومت کی بنیاد تھی۔ درحقیقت آقائی نسل کا تصور شہنشاہیت پرستی کی جبلت میں پایا جاتا ہے۔ اس پر مکر و فریب کا کوئی پردہ نہیں تھا بلکہ حکمرانوں نے اس کا واضح زبان میں اعلان کیا۔ زبان کی نسبت ان کے عمل میں اس کا شدید تر اظہار تھا۔ نسل بہ نسل اور سال بہ سال ہندوستان کے ساتھ بحیثیت ایک قوم کے اور ہندوستانیوں کے ساتھ بطور افراد کے توہین، تذلیل اور حقارت کا سلوک روا رکھا گیا۔'' (108)

ہندوستان میں بعض بلند رتبہ سیاستدان اور مورخ ایسے بھی ہیں جو ماضی کو بھول جانے کی تلقین کرتے ہیں اور یہ تاکید بھی کہ صد سالہ یادگار کے دوران ہمیں ان مظالم کا ذکر نہیں چھیڑنا چاہئے۔ اس کا مطلب نہ صرف تاریخ سے آنکھیں موڑنا ہے بلکہ خود اپنی تاریخ اور تجربے سے کچھ سیکھنے سے انکار کرنا ہے۔

1857ء میں ہمارے آباواجداد نے سختیاں جھیلیں اور اپنا خون بہایا۔ بعد کی پشتوں نے جدوجہد کو جاری رکھا اور ضروری قربانی کرتے رہے۔ آزادی کے بعد اگر ہم اپنے ماضی کے تجربات کو بھول جائیں اور برطانوی شہنشاہیت پرستی کو بجائے اپنے قدیم دشمن کے ایک نیا دوست سمجھنے لگیں تو ہم نہ تو ہندوستان کی آزادی کے تحفظ کے قابل ہوں گے اور نہ جدوجہد میں مصروف ایشیا اور افریقہ کی نوآبادیاتی قوموں کے تئیں ہندوستان کا فرض ادا کرسکیں گے۔

5-ناکامی کیوں؟

1857ء کی بغاوت کی ناکامی کے اسباب نے برطانوی اور ہندوستانی مورخین کو پریشان کررکھا ہے۔ اولین برطانوی مورخین نے اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ بغاوت اس لئے ناکام ہوئی کہ باغی نہ تو اچھی طرح منظم تھے اور نہ ہی متحد۔ وہ کام کے فوجی راہنما پیدا نہ کرسکے۔ ہندوستانی مورخوں نے اس مسئلے پر زیادہ گہری نظر ڈالی ہے اور بغاوت کی ناکامی کو ہندوستانی باغی لیڈروں کی سیرت کے ساتھ وابستہ کیا ہے کیوں کہ وہ قدامت پرست اور جاگیردار تھے۔ اس وقت کے ہندوستانی راہنماؤں کی جائز نکتہ چینی کی بنا پر بعض ہندوستانی مورخ بغاوت کی قومی خصوصیت سے ہی انکار کرنے پر مائل ہیں بلکہ نظریاتی اور غیر تاریخی زبان میں باغی راہنماؤں پر تنقید کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سین جنہوں نے حکومتِ ہند کے لئے 1857ء کی تازہ ترین سرکاری تاریخ لکھی ہے اور ڈاکٹر آر۔سی۔ موزمدار جنہیں یہی کام پہلے تفویض کیا گیا تھا لیکن بعد میں انہوں نے خود اپنی کتاب تصنیف کی، دونوں کم وبیش تاکید کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ باغی راہنماؤں میں کوئی بھی حبِ وطن کے خالص جذبے سے متاثر نہ تھا بلکہ خودغرضی غالب تھی۔

ہم پہلے یہ ثابت کرچکے ہیں کہ 1857ء کے آغاز میں برطانوی حکمران جن سیاسی اور

معاشی پالیسیوں پر عمل کر رہے تھے وہ ایسی تھیں کہ چوٹی کے ہندوستانی حکمران سے مفلس ترین کسان اور دستکار تک ہندوستانیوں کا ہر فرقہ ان کی حکومت کا مخالف ہو گیا۔ ایسے حالات میں اگر ہندوستانی جاگیرداروں کا ایک طبقہ عوامی مسلح بغاوت میں شریک ہو گیا جس کا ہر لحاظ سے مسلمہ مقصد انگریزوں کو وطن سے نکالنا تھا تو واقعی انہوں نے ایک بے غرض محبِ وطن کا کام کیا۔ اس سے انکار کرنا تاریخی واقعیت پسندی کو ترک کرنا ہوگا اور خالص ذاتیت کے نقطہء نظر کو اختیار کرنا ہوگا۔

1857ء کے دوران ہندوستانی جاگیرداروں کے ایک حصے کے طبقاتی مفاد انگریزی حکومت کے خلاف قومی مفادات کے ساتھ مطابقت رکھتے تھے اور انہوں نے قومی بغاوت میں سرگرم حصہ لیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان میں حقیقی معذوریاں اور سخت کوتاہیاں نہیں تھیں جن کے سبب قومی بغاوت نے بڑی زک اٹھائی لیکن جو اصلی پارٹ ایک طبقے نے فوجی بغاوت میں ادا کیا اس پر نکتہ چینی کو اس پارٹ کی قدر و قیمت کے اندازے کے ساتھ غلط ملط نہیں کرنا چاہئے۔

یہ کہنا صحیح نہیں کہ جاگیرداروں نے کبھی بھی تاریخ میں مطلق وطن پرست کا پارٹ ادا نہیں کیا۔ ہم روسی سیاستدانوں اور مورخوں کی مصلحت پسندی کو سراہتے ہیں جب وہ ان روسی جاگیردار جرنیلوں اور راہنماؤں کے حبِ وطن پر فخر کرتے ہیں جنہوں نے انیسویں صدی کے آغاز میں نپولین کا مقابلہ کیا۔ ہم پولینڈ کے لوگوں کی وطن کی آزادی کے حق میں اور اس کی تقسیم کے خلاف اس جدوجہد کی تعریف کرتے ہیں جس کی راہنمائی پولینڈ کے جاگیرداروں نے کی۔ ہم اٹلی کے لوگوں کی اپنی مادرِ وطن کی آزادی اور اس کے اتحاد کے لئے بہادرانہ اور مستقل جدوجہد کی بھی تعریف کرتے ہیں جس کی راہنمائی نہ صرف میزنی اور گیری بالڈی جیسے انقلابی جمہوریت پسندوں نے کی بلکہ جس میں کونٹ کیوور اور بادشاہ پیڈمونٹ نے بھی اپنا پارٹ ادا کیا۔ ہم دوسرے ملکوں کے جاگیرداروں کی وطن پرستی کے تو قائل ہیں لیکن اپنے ملک کے جاگیرداروں کی وطن دوستی کو تسلیم نہیں کرتے۔

صرف اس صورت میں کہ جب ہم باغی جاگیردار راہنماؤں کے قطعی وطن پرستانہ پارٹ کا اعتراف کریں تب ہی ہم ان کی قوت وعمل اور شدید کمزوری کا تنقیدی جائزہ لے سکتے ہیں جو انہوں نے بغاوت کے اہتمام اور اس کی راہنمائی میں داخل کی۔ صرف ایسے حقیقت پسندانہ نقطہء نظر سے ہی ہم 1857ء کی بغاوت اور بعد کی قومی ترقی کے دوران جاگیردار محبِ وطن کے پارٹ کو

باقاعدہ طور پر سمجھنے کے قابل ہوں گے۔

اب ہم ایک بار پھر مثال کے طور پر اودھ کی اس تصویر کا جائزہ لیتے ہیں جو زیادہ تر ہم عصر برطانوی وقائع نگار چھوڑ گئے ہیں۔

رسل کے مندرجہ ذیل بیان سے بیگم اودھ، تعلقداروں، مسلح دیہاتی مجاہدوں اور باغی سپاہیوں کے کارناموں اور 1857ء کی بغاوت کے دوسرے دور کے ان کے باہمی تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے۔

''خیال یہ ہے کہ فوجی سپاہیوں کی اکثریت لکھنو کے اندر ہی ہے لیکن وہ اس خوبی کے ساتھ جنگ نہیں کریں گے جیسا کہ اودھ کے توڑے دار بندوق چلانے والے جو اپنے نوجوان بادشاہ برجیس قدر کے ساتھ ہیں اور جنہیں بجا طور پر اپنے ملک اور بادشاہ کے وطن پرست مجاہدینِ جنگ کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ ریذیڈنسی کے محاصرے کے دوران سپاہی کبھی بھی ایسی دلیری کے ساتھ آگے نہ بڑھے جیسے زمیں دار رنگروٹ اور نز جیب بیگم بڑی ہمت اور قابلیت کا مظاہرہ کرتی ہے۔ اس نے تمام اہلِ اودھ کو مشتعل کر دیا ہے تا کہ وہ اس کے بیٹے کے مفادات کی حمایت کریں اور امراء نے اس کے ساتھ وفاداری کی سوگند کھائی ہے۔ بظاہر ہم اس کے حلالی ہونے پر باور نہیں کرتے لیکن زمیندار جو اصلیت سے بہتر واقف ہیں برجیس قدر کو بلا تامل قبول کرتے ہیں۔ کیا سرکار ان لوگوں کو باغی قرار دے گی یا معزز دشمن؟ بیگم ہمارے خلاف دائمی جنگ کا اعلان کرتی ہے۔ ان رانیوں اور بیگموں کی بلند ہمتی سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے حرم میں حد درجہ دماغی استعداد واقعی حاصل کرتی ہیں۔ بہر حال وہ سازشوں میں ضرور ماہر ہیں۔ مردوں کے دلوں پر غلبہ کے لئے ان کی جدوجہد انہیں ذہین بنا دیتی ہے۔'' (109)

لارڈ کیننگ نے بھی اس مسئلے پر بحث کی کہ آیا زمیندار اور تعلقدار صرف اپنے محدود طبقاتی مفاد سے متاثر تھے یا اس معاملے نے بڑھ کر قومی درد کا رنگ اختیار کیا اور قومی بغاوت کا سبب ہوا۔ سر جیمز اوٹرام کے جواب میں اس نے لکھا: ''معلوم ہوتا ہے تم یہ خیال کرتے ہو کہ اودھ کے راجہ اور زمیندار اس لئے باغی ہوئے ہیں کہ انہیں ہماری لگان آراضی کی تشخیص سے ذاتی طور پر نقصان پہنچا ہے، لیکن گورنر جنرل کی رائے ہے کہ اس پر کافی غور و خوض کی ضرورت ہے۔ شاید ہی کوئی جاگیر دار اتنی کامل نفرت ظاہر کر سکتا تھا جتنی کہ چندا بھنجا اور گونڈا کے راجاؤں نے ظاہر کی۔ ان میں سے

پہلے کا ہم نے ایک بھی گاؤں نہیں لیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کا خراج بھی کم کر دیا گیا تھا۔ دوسرے کے ساتھ بھی ایسا ہی فیاضانہ سلوک روا رکھا گیا۔ تیسرے کے چار سو دیہات میں صرف تین لے لئے گئے تھے اور اس کے عوض اس کے خراج میں دس ہزار روپے کی کمی کر دی گئی تھی۔

''حکمرانوں کی تبدیلی سے کسی کو نو پارہ کے نوجوان راجہ سے زیادہ فائدہ نہیں پہنچا۔ جونہی انگریزی عملداری شروع ہوئی ہم نے اُسے دس ہزار گاؤں عطا کئے اور دوسرے تمام دعوی داروں کو نظر انداز کر کے اس کی ماں کو اس کا سرپرست مقرر کیا۔ لیکن شروع سے ہی لکھنو میں اس کی فوج ہمارے خلاف لڑ رہی ہے۔ راجہ دھرا نے بھی ان تبدیلیوں سے بے حد فائدہ اٹھایا لیکن اس کے اپنے آدمیوں نے ہی کپتان ہرسے پر حملہ کیا۔ اس کی بیوی کو گرفتار کر لیا اور اسے لکھنو بھیج کر جیل میں قید کر دیا۔''

''ہم نے اشرف بخش خان تعلقدار کو جو اپنے سابق آقا کے ہاتھوں جور و ستم سہتا تھا، فوراً اس کی تمام جائیداد کا واحد مالک بنا دیا۔ لیکن شروع سے ہی اس نے ہمارے ساتھ انتہائی نفرت کا اظہار کیا ہے۔ اس قسم کی دوسری مثالوں سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ زمینداروں اور راجاؤں کی بغاوت کا سبب ہماری حکومت اور ان کا ذاتی نقصان نہیں تھا۔'' (110)

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے وہ داستان کا روشن پہلو ہے۔ دربارِ اودھ میں حکومت کے معاملات کی انجام دہی اور کہانی کے تاریک پہلو کو ایک فاضل وطن دوست اور عینی شاہد، جاگیردار عالم علامہ فضل حق نے بیان کیا ہے۔ ان کا بیان بغاوت کے آخری مرحلے کی داستان ہے جب باغی ہار رہے تھے اور انگریز جیت رہے تھے۔

''نواب کی سرکار کے تمام افسر اور ریاست کے وزیر نکمے، ڈرپوک، بزدل، احمق اور بے ایمان تھے۔ وہ نہ تو دانشمند تھے اور نہ ہی قابلِ اعتبار۔ ان میں اَن پڑھ، آرام طلب، بدتمیز، غل غپاڑہ کرنے والے، کاہل اور کمزور لوگ شامل تھے۔ ان کے علاوہ ان میں خوشامدی، طفیلی اور چاپلوس بھی تھے۔ وہ اپنے عہد و پیمان توڑ دیتے اور ایمان کے عوض کفر قبول کرتے۔ وہ بگلے بھگتوں کا کام کرتے۔ عیسائیوں کی پاسداری شروع کر دی، ان کے ساتھ مل گئے اور ان کی فتح حاصل کرنے میں مدد کی۔'' (111)

مذکورہ بالا اقتباس میں صاف اور ناشائستہ زبان میں اس اخلاقی کمزوری کا بیان ہے جو ایک

جاگیردار دربار اور راہنماؤں پر غالب تھی۔ بغاوت کے دوران اودھ کے جاگیردار راہنماؤں کی کارگزاری کا جائزہ لیتے ہوئے جو تصویر سامنے آتی ہے، حسب ذیل ہے: بغاوت کے پہلے مرحلے کے دوران تعلقداراور زمیندار چند ایک کے سوا، بغاوت میں شریک ہوئے لیکن انہوں نے مجموعی طور پر زیادہ سرگرم حصہ نہ لیا۔ وہ انتظار کر رہے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ کون سا فریق فتح پاتا ہے۔ بغاوت کا دوسرا مرحلہ لارڈ کیننگ کے مارچ 1858ء کے اعلان کے ساتھ شروع ہوتا ہے جس کی رو سے سوائے چھ مخصوص تعلقداروں کے سب کی زمینیں ضبط کر لی گئیں۔ زمیندار متحد ہو کر بدل و جان عوامی بغاوت میں کود پڑے۔ لکھنو کی شکست کے بعد بغاوت کے تیسرے مرحلے کے دوران جوں جوں یہ زیادہ واضح ہوتا گیا کہ انگریز جیت رہے ہیں یہ جاگیردار راہنما قومی دشمن کے ساتھ صلح جوئی کرنے لگے اور یکے بعد دیگرے برطانوی حکمرانوں کی اطاعت قبول کرنے لگے بلکہ بادشاہ بیگم نے بھی جس نے اکثر محبِ وطن کا پارٹ ادا کیا تھا۔ اپنا وکیل برٹش ہائی کمانڈر کی خدمت میں بھیجا جب کہ خود اپنے باقی فوجیوں اور مددگاروں کے ساتھ نیپال کی طرف پسپا ہو گئی۔ جاگیرداروں کی وطن پرستی ریاکارانہ تھی۔ جب انقلاب کی لہر عروج پر تھی تو وہ بڑھتے ہوئے عوامی دباؤ سے متاثر ہوئے اور غیر ملکی حکومت سے عام قومی منافرت میں شریک ہو کر انہوں نے قطعی وطن پرستانہ پارٹ ادا کیا۔ لیکن جب وہی لہر اترنے لگی اور عوام کی انقلابی قوتوں میں انتشار پیدا ہونے لگا تو جاگیردار طبقے کی اصلی اخلاقی کمزوری ظاہر ہو گئی۔ انہوں نے بزدلوں یا غداروں کا کام کیا۔ طبقے کی حیثیت سے جاگیرداروں نے دہرا پارٹ ادا کیا جو نہ تو خالص وطن پرستی کا تھا اور نہ یکسر خود غرضی اور غداری کا۔

جس طرح رانی جھانسی، کنور سنگھ، تانتیا ٹوپے اور مولوی احمد اللہ جاگیردار محبانِ وطن شجاعت، دلاوری اور وفاداری کے پُتلے تھے اسی طرح زوال پذیر جاگیردارانہ نظام کی تمام کمزوریاں مثلاً خود غرضی، بزدلی اور غداری دہلی کے جاگیردار راہنماؤں میں نمایاں تھیں۔

یہ علامہ فضل حق کے بیان سے بہ خوبی ظاہر ہے جس کا شہنشاہ اور اس کے دربار سے گہرا تعلق تھا۔ اس کی قدرے تفصیل قابلِ ذکر ہے۔

''اس (بہادر شاہ) کا ایک اپنا وزیر (حکیم احسن اللہ) تھا اور عملہ بھی۔ وہ کافی بوڑھا اور ناتجربہ کار تھا لیکن اپنی بیگم (زینت محل) اور وزیر کے اشاروں پر چلتا تھا۔ وزیر مذکور حاکم اعلیٰ تھا اور

درحقیقت عیسائیوں کا دوست تھا اوران سے بے حد محبت رکھتا تھا اوران کے مخالفوں کا سخت دشمن تھا۔شہنشاہ کے خاندان کے بعض افراد کا بھی یہی حال تھا۔کچھ تو اس کے مقرب تھے اوراس کے تخت کے نزدیک اوراس کے معتمد تھے۔''

''وہ خوداپنی رائے سے کوئی احکام جاری نہ کرتا اور بھلائی اور برائی میں تمیز نہ کرسکتا۔ وہ بظاہر یا خفیہ طور پر کسی چیز کا فیصلہ نہ کرسکتا اور نہ ہی کسی کے ساتھ برائی یا بھلائی کرنے کے قابل تھا۔''

''بہادر شاہ نے اپنے بعض بیٹوں اور پوتوں کو فوج کے افسر مقرر کیا لیکن وہ احمق بے ایمان اور بزدل تھے۔وہ دیانتدار اور دانشمند اشخاص سے نفرت کرتے۔انہوں نے کبھی معرکہ آرائی نہ دیکھی تھی اور نہ ہی انہیں تلواروں اور نیزوں کی ضرب کا کوئی تجربہ تھا۔وہ اپنی صحبت اور صلاح مشورے کے لئے لُچے اور مشٹنڈے آدمیوں کا انتخاب کرتے۔یہ ناتجربہ کار لوگ عیش وعشرت میں محو اور حرام کاری کے سیلاب میں غرق تھے۔وہ افلاس زدہ تھے جو اچانک دولت مند ہو گئے تھے۔ جب امیر ہو گئے تو عیاشی کی زندگی بسر کرنے لگے۔فوج کو رسد بہم پہنچانے کے بہانے سے انہوں نے بڑی بڑی رقمیں لوگوں سے اینٹھ لیں۔جو کچھ لوگوں سے حاصل کیا وہ خود ہڑپ کر گئے۔مشہور رنڈیاں ان کو باغی فوجوں کی راہنمائی سے غافل کر دیتیں اور داشتاؤں کے ساتھ ان کی صحبت ان کو رات کے وقت فوج کے ساتھ کوچ کرنے سے روکتی۔وہ راتیں سو کر اور دن بدمستی میں گزار دیتے۔جب وہ جاگتے اور ہوش میں آتے تو حیران و پریشان ہوتے۔''(112)

برطانوی مورخ، افسر اور جاسوس احمد اللہ کے اس حقیقت افروز بیاں کی تصدیق کرتے ہیں۔

16- مئی کے دن چونی لال نے اپنے روزنامچہ میں یہ قلم بند کیا کہ احسن اللہ کا انگریزوں کے نام ایک خط باغی سپاہیوں کے ہاتھ لگ گیا۔یہ انگریز شہر کا محاصرہ کئے ہوئے تھے۔اس خط میں سپاہیوں کو ملعون ٹھہرایا گیا اور دہلی پر قبضہ کرنے کے لئے انگریزوں کی مدد کا وعدہ کیا گیا بشرطیکہ وہ زینت محل کے بطن سے بہادر شاہ کے بیٹے مرزا جواں بخت کو ولیعہد تسلیم کرنا منظور کر لیں۔سپاہی غضب ناک ہو کر محل کے گرد جمع ہو گئے۔تند و تیز زبان استعمال کی گئی اور سخت غل غپاڑہ مچایا۔بادشاہ کی وفاداری کی ضمانت کے طور پر انہوں نے احمد اللہ کے سر اور زینت محل کی

حراست کا مطالبہ کیا۔

گریتھڈ نے جو لیفٹیننٹ گورنر شمال مغربی صوبجات کے پولیٹکل ایجنٹ کی حیثیت میں دہلی فیلڈ فورسز (Delhi Field Forces) کے ساتھ وابستہ تھا اپنے ایک خط مورخہ 23-اگست میں لکھا:

''بادشاہ کی چہیتی بیگم زینت محل، جن کی ایک اہم سیاسی اہمیت تھی کی طرف سے ایک قاصد آیا۔ اس نے بادشاہ پر اپنا اثر ڈالنے کی پیش کش کی تا کہ مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے۔''(113)

19-اگست کو پھر گریتھڈ نے لکھا: ''شہزادوں سے مجھے خطوط ملنے شروع ہو گئے ہیں۔ وہ اعلان کرتے ہیں کہ ہمیں تمہارے ساتھ ہمیشہ دل بستگی رہی ہے اور ہم صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں۔''(114)

مورخہ 6-اگست کے اپنے ایک خط میں گریتھڈ نے سر ولیم میور کو اطلاع دی کہ ''مٹکاف کو بادشاہ کی طرف سے ایک خط ملا ہے جس میں اس نے اس کی مزاج پرسی کی ہے۔ یہ راہ ورسم پیدا کرنے کا جاگیردارانہ شائستہ طریقہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ''

تمام شہادت فراہم کرنے کے بعد ڈاکٹر سین دربار کے اندر کی غدار منڈلی کی پیش کش کے بارے میں اس نتیجہ پر پہنچتا ہے: ''تدبیر سادہ تھی۔ اگر برطانوی حکام بادشاہ کی سابقہ پنشن اور حقوق خصوصی کی ذمہ داری قبول کر لیں اور جنگ سے پہلے کی حالت بحال کر دیں تو اس کے طرف دار لکڑی کے پل کو تباہ کرنے، رسالہ کو اپنے ساتھ ملانے، ان کی مدد سے پیدل فوج کو مغلوب کرنے اور انگریزوں کو شہر کے اندر داخل کرنے کی تدبیر کریں گے لیکن انگریزوں کی فوجی حالت بہت بہتر ہو گئی تھی اس لئے انہوں نے ان تجاویز پر توجہ دینے سے انکار کر دیا۔''(115)

اعلیٰ حلقوں کی ان ہمہ گیر غدارانہ سرگرمیوں کا اثر باقی آبادی پر یہ پڑا کہ ان میں افراتفری پیدا ہو گئی اور پست ہمتی پھیلنے لگی۔ اس سے باغی سپاہیوں کی بلند حوصلگی کو سخت دھکا لگا۔ انگریز افسر اس صورتِ حال سے باخبر تھے۔ ''باغی سپاہیوں کا اپنے راہنماؤں پر اعتماد جاتا رہا اور باغی سپاہی پریشانی اور ہچکچاہٹ کے ساتھ ہم سے دوچار ہوتے......''(116)

اوپر ہم نے ہندوستانی جاگیرداروں کے ایک طبقے کی کارگزاری کی وضاحت کی ہے یعنی

وراثت سے محروم اور بے دخل کئے گئے طبقے کی۔ جاگیرداروں کا ایک اور طبقہ تھا جو کم اہم نہیں تھا یہ ہندوستان کے والیانِ ریاست تھے۔ انگریز دشمنی کا جذبہ اس قدر پھیلا ہوا تھا کہ تمام ہندوستانی درباروں میں بھی سرایت کر گیا تھا۔ ہر دربار میں ایک منظّم منڈلی تھی جو قومی بغاوت کو عملی امداد دینے کی حامی تھی۔ بقول ساورکر بیشتر والیانِ ریاست نے ''مشکوک پارٹ ادا کیا۔''(117) انس اسے ''عدم مزاحمت''(118) کا نام دیتا ہے یعنی انہوں نے انگریزوں کے تئیں رسمی وفاداری کا وطیرہ اختیار کئے رکھا اور جب انگریزوں نے ان کی ریاست سے روپیہ اور یہ مسلّح فوج کی امداد حاصل کی تو وہ خاموش رہے گویا رضامند ہیں لیکن درحقیقت یہ موقع محل کا جائزہ لینے میں مصروف تھے۔ والیانِ ریاست کے ایک اہم طبقے نے البتہ شروع سے ہی عملی طور پر دل و جان سے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ جوں ہی انقلاب کا پانسہ پلٹا سبھی نے انگریزوں کے تئیں وفاداری کے اظہار میں جلدی کی۔

بغاوت پھوٹنے کے بعد برطانوی سرکار کو والیانِ ریاست کی وفاداری کا یقین نہ تھا اس لئے انہوں نے ان پر نگرانی کی نگاہ رکھی۔ ریذیڈنٹوں نے ان کی عملی امداد حاصل کرنے یا کم سے کم ان کو بے حرکت رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ باغی بے تابی کے ساتھ منتظر تھے کہ والیانِ ریاست مع اپنی رعایا کے ان کے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔ تدبیر جنگ میں ان کا اہم مقام تھا اور اس جدوجہد کے حشر کا فیصلہ کرنے میں ان کا پارٹ قطعی اہمیت رکھتا تھا۔

کون سی چیز تھی جس نے والیانِ ریاست کو قوم کا ساتھ دینے سے عاری کر کے رکھ دیا اور ملک کی زندگی میں اس نازک گھڑی کے موقعے پر انہیں برطانوی اقتدار سے چمٹائے رکھا؟ اس کا جواب ان مضر معاہدات معاونت میں ہے جس کے شکار وہ پہلے ہی ہو چکے تھے۔ ان معاہدات کی رو سے ہر ریاست میں کمپنی کے فوجی دستے تعینات تھے اور برطانوی ریذیڈنٹ یا ایجنٹ ہی اصلی حکمران تھا۔ سر تھامس منرو نے گورنر جنرل کے نام ایک خط میں اس نظام کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ''اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ یہ ہر ریاست کی سرکار کو کمزور اور سخت گیر بناتا ہے، سماج کے اعلیٰ طبقات میں جذبہء غیرت کو مٹاتا ہے اور تمام قوم کو خوار اور کنگال کر دیتا ہے۔ ہندوستان میں ناقص حکومت کا عام علاج محل کے اندر خاموش انقلاب یا خونریز بغاوت یا غیر ملکی فتح ہے لیکن انگریزی فوج کی موجودگی علاج کے ہر امکان کو ختم کر دیتی ہے کیوں کہ یہ فوج والی ریاست کی گدّی کو ہر

بیرونی اور اندرونی دشمن سے محفوظ رکھتی ہے۔''(119)

اب ہم کسی قدر ٹھوس طریقے سے اور خود برطانوی مصنفین کے بیانات سے اس بات کی تحقیق کرتے ہیں کہ والیانِ ریاست نے کس طرح 1857ء کی قومی بغاوت کے دوران انگریزوں کو بچایا۔

حیدرآباد جنوبی ہند کا دروازہ تھا لیکن نظام عملی طور سے انگریز غاصبوں کے ساتھ تھا۔ نارٹن نے تسلیم کیا: ''اگر حیدرآباد باغی ہو جاتا تو ہم لگ بھگ سارے دکن اور جنوبی ہندوستان میں بغاوت سے نہ بچ سکتے تھے۔''(120)

والیانِ راجستھان نے جو خاندانی نجابت اور شاندار فوجی روایات کا دعویٰ کرتے تھے، قومی بغاوت کو دبانے کے لئے اپنے فوجی دستے انگریزوں کے حوالے کر دیئے۔ انہوں نے اپنی رعایا کی امیدوں پر بھی پانی پھیر دیا اور باقی ہندوستان کی امیدوں پر بھی کہ وہ انگریزوں کے خلاف جہاد میں شامل ہوں گے۔ مالیسن کا بیان ہے کہ ''اگر راجپوتانہ باغی ہو جاتا تو یہ سمجھنا مشکل ہے کہ آگرہ کس طرح مقابلے پر ڈٹا رہتا اور دہلی کے محاذ پر کس طرح ہماری فوج کے پاؤں جمے رہتے۔''(121)

وسطی ہندوستان میں گوالیار کو نہایت اہم مقام حاصل تھا۔ راجہ سندھیا پر عوام کا بڑا دباؤ پڑا لیکن اس نے اس کی مزاحمت کی ''ریڈ پمفلٹ''(Red Pamphlet) کا گمنام مصنف لکھتا ہے:
''اگر سندھیا اپنے بے تاب فوجیوں کی قیادت کرتا اور اپنے قابلِ اعتماد مرہٹوں کو ساتھ لے کر میدانِ کارزار کی طرف کوچ کر دیتا تو ہمارے لئے نہایت تباہ کن نتائج پیدا ہوتے۔ وہ کم از کم بیس ہزار فوجی ہمارے محاذ کے غیر محفوظ مقامات پر لے آتا۔ آگرہ اور لکھنو فوراً ہاتھ سے نکل جاتے۔ ہیولاک الٰہ آباد میں گھر کر رہ جاتا۔ یا تو وہ قلعہ محصور ہو جاتا یا باغی اس سے کنارہ کشی کر کے بنارس کے راستے سے کلکتہ کی طرف کوچ کرتے۔ وہاں ان کو روکنے کے لئے کوئی فوجی دستے نہ تھے اور نہ ہی کوئی قلعہ بندیاں تھیں۔''(122) انس کا بیان ہے کہ ''سندھیا کی وفاداری نے ہندوستان کو برطانیہ کے لئے بچا لیا۔''(123)

پٹیالہ اور جیند کے راجاؤں اور کرنال کے نواب نے اپنے تمام وسائل انگریزوں کے حوالے کر دیئے اور اپنے رنگروٹوں کے ساتھ انگریزوں کے بڑے اڈے انبالہ سے دہلی تک

سڑک کو کھلا رکھنے کا کام سنبھال لیا۔ اس طرح پنجاب سے باغی پایہ ءتخت کے انگریز محاصرین کو کمک پہنچنا ممکن ہو گیا۔

اخباری اطلاعات پڑھنے کے بعد مارکس نے اپنے روزنامچہ میں قلمبند کیا: ''سندھیا انگریز کتوں کا وفادار ہے! لیکن اس کے فوجی نہیں۔ راجہ پٹیالہ پر تف! وہ فوجیوں کے بڑے بڑے دستے انگریزوں کو کمک کے طور پر بھیج رہا ہے!'' (124)

البتہ نئی انقلابی ذہنیت دیسی ریاستوں میں سرایت کر چکی تھی۔ بالخصوص ان کے فوجیوں میں جنہوں نے عملی طور پر باقی ہندوستان کے سپاہی بھائیوں کی مثال کی پیروی کی۔ مہاراجہ اندور کے فوجیوں نے بغاوت کر دی اور انگریزوں کو ریاست سے نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ انتہائی ڈرامائی واقعہ اس وقت رونما ہوا جب رانی جھانسی اور تانتیا ٹوپے گوالیار پہنچے۔ سندھیا کے فوجی ان سے مل گئے اور سندھیا اپنے مٹھی بھر وفادار پیروؤں کے ساتھ بچ کر آگرہ کے برطانوی قلعے کی جانب بھاگ گیا۔ مہاراجہ اودے پور کے فوجی جو آگرہ کی حفاظت کے لئے بلوائے گئے تھے، معلوم ہوا کہ وہ ''ساز باز کا شکار ہوئے ہیں۔'' (125) جے پور کے فوجیوں کو ''متھرا اور گوڑگاؤں میں امن و امان بحال کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ انہوں نے فرنگی پناہ گیروں کی حفاظت کرنے پر رضامندی کا اعلان کیا لیکن جارحانہ جنگ کرنے سے انکار کر دیا۔'' (126) رسالہ سہور نے اسی قصے کو دہرایا۔ ''کوٹاہ کنٹنجنٹ نے جسے آگرے کی حفاظت کے لئے بلایا گیا تھا، بغاوت کر دی۔ بھرت پور رسالہ فرار ہو گیا اور کرولی کے جوان نمک حرام ثابت ہوئے۔''

جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس سے مالیسن اس نتیجہ پر پہنچا: ''یہ صاف طور پر ثابت ہو گیا ہے کہ جب اہلِ مشرق کا مذہبی جنون ابھرتا ہے تو پھر ان کا راجہ بھی جسے وہ باپ کا درجہ دیتے ہیں اور بعض اُسے خدا کہہ کر خوش ہوتے ہیں، وہ بھی انہیں اپنے اعتقادات سے منحرف نہیں کر سکتا۔'' (127) جسے انگریز شہنشاہیت پرست مورّخ مذہبی کٹڑپن قرار دیتا ہے۔ وہ ایک نئے شعور کا آغاز، انگریز دشمنی کا قومی جذبہ اور روایتی جاگیردارانہ وفاداریوں کا خاتمہ تھا۔ ان کا راجہ اب ان کا ''باپ'' نہ رہا اور نہ ان کا خدا تھا۔ 1850ء کے دوران جب والیانِ ریاست انگریزوں کے تئیں وفاداری کا وعدہ کر رہے تھے ان کے فوجی ان سے منہ موڑ لیتے اور اپنے ملک سے اپنی وفاداری کا ثبوت دیتے۔

البتہ دیسی ریاستوں کے عوام ابھی جاگیرداروں کے سیاسی اثر و رسوخ کے تحت تھے اور والی ریاست کی راہنمائی کے منتظر تھے۔ اس طرح والیانِ ریاست اپنے ماتحت لوگوں کی بیزاری کو دبا سکتے تھے اگرچہ یہ کبھی کبھی مقامی شورشوں کی صورت میں پھوٹ پڑتی تھی جنہیں آسانی کے ساتھ دبا دیا جاتا۔ اس طرح 1857ء کی قومی بغاوت کے دوران ہندوستان کے والیانِ ریاست نے برطانوی راج کو بچالیا۔

1857ء کی بغاوت کے مورخین کے ایک طبقے نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ یہ کوئی قومی بغاوت نہ تھی کیوں کہ سارا ہندوستان اس میں شریک نہیں ہوا تھا اور ایک خاص علاقے کے اندر یہ محدود تھی۔ اب ہم مسلمہ حقائق کو ملاحظہ کرتے ہیں:

شمالی ہندوستان کا بیشتر حصہ اس وسیع علاقے میں شامل تھا جہاں بغاوت رونما ہوئی یعنی دہلی، اودھ، روہیل کھنڈ، بندھیل کھنڈ، آگرہ پر مشتمل شمال مغربی صوبجات اور بہار کا بہت سا حصہ۔ فچٹ کا بیان ہے: ''یہ یاد رکھنا چاہئے کہ بغاوت زدہ اضلاع فرانس، آسٹریا اور پرشیا کے مجموعی رقبے کے برابر تھے اور آبادی میں ان سے بھی زیادہ۔''

''بغاوت کی وسعت اور کمال عروج کا کچھ اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ اس وقت بنگالی فوج کے عملہ میں باقاعدہ شامل رسالے کی ہر رجمنٹ بے قاعدہ رسالے کی اٹھارہ میں سے دس رجمنٹیں اور فوج پیادہ کی چوہتر میں سے تریسٹھ رجمنٹیں فرد ملازمین سے قطعاً اور کلیتہً غائب ہو گئیں۔'' (128)

برطانوی غلبے کے خلاف ہندوستانی جدوجہد کے تاریخی تصوّر میں جس بات پر زور دینے کی ضرورت ہے وہ 1857ء کی بغاوت کی حد بندی اور تنگی نہیں ہے بلکہ اس کی تندی و تیزی، وسعت اور گہرائی ہے۔ سرزمین ہند پر انگریزوں کے خلاف لڑی گئی تمام سابقہ جنگوں سے 1857ء کی بغاوت نمایاں طور پر الگ حیثیت رکھتی ہے۔

پہلی خصوصیت اس علاقے کی وسعت ہے جس میں 1857ء کی بغاوت پھیلی اور اس سے وسیع تر وہ ہمدردی اور اتحادِ عمل ہے جو اسے حاصل ہوا۔ تمام برطانوی اور ہندوستانی مورّخ اور وقائع نگار یکساں طور پر اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ 1857ء کی بغاوت ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف مسلح جدوجہد میں عظیم ترین متحدہ محاذ تھا جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

اس کے علاوہ اس جنگ اور برطانیہ کے خلاف دوسری جنگوں میں ماہیتی فرق ہے۔ سابقہ جنگوں میں ایک قلمرو کے لوگ جو اکثر ایک ہی قوم کے ہوتے تھے تن تنہا لڑتے تھے۔ مثلاً بنگالیوں نے پلاسی کی لڑائی اکیلے ہی لڑی۔ یہی حال کرناٹک، مرہٹہ، سکھ اور سندھ کی جنگوں کا تھا۔ وسیع تر متحدہ محاذ کی ابتدائی کوششیں ناکام ہوگئی تھیں لیکن 1857ء کے دوران مختلف ذاتوں، قبیلوں، قوموں اور مذہبوں کے لوگوں نے جو الگ الگ عملداریوں میں رہتے تھے مل کر بغاوت کی تاکہ برطانوی راج کو ختم کیا جائے۔ یہ ہندوستانیوں کا بے نظیر اتحاد تھا۔ اپنے زمانے کے سب سے زیادہ دور اندیش مفکر مارکس نے اس نئی حقیقت پر یوں روشنی ڈالی ہے۔

''اس سے پہلے ہندوستانی فوج میں کئی بار غدر ہوا لیکن یہ بغاوت مخصوص اور مہلک کیفیتوں کے سبب امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ پہلا موقع ہے جب فوجی رجمنٹوں نے اپنے فرنگی افسروں کو قتل کیا ہے۔ ہندو اور مسلمان اپنی باہمی کدورتوں کو ترک کر کے اپنے آقاؤں کے خلاف متحد ہوئے ہیں۔ جن ہنگاموں کی ابتدا ہندوؤں سے ہوئی ان کا عملی انجام یہ ہوا کہ ایک مسلمان شہنشاہ کو دہلی کے تخت پر بٹھا دیا گیا۔ بغاوت صرف چند علاقوں تک محدود نہیں رہی۔''(129)

جس طرح 1857ء کی بغاوت کے مذکورہ بالا مثبت پہلو پر زور دینا ضروری ہے اسی طرح یکساں طور پر یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے منفی پہلو کو بیان کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ کون کون سے فیصلہ کن علاقے اور ہندوستانیوں کے طبقے تھے جو قومی بغاوت میں شریک نہ ہوئے اور کس طرح بعضوں کو برطانوی فریق کی حمایت پر اکسایا گیا۔ اس میں متعدد اسباب کو دخل تھا لیکن ہم صرف سب سے بڑے یعنی قومی پہلو کا مطالعہ کریں گے۔

گورکھوں اور سکھوں نے انگریزوں کے طرفدار ہو کر فیصلہ کن پارٹ ادا کیا۔ انگریزوں نے نیپال کی جنگ ہندوستانی فوج کی مدد سے لڑی تھی۔ رانا جنگ بہادر نیپال کو رانا شاہی کے مرکزی نظامِ حکومت کے تحت لا رہا تھا۔ انگریزوں نے اُسے ایک مستقل امدادی رقم اور ترائی کے وسیع علاقے دینے کا وعدہ کیا۔ وہ انتقام کی آڑ میں اودھ کو فتح کرنے کے لئے گورکھا فوجیوں کو نیچے لے آیا۔

مغلوں سے متعلق سکھوں کی تلخ تاریخی یادیں ابھی تازہ تھیں۔ تھوڑے سے ابتدائی تامل کے بعد خالصہ فوج کے بیکار فوجیوں اور سکھ راجاؤں اور سرداروں کے نوکروں چاکروں کو بھرتی

کرنے میں انگریز کامیاب ہو گئے۔ مرہٹوں میں پیشواؤں کے وارث نے بغاوت کی لیکن مرہٹے راجے جنوب میں نظام کے ساتھ اور شمال میں مغلوں کے ساتھ ذاتی رقابتیں اور دیرینہ عداوتیں رکھتے تھے۔

راجپوتانہ کے راجاؤں کے دلوں میں پہلے مغلوں کے اور بعد میں مرہٹوں کے غلبہ کی گذشتہ تلخ یادیں تھیں۔ اس کے علاوہ اب وہ انگریزوں کے چنگل میں تھے۔

ہمارے جاگیرداروں کے نفاق سے متعلق ماضی کی تاریخی یادوں نے ملک کے بیشتر حصوں کے لوگوں کو پست کر دیا اور ہندوستانی والیانِ ریاست نے جاگیردارانہ ذاتی مفاد کے زیرِ اثر انگریز غاصبین کی مدد کی۔ نہرو نے بحث کے ماحصل کو اختصار کے ساتھ یوں بیان کیا ہے۔ ''بغاوت نے انگریزوں کی حکومت کے انجر پنجر ڈھیلے کر دیئے اور بالآخر اسے ہندوستانیوں کی مدد سے دبایا گیا۔''(130)

جس طرح یہ ایک حقیقت ہے کہ 1857ء کی بغاوت برطانوی حکومت کے خلاف سب سے بڑی قومی شورش تھی اسی طرح یہ بھی صحیح ہے کہ انگریز ہندوستانیوں کو ہندوستانیوں کے خلاف لڑا کر اسے دبانے کے قابل ہوئے۔ ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' انگریزوں کی روایتی پالیسی تھی اور انہوں نے 1857ء کے دوران اس سے تباہ کن اثر کے ساتھ کام لیا۔ فچٹ بغلیں بجاتے ہوئے دعویٰ کرتا ہے ''یہ ساری داستان برطانوی قوم کی شہنشاہی ذکاوت کا کیا خوب مظاہرہ ہے۔'' بقول ہاڈسن، جو خود اس شاندار ڈرامے میں نہایت ممتاز اداکار تھا۔ ''وہ قوم جس نے پنجاب جیسے بڑے ملک کو ہندوستانی (پوربیا) فوج کے ساتھ فتح کیا! پھر مفتوح سکھوں کی قوت کو اسی فوج کے مغلوب کرنے میں استعمال کیا جس نے انہیں رام کیا تھا۔ جس نے پشاور پر برسوں لڑ کر قبضہ جمائے رکھا حالاں کہ افغان قبیلوں نے سخت مزاحمت کی تھی۔ پھر جب وہ ان رجمنٹوں سے اچانک محروم ہو گئے جنہوں نے یہ کارنامہ انجام دیا تھا اور انہوں نے بغاوت کر دی تو انہیں بے ہتھیار کرنے اور دبانے میں بلا تامل انہیں قبیلوں سے کام لیا۔ وہ قوم جو اتنا کچھ کر سکتی ہے بے شک اس کی قسمت میں دنیا پر حکومت کرنا لکھا ہے۔''(131)

انس اس حقیقت کو زیادہ مدبرانہ زبان میں پیش کرتا ہے اور اس حکمتِ عملی کو بیان کرتا ہے جس کے ساتھ برطانوی سیاستدانوں نے 1857ء کے دوران ہندوستانی زندگی کی کمزوریوں سے

فائدہ اٹھایا۔صرف ہماری موجودگی ہی قدیم ہلاکت خیز جنگوں اوران کے ساتھ وابستہ ہولنا کیوں سے تحفظ کی ضمانت تھی۔ان ہولنا کیوں کی روایتیں اور یادیں ابھی تازہ تھیں۔''(132)

اس سوال کو پیش کرنا ضروری ہے، کہ انگریز ہندوستانیوں کے نفاق سے کیوں کر فائدہ اٹھا سکے؟اس کا جواب ہندوستان میں بحیثیت مجموعی اور مختلف سماجی طبقات کے سیاسی شعور پر منحصر ہے۔

کسان انگریز کا مخالف تھا لیکن اس کی نظر گاؤں تک محدود تھی۔اس کی سیاسی واقفیت اس ریاست کے معاملات سے آگے نہ بڑھتی جس میں وہ روایتی راجہ کے تحت رہتا تھا۔

ملک کی سیاسی اور نظریاتی راہنمائی ابھی جاگیردار حکمران طبقات کے ہاتھ میں تھی۔انگریز دشمنی کے عام جذبے میں وہ دوسروں کے ساتھ شریک تھے لیکن وہ اپنے جاگیردار حریفوں سے زیادہ ڈرتے تھے۔وہ ایک زوال پذیر طبقہ تھا۔ان کی تاریخی یادیں ماضی کی جاگیردارانہ پھوٹ اور خانہ جنگیوں تک محدود تھیں۔انہیں ایک متحد اور آزاد ہندوستان کا تصور نہ سوجھ سکتا تھا۔

ان دنوں حبِ وطن سے مراد اپنے علاقے کی محبت تھی جس پر اس کا روایتی حکمران راج کرتا تھا۔ہندوستان کا تصور بطور ایک مشترک وطن کے ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔اس کی راہ میں نہ صرف جاگیردارانہ تاریخی یادیں حامل تھیں بلکہ اس کی مادی بنیادیں ابھی نہیں پڑی تھیں یعنی ریلوے ٹیلیگراف جذبہ تعلیم کا یکساں طریقہ وغیرہ۔

ہندوستان کا تصور ایک مادر وطن کی حیثیت سے بعد میں پیدا ہوا اور 1857ء کی بغاوت کے قابل قدر تجربہ نے اس کی ترقی میں مدد دی۔''دی لندن ٹائمز'' (The London Times) نے اس نئے نظریے کا ٹھیک ذکر کیا ہے۔''58-1857ء کی بغاوت کا ایک بڑا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کے ہر حصے کے باشندے ایک دوسرے سے آشنا ہو گئے ہیں۔ہم نے دیکھا ہے کہ جنگ کا سیلاب نیپال سے امنڈتا ہوا گجرات کی حدود تک اور راجپوتانہ کی صحراؤں سے نظام کے علاقوں کی سرحدوں تک جا پہنچتا ہے۔ایک ہی طرح کے لوگ سارے ہندوستان کی سرزمین کو تاخت وتاراج کر رہے ہیں اور اپنی تحریک کو قومی رنگ دے رہے ہیں۔الگ تھلگ ریاستوں کے حقیر مفادات، جہالت جس کے زیر اثر ایک چھوٹی سی ریاست کے باشندے دوسری ریاست کے آداب و رسوم سے بے خبر رہتے، یہ سب کچھ ختم ہو گیا ہے اور اس کی جگہ سارے ہندوستان میں

پبلک معاملات کی زیادہ یکساں سوجھ بوجھ نے لے لی ہے۔ اگر یہ بھی فرض کرلیا جائے کہ 1857ء کی بغاوت میں کوئی قومی جذبہ بیدار نہیں ہوا تھا تو بھی ہم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ بغاوت کو دبانے کے لئے ہماری کوششوں نے ایک نئے پودے کے بیج بو دیئے ہیں اور اس طرح آنے والے برسوں میں لوگوں کی طرف سے زیادہ سرگرم جدوجہد کی بنیاد پڑ چکی ہے۔"(133)

6- جاگیرداری کی بحالی

باغیوں کا مقصد کیا تھا؟ وہ کس قسم کا سیاسی اور سماجی نظام ہندوستان میں قائم کرنا چاہتے تھے؟ 1857ء کی بغاوت کے صحیح جائزے کا مدار مذکورہ بالا سوال کے صحیح جواب پر ہے۔ اس سے یہ فیصلہ کرنے میں مدد ملے گی کہ آیا یہ بغاوت رجعت پسندانہ تھی یا ترقی پسندانہ؟

یہ حیرت کا مقام ہے کہ اس سوال پر نہ صرف برطانوی اور بعض بلند رتبہ ہندوستانی مورخین میں اتفاق رائے ہے بلکہ کچھ صف اوّل کے ہندوستانی سیاسی راہنماؤں میں بھی۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی رائے اس طرح پیش کی ہے: "اصل میں یہ جاگیرداروں کی شورش تھی۔ جاگیردار سرداروں نے اور ان کے پیروؤں نے اس کی قیادت کی۔ دور دور تک پھیلے ہوئے انگریز دشمنی کے جذبے نے اس کی مدد کی...... ہاری ہوئی بازی یعنی نظام جاگیرداری کے لئے جدوجہد کرنے سے آزادی حاصل نہ ہوگی۔"(134)

ڈاکٹر موزمدار اس نتیجے پر پہنچتا ہے: "1857-58ء کی خونریزی اور مصائب ہندوستان کی تحریک آزادی کا پیش خیمہ نہیں تھے بلکہ زمانۂ وسطیٰ کے فرسودہ طبقۂ امرا اور مرکز گریز نظام جاگرداری کے نزع کا درد و کرب تھا۔"(135)

سرکاری مورّخ ڈاکٹر سین وزیراعظم کے نقطۂ نظر کی اصلاح اور مزید وضاحت پیش کرتا ہے: "برطانوی حکومت نے نادیدہ طور پر ایک سماجی انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ انہوں نے عورتوں کی بعض مجبوریاں رفع کر دی تھیں۔ انہوں نے قانون کی نگاہ میں انسانوں کی مساوات قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے کسان اور نیم غلام مزدوروں کی حالت سنوارنے کی کوشش کی تھی۔ بغاوت کے راہنما اگر جیتتے تو رجعت پسندانہ اقدام کر کے وہ نئی اصلاحات پر پانی پھیر دیتے، نئے نظام کو ختم کر دیتے اور پچھلے دنوں کی یاد تازہ کرتے جب ایک عام آدمی امیر کے مقابلے میں یکساں

انصاف کی توقع نہ کر سکتا تھا۔ جب اسامی تعلقدار کے رحم و کرم پر تھا اور جب چوری کی سزا میں ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جاتے تھے۔ غرضیکہ وہ انقلاب کے پہیئے کو الٹا چلانا چاہتے تھے۔'' (136)

اس کا مطلب یہ ہے کہ برطانوی حکومت اگرچہ غیر ملکی تھی ایک سماجی انقلاب پیدا کر رہی تھی اور 1857ء کے راہنما اگرچہ وہ آزادی کے لئے مسلح جدوجہد کر رہے تھے درحقیقت ایک جوابی انقلاب لا رہے تھے۔ پھر ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ ہندوستانیوں نے برطانوی حکمرانوں کو ہندوستان چھوڑ جانے پر کیوں مجبور کیا؟ ان سے یہ تقاضا کیوں نہ کیا کہ وہ مزید سو سال یہاں ٹھہریں تاکہ سماجی انقلاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں اور سماجی مساوات کا نظام ہمارے لئے تعمیر کریں!

یہ نظریہ کہ برطانوی سرکار کے ترقی پسندانہ اقدام کے مقابلے میں باغیوں کا رویّہ رجعت پسندانہ تھا نہ نیا ہے اور نہ طبع زاد بلکہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا لارڈ کیننگ اور 1857ء کی بغاوت کے پہلے مسلم الثبوت برطانوی مورّخ کے بقول: ''لارڈ کیننگ نے بلاشبہ یہ دیکھا کہ شورش سے پہلے چند سالوں کے دوران انگریزوں نے ہندوؤں میں اپنے یقینِ محکم سے متاثر ہو کر کسی قدر شدید جوش کے ساتھ کوشش کی تھی کہ وہ ہر چیز کو اپنے خیال کے سانچے میں ڈھالیں۔ قدامت پرست اس جدّت کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور متواتر جدت طرازیوں پر غضب ناک ہو گئے۔'' (137)

برطانوی سیاستدانوں اور مورخوں کا وطیرہ تو ہماری سمجھ میں آ سکتا ہے جب وہ قدیم وضع اور جدید وضع کے مقابلے کا نظریہ پیش کرتے ہیں اور وہ اپنے طرزِ عمل کو تو ترقی پسندانہ اور باغیوں کے مقصد کو رجعت پرستانہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن جب ہندوستانی راہنما اور مورخ اسی نظریہ کا بار بار ذکر کرتے ہیں تو ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ ظاہر کو حقیقت سمجھ رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ 1857ء کی بغاوت کی راہنمائی ہندوستانی جاگیرداروں نے کی (لیکن صرف انہوں نے ہی نہیں) لیکن وہ کوئی کارنامے انجام دینے والے نہ تھے نہ ہی ہندوستان کے مقدر کے مختارِ کل۔ اس جدوجہد کے دوران عوام کی سماجی قوتیں بھی بروئے کار تھیں جن کے ساتھ نئے خیالات اور عوامل بھی آئے۔ حیف کا مقام ہے کہ ڈاکٹر موزمدار، ڈاکٹر سین اور پنڈت نہرو نے ان پر نہ تو توجہ کی اور نہ انہیں کوئی وقعت دی۔ اگر ہم غور اور سنجیدگی کے ساتھ ان کا مطالعہ کریں تو یہ نتیجہ ناگزیر ہے کہ

1857ء کی قومی بغاوت کے دوران عوامی قوتیں بہت سرگرم تھیں۔ان کی آرزوئیں معقول تھیں اور ہندوستان میں رجعت پسندانہ جاگیرداری کی بحالی کو روکنے کے لئے خیالات ان کے دماغ میں روشن تھے۔

1857ء کی بغاوت کا ایک قطعی عظیم کارنامہ، جس کا ہندوستانی قومی تحریک بجا فخر کے ساتھ دعویٰ کر سکتی ہے، وہ انگریزوں کے حیلوں چالوں کے خلاف جدوجہد کو کامیابی کے ساتھ جاری رکھنے اور ہندو مسلم اتحاد پیدا کرنے کی نیک کوشش اور اس کو قائم رکھنے کی متواتر سعی ہے۔

ہندو مسلم تفرقے سے فائدہ اٹھانے کی پالیسی ہندوستان میں برطانوی نمائندوں کے گوشت پوست کا ایسا جزو بن چکی تھی کہ جب شورش کے اولین آثار مئی 1857ء میں نمودار ہوئے تو لارڈ کیننگ نے فوراً یہ سوچنا شروع کیا کہ آیا اس کی پشت پر ہندو ہیں یا مسلمان۔ ٹے اس نئی صورتحال کی الجھن اور اہمیت کو بیان کرتا ہے جس سے برطانوی حکمران دوچار تھے۔''لیکن ماہ اپریل کے خاتمے سے پہلے لارڈ کیننگ پر یہ ظاہر ہو گیا ہوگا کہ جن ایشیائی نسلوں کو ہمارے تحفظ اور قوت کا بڑا وسیلہ سمجھا گیا تھا اب ان کی مخالفت کے سبب کسی چیز کی توقع نہیں رہی۔ مسلمان اور ہندو کھلم کھلا ہمارے خلاف متحد تھے۔''(138)

البتہ برطانوی افسروں نے ہمت نہ ہاری بلکہ ہندو مسلم تفرقات کو برانگیختہ کرنے کی پالیسی پر ثابت قدم رہے۔مئی 1857ء میں سر ہنری لارنس نے لکھنو سے لارڈ کیننگ کو لکھا: ''میں دونوں فرقوں کے مابین جذبات کے اختلافات پر نظر رکھوں گا۔'' لیکن فرقہ وارانہ منافرت پیدا نہ ہو سکی۔ اچکسن افسوس کے ساتھ تسلیم کرتا ہے: ''اس موقعہ پر ہم مسلمان کو ہندو کے خلاف نہ لڑا سکے۔''(139)

باغی راہنما پوری طرح انگریزوں کی اس تفرقہ انگیز چال سے آگاہ تھے۔احیائے اسلام کے حامی علامہ فضل حق نے لکھا: ''انگریزوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ اپنے حیلوں اور دھوکے کی چالوں سے انقلابی قوتوں میں انتشار پیدا کیا جائے، مجاہدوں کی طاقت کو بے اثر کیا جائے اور ان کی بیخ کنی کی جائے، اور ان میں پھوٹ ڈال کر انہیں تتر بتر کر دیا جائے۔اس باب میں انہوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔''(140)

جدوجہد کی کامیابی کے لئے باغی راہنماؤں نے دیدہ و دانستہ ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا۔

بہادر شاہ، فوجی لیڈروں، فاضل علماء اور شاستریوں نے اعلان اور فتوے جاری کئے جن میں یہ تاکید کی گئی کہ ہندو مسلم اتحاد وقت کا تقاضا ہے اور سب کا فرض۔ جو علاقے برطانوی حکومت سے آزاد ہو گئے ان میں باغی راہنماؤں نے جو کام سب سے پہلے کیا وہ گاؤکشی کی ممانعت کا حکم اور اس کا نفاذ تھا۔ باغی راہنماؤں کی اعلیٰ ترین سیاسی اور فوجی تنظیم میں ہندو اور مسلمان نمائندوں کی تعداد برابر تھی۔(141) جب بہادر شاہ نے سمجھا کہ وہ حکومت کے معاملات کا انتظام نہیں کر سکتا تو اس نے جے پور، جودھ پور، بیکانیر اور الور کے راجاؤں کو لکھا کہ ''اگر آپ انگریزوں کو نیست و نابود کرنے کے مقصد سے متحد ہو جائیں تو میں برضا و رغبت شہنشاہی اقتدار آپ کے ہاتھوں میں سونپ دوں گا۔''(142) دہلی میں ایک باغی سکھ رجمنٹ نے ایک مسلمان سپہ سالار کے تحت فوجی خدمت انجام دی۔(143) ایسی متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

البتہ ان دنوں لوگوں پر مذہبی نظریے کا غلبہ تھا۔ روایتی ہندو مسلم تفرقہ موجود تھا۔ ہندو اور مسلمانوں میں احیائے مذہب کے نظریات بھی پائے جاتے تھے۔ وہابیوں کا سب سے زیادہ اثر و رسوخ تھا۔ باغیوں کے ڈیرے میں برطانوی جاسوسی پیدا کی یعنی ففتھ کالم نے ہندو مسلم اتحاد میں رخنہ ڈالنے کے لئے نعرۂ جہاد بلند کیا۔ ''بادشاہ کے حضور میں عرضداشتیں پیش کی گئیں کہ کل 22- مئی رمضان کا آخری دن ہے اس لئے بادشاہ سلامت ہندوؤں کے خلاف جہاد کے احکام صادر فرمائیں۔ بادشاہ نے ڈنکے کی چوٹ پر یہ اعلان جاری کیا کہ ہندو مسلمان آپس میں کوئی جھگڑا نہ کریں۔ تمام ہندوؤں نے جان کے خوف سے اپنے مکانات بند کر لئے۔''(144) 20- مئی کو ہندو افسروں کا ایک وفد پہنچا اور شکایت کی کہ ہندوؤں کے خلاف جہاد کی تلقین کی جا رہی ہے۔ بادشاہ نے جواب دیا: ''جہاد انگریزوں کے خلاف ہے۔ میں نے ہندوؤں کے خلاف اس کی ممانعت کر دی ہے۔''(145)

..جب عید کا تیوہار آیا تو بادشاہ نے احکام جاری کئے کہ کوئی گائے ذبح نہ کی جائے۔ اگر کوئی مسلمان ایسا کرے گا تو توپ سے اڑا دیا جائے گا۔ انگریزوں کے دوست حکیم احسن اللہ خاں نے اس حکم پر اعتراض کیا اور کہا کہ میں مولویوں سے مشورہ کروں گا۔ یہ سن کر بادشاہ بہت غضبناک ہوا۔ دربار کو موقوف کر دیا اور اپنے دیوانِ خاص میں چلا گیا۔ جنرل بخت خاں نے شاہی احکام کے مطابق ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ شہر میں گاؤکشی منع ہے۔''(146)

ڈاکٹر موز مدار کا یہ بیان درست نہیں کہ ''فرقہ وارانہ تعصب کی جڑیں اتنی گہری تھیں کہ صرف اعلان میں مذکور نیک خواہشات کی برکت سے اس کی بیخ کنی کرنا ممکن نہ تھا۔'' (147) فرقہ وارانہ فساد کے جو کچھ اکا دکا واقعات رونما ہوئے ڈاکٹر موز مدار ان کی اہمیت میں مبالغہ کرتا ہے۔ اصلی اہمیت تو اس حقیقت کی ہے کہ برطانوی ایجنٹ بہت کم فرقہ وارانہ فساد برانگیختہ کر سکے اور باغی راہنما بحیثیت مجموعی جدوجہد کے دوران ہندو مسلم متحدہ محاذ کو کامیابی کے ساتھ قائم رکھنے کے قابل تھے۔

اس مسئلے کا ایک اور بہت اہم پہلو ہے۔ اس ہنگامے کے نتیجہ کا فیصلہ کرنے میں ہندو مسلم اتحاد کو بڑا دخل تھا۔ برطانوی فریق اس سے باخبر تھا اور انہوں نے اس اتحاد میں رخنہ ڈالنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور انتہائی کوشش کی۔ ہندوستانی بھی اس سے آگاہ تھے اور انہوں نے اس کی وقعت کو قائم رکھنے اور سمجھنے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ لیکن بذاتِ خود یہ مسئلے کا غیر محرک بیان ہوگا۔ باغیوں کے لشکر میں جس قدر زیادہ ہندو مسلم اتحاد ہوتا اسی قدر جدوجہد زیادہ طویل ہوتی۔ اسی قدر عوامی قوتوں کو پیش پیش رہنے کے زیادہ مواقع ملتے اور جاگیردارانہ قوتوں کا نظریاتی اور سیاسی اثر ورسوخ کمزور تر ہوتا۔ جاگیردارانہ قوتیں جس قدر کمزور ہوتیں اسی قدر جاگیرداری کی بحالی کے امکانات کم تر رہ جاتے۔ ہر قسم کی عوامی اور قومی جدوجہد کی یہی منطق ہے۔ 1857-58ء کی جدوجہد کے آخری دور میں جاگیردارانہ قوتیں کلیتہً عریاں اور کمزور ہو کر رہ گئیں۔ عوامی قوتیں ابھی اتنی زور آور، بیدار اور منظم نہ تھیں کہ ان پر غالب آئیں اور جدوجہد جاری رکھیں۔ اصل میں جو کچھ ہوا وہ برطانوی فتح تھی نہ کہ جاگیردارانہ نظام کی بحالی۔ جب اگلی پشت میں جدید قومی تحریک شروع ہوئی تو 1857ء کی جدوجہد سے ہندو مسلم اتحاد کی شاندار میراث حاصل کی گئی اور اگلی دو پشتوں نے برطانوی غلبہ کے خلاف ہندو مسلم متحدہ محاذ کے تصور کو زیادہ جمہوری پروگرام کا رنگ دیا۔

برطانوی فریق نے بھی اس تاریخی واقعے سے عبرت حاصل کی۔ فارسٹ ''انٹروڈکشن ٹو سٹیٹ پیپرز'' 1857ء (Introduction of State Papers) میں لکھتا ہے:

''ان بہت سے اسباق میں جو مورّخ کو ہندوستان کے غدر سے ملتے ہیں کوئی بھی سبق اس تنبیہ سے زیادہ اہم نہیں کہ ہم ایک ایسے انقلاب سے دوچار ہو سکتے ہیں جس میں برہمن اور شودر

ہندو اور مسلمان ہمارے خلاف متحد ہو سکتے ہیں اور یہ فرض کر لینا قرینِ مصلحت نہیں کہ ہمارے مبقوضات میں امن اور استحکام کا اس بات پر انحصار ہے کہ براعظم میں مختلف مذاہب کے فرقے آباد ہیں۔ غدر ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہماری عملداری ایک ایسی پتلی پرت پر قائم ہے جسے سماجی تغیرات اور مذہبی انقلابات کی زبردست قوتیں کسی بھی وقت پارہ پارہ کر سکتی ہیں۔"(148)

7-باغی سپاہی فوج

ایسٹ انڈیا کمپنی کی باغی سپاہی فوج نے نہ صرف 1857ء کی بغاوت کو شروع کیا بلکہ اس کی تنظیم اور قیادت میں اہم اور قطعی پارٹ ادا کیا۔

اس وقت کے حالات میں اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ یہ قومی بغاوت ہندوستانی سپاہیوں کی طرف سے شروع کی جاتی۔ مارکس نے جو اس وقت واقعات کو قلم بند کر رہا تھا اس کی اہمیت کو فوراً بھانپ لیا۔ "یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کی اطاعت کا مدار دیسی فوج کی وفاداری پر ہے۔ اس فوج کی بھرتی کے ساتھ برطانوی حکومت نے مزاحمت کا پہلا عام محاذ منظم کر دیا جو ماضی میں کبھی ہندوستانیوں کو حاصل نہ ہوا تھا۔"(149)

ہندوستانی سپاہی فوج کی اپنی شکایات تھیں جو اس وجہ سے پیدا ہوئیں کہ یہ ایک غیر ملکی حکومت کی بھاڑے کی فوج تھی۔ ان کی شکایات نہ صرف مذہبی رسم و رواج میں مداخلت سے متعلق تھیں بلکہ تنخواہ، بھتے وغیرہ سے متعلق معاشی شکایتیں بھی تھیں۔ سب سے بڑھ کر ان کے نسلی امتیاز کی شکایت تھی جس کی وجہ سے انہیں بلا لحاظ قابلیت اور تجربے ہر اہم معاملے میں انگریزوں کی نسبت ادنیٰ سمجھا جاتا تھا۔

صرف یہی نہیں کہ ہندوستانی فوج کی اپنی شکایات تھیں اور وہ ہندوستانی لوگوں کی سب سے زیادہ منظم قوت تھی بلکہ آخر وہ تھے تو ہندوستانیوں کی اولاد اور اس حیثیت سے وہ برطانوی راج کے اسی طرح شکار تھے جیسے دوسرے ہندوستانی۔

بحیثیت ایک طبقے کے ہندوستانی سپاہی، کسان تھے اور بنگالی فوج کی اکثریت "اودھ کے دیہات"(150) سے تعلق رکھتی تھی۔ اسی لئے وہ ہندوستان کے دیہاتی گھرانوں کے مصائب سے اچھی طرح واقف تھے۔ الحاقِ اودھ کے بعد اپنی وطن کی آزادی کھونے سے باقی ہندوستانی

فوج کی نسبت بنگالی فوج میں قومی ذلت کے سوال کا زیادہ سخت اور تیز ردعمل ہوا۔

سپاہیوں کا ہندوستان کے لوگوں کے ساتھ وہی تعلق تھا جو پیٹ کے بچے کا اپنی ماں کے رحم کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان کے دلوں سے برطانوی آقاؤں کی عزت جاتی رہی۔ وہ جنگ کے اعتبار سے اپنی وقعت اور قوت سے آگاہ ہو رہے تھے۔ سکھ اور افغان جنگوں کے دوران سپاہی نے نہ صرف یہ دیکھ لیا تھا کہ انگریز ناقابلِ تسخیر نہیں ہیں بلکہ وہ برطانوی فوجیوں اور افسروں کی کمزوری، بزدلی اور خود غرضی سے بھی واقف ہو گیا تھا اور جانتا تھا کہ جب یہ ناکامیوں سے دوچار ہوتے ہیں تو یہ ایک جارحانہ اور غاصبانہ فوج بن جاتے ہیں۔ اس پس منظر میں ہندوستانی سپاہیوں کو اس فوج میں جس نے ہندوستان کو انگریزوں کے لئے مطیع کر رکھا تھا انگریزی عملہ کی نسبت اپنی کثرتِ تعداد کا زعم ہونے لگا۔

1857ء کے دوران چیف کمشنر پنجاب جان لارنس نے بجا طور پر یہ لکھا: ''اس بات کی توقع کرنی چاہیئے تھی کہ دیسی فوج جو ہمارے قلعوں، اسلحہ خانوں، بارود خانوں اور خزانوں کی ذمہ دار تھی وہ فرنگیوں کی نگرانی کے بغیر اپنی اہمیت کے زعم میں مبتلا ہو جائے گی۔'' (151)

اس وقت ہندوستانی فوجیوں میں جو جذبات غالب تھے ان کا مفصل اندازہ ہمیں سر سید احمد خاں کے بیان سے ہو سکتا ہے۔

''وہ فوج میں انگریزوں کو آٹے میں نمک کے برابر سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جو بہت سی فتوحات انگریزوں کو حاصل ہوئی تھیں وہ سراسر ہماری جوانمردی کا نتیجہ تھیں۔ ان کا ایک عام دعویٰ تھا کہ ہماری مدد سے ہی انگریزوں نے ہندوستان کو برما سے کابل تک فتح کیا ہے۔ لوگ پوری طرح جانتے تھے کہ سرکار کا انحصار ہندوستانی فوج پر ہے۔ اس لئے جب انہیں معلوم ہوا کہ فوج نے بغاوت کر دی ہے تو لوگوں نے فسادات بپا کر دیئے۔ اب ان پر سرکار کا کوئی رعب نہ تھا۔'' (152)

ایسی ہندوستانی فوج جو ہندوستانی کسانوں سے طبقہء عام سے بھرتی کی گئی اپنے تجربہ کی بنا پر اس نتیجے پر پہنچی کہ اگر پہلے اس نے ہندوستان کو فتح کرنے میں انگریزوں کی مدد کی تھی تو اب اُسے ہندوستان کو انگریزوں کے جوئے سے آزاد کرانے کے لئے لوگوں کی قیادت کرنا چاہیئے۔ ایسی فوج ہندوستانی جاگیردار راہنماؤں کی حاشیہ بردار نہیں ہو سکتی تھی بلکہ اس نے انقلابی جدوجہد

کی رفتار اور ترقی پر اپنا نقش ثبت کیا۔

جنرل بخت خاں فوج میں نئی اسپرٹ کا ترجمان تھا۔ وہ بریلی برج میں توپخانے کا معمولی رسالدار تھا۔ بریلی کو آزاد کرانے اور وہاں باغی حکومت قائم کرنے کے بعد اس نے پورے بریگیڈ کے ساتھ دہلی کی طرف کوچ کیا۔ دارالخلافہ میں حقیقی جاگیردارانہ بدنظمی اور انتہائی ابتری پھیل گئی۔ باغی سپاہیوں نے اس میں مداخلت کا فیصلہ کیا اور بخت خاں کو اپنا نمائندہ بنا کر بہادر شاہ کے حضور میں بھیجا۔ جیون لال 2- جولائی کو اپنے روزنامچے میں قلمبند کرتا ہے:

''انضباطِ عامہ نافذ کرنے کے لئے محمد بخت خاں نے افواج کے سپہ سالارِ اعظم کی حیثیت میں اپنی خدمات پیش کیں۔ بادشاہ نے دوستی کا ہاتھ تھام لیا۔ فوجوں میں واپس آکر بخت خاں نے صوبیداروں کو آگاہ کیا کہ بادشاہ نے میری خدمات، وفاداری اور اطاعت کو قبول کر لیا ہے۔ محمد بخت خاں کو ایک ڈھال، ایک تلوار اور جنرل کے لقب سے سرفراز کیا گیا۔ اسے تمام افواج کا سپہ سالارِ اعظم مقرر کیا گیا۔ ایک اعلان جاری کیا گیا جس میں تمام کمان افسروں کو حاضر ہونے کا حکم صادر کیا گیا تاکہ وہ محمد بخت خاں سے ہدایات حاصل کریں۔ محمد بخت خاں نے بادشاہ کو آگاہ کیا کہ اگر کسی شہزادے نے شہر کو لوٹنے کی کوشش کی تو اس کے کان اور ناک کاٹ دیئے جائیں گے۔ بادشاہ نے جواب دیا: ''تمہیں کلّی اختیارات حاصل ہیں، جو تم ٹھیک سمجھو کرو۔'' (153)

ہندوستان کی قومی تاریخ میں یہ ایک انوکھا اور بے مثال واقعہ تھا۔ یہ باغی ہندوستانی فوج تھی جو اُس مغل بادشاہ کو شرائط پیش کر رہی تھی۔ جسے اس نے کچھ دیر پہلے شہنشاہِ ہندوستان بنا کر اس کے سر پر تاج رکھا تھا۔ یقیناً یہ ایسی فوج نہیں تھی جیسی کہ اکبر یا اورنگ زیب کی تھی۔ یہ ایک انقلاب پسند فوج تھی جو جاگیردار حکمران طبقے کے ساتھ لوگوں کی راہنمائی میں شریک تھی لیکن ان پر قابو پانے اور ان کی روک تھام کے لئے اپنی شرائط نافذ کر رہی تھی۔ یہ ایک نئی قسم کی فوج تھی جس کا جاگیردارانہ بھاڑے کی فوج کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔

اس فوج نے بادشاہ سے نہ صرف اپنے راہنما بخت خاں اور اس کے پورے اختیارات کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا بلکہ انقلابی جدوجہد کے لئے باغیوں کی جماعت یعنی باغیوں کی مجلس قائم کی، جس کا ذکر تلمیذ خلدون کے اس بیش قیمت مقالے میں تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے جو اس کتاب میں شائع ہوا ہے۔ اس مجلس کا آئین مجموعی طور پر جمہوری تھا۔ اس کا کام باغی قوتوں کی

ہمہ گیر فوجی قیادت اور ملک اور پایہ تخت کا انتظامِ حکومت تھی۔ اس کے راہنما بخت خاں کو نہ صرف جرنیل بلکہ صوبہ دار کا درجہ دیا گیا۔

مغل بادشاہ کے ساتھ مجلس کا تعلق اہم ہے۔ مجلس کو کثرتِ رائے کے ساتھ انگریزوں کے خلاف نہ صرف فوجی اقدامات سے متعلق تمام فیصلے کرنے کا حق تھا بلکہ ملک کے دیوانی کے لئے احکام اور قوانین بھی صادر کر سکتی تھی۔ اس کے احکام اور اعلانات بادشاہ کے پاس دستخط کے لئے بھیجے جاتے۔ مقدمہ کی سماعت کے دوران اپنے بیان میں بہادر شاہ نے کہا کہ جو بھی دستاویزات اس کے سامنے پیش کی جاتیں ان پر، بلکہ کبھی کبھی گورے کاغذوں پر بھی اُسے دستخط کرنے پڑتے۔ مجلس ہی اعلیٰ اختیارات کا مرکز تھی اور مجموعی طور پر یہ ایک ایسا نظام تھا جو آئینی مطلق العنان حکومت سے ملتا جلتا تھا۔

لال قلعہ میں جو زمانہء وسطیٰ کی قدیم جاگیردارانہ روایات اور رسوم و آداب میں مستغرق تھا سپاہیوں نے حقیقی جمہوری فضا پیدا کی۔ سپاہی فوجی بوٹ پہنے مارچ کرتے ہوئے دیوانِ خاص میں داخل ہو جاتے۔ اہل رسالہ اپنے گھوڑوں کو اس کے احاطے میں باندھ دیتے جس پر مغل بادشاہ اور اس کے درباری نوکر چاکر حیرت و ہیجان میں مبتلا ہو جاتے۔

''یہ امر محلِ غور ہے کہ باغی راہنماؤں اور مجلس نے کس طرح مغل شہزادوں کو قابو میں رکھا جو فضول خرچی اور خود رائی کے عادی، حرص و ہوس کے بندے، بزدل اور ذلیل تھے جس کا لازمی نتیجہ ان کی نفاق انگیزی اور بداخلاقی تھی۔ انگریزوں کے وفادار نامہ نگار جیون لال نے تمام ماجرا احتیاط کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ 30- جولائی کو ایک حکم جاری کیا گیا جس کی رو سے شہزادوں کو فوج سے متعلق تمام فرائض سے آئندہ کے لئے سبکدوش کر دیا گیا۔'' (154)

انگریزوں کے خلاف جہاد کے نام پر شہزادے دولت مندوں سے روپیہ وصول کر رہے تھے لیکن وہ اسے اپنے تصرف میں لے لیتے جب کہ شاہی خزانہ خالی تھا اور سپاہی فاقے کر رہے تھے۔ سب سے زیادہ سنگین مسئلہ جس سے مجلس دوچار تھی فوج کو رسد پہنچانے اور باغی حکومت کو چلانے کے لئے کافی روپیہ فراہم کرنا تھا۔ اس معاملے پر اس نے سخت رویہ اختیار کیا۔ 6- جولائی کو ''بادشاہ نے مرزا عبداللہ اور دوسرے شہزادوں کے بُرے لچھنوں کی برملا مذمت کی اور انہیں وہ تمام روپیہ اگلنے کا حکم دیا جو انہوں نے ساہوکاروں سے جبراً اینٹھا تھا ورنہ ان کا وظیفہ بند کر دیا جائے

گا۔'' (155) 17-اگست کو بخت خاں نے پھر شہزادوں کے خلاف بادشاہ سے شکایت کی تو اس نے احکام صادر کئے کہ ''جب روپیہ کی فراہمی کا حکم جاری کیا جائے تو اس کی ادائیگی اہلِ شہر کے روبرو جنرل بخت خاں کو کی جائے۔'' (156) 18-اگست کو ''ساہوکاروں کے نام احکام جاری کئے گئے کہ وہ براہِ راست جنرل بخت خاں سے بات چیت کریں۔'' (157) 31-اگست کو ارا کینِ مجلس نے ''ساہوکاروں کو بلایا اور ان سے روپوں کا مطالبہ کیا۔'' ساہوکاروں نے جواب دیا: ''شہزادوں نے پہلے ہی ہم سے تین لاکھ ستّر ہزار روپیہ وصول کر لیا ہے اور ہم مزید کچھ بھی نہیں دے سکتے۔ مجلس اس جواب پر غضبناک ہوگئی اور اعلان جاری کیا کہ شہزادوں کو آئندہ کوئی روپیہ ہرگز نہ دیا جائے۔'' (158) اب مجلس بادشاہ کی وساطت سے نہیں بلکہ بلاواسطہ لوگوں سے اپیل کر رہی تھی۔

9- ستمبر کو ''بادشاہ نے ان شہزادوں کی گرفتاری کا حکم دیا جنہوں نے سپاہیوں کی تنخواہ کے لئے وصول کیا ہوا روپیہ خُرد بُرد کر دیا تھا۔'' (159) اب موقع ہاتھ سے جا چکا تھا۔ مہینہ ختم ہونے سے پہلے ہی دہلی فتح ہوگئی۔ سپاہی دہلی سے باہر کے رہنے والے تھے اور چوں کہ دہلی کے سماج میں شہزادوں کو ایک مقام حاصل تھا، ان کی گرفتاری عمل میں لانے سے دشمن کے خلاف محاذ میں رخنہ پیدا ہونے کا احتمال تھا اس لئے انہیں گرفتار نہ کیا گیا۔

ہومز لکھتا ہے: ''ایک موقعہ پر چند سو بھوکے سپاہی ہال میں گھس آئے اور بادشاہ کے گرد کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے بیٹوں کو قید کرے جنہوں نے ان کی تنخواہ میں غبن کیا تھا۔ پھر قسم کھائی کہ اگر انہیں تنخواہ ادا نہ کی گئی تو وہ اس کو اور اس کے خاندان کو قتل کر دیں گے۔'' (160)

مجلس نے جو اقتصادی اقدامات نافذ کئے ان سے صاف ظاہر ہے کہ اس کی فوجی تنظیم کی بنیاد کسانوں کے طبقے پر تھی۔ انگریزوں کے خلاف جنگ کا اہتمام اور حکومت کی روزمرہ کی ضروریات کے لئے عظیم مالی وسائل درکار تھے۔ امیروں پر بھاری ٹیکس لگائے گئے جو انہیں بخوبی برداشت کرنے کے قابل تھے اور غریب لوگوں کو اس بوجھ سے آزاد رکھا گیا۔ زمین کے مسئلے پر ایک پروانہ جاری کیا گیا جس میں انگریزوں کے بندوبست آراضی کو تبدیل کرنے کا وعدہ کیا گیا اور ''کاشت کار کو زمین مہیا کرنے کا یقین دلایا گیا۔'' (161)

اشیائے خوردنوش کے تھوک بیوپاریوں نے ذخیرہ اندوزی شروع کر دی تھی اور ضرورت مندوں سے بھاری قیمتیں اینٹھنے کے لئے جنگ کی سی حالت سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے تھے۔ عوام کو بڑی مصیبت کا سامنا تھا۔ 5- ستمبر کو "پولیس کے نام احکام جاری کئے گئے کہ وہ اشیائے خوردنی کی قیمتیں مقرر کرنے کے لئے ہر روز ایک پنچ کا تقرر عمل میں لائیں (پنچ سے مراد پانچ تاجروں کی ایک منڈلی ہے)۔" (162) شہر کا کوتوال تھانیداروں کے نام قیمتوں کی باقاعدہ سرکاری فہرستیں جاری کرتا تھا۔

معلوم نہیں کہ مذکورہ بالا دستور پر کس حد تک حقیقتاً عمل ہوا اور طاقتور جاگیردار، ان کے مختار اور حکومت میں ان کے ایجنٹ اس میں کس حد تک رخنہ ڈالتے تھے اور وقت کی کمی اور زیرِ محاصرہ شہر کی مشکلات کے سبب کہاں تک ان پر عمل کرنا ناممکن تھا۔ لیکن باغی راہنماؤں کے نہایت جاندار اور اہم طبقے کے عزائم تصورات اور طرزِ عمل نمایاں طور سے واضح ہیں۔

ایک اور اہم کام جو سپاہی انجام دیتے تھے وہ انگریزوں کے "ففتھ کالم" (جاسوسی ٹوپی) کے خلاف انقلابیوں کی چوکسی تھی۔ وہ کسی بھی شخص کا لحاظ نہ کرتے خواہ وہ کوئی بڑے درجہ کا جاگیردار ہی کیوں نہ ہو۔ جیون لال کا روزنامچہ ذیل کی قسم کے واقعات سے بھرا پڑا ہے:

"سپاہی بڑے غیظ و غضب کے عالم میں محل میں داخل ہوئے۔ انہوں نے احسن اللہ خاں کو قتل کرنے کی دھمکی دی۔ زینت محل بیگم صاحب کو لے جانے کی دھمکی بھی دی تا کہ وہ اسے بادشاہ کی وفاداری کی خاطر بطور ضمانت رکھ سکیں۔" (163)

مغل خاندان کے وارث کو کبھی بھی یہ گمان نہ ہو سکتا تھا، اور وہ بھی اپنے موروثی تخت پر بیٹھنے کے بعد کہ وہ ایسی صورت حال سے دوچار ہوگا کہ پانی سر سے گزر جائے گا۔ نئے خیالات اور حالات کے تھپیڑوں سے گھبرا کر اس نے زیارت مکّہ معظمہ کی خواہش کا اعلان کیا۔

کیا مذکورہ بالا واقعات اس نظریے کی تائید کرتے ہیں کہ 1857ء کی بغاوت کی کامیابی ہندوستان میں جاگیردارانہ نظام اور اس کے لوازمات کو بحال کرنے کا موجب ہوتی۔ اس کے برعکس اس بغاوت نے تو چوٹی کے جاگیرداروں کے بھی حوصلے پست کر دیئے۔ ان میں مغل بادشاہ اس کی چہیتی بیگم اور شہزادوں کی کثیر تعداد بھی شامل تھی جنہوں نے انگریزوں کے ساتھ صلح کی ٹھان لی تھی۔ بادشاہ نے اس ارادے کے پیشِ نظر مکّہ جانے کا بہانہ کیا۔ یہ حالت سارے ملک میں پیدا

ہوگئی جہاں کہیں باغی فوجیں سرگرمِ عمل تھیں ہندوستانی جاگیرداروں کی جائے پناہ یا زیارت گاہ نزدیک ترین برطانوی چھاؤنی تھی۔

جو سرکش سپاہی باغیانہ قوتوں میں سب سے زیادہ سرگرم اور بارسوخ تھے انہوں نے برطانیہ کے خلاف مشترکہ جدوجہد کی غرض سے ہندوستانی جاگیرداروں کے ایک طبقے کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا۔ لیکن جدوجہد کو جاری رکھنے کے لئے انہوں نے باغیوں کی مجلس کی صورت میں ایک اعلیٰ اور مقتدر جماعت بھی قائم کی۔ یہ مجلس اس وقت کے حالات میں آئینی شخصی حکومت کے ڈھانچے کے اندر فوجیوں اور کسانوں کی ایک ملی جلی جمہوری سرکار کا نمونہ تھی۔

اس بات کو نہ صرف بہادر شاہ نے برطانوی عدالت کے روبرو تسلیم کیا بلکہ دوسرے بیانات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ باغی راہنما اور مجلس بادشاہ سے خطوط لکھواتے اور اعلانات جاری کرواتے جو اُن کی رائے میں جدوجہد کے مفاد میں ضروری تھے۔ جب بہادر شاہ انگریزوں کے ساتھ رابطہ قائم کر رہا تھا تو اُسے اس بات پر مجبور کیا گیا کہ وہ جے پور، جودھپور، بیکانیر اور الور کے حکمرانوں کو یہ لکھے کہ ''میں اس نازک گھڑی میں سلطنت کے اہم معاملات کے اہتمام اور انجام دہی کے لئے تمہاری مدد اور تعاون چاہتا ہوں اور ریاستوں کی ایک گروہ بندی قائم کرنے کا خواہاں ہوں۔ اگر یہ ریاستیں جن کو میں نے خطوط لکھے ہیں متحد ہو جائیں تو میں شاہی اقتدار انہیں سونپ دوں گا۔'' (164) ہندو مسلم اتحاد کو مضبوط کرنے کی کوشش میں اس اقدام کا ہم پہلے ہی ذکر کر چکے ہیں۔ انگریزی اقتدار کے خلاف کامیاب جدوجہد کے نتیجے کے طور پر آزاد ہندوستان کی صورت میں ہندوستانی ریاستوں کے وفاق کا تصور ایک نیا اور معنی خیز خیال ہے جو بغاوت کی پیداوار ہے۔

اس ضمن میں جنگِ کالپی کے موقع پر اور جھانسی کی شکست کے بعد اس باجماعت حلف کے الفاظ بہت پُر معنی ہیں جو رانی لکشمی بائی نے اپنے باغی سپاہیوں کو دلائی: ''جب تک ہم میں دم ہے ہم کالپی سے دست بردار نہ ہوں گے۔ ہم اپنے ہاتھوں سے آزاد شاہی کو دفن نہ کریں گے۔'' (165) ایک رانی سپاہیوں کو لڑتے لڑتے مرجانے یا فتح پانے پر آمادہ کرنے کے لئے مغل شاہی یا مرہٹہ شاہی کے بجائے ''آزاد شاہی'' کے نئے تصور سے کام لیتی ہے اور یہ بھی اس وقت جب نانا صاحب کا نمائندہ، اس کا اپنا بھائی موقعہ پر موجود تھا اور وہ خود مہاراشٹر کی رہنے والی تھی!

جھانسی کے شری ورنداون لال ورما جنہوں نے رانی سے متعلق ہندی میں ایک مشہور تاریخی ناول لکھا ہے۔ مجھے بتایا ہے کہ انہوں نے راجہ مروان سنگھ کے نام رانی کا ایک خط پڑھا ہے جس میں وہ جدید لفظ ''سوراج'' استعمال کرتی ہے۔

لکھنو میں ''اودھ کا کمسن بادشاہ محض ایک کٹھ پتلی تھا اور اقتدار سپاہیوں کے ہاتھ میں تھا جو اپنے افسروں کا انتخاب کرتے اور جب چاہتے انہیں معزول کر دیتے۔'' (166) لکھنو میں بھی اسی طرح کی ایک مجلس تھی جیسی دہلی میں تھی۔(167)

غرضیکہ نئی ہوائیں صرف دہلی تک محدود نہ تھیں بلکہ سارے ملک میں چل رہی تھیں جہاں بغاوت زور پر تھی اور یہ ہرگز نظام جاگیرداری کی بحالی کا پیش خیمہ نہ تھیں۔

اس وقت ہندوستان کے اندر جاگیرداری کا شیرازہ بکھر رہا تھا اور جمہوری خیال اور عمل کی نئی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ لیکن یہ اتنی طاقتور نہ تھیں کہ قدیم جاگیرداری کے نظریاتی بندھنوں کو توڑ سکیں اور برطانوی حکام پر غلبہ پائیں۔ البتہ یہ اس درجہ خطرناک ضرور تھیں کہ اصلی ہندوستانی جاگیردار اس بات پر مجبور ہو گئے کہ انگریزوں سے بغاوت میں شرکت کی معافی مانگ کر ان سے زندگی کا نیا پٹہ بطور ہدیہ حاصل کریں۔

ہندوستان میں قدیم بندوبست آراضی کی تباہی اور انتقال آراضی کے قانون نے سارے دیہاتی علاقے کو سرکار کے خلاف شورش پر آمادہ کر دیا۔ حکومت کی پالیسیوں کی وجہ سے قدیم دیہاتی طبقات تاجروں، ساہوکاروں اور کمپنی کے افسروں کی نئی جماعت کے ہاتھوں اپنی زمینیں کھو بیٹھے۔ اس طرح سرکار نے ان کی زندگی کو تباہ کر دیا تھا۔ 1857ء کی بغاوت میں بڑے پیمانے پر کسانوں کی شرکت نے اسے ایک ٹھوس جمہوری بنیاد اور عوامی بغاوت کا رنگ دیا۔ 1857ء کے دوران ہندوستانی کسانوں نے وطن پرستانہ فرض ادا کیا۔

کسان باغی قوتوں کے ساتھ بطور مجاہدین شامل ہوئے۔ اگرچہ انہوں نے کوئی فوجی تربیت حاصل نہ کی تھی لیکن وہ اس قدر شجاعت اور خوبی کے ساتھ لڑے کہ خود انگریزوں نے انہیں خراجِ تحسین ادا کیا۔ اور ان میں سے بعض کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔

لکھنو اور کانپور کے درمیان میانگنج کی لڑائی میں انگریزوں کو آٹھ ہزار ہندوستانی باغی فوج کا مقابلہ کرنا پڑا جن میں سپاہیوں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ نہ تھی۔(168) سلطانپور میں باغیوں

نے ایک اور جنگ لڑی۔ اس میں 25000 فوجی 11000 رسالہ اور 25 توپیں تھیں۔ ان میں صرف پانچ ہزار باغی سپاہی شامل تھے۔ (169) دہلی کی شکست کے بعد انگریزوں نے لکھنو پر تمام تر توجہ مرکوز کی۔ جب انگریزوں نے اپنی تمام طاقت لکھنو کے محاذ پر جمع کر دی تو اودھ کے دیہات سے مسلح کسان مجاہدین اپنے پایہ تخت کی آخری مدافعت کے لئے پہنچ گئے۔ چارلس بال کے الفاظ میں ''سارے ملک کے مسلح اور آوارہ گردوں کے ہجوم لکھنو کی طرف امنڈ رہے تھے تا کہ سبھی ایک ساتھ کیفرِ کردار کو پہنچ کر فرنگیوں کے ساتھ آخری شاندار جنگ میں کام آئیں۔'' (170)

بریلی اور لکھنو کی شکستوں کے بعد بھی باغی لڑتے رہے اور انہوں نے گوریلا جنگ کے ڈھنگ اپنا لئے۔ اس کا نمونہ خان بہادر خان کے فرمان عام میں بیان کیا گیا ہے: ''کافروں کے ساتھ باقاعدہ فوجی دستوں کے مقابلے کی کوشش نہ کرو کیوں کہ وہ بندوبست کے اعتبار سے تم پر فوقیت رکھتے ہیں اور ان کے پاس بڑی بڑی توپیں ہیں۔ البتہ ان کی حرکات وسکنات پر نگاہ رکھو، دریا کے تمام گھاٹوں کی نگرانی کرو۔ ان کے سلسلہء رسل ورسائل میں رخنے ڈالو۔ ان کی رسد رسانی میں خلل اندازی کرو۔ ان کی ڈاک کا سلسلہ منقطع کرو اور ان (فرنگیوں) کے آس پاس متواتر چکر کاٹتے رہو تا کہ وہ دم نہ لے سکیں۔'' (171)

مذکورہ بالا حالات پر رائے دیتے ہوئے رسل نے اپنے روزنامچے میں لکھا: ''اس فرمانِ عام سے دانش مندی ظاہر ہوتی ہے اور یہ اس خوفناک جنگ کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کا ہمیں سامنا کرنا ہوگا۔'' (172) انگریزوں کے خلاف جنگ کو طویل کرنے کی غرض سے مذکورہ بالا طریق کار کو عمل میں لانے اور متفرق باغی قوتوں کی امداد کرنے کی ذمہ داری کا بار دیہاتی عوام پر پڑا۔ روہیلکھنڈ، بندھیلکھنڈ، اودھ اور بہار میں اس جنگ کی داستان کے تمام ہمعصر برطانوی بیانات میں اس بات کی متعدد کہانیاں موجود ہیں کہ کس طرح ہندوستان کے دیہاتیوں نے وفاداری اور صدق دلی کے ساتھ باغی ہائی کمان کے احکام کی تعمیل کی۔ ہم صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں: ''جب باغی اپنے مقصد میں ناکام ہوتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے تب بھی انہوں نے ہمارے ساتھ خیر سگالی کا کوئی ثبوت نہ دیا بلکہ جو اطلاع ہم چاہتے تھے وہ بھی دینے سے دریغ کرتے اور اکثر ہمیں گمراہ کرتے۔'' (173)

ناکام قومی بغاوت میں کسی طبقے کے حصے اور امداد کا بہترین اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے

کہ اس نے اس میں کس قدر قربانی کی۔ اگر اس معیار کے مطابق اندازہ لگایا جائے تو 1857ء کی بغاوت کے اعزازی مراتب میں کسانوں کا طبقہ سب پر سبقت لے جائے گا۔ ہومز لکھتا ہے: ''ان مسلح جوانوں کی تعداد جنہوں نے اودھ میں جان دی لگ بھگ ایک لاکھ پچاس ہزار تھی جن میں سے کم سے کم پینتیس ہزار سپاہی تھے۔'' (174)

یہ دیکھنے کے بعد کہ 1857ء کی جنگ میں کسانوں نے اپنے گاؤں سے باہر کیا کارنامے انجام دیئے اس جدوجہد کی ماہیت اور وسعت کا جائزہ بھی ضروری ہے جو اس نے گاؤں کے اندر جاری رکھی۔ اس سے اس بحث کا فیصلہ ہو جائے گا جو انتہا پسند حلقوں میں چھڑی ہوئی ہے کہ آیا یہ ایک قومی جنگ تھی یا طبقاتی اور اس وقت طبقاتی قوتوں کی صف بندی کس طور تھی۔ اب ہم برطانوی عینی شاہدوں اور افسروں کے بیانات کا حوالہ پیش کرتے ہیں جنہیں آنکھوں دیکھا حال معلوم تھا اور جو براہِ راست جدوجہد کے ساتھ وابستہ تھے۔

تھارن ہل اس کے آغاز کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

> ''جب یہ خبر پھیلی کہ دہلی کے بادشاہ کو دوبارہ اپنے تخت پر بٹھا دیا گیا ہے تو دیہاتیوں نے خیال کیا کہ ہماری حکومت ختم ہو گئی ہے۔ جب قانون کی دہشت جاتی رہی تو ہر شخص جس میں کچھ دم تھا وہی کچھ کرنے لگا جو اس کی نگاہ میں درست تھا۔ ہر جگہ پہلا کام بنیوں سے انتقام لینا تھا۔ ان کے مکانات کو لوٹا گیا، ان کے بہی کھاتے جلا دیئے گئے، خود ان کے ساتھ اور ان کے عیال واطفال کے ساتھ بُرا سلوک کیا گیا۔ باہر کے زمینداروں کو ہر جگہ زمینوں سے بے دخل کر دیا گیا۔ اگر وہ گاؤں کے رہنے والے ہوتے تو انہیں اپنی حیثیت برقرار رکھنے کے لئے قدیم مالکانِ آراضی کے ساتھ جدوجہد کرنا پڑتی کیوں کہ وہ ہتھیاروں کے زور سے اپنی کھوئی ہوئی میراث کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔'' (175)

ولیم ایڈورڈس جو ضلع بدایوں کا حاکم تھا مذکورہ بالا بیان کی تصدیق کرتا ہے:

> ''بلند رتبہ اور با رسوخ خاندانوں کی کثیر التعداد جائیدادوں کو نئے آدمیوں نے دغا بازیوں اور قانونی حیلوں سے خرید لیا جن میں زیادہ تر تاجر اور

سرکاری ملازم تھے اور جن کا کوئی چلن یا اپنے مزارعین پر کوئی اثر نہ تھا۔ ان لوگوں کی اکثریت (زمینوں سے) غائب باشوں کی تھی جو اپنی خریدی ہوئی زمینوں پر رہنا پسند نہ کرتے تھے یا ڈرتے تھے کیوں کہ وہاں انہیں زبردستی دخل دینے والے اور ناخواندہ مہمان سمجھا جاتا تھا۔ منتقل شدہ جائیدادوں کے قدیم مالکوں سے انہیں زمینوں پر مزارعین کی حیثیت سے کام لیا جاتا تھا جو کبھی ان کی اپنی تھیں۔ وہ کسی بھی طرح اپنی حیثیت کی تبدیلی پر قانع نہ تھے بلکہ کاشت کاروں کے طبقے کی ہمدردیوں پر انہیں زبردست موروثی اختیار حاصل تھا۔ یہ کاشتکار اپنے جاگیردار آقاؤں کی اس کوشش میں شریک ہونے پر رضامند اور تیار تھے کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی عزت اور جاگیروں کا قبضہ دوبارہ حاصل کریں۔ نئے آدمیوں میں سے کوئی بھی جو ان کے بعد زمینوں کے مالک بنے تھے، اس قدر اثر ورسوخ نہ رکھتا تھا کہ وہ امنِ عامہ کے قیام میں میری امداد کر سکے۔ اس کے برعکس جو لوگ واقعی دیہاتی آبادی کی کثیر تعداد پر قابو پا سکتے تھے وہ بدامنی اور ابتری کی حالت پیدا کرنا چاہتے تھے۔'' (176)

فارسٹ نے بغاوت کے دوران دیہات میں طبقاتی صف بندی کا صاف صاف نقشہ کھینچا ہے:

''سرمایہ دار طبقات کو بے دخل کرنے میں پُرانے زمینداروں کی ان کے سابق مزارعین نے مدد کی۔'' (177)

قومی بغاوت کے دوران اصلی طبقاتی صف بندی کو ملاحظہ کرنے کے بعد آیئے دیکھیں کہ جو واقعات سچ مچ رونما ہوئے ان میں دیہات کے باغی عوام نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا۔

مختلف اضلاع کی اطلاعات موجود ہیں جو ضلع مجسٹریٹوں یا ڈویژنل کمشنروں نے فرمانِ عام نمبر 212 مورخہ 30- اپریل 1858ء سے متعلق مرتب کیں۔ اب ہم جنگ 1857ء کے کوروکشیتر یعنی اتر پردیش کے مختلف خطوں کے چیدہ ضلعوں پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ ان اطلاعات کے نقطہء نظر میں شہنشاہیت پرستی کی خو بو ہے اور حقیقت کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے جیسا کہ ان کی

زبان سے ظاہر ہے لیکن وقعت حقائق کی ہوتی ہے، الفاظ کی نہیں۔ اور شہنشاہانہ لفاظی میں ملبوس مفہوم کو نہایت آسانی کے ساتھ اخذ کیا جاسکتا ہے۔

میرٹھ کا ذکر یوں کیا گیا ہے: ''گوجروں (کاشتکاروں کی مویشی پالنے والی ذات) اور رہائی یافتہ مجرموں نے فوراً رہزنی اور لوٹ مار شروع کر دی۔ سڑکوں کو بند کر دیا گیا۔ ڈاک کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ 11- اور 12- مئی کو رنگھڑوں (ایک اور کاشتکار ذات) اور راجپوتوں نے تحصیل سردھانہ پر حملہ کر دیا۔ قلندر خاں نام کے ایک حوالدار نے فوراً اپنے حکمران ہونے کا اعلان کر دیا۔''

شاہ مل، باغ پت کا جاٹ باغی راہنما تھا اس کے بارے میں یہ رپورٹ تھی کہ ''اس نے باغ پت پر حملہ کیا اور اسے لوٹا اور دریائے جمنا پر کشتیوں کے پُل کو تباہ کر دیا جو میرٹھ اور برطانوی فوج کے ہیڈ کوارٹرز کیمپ کے بیچ رسل و رسائل کا واحد اور سیدھا ذریعہ تھا۔ 9- جولائی کو باغیوں کا ایک بہت بڑا گروہ بیگم آباد کو لوٹنے کے بعد سیکری میں جمع ہوگیا اور برطانوی فوجی دستوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ دھولانہ کے باشندوں نے دہلی کے کچھ باغیوں کی امداد سے پولیس افسروں کو نکال دیا اور سرکاری کاغذات اور عمارات کو تباہ کر دیا۔ پرگنہ بڑوت کے لوگ باقاعدہ طور پر رسد فراہم کرتے اور شاہ محل کے توسط سے دہلی کے باغیوں کو بھیج دیتے۔ 16- جولائی کو برطانوی فوجی دستوں کو موضع بسودھ کے باشندوں کی سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان لوگوں نے شاہ مل کی اس قسم کی مدد کی تھی اور دہلی کے باغیوں کے لئے اناج کے بھاری ذخیرے فراہم کر رکھے تھے۔ اس اناج کی مقدار اتنی زیادہ تھی کہ محکمۂ رسد کی تمام گاڑیاں اس ذخیرے کے صرف ایک قلیل حصے کو ڈھونڈنے کے لئے کافی ثابت ہوتیں۔'' (178)

سہارنپور میں ''پہلے ساہوکاروں کو لوٹا گیا یا انہیں لوٹ سے بچنے کے لئے رقم ادا کرنی پڑی۔ سودخوروں اور تاجروں کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے بہی کھاتے اور قرضوں کی رسیدیں دے دیں۔ گڑے مردے اکھاڑے گئے۔ اولین شورشیں دیرینہ عداوتیں نکالنے، پُرانے حساب چکانے یا لوٹ مار کے لئے تھیں۔'' رنگھڑوں کے بارے میں یہ بیان کیا گیا: ''ان کی پرجوش دلیری کی داد دینے سے دریغ کرنا ناممکن تھا پناہ مانگنا کسرِ شان سمجھتے تھے اور اپنے تعاقب کرنے والوں پر فوراً مُڑ کر ٹوٹ پڑتے خواہ وہ گنڈاسے یا ایسے ہی کسی بھدّے سے ہتھیار سے لیس ہوتے۔'' (179)

مظفر نگر میں ''سارے ضلعے میں ہر روز بلکہ ہر گھنٹے میں ہر قسم کے قتل و غارت کے جرائم چھپ

کر یارات کونہیں بلکہ کھلم کھلا اور دن دہاڑے سرزد ہوتے۔اکثر حالتوں میں بنیے اور مہاجن ہی ان کے تشدد کا شکار تھے اور ان میں سے کئی ایک کو اپنے گذشتہ حرص اور طمع کا خوف ناک خمیازہ بھگتنا پڑا۔''(180)

علی گڑھ میں ''ماہ جون کے وسط سے پہلے پرگنہ کے چوہانوں (راجپوت زمیندار) نے جو انتقام پر تلے ہوئے تھے جاٹوں (ایک اور زمینداروں کی ذات) کو مدد کے لئے بلایا۔خیر پر حملہ کیا اور لگ بھگ ساری سرکاری عمارتوں کو بھی لوٹا اور تباہ کیا اور بنیوں اور مہاجنوں کو بھی گھروں کی بھی۔ صدر، کچہری اور تحصیلوں کے سرکاری کاغذات کو برباد کر دیا گیا۔ بہت سے لوگوں نے جنہیں ہماری حکومت کا تختہ الٹنے سے بڑا فائدہ پہنچا اپنی کھوئی جائیدادیں حاصل کرلیں اور ان پر قناعت کر کے شورش کے نتیجے کا انتظار کرنے لگے۔''(181)

متھرا میں ''ہنگاموں میں زیادہ تر بنیوں پر حملے ہوئے اور پرانے زمینداروں کے ہاتھوں نئے زمیندار زمینوں سے بے دخل ہو گئے۔آگرہ کو جانے والی سڑک کے ساتھ ساتھ تمام دیہات کے زمیندار باغی سپاہیوں کے ساتھ شامل ہو گئے اور ان کی امداد کی۔محکمہء مال اور پولیس کے عملے کو ہر جگہ نکال دیا گیا اور اگر رہنے دیا گیا تو وہ باغیوں کے رحم وکرم پر تھے۔''(182)

الہ آباد میں '' کاشتکار اور غریب طبقات ابھی تک پرانے بے دخل زمینداروں کو ان زمینوں کے خریداروں کی نسبت زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے خواہ نئے زمیندار کتنی ہی مدت سے زمینوں پر قابض رہ چکے ہوتے۔سابق زمیندار اور اس کے خاندان کے لوگ اب بھی گاؤں کے سب سے زیادہ بارسوخ باشندے تھے۔''

''اس کے برعکس نیلام میں زمین کا خریدار عام طور پر شہر کا باشندہ تھا اور کبھی اپنے گاؤں میں نہ آتا تھا سوائے اس موقع کے جب وہ پٹہ کی رقم وصول کرنے یا ڈگری کے عملدرآمد کے قبیح مقصد کے ساتھ آتا۔اس لئے لوگوں نے قدرتی طور پر زمینداروں کا ساتھ دیا جنہیں ہنگاموں میں اپنی کھوئی ہوئی حیثیت کو بحال کرنے کا شاندار موقع نظر آیا۔ پہلے وہ فرنگیوں کی ہر چیز کو تباہ کرنے اور لوٹنے پر مصروف ہوئے اور ان کی تمام جائیدادوں پر جبراً قبضہ کرلیا۔البتہ نیلام میں زمین کے خریدار ہمارے خیر خواہ تھے اور انہوں نے امن وامان کی بحالی میں حتی المقدور ہماری مدد کی۔''(183)

جونپور کے مشرقی اضلاع میں ''کوئی نام کا بھی حاکم نہ رہا۔ جولوگ ہماری حکومت کے تحت اپنی جائیدادوں سے محروم ہو گئے تھے انہوں نے ان کھوئی ہوئی جائیدادوں کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے موقع کو غنیمت جانا۔ جن لوگوں نے ایسا خیال نہ کیا وہ اپنے کمزور ہمسایوں کو لوٹ کر معمولی فائدہ اٹھا سکے۔ جو کسی قدر زیادہ منچلے تھے انہوں نے اودھ کی باغی قوتوں سے راہ ورسم پیدا کر کے زیادہ مجاہدانہ فوائد حاصل کرنے کی ٹھان لی۔ یہ بدنظمی کی حالت جاری رہی حتیٰ کہ 8- ستمبر کو گورکھوں نے پہنچ کر برطانوی حکومت کی صورت دوبارہ پیدا کر دی۔''(184)

گورکھپور کے مشرقی علاقے میں بھی ''راجہ نگر سے شہہ پا کر اور بعض اوقات اس کی نجی کمان کے تحت گوتم راجپوت ہر جگہ باغی ہو گئے اور موجودہ مالکوں کو ان تمام زمینوں سے بے دخل کر دیا جو روایتاً ان کی نسل کی ملکیت تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ معلوم ہوا کہ نرہرپور، نگرا اور ستاسی کے راجے اور پانڈے پور کے بابو اور کئی دوسرے لوگوں نے باہم ملاقاتیں کی ہیں جن میں اودھ سے امداد حاصل کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔''

''اختیارات سنبھالنے کے بعد محمد حسین کا پہلا کام یہ تھا کہ اس نے تمام سرکاری ملازموں کو سزا کی دھمکی کے ساتھ حکم دیا کہ وہ اس کی ملازمت قبول کریں۔ اس نے موجودہ صیغہ مال اور ضابطہ فوجداری کو برقرار رکھا اس پر اس کے بہت سے زمیندار حامی بیزار ہو گئے۔ انہوں نے اعتراض کیا کہ ''نوابی'' کے تحت جیسا کہ اب ضلع بن گیا ہے، تھانیداروں کا وجود نہیں ہوتا تھا۔ عدالت دیوانی کی ڈگریوں کی تعمیل عدالتی فیصلے کی نصف رقم پر بھی کی جاتی تھی۔

''ضلع میں جو لوگ دیوانی عدالتوں کے ذریعہ سے اپنی جائیدادیں کھو بیٹھے تھے اب انہوں نے خریداروں کو بے دخل کر دیا اور خود دوبارہ قابض ہو گئے۔ دستاویزوں اور ڈگریوں کو بڑی دوڑ دھوپ سے ڈھونڈا گیا۔''(185)

جنوبی ہمیر پور میں ''بغاوت کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ ضلع میں ہر جگہ تمام ساہوکاروں، بنیوں، مارواڑیوں وغیرہ کو تمام جائیداد آراضی سے محروم کر دیا گیا خواہ وہ کسی بھی طریقے سے انہوں نے حاصل کی تھیں یعنی نیلامی میں، نجی بیع سے یا کسی اور طریقے سے۔ نیز بڑے بڑے فرقوں نے اس بدنظمی کے دور سے بے حد فائدہ اٹھایا اور پرانے حساب خون سے چکائے گئے۔''(186)

پاس ہی باندا میں ''سرکاری کاغذات پھاڑ کر ان کی دھجیاں اڑا دی گئیں تا کہ ان کے قول

کے مطابق نئی حکومت کے ہاتھ میں ان کے قرض کا کوئی ثبوت باقی نہ رہے۔ ہر طرف گاؤں کے گاؤں باغی ہو گئے۔ نیلامی میں جائیداد کے خریداروں اور عدالتی ڈگری رکھنے والوں کو بے دخل کر دیا گیا۔ مسافروں اور تاجروں کو لوٹا گیا۔ سرکاری ملازموں کو جان بچانے کے لئے بھاگنے پر مجبور کر دیا گیا اور ہر حالت میں ہر قسم کی سرکاری جائیداد اور عمارت کو لوٹ کر تباہ کر دیا گیا۔

''بندھیلکھنڈ میں تلواروں اور توڑے دار بندوقوں کی کمی تھی لیکن لوگوں نے برچھیوں، درانتیوں، آہنی لاٹھیوں اور چھڑی کے سرے پر چُھری لگا کر عارضی ساخت کی کلہاڑیوں سے مسلح ہو کر اپنے آپ کو سپاہی تصور کر لیا۔ اپنے بادشاہوں کا انتخاب کیا اور تمام نو واردوں کو للکار کر ان کا مقابلہ کیا۔ بغاوت کبھی بھی اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ نہ پھیلی تھی اور نہ ہی اس سے زیادہ مکمل تھی۔'' (187)

مذکورہ بالا اقتباسات کی بے شمار مثالیں باغی صوبوں کے تمام اضلاع سے پیش کی جاسکتی ہیں۔ ان بیانات سے 1857ء کی قومی بغاوت کے دوران دیہات میں جدوجہد کی ماہیت صاف صاف ظاہر ہے۔ اوّل یہ کہ ساری دیہاتی آبادی اس نئے بندوبست آراضی کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی جسے برطانوی حکمرانوں نے ان کے گلے منڈھ دیا تھا۔ دوسرے جدوجہد کا یکساں طریقہ یہ تھا کہ برطانوی حکومت کے تحت جو نئے زمیندار پیدا ہوئے تھے ان کو نیست و نابود کر دیا جائے۔ ان کی دستاویزات کو تباہ کر دیا جائے۔ دیہات سے انہیں مار بھگایا جائے اور ان کی زمینوں پر قبضہ کر لیا جائے۔ برطانوی حکومت کے تمام آثار بالخصوص کچہری، تحصیل اور تھانے پر دھاوا بولا جائے۔ تیسرے، جدوجہد کی بنیاد دیہاتی عوام اور غریبوں پر تھی جب کہ قیادت کی باگ ڈور ان زمینداروں کے ہاتھ میں تھی جنہیں برطانوی قانون کے تحت بے دخل کر دیا گیا تھا۔ چوتھے، جدوجہد کا یہ طریقہ 1857ء کی قومی بغاوت کے عام طریقے سے مطابقت رکھتا تھا۔ دیہات میں طبقاتی جدوجہد تمام زمینداروں کی جماعت کے خلاف نہیں تھی بلکہ صرف اس نئے طبقے کے خلاف تھی جو انگریزوں نے نئے قانونوں کے تحت پیدا کیا تھا اور یہ ان کے وفادار سیاسی حامیوں کے طور پر کام کرتے تھے یعنی یہ طبقاتی جدوجہد غیر ملکی غاصب کے خلاف قومی اتحاد کے عام تقاضے کے تحت تھی۔

تلمیذ خلدون کا یہ نظریہ کہ اس بغاوت کے دوران ''ہندوستانی کسان غیر ملکیوں اور

ہندوستانی جاگیرداروں کی غلامی سے نجات پانے کے لئے جان ہتھیلی پر رکھ کر لڑ رہے تھے اور یہ بغاوت ملکی زمینداری نظام اور غیر ملکی شہنشاہیت کے خلاف کسانوں کی جنگ بن کر ختم ہو گئی۔'' محض مبالغہ ہے۔ اس بات کی مطلق کوئی شہادت نہیں کہ ہندوستانی کسانوں نے جاگیردارانہ بندھنوں کو سیاسی یا اقتصادی طور پر توڑ ڈالا تاکہ وسیع قومی بغاوت کو کسانوں کی جنگ میں بدل دیں بلکہ اس کے برعکس تمام شہادت جو معلوم ہے اس نظریے کے خلاف ہے۔

ضلعوں سے متعلق مذکورہ بالا اقتباسات کے متعلق کسانوں کی جدوجہد برطانیہ کے پیدا کردہ نئے زمینداروں کے خلاف ہے نہ کہ تمام نئے اور پُرانے زمینداروں کے طبقے کے خلاف۔ دوسرے اضلاع سے متعلق ''دی نیریٹو آف ایونٹس'' (The narrative of events) میں جو معاصرین کے نہایت مفصل دستیاب بیانات ہیں مجھے کوئی شہادت نہیں ملی سوائے اس کے جو اس طبقاتی صف بندی کی تصدیق کرتی ہے جس کا میں پہلے ہی ذکر کر چکا ہوں۔ ان برطانوی ماخذوں سے جن کا خلدون نے حوالہ دیا ہے ظاہر ہے کہ زمیندار اعلیٰ طبقات کے خلاف ادنیٰ طبقات کی بغاوت سے خوفزدہ تھے اور انہوں نے جدوجہد کو حسبِ مصلحت حدود کے اندر رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ کسی ایسی شہادت کا حوالہ نہیں دیتا جس سے ثابت ہو کہ کاشتکاروں کی جدوجہد نئے زمینداروں یعنی نیلام میں خرید کرنے والوں کی زمینوں کی ضبطی اور قبضے سے آگے بڑھی اور تمام زمینداروں کے طبقے کی زمینوں پر قبضہ کر لیا گیا تاکہ ''زمین برائے کاشت۔'' کے نعرے پر عمل کرنے کے لئے زمینوں کو از سر نو تقسیم کیا جائے۔ زمینداروں کا طبقاتی خوف ایک تاریخی حقیقت تھی جس نے زمینداروں کو زیادہ آسانی اور رضامندی کے ساتھ اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیں لیکن یہ ثابت کرنے کے لئے کوئی تاریخی حقائق موجود نہیں ہیں کہ 58-1857ء کے دوران کسانوں کی جدوجہد نئے زمینداروں کے خلاف جدوجہد سے آگے بڑھ کر تمام زمیندار طبقے کے خلاف جدوجہد کے مرحلے تک پہنچی۔ یعنی اس نے ایک کسانوں کی جنگ کی صورت اختیار کی۔

پھر کچھ ایسے نظریاتی اور سیاسی اسباب تھے جن کی بنا پر زرعی شورش کو زمینداروں کے صرف ایک طبقے کے خلاف محدود اور محصور رکھا گیا جس نے دیہاتی کاشتکاروں اور قدیم روایتی زمینداروں کی اکثریت کو یکساں زمینوں سے بے دخل کیا تھا۔ مشترکہ شکایات کی بنا پر یہ تمام

دیہاتی طبقات کی غیر دیہاتی، غیر کاشتکار، سرمایہ دار اور سود خور طبقات، برطانوی حکومت کے پیدا کردہ مختار کاروں اور خودغرض رشوت خور ہندوستانی ملازموں کے خلاف بغاوت تھی جو ان کی زمینوں پر جبراً دخل اور قبضہ جما رہے تھے۔ یہ ایسی زمینیں تھیں جن کے یہ دیہاتی طبقے پشتوں سے مالک رہے تھے اور ان پر کاشت کی تھی۔

ایسی صورتِ حال کے تحت پرانے زمیندار جدوجہد کے راہنما بن کر ظاہر ہوئے کیوں کہ وہ دیہات کے روایتی پیشوا تھے۔ نئی قوتوں کے زیر اثر جو برطانوی حکومت حرکت میں لائی بحیثیت ایک معاشی اور انتظامیہ اکائی کے قدیم دیہاتی برادری کا شیرازہ تیزی سے بکھر رہا تھا لیکن اس کی نفسیاتی اور سماجی میراث محفوظ تھی اور ازسرِ نو تازہ ہو گئی۔ جب یہ سوال پیدا ہوا کہ قدیم دیہاتی برادری کے مختلف عناصر ترکیبی جو تمام آراضی کے مالک تھے، مل کر زمینوں کے نئے غاصبین کے خلاف جنہوں نے ان کی قدیم زمینوں پر قبضہ جما لیا تھا اور اس غیر ملکی غاصبانہ حکومت کے خلاف جدوجہد کریں جس نے اپنے قانونوں، عدالتوں اور حکومت کے ایجنٹوں کے ذریعے یہ سب کچھ ناممکن بنایا تھا۔ پس اس طرح گاؤں کے روایتی پیشوا دیہات میں 1857ء کی بغاوت کے تاریخی راہنما بن گئے۔

یہ بات نہیں کہ باغی کسانوں کا دانشمند عنصر ان زمینداروں کے ساتھ اپنے طبقاتی تنازعوں سے باخبر نہ تھا لیکن انہوں نے مصلحت اس میں سمجھی کہ اس تنازعے کو ابھرنے نہ دیا جائے بلکہ عقلِ سلیم کا تقاضا یہ تھا کہ پہلے بڑے مشترکہ دشمن سے نپٹا جائے۔ ہومز کا بیان ہے: ''دیہاتیوں کے لئے ان تعلقداروں کے ساتھ ہمدردی کی کوئی وجہ نہ تھی جنہوں نے انہیں حقوق آراضی سے محروم کیا تھا، لیکن یہی تعلقداران کے قدرتی پیشوا تھے جن کی قیادت قبول کرنا ان کے لئے ضروری تھا اگر وہ غیر ملکی ناخواندہ مہمانوں کے ساتھ سنجیدگی سے لڑنا چاہتے تھے۔'' (188)

دیہات میں طبقاتی جدوجہد کی صورت میں بے شک تبدیلی پیدا ہوئی لیکن یہ 1857ء کی بغاوت کے بعد رونما ہوئی اور اس پر ہم بعد میں بحث کریں گے۔

اس بغاوت کے ۔۔ ان کسانوں اور دوسرے طبقوں پر روایتی زمینداروں کی نظریاتی اور سیاسی گرفت نے بے شک انقلابی قوتوں کو کمزور کیا ہم پہلے گورکھپور کی رپورٹ کا حوالہ دے چکے ہیں جس میں یہ مذکور ہے کہ علاقے کو آزاد کرانے کے بعد زمیندار راہنماؤں نے زیادہ تر قدیم

انتظامیہ ڈھانچے کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ اس سے بے اطمینانی پیدا ہوئی۔ ضلع علی گڑھ کی رپورٹ میں بیان کیا گیا ہے کہ مقامی بغاوت کے بعد بااختیار مقامی تنظیم کے طور پر ایک بڑی پنچایت قائم کی گئی لیکن جاگیردار راہنماؤں نے اس کے خلاف سازش کی۔ ان میں سے ایک ''مالاگڑھ کے ولی دادخاں سے پروانہ لے آیا (جس نے دہلی کے بادشاہ سے لقب 'صوبہ' پایا تھا) جس کی رو سے اُسے 'نائب صوبیداری' کی سند عطا کی گئی۔ اس سے لیس ہوکر وہ واپس آیا، اپنے القاب کا اعلان کیا اور اقتدار سنبھال لیا۔'' فرخ آباد میں سابق نواب کو وہاں کا حاکم اور بادشاہِ دہلی کا مقامی نائب بنا دیا گیا، جب کہ حکومت کے معاملات پرانے جاگیرداروں اور اکثر سابق برطانوی ملازموں کی مدد سے انجام دیئے جاتے تھے۔ سپاہیوں کے نمائندے کئی بار لوگوں کی طرف سے مداخلت کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باغی راہنماؤں کے تحت ضلعوں اور صوبوں میں دہلی کی نسبت نظام حکومت جاگیرداروں کے زیادہ زیر اثر تھا۔ پنچایتیں ہر جگہ بحال ہوگئیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جدوجہد کے مراکز کے طور پر کام کرتی تھیں تاکہ انگریزوں کے خلاف جنگ کے لئے انسانی اور مادی وسائل کو متحد کر کے حرکت میں لایا جائے۔ شاید یہ پنچایتیں سوائے دیہات کے کہیں بااقتدار جماعت کی حیثیت سے کام نہ کرتی تھیں۔ دہلی پر باغی سپاہیوں کا قبضہ تھا۔ انہیں انگریزوں اور شہری مراکز کے ساتھ واسطہ رہا۔ وہ نہ صرف ہندوستان کے مختلف حصوں بلکہ ہمسایہ ممالک کے حالات سے بھی واقف تھے۔ تجربہ اور سوجھ بوجھ کے اعتبار سے وہ باغی عوام میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ طبقہ تھا۔ ان کے دیہات میں رہنے والے لوگ بہت محدود مقامی تجربہ رکھتے تھے اور ان پر روایتی جاگیردارانہ نظریاتی، اور سیاسی اثر کہیں زیادہ غالب تھا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ باغی کسان دیدہ ودانستہ ہندوستان میں قدیم جاگیردارانہ نظام کی بحالی میں شریک ہوتے یا ان پر متعلقہ جاگیردارانہ اثر ورسوخ اس نظام کی بحالی کا موجب ہوتا۔ دہلی کے باغی سپاہی جنہوں نے مجلسِ انتظامیہ قائم کی اور جمہوری احکام جاری کئے ان کے اپنے ہی بیٹے تھے اور ان کی اپنی آرزوؤں کا اظہار کر رہے تھے جو اگلی صفوں کے ان مورچوں کو ظاہر کرتے تھے جو ہندوستانی کسانوں نے فوجی وردیوں میں ملبوس ہوکر پہلے ہی سنبھال رکھے تھے۔

ہندوستانی کسانوں قدامت پسند زمینداروں کے ساتھ مشترکہ جدوجہد کی خاطر مصالحت کر لی لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ یہ عوام کی انقلابی جدوجہد کی حقیقی صورت اختیار کر رہی ہے تو وہ

اس اتحاد سے خوفزدہ ہو گئے۔ گبنس جسے اودھ اور دوسرے مشرقی اضلاع سے متعلق وسیع ذاتی تجربہ حاصل تھا لکھتا ہے:

''اس نازک گھڑی میں بے شک ہندوستانی شرفاء کی معذوری کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہئے کیوں کہ ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ اس مسلح اور منظّم دشمن کی تاب لائیں جس نے اچانک ہمارے خلاف سر اٹھایا۔ دشمن اپنے ان ہم وطنوں کے ساتھ ہمیشہ انتہائی سختی کا سلوک کرتے جو انگریزوں کے خیر خواہ سمجھے جاتے تھے۔ نہ اُن کی جان محفوظ تھی نہ مال۔ اس لئے یقیناً دیسی باشندوں پر بڑا خوف طاری ہو گیا جس کے سبب بہت سے لوگ ہمارا ساتھ چھوڑ گئے۔''(189)

محدود طبقاتی مفاد اور ''مسلح و منظّم'' عوام کے خوف نے جنہیں انگریزوں نے بجا طور پر ''دشمن'' کا نام دیا۔ بالآخر جاگیردار شرفا کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ انقلابی جدوجہد کو ترک کر کے غیر ملکی حاکموں کے ساتھ مصالحت کر لیں۔ یہ صورتِ حال جاگیرداروں کی غداری اور قومی بغاوت کے دب جانے کا موجب ہوئی لیکن ہندوستانی کسانوں اور لوگوں کے دلوں اور بعد ازاں ان کی تحریک میں جاگیرداری کی تقویت کا سبب نہ بنی۔

ڈاکٹر آر۔سی۔ موزمدار خود ''سپریم گورنمنٹ، نیریٹو آف ایونٹس'' (Supreme Government Narrative of Events) مورخہ 12- ستمبر 1857ء میں یہ اقتباس پیش کرتے ہیں: ''بغاوت کی عمومی خصوصیت اور باغیوں کی اکثریت کی شناخت ناممکن ہونے کے سبب مجسٹریٹ نے سفارش کی کہ ان تمام دیہاتوں کو سالم طور پر جلا کر تباہ کر دیا جائے جن کے بارے میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ انہوں نے بغاوت میں عملی طور پر حصہ لینے کے لئے آدمی بھیجے۔''(190) یہ 1857ء کی بغاوت میں کسانوں کے پارٹ کا برطانوی جائزہ ہے۔ کیا ہندوستان میں کسانوں کے ایسے طبقے کے کندھے پر بندوق رکھ کر جاگیردارانہ نظام کی بحالی ممکن تھی؟

8- خمیازہ اور سبق

1857ء کی بغاوت ایک عہد آفریں تاریخی واقعہ ہے۔ یہ ایک پورے تاریخی دور کے

اختتام اور نئے عہد کے آغاز کی علامت ہے۔ جہاں تک انگریزوں کا تعلق ہے اس نے کمپنی کی حکومت کو ختم کر دیا اور برطانوی تاج کے تحت بلاواسطہ حکومت کا موجب ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اجارہ دار تاجروں کے دور حکومت کا خاتمہ ہوا اور ہندوستان کے معاملات میں برطانیہ کے صنعتی متوسط طبقہ کا غلبہ شروع ہوا۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے بغاوت ناکام ہوئی لیکن ہندوستانیوں کو وہ تجربہ حاصل ہوا جس سے وہ نئے خیالات کے ساتھ نئی بنیادوں پر جدید ہندوستانی قومی تحریک تعمیر کرنے کے قابل ہو گئے اور 1857ء کے اسباق بے بہا ثابت ہوئے۔ فریقین نے 1857ء کے تجربے سے سبق حاصل کئے اور بعد میں ان سے استفادہ کیا۔ انگریز فاتح تھے، انہوں نے جلد اقدامات کئے ہم مفتوح تھے، ہم نے زیادہ وقت لیا۔

1857ء کی بغاوت کے تجربے کی بنا پر انگریز حکمرانوں نے ہندوستانی جاگیردار طبقات کے تئیں اپنی پالیسی کو تیزی سے بدلا۔ ان کے مفادات پر ضرب لگانے کی پُرانی پالیسی کو ترک کر دیا اور ہندوستان میں اپنی حکومت کی اصلی سماجی بنیاد قائم کرنے کی غرض سے ان کے ساتھ مصالحت کی نئی پالیسی اپنائی۔ ہندوستانیوں نے ہندوستانی جاگیرداروں کے تجربے سے یہ درس حاصل کیا کہ اپنی تحریک کے اگلے دور کے لئے انگریزوں کے خلاف ان کی جدوجہد کی کامیابی کا مدار اس بات پر ہے کہ یہ جدوجہد جاگیرداروں کے خلاف بھی ہو۔ وہ لوگ جنہیں آج تک ہندوستانیوں نے اپنا روایتی راہنما سمجھا اب بجا طور پر انہیں 1857ء کی بغاوت کے غدار اور برطانوی اقتدار کی ہندوستانی کٹھ پتلیاں تصور کیا گیا۔

جہاں تک والیانِ ریاست کا تعلق ہے، الحاق کی پالیسی ترک کر دی گئی۔ ملکہ وکٹوریہ نے اپنے اعلان میں ان سے وعدہ کیا: ''ہندوستانی حکمرانوں کے حقوق، شان اور عزت کا ہم ایسا ہی پاس رکھیں گے جیسا کہ اپنا۔'' لارڈ کیننگ نے اپنی سرکاری یادداشت مورخہ 30-اپریل میں بڑی صاف گوئی سے لکھا: ''ہندوستانی سرداروں کی سرپرستی سے جو ہمارے ساتھ اچھی خاصی وابستگی رکھتے ہیں، ہماری حکومت کا تحفظ بڑھتا ہے، کم نہیں ہوتا۔''

1857ء کے بعد والیانِ ریاست کے تئیں برطانوی پالیسی کو جس طرح ہندوستان کی قومی تحریک نے سمجھا اس کا بہترین اظہار نہرو کی کتاب ''ڈسکوری آف انڈیا'' (Discovery of India) میں کیا گیا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں، ''دیسی ریاستوں کو برقرار رکھنا ہندوستان کے

اتحاد میں رخنہ ڈالنے کے ارادے سے تھا۔(191) ہندوستانی والیانِ ریاست ہندوستان میں برطانیہ کے ففتھ کالم کا کام کر رہے ہیں۔''(192)

ملکہ کے اعلان میں یہ وعدہ کیا گیا کہ ''ہندوستانی باشندے اپنی موروثی آبائی زمینوں کے ساتھ جو وابستگی رکھتے ہیں اس کا پاس رکھا جائے گا۔'' اور'' قانون کے بنانے اور نافذ کرنے میں ہندوستان کے قدیم حقوق اور رسم ورواج کا مناسب لحاظ رکھا جائے گا۔'' اودھ کے برطانوی اعلیٰ افسر مال، گبنس نے یہ دلیل پیش کی: ''ہم ایسے نظام کے مستقل قیام کا تصور نہیں کر سکتے جس سے ہندوستانی باشندوں کے اعلیٰ طبقات ہم سے بیگانے رہیں۔'' یہ عمل خود بغاوت کے دوران ہی شروع ہو گیا جب گبنس نے اعتراف کیا: ''اس وقت ہم انہیں جاگیریں بطور رشوت دے رہے ہیں۔''(194) ''گذشتہ راصلوٰۃ آئندہ را احتیاط'' کی آڑ میں اودھ کے دو تہائی تعلقداروں کو غداری کے انعام کے طور پر پہلے سے زیادہ موافق شرائط پر اپنی زمینیں واپس مل گئیں۔ اس کے برعکس ہم نے دیکھا ہے کہ باغی کسانوں کے ساتھ کس بے دردی کا سلوک روا رکھا گیا۔ زمینداروں پر خاص لطف وعنایت اور کسانوں کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا 1857ء کے بعد حکومت کی مسلمہ پالیسی بن گئی۔

کسانوں کے طبقے کو اس نئی حقیقت کا اچھی طرح احساس ہوا لیکن کچھ حقوق رعیت داری حاصل کرنے سے پہلے انہیں ملک گیر قحط اور زرعی فسادات کے مصائب کا شکار ہونا پڑا۔ جس طرح برطانوی پالیسی سے قدیم دیہاتی برادری تباہ ہو گئی تھی اسی طرح نئے تلخ تجربے سے روایتی راہنماؤں کی حیثیت سے زمینداروں کے ساتھ گاؤں کے روایتی اتحاد کا رشتہ بھی ٹوٹ گیا۔ طبقاتی جدوجہد دیہات میں بھی پھیل گئی۔ جب جدید قومی تحریک نے کسانوں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی تو ہندوستانی کسانوں کا طبقہ زمینداروں سے لڑنے کے لئے قومی تحریک کی حمایت پر آمادہ ہو گیا کیوں کہ زمینداران کی کمائی ہڑپ کرنے والے 1857ء کے غدار اور دیہات میں برطانوی حکومت کے ستون تھے۔

سپاہیوں کے غدر کے بعد جس سے سارے ملک میں شورش کی آگ بھڑک اٹھی تھی، فوج کو ازسرِ نو منظم کیا گیا۔ برطانوی فوجیوں کا تناسب بڑھایا گیا۔ انہیں خاص طور پر ''قبضہ رکھنے والی فوج'' کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا تاکہ اندرونی امن وامان کو قائم رکھا جا سکے۔ ہندوستانی

فوجیوں کوغیر ممالک میں فوجی خدمت انجام دینے کے لئے منظم کر کے تربیت دی گئی تا کہ برطانوی سلطنت کے لئے ایشیائی اور افریقی غلاموں کو فتح کیا جائے۔توپخانہ ہندوستانیوں سے واپس لے لیا گیا۔تمام اعلیٰ عہدے انگریزوں کے لئے مخصوص کر دیئے گئے۔اب ہندوستانی کو کنگ کمیشن (Kings Commissin) بھی نہ مل سکتا تھا اور نہ ہی فوجی ہیڈ کوارٹرز میں کوئی ملازمت مل سکتی سوائے کلرک کی حیثیت سے جسے صرف غیر فوجی کام سپرد کیا جاتا۔ہندوستانی رجمنٹوں کو ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کے اصول پر از سرِ نو منظم کیا گیا اور فوج کی بھرتی کو صرف نام نہاد جنگجو نسلوں تک محدود کیا گیا۔

لیکن آخر سب کچھ کرنے کے باوجود کوئی چیز انگریزوں کے آڑے نہ آئی۔1857ء کے دوران ہندوستانی سپاہیوں کے کارناموں کی یاد نہ صرف ہندوستانی عوام کے دلوں سے کبھی محو نہ ہوئی بلکہ ہندوستانی مسلح افواج کے دلوں سے بھی خواہ ہندوستانی فوج کو کتنا ہی دوبارہ منظم کیا گیا۔ جب جدید قومی تحریک نے زور پکڑا تو یہ فوج اس کے اثر سے نہ بچ سکی۔1930ء کی قومی تحریک کے دوران گڑھوالی فوجوں نے پشاور میں ہندوستانی مظاہرہ کرنے والوں پر گولی چلانے سے انکار کر دیا۔دوسری عالمگیر جنگ کے بعد قومی شورش کے دوران ہندوستانی برّی اور ہوائی افواج میں یکے بعد دیگرے ''غدر'' ہوئے۔اس کے بعد 18-فروری 1946ء کو ہندوستانی بحری فوج میں بغاوت ہوگئی اور اگلے ہی دن برطانوی وزیر اعظم نے ہندوستان کو ایک وزارتی وفد بھیجنے کا اعلان کر دیا اور ہندوستان کی آزادی کے لئے گفت وشنید شروع ہوگئی۔

ہندوستان میں نظامِ حکومت کو از سرِ نو مرتب کیا گیا اور دفتری حکومت کا بھاری ڈھانچہ قائم کیا گیا جس میں ہندوستانیوں کو صرف ادنیٰ اسامیوں پر مامور کیا جاتا۔اصلی طاقت اور ذمہ داری انگریزوں کے ہاتھ میں تھی۔ملکہ کے اعلان میں یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ سرکاری ملازمت میں ہندوستانیوں کے خلاف کوئی نسلی امتیاز روا نہ رکھا جائے گا لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔

''1857ء میں برطانوی تاج کے براہِ راست حکومتِ ہند کو سنبھالنے کے بعد پہلے پچیس برسوں کے دوران شاید ہی کوئی ہندوستانی سول سروس (Civil Service) میں لیا گیا ہو۔اگرچہ صدی کے اختتام سے کچھ گنتی کے ہندوستانی اس اعلیٰ ملازمت میں ہر سال بھرتی ہوتے رہے لیکن

نجات ملے گی اور نہ ہی ان کی سماجی حالت میں قابلِ قدر اصلاح ہوگی۔ اس کی قوت کا انحصار نہ صرف پیداوار کی ترقی پر ہے بلکہ عوام کے اس پر اختیار حاصل کرنے پر بھی ہے۔ لیکن ایک بات جو وہ ضرور کریں گے وہ یہ ہے کہ ان دونوں صورتوں کے لئے وہ ضروری وسائل فراہم کر دیں گے۔ کیا شہری متوسط طبقے نے کبھی اس سے زیادہ کیا ہے؟ کیا اس نے کبھی افراد اور قوم کو خون خرابہ اور مصیبت و ذلّت میں مبتلا کئے بغیر ترقی کی ہے؟''

مارکس نے اپنے نتائج پیش گوئی کے طور پر بیان کئے ہیں۔

''ہندوستان اس وقت تک ان نئے بیجوں کا پھل نہیں پائیں گے جو برطانیہ کے شہری متوسط طبقے نے ان کے درمیان بکھیرے ہیں جب تک خود برطانیہ عظمیٰ میں صنعتی مزدوروں کا طبقہ نئے حکمران طبقے کی جگہ نہیں سنبھال لیتا جب تک خود ہندو اتنے طاقتور نہیں ہو جاتے کہ برطانوی غلامی کا جوا یکسر اتار پھینکیں۔ بہ ہر حال مستقبل بعید میں ہم یقیناً اس عظیم اور دل چسپ ملک کے نئے جنم کو دیکھنے کی توقع رکھتے ہیں جس کے ادنیٰ ترین طبقات میں بھی شریف النفس باشندے 'اہلِ اٹلی سے زیادہ ہنر مند ہیں' اور ان کی اطاعت میں بھی خاص سنجیدہ شرافت کا رنگ ہے۔ باوجود طبعی سُستی کے انہوں نے اپنی بہادری سے انگریز افسروں کو محو حیرت کر دیا ہے۔ ان کا ملک ہماری زبانوں اور ہمارے مذاہب کا سرچشمہ رہا ہے۔ ان کے جاٹ قدیم جرمنوں کی اور ان کے برہمن قدیم یونانیوں کی مثال پیش کرتے ہیں۔''

ہندوستان نہ صرف بذاتِ خود برطانیہ کا نہایت قیمتی انعام تھا بلکہ اس لئے بھی بہت اہم تھا کہ اس نے برطانیہ کو دوسرے ملک فتح کرنے اور اپنی سلطنت کو وسعت دینے کے لئے قابل بنایا۔ کے۔ ایم۔ پانیکر کا بیان ہے: ''بلاشبہ ہندوستان ایک عظیم ایشیائی قوت ہے جس کے بل بوتے پر ہی چین کے دروازے پھٹ سے کھول دیئے گئے اور باقی ایشیا یورپ کی ایک بستی بن کر رہ گیا۔ اگرچہ ہندوستان کی فوجی فتح صرف 1858ء میں پایہ تکمیل کو پہنچی لیکن 1818ء تک یہاں برطانیہ کے قدم جم چکے تھے۔ برطانیہ میں صنعتی انقلاب آ چکا تھا اور وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ نپولین کے بعد کے دور میں اس نے بحرالکاہل میں اپنا سیاسی اور اقتصادی اقتدار بڑھا لیا۔''(206)

1857ء سے پہلے ہی ''ہندوستان سے باہر برطانوی سلطنت کی توسیع کا منصوبہ باندھا گیا

تھا اور ہندوستان کی برطانوی سرکار برطانیہ کے فائدے کے لئے مشرق میں فتح اور الحاق کی خطرناک راہ پر گامزن تھی۔ البتہ اس کا خرچ ہندوستانی محصول گزاروں کے سر پڑا۔''(207) اس طرح ملاکا اور سنگاپور پر قبضہ کر لیا گیا، برما کو فتح کیا گیا، نیپال اور افغانستان کی جنگیں لڑی گئیں اور جنگِ ایران کا بھی اہتمام کیا گیا۔

''برطانوی سلطنت کا عہد جس کی بنیاد ہندوستان پر تھی 1857ء کے بعد شروع ہوا۔ درحقیقت اب ہندوستان محض ایک برطانوی مقبوضہ بستی بن کے رہ گیا۔ اس وقت سلطنتِ ہند ایک براعظم کی حیثیت رکھتی تھی اور ایک ایسا سیاسی نظام وجود میں آیا جس کی بنیاد ہندوستان پر تھی۔ عدن سے ہانگ کانگ تک اس کا سکہ چلتا تھا۔''(208) اس دور میں افغانستان اور ایران حقیقتاً برطانیہ کے زیرِ سایہ تھے۔ شمال میں سنکیانگ اور تبت کو مہمات اور وفد بھیجے گئے اور جنوب مشرقی ایشیا اور چین میں برطانیہ کو ایک مستحکم مقام حاصل ہو گیا۔

''اس براعظم کے نظام میں ہندوستان کو ادنیٰ درجے کی شرکت حاصل تھی۔ برطانیہ کی بڑھتی ہوئی نوآبادیوں کی صنعت و کاشت کے کارخانوں میں ہندوستانی بطور سپاہیوں، تاجروں، سودخوروں اور قلیوں کے کام کرتے تھے۔ ہندوستان کے مادی اور انسانی وسائل سے نہ صرف فتح کرنے بلکہ برطانیہ کی نوآبادیاتی سلطنت کے قیام اور اہتمام میں بھی کام لیا گیا۔

البتہ یہ تصویر کا صرف ایک رُخ تھا۔ کہتے ہیں کہ ہندوستانی بغاوت کے لئے غیر ملکی حمایت حاصل کرنے کی غرض سے نانا صاحب کے نمائندے عظیم اللہ نے روس اور ترکی کے ساتھ رابطہ قائم کر رکھا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ستارا کے نمائندے رنگو باپوجی نے عظیم اللہ کے ساتھ مل کر کام کیا تھا۔ بہادر شاہ کا دربار ایران کی حمایت کا دعویٰ کرتا تھا۔ یہ سب کچھ اس قدیم اصول کی بنا پر عمل میں آیا کہ برطانیہ کے دشمن ہمارے دوست ہیں۔ لیکن برطانیہ اس دور کی عظیم ترین طاقت تھا۔ ان ملکوں کے جاگیردار حکمران طبقے کبھی بھی ہندوستانی بغاوت کی مدد کرنے میں جلد بازی سے کام نہ لے سکتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ کر سکتے تھے کہ اس سے فائدہ اٹھائیں اور نتیجہ کا انتظار کریں۔

البتہ ان ملکوں اور دوسرے ملکوں میں جمہوریت پسند طبقات کا یہ وطیرہ نہ تھا جیسا کہ اس کتاب کے بین الاقوامی باب میں مطبوعہ مقالات سے ظاہر ہے۔ مہذب دنیا کے تمام جمہوریت پرست حلقوں میں ہندوستانی بغاوت کے لئے بڑی ہمدردی پائی جاتی تھی۔ ہندوستان کی قومی

78- رابرٹس: ''فارٹی ایرس ان انڈیا'' صفحہ 431

79- بال: بحوالہ تصنیف جلد اول صفحہ 629

80- فضل حق: بحوالہ تصنیف صفحہ 29

81- منقول از تصنیف ساور کر صفحہ 55

82- ایضاً: صفحہ 56

83- ایضاً: صفحات 62-61

84- خان: بحوالہ تصنیف صفحہ 18

85- ایضاً: صفحات 23-22۔ مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمائیں موزمدار: بحوالہ تصنیف صفحات 52-248 نیز سین: بحوالہ تصنیف صفحات 22-20

86- منقول از تصنیف ساور کر: صفحہ 55

87- موزمدار: بحوالہ تصنیف صفحہ 249

88- ایضاً: صفحہ 229

89- بال: بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ 242

90- مٹکاف: بحوالہ تصنیف صفحات 99-98

91- مارکس: مقالہ بلا دستخط: ''دی انڈین ریولٹ'' مطبوعہ ''نیویارک ڈیلی ٹریبیون'' مورخہ 10- ستمبر 1857ء

92- مسز آر۔ ایم۔ کوپ لینڈ: A Lady's Escape from Gwalior and Life in the Fort of Agra During The Mutiniss of 1857, P. 234

93- فضل حق: بحوالہ تصنیف صفحہ 30

94- فارسٹ: ''اے ہسٹری آف دی انڈین میوٹنی'' جلد اول صفحہ 217

95- کے اینڈ مالیسن: ''ہسٹری آف دی انڈین میوٹنی'' جلد دوم صفحہ 281

96- منقول از تصنیف ساور کر صفحہ 125

97- منقول از تصنیف ایڈورڈ تھامپسن: ''دی اور سائڈ آف دی میڈل'' صفحات 74-73

98- منقول از تصنیف موزمدار صفحہ 112

99- ٹی۔آر۔ہومز: ''ہسٹری آف دی سپاہی وار'' صفحہ 124
100- فضل حق: بحوالہ تصنیف
101- اچیسن: ''لائف آف لارنس'' جلد دوم صفحہ 262
102- ایضاً: صفحہ 454
103- مارٹن: ''دی انڈین ایمپائر'' جلد دوم صفحہ 449
104- منقول از تصنیف ساورکر صفحہ 134
105- میجنڈی: ''اپ امنگ دی پینڈیز'' صفحات 96-195
106- کے اینڈ مالیسن: بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ 177
107- منقول از تصنیف باسو صفحہ 959
108- نہرو: بحوالہ تصنیف صفحہ 281
109- رسل: بحوالہ تصنیف صفحہ 475
110- منقول از تصنیف ساورکر صفحات 02-401
111- فضل حق: بحوالہ تصنیف صفحات 43-42
112- ایضاً: صفحہ 32-30
113- گریتھڈ: ''لیٹرز رٹن ڈیورنگ دی سیج آف دہلی'' صفحہ 217
114- ایضاً: صفحات 206-205
115- سین: بحوالہ تصنیف صفحہ 95
116- اے۔آر۔ڈی۔میکنزی: ''میوٹنی میمائرز'' صفحہ 131
117- ساورکر: بحوالہ تصنیف صفحات 67-266
118- انس: بحوالہ تصنیف صفحہ 122
119- منقول از تصنیف نہرو: صفحات 67-266
120- نارٹن: ''ٹاپکس فار انڈین سٹیٹس من'' صفحہ 56
121- مالیسن: بحوالہ تصنیف جلد اول صفحہ 261
122- ''ریڈ پمفلٹ'' صفحہ 194

123- انس: بحوالہ تصنیف صفحہ 301

124- مارکس: Chronological Experts on East India in the year 1854-58

(نسخہ عکسی دی انسٹی چیوٹ فار مارکسزم لیبنزم، برلن)

125- کے اینڈ مایسن: بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ 357

126- مایسن: بحوالہ تصنیف جلد اول صفحہ 258

127- ایضاً: صفحہ 552

128- ڈبلیو۔ ایچ۔ فچٹ: ''دی ٹیل آف دی گریٹ میوٹنی'' صفحات 48-49

129- مارکس: مقالہ بے دستخط مطبوعہ ''نیویارک ڈیلی ٹریبیون'' مورخہ 15- جولائی 1857ء

130- نہرو: بحوالہ تصنیف صفحہ 279

131- فچٹ: بحوالہ تصنیف صفحات 21-22

132- انس: بحوالہ تصنیف صفحہ 22

133- منقول از تصنیف ساورکر صفحات 534-35

134- نہرو: بحوالہ تصنیف صفحہ 279

135- موزمدار: بحوالہ تصنیف صفحہ 241

136- سین: بحوالہ تصنیف صفحات 412-13

137- کے: بحوالہ تصنیف جلد اول 617

138- ایضاً: صفحہ 565

139- منقول از تصنیف اشوک مہتہ: ''دی گریٹ ری بلین'' صفحہ 42

140- فضل حق: بحوالہ تصنیف صفحہ 33

141- ملاحظہ فرمائیں مقالہ تلمیذ خلدون اس کتاب میں

142- مٹکاف: بحوالہ تصنیف صفحہ 220

143- ایضاً: روزنامچہ جیون لال زیر تاریخ 26- اگست

144- ایضاً: صفحہ 101

145- ایضاً: صفحہ 98

146- ایضاً: صفحہ 170

147- موزمدار: بحوالہ تصنیف صفحہ 229

148- جی۔ ڈبلیو فارسٹ: بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ 150

149- مارکس: مقالہ بلا دستخط مطبوعہ ''نیویارک ہیرلڈ ٹریبیون'' مورخہ 15- جولائی 1857ء

150- گبنس: بحوالہ تصنیف صفحہ 59

151- فچٹ: بحوالہ تصنیف صفحہ 20

152- خان: بحوالہ تصنیف صفحات 53-51

153- مٹکاف: بحوالہ تصنیف صفحات 35-134

154- ایضاً: صفحہ 130

155- ایضاً: صفحہ 140

156- ایضاً: صفحہ 198

157- ایضاً: صفحہ 199

158- ایضاً: صفحہ 215

159- ایضاً: صفحہ 226

160- ہومز: بحوالہ تصنیف صفحہ 353

161- ملاحظہ فرمائیں مقالہ تلمیذ خلدون، اس کتاب میں

162- مٹکاف: بحوالہ تصنیف صفحہ 222

163- مٹکاف: بحوالہ تصنیف صفحات 94-93

164- ایضاً: صفحہ 220

165- مہا شویتا بھٹا چاریہ: ''جھانسیز رانی'' (بنگالی زبان میں) صفحہ 253

166- مائیکل جائس: ''دی آرڈیل ایٹ لکھنؤ'' صفحہ 284

167- ملاحظہ فرمائیں مقالہ تلمیذ خلدون نیز اشوک مہتہ: بحوالہ تصنیف صفحہ 47

168- بتاریخ 5- اکتوبر 1858ء ملاحظہ فرمائیں مالیسن: بحوالہ تصنیف جلد سوم صفحہ 287

169- بتاریخ 3- فروری ملاحظہ فرمائیں ایضاً جلد دوم صفحہ 234

170- بال: بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ 241

171- منقول از تصنیف اشوک مہتہ صفحات 52-51 نیز ساورکر: بحوالہ تصنیف صفحہ 444
172- رسل: بحوالہ تصنیف صفحہ 276
173- گبنس: بحوالہ تصنیف صفحہ 53
174- ہومز: بحوالہ تصنیف صفحہ 506
175- تھارن ہل: ''انڈین میوٹنی'' صفحہ 35
176- ولیم ایڈورڈس: ''پرسنل ایڈونچرز ان دی انڈین ریبلین'' صفحات 13-12
177- منقول از تصنیف اشوک مہتہ صفحہ 46
178- ''نیریٹو آف ایونٹس'' نمبر 406، 1858ء مئولفہ کمشنر ایف۔ ولیمز مورخہ 15- نومبر 1858ء
179- ایضاً۔
180- ایضاً: مئولفہ آر۔ ایم۔ ایڈورڈس مورخہ 16- نومبر 1858ء
181- ایضاً: مئولفہ ڈبلیو۔ جے۔ براہیے مورخہ 17- نومبر 1858ء
182- ایضاً: مئولفہ تھارن ہل مورخہ 10- اگست 1859ء
183- ایضاً: مئولفہ ایف تھامس
184- ایضاً: مئولفہ ایف۔ بی۔ گبنس مورخہ 6- نومبر 1858ء
185- ایضاً: مئولفہ کمشنر گورکھپور مورخہ 8- جولائی 1858ء
186- ایضاً: مئولفہ جی۔ ایچ۔ فریلنگ
187- ایضاً: مئولفہ ایف۔ ڈی۔ مین۔ مورخہ 4- ستمبر 1858ء
188- ہومز: بحوالہ تصنیف
189- گبنس: بحوالہ تصنیف صفحہ 58
190- موزمدار: بحوالہ تصنیف صفحہ 217
191- نہرو: بحوالہ تصنیف صفحہ 284
192- ایضاً: صفحہ 268
193- گبنس: بحوالہ تصنیف
194- ٹیلیگرام مورخہ 29- جون 1857ء: فارسٹ: بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ 29
195- پانیکر: بحوالہ تصنیف صفحات 156-145

196- نہرو: بحوالہ تصنیف صفحہ 385
197- ارل گرینول 19- فروری 1858ء، بدارالامرا بجواب الزامات صدر بورڈ آف کنٹرول لارڈ ایلن برا''پارلیمنٹری ڈیبیٹس'' سلسلہ سوم1858CXL VIIIء صفحات29-1728
198- منقول از تصنیف سین صفحہ 29
199- دادا بھائی نارو جی: ''دی کنڈیشن آف انڈیا'' وزیر ہند کے ساتھ خط و کتابت ''جرنل آف دی ایسٹ انڈیا افیرز'' XIV 1882 PP. 171-172
200- منقول از تصنیف نہرو صفحات78-276
201- مارکس: "The Future Results of British Rule in India" New York Herald Tribune, June 8, 1853.
202- مارکس اینڈ اینجلس: ''سیلکٹڈ کارس پانڈنس'' صفحہ 70
203- مارکس: ''دی برٹش رول ان انڈیا'' نیو یارک ہیرلڈ ٹریبیون مورخہ 25- جون1853ء
204- مارکس: "The Future Results of British Rule in India" New York Herald Tribune, August 8, 1853.
205- ایضاً
206- پانیکر: بحوالہ تصنیف صفحہ 95
207- ایضاً: صفحہ 105
208- ایضاً: صفحات63-162
209- ایضاً: صفحات65-164
210- مارکس: مقالہ بلا دستخط ''نیو یارک ہیرلڈ ٹریبیون'' 15- جولائی1857ء
211- منقول از تصنیف آر۔ پی۔ دت صفحہ 235
212- جے۔ کیر۔ ہارڈی ایم۔ پی ''انڈیا'' صفحات60-58
213- تھامپسن: بحوالہ تصنیف صفحہ 30

❁❁❁❁❁

1857: چند سوال اور حقیقتیں

اشفاق سلیم مرزا

سب سے پہلے میں اُن سب جانثاروں کو سلام پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جو نتائج سے بے خبر اپنی معصومیت اور حُب الوطنی کی وجہ سے وطن پر نثار ہو گئے۔

1857ء کی جنگِ آزادی کو ڈیڑھ سو سال ہونے کو آئے ہیں۔ آج بھی محبِ وطن اور قوم پرست لکھنے والوں کے قلم سے اُس کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ محبِ وطن اُسے جنگ آزادی کہتے ہیں تو نو آبادیاتی قلمکار اُسے غدر کا نام دیتے بعض غیر جانبدار تجزیہ نگار اُسے بغاوت بھی کہتے ہیں۔ اُس دور میں مارکس سے لے کر سرسید اور غالب تک سب نے اپنے اپنے حوالے سے اُس کے بارے میں لکھا ہے۔ کسی نے اُسے ایک زیادہ ترقی یافتہ تہذیب کی فتح کے ساتھ ساتھ مغل اشرافیہ کے زوال پذیر تمدن کو بھی شکست کی ایک وجہ قرار دیا۔ تو کسی نے پُر جوش لشکریوں کی بے ترتیبی اور بد نظمی کو بھی اس کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ کسی نے اُس کا سبب سامراج کا ظلم اور عوام کی تذلیل بتایا۔

آج ڈیڑھ سو سال بعد محققین دوبارہ ان تمام واقعات کے اسباب اور نتائج کو نظر ثانی کرنے کے بعد قارئین کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہوئے ہیں۔ جس سے ان تمام واقعات سے متعلق چند نئے نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔

اس مضمون میں ہم مختصراً اس بات کا جائزہ لیں گے کہ کن اسباب کی بنا پر ہندوستان کے مختلف خطوں کے عوام نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ میرے نزدیک ان اسباب کو تین بڑے گروپوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

1- سیاسی اور معاشی بے اطمینانی برطانوی استحکام کے پس منظر میں

2- اقتصادی اور سماجی بعد

3- سماجی تذلیل

کہا یہ جاتا ہے کہ کسی بھی ملک کی توسیع پسندی کے پیچھے معاشی عوامل کارفرما ہوتے۔ وہ توسیع پسندی خواہ مذہبی مقاصد کی تکمیل کے لئے ہو یا کسی اور نظریاتی سہارے کی مرہون منت ہو۔ بات بالآخر معاشی مقاصد پر ہی آ کر ٹھہرتی ہے۔ آپ صلیبی جنگوں (Crusades) کو خواہ مذہبی مبلغوں کی تحریک اور ایما پر ہی کیوں نہ شروع کریں۔ اُس کے مالیاتی بوجھ اُٹھانے والے اور خرچ برداشت کرنے یورپ اور خصوصاً (Naples) نیپلز اور (Venice) وینس کے تاجر ہی تھے۔ اور وہ سب مشرق میں نئی منڈیوں کی تلاش میں تھے۔

اس طرح معاشی مقاصد کو تقویت پہنچانے کے لئے سیاسی حکمت عملی اور اُس کو پایہ تکیل تک لے جانے کے لئے فوجی جارحیت کا سہارا لینا پڑتا ہے یہی کچھ ہندوستان میں بھی ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی 31- دسمبر 1600 میں ملکہ ایلزبیتھ اول کے ایک فرمان کے ذریعے وجود میں آئی۔ (Sapre 1929.1)

اِس کی رو سے اِس کمپنی کو پندرہ سال کے لئے ہندوستان سے تجارت کرنے کا اجارہ مل گیا۔ ملکہ کے فرمان کا مقصد قوم کی ترقی، ملک کی فلاح، جہازوں کی تعمیر اور ذرائع آمد و رفت کی توسیع قرار دیا گیا۔ (Bari 1999.69)

معاشی اور سیاسی بے اطمینانی (برطانوی استحکام کے پس منظر میں)

اپنے تجارتی مقاصد کے حصول کے لئے 1615 میں برطانوی سفیر سر طامس رو (Sir Thomas Roe) جہانگیر کے دربار میں حاضر ہوا۔ وہ کوئی تجارتی معاہدہ تو نہ کر سکا البتہ مغلوں سے چند مراعات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ تین سال تک ہندوستان میں رہا اور سن 1619 تک انگریز سورت، آگرہ، احمد آباد اور بھرائچ میں تجارتی کوٹھیاں قائم کرنے کی اجازت حاصل کر چکے تھے۔ (Majumdar.1992.637) سن 1668 میں اُنہیں بمبئی بھی پرتگالیوں نے شہزادی کیتھرین (Catherine) کی چارلس دوئم کی شادی پر جہیز میں دے دیا۔

مشرقی گھاٹ پر موصلی پٹم کے مقام پر انگریز اپنی ایک کوٹھی قائم کر چکے تھے۔ 1632 میں سلطان گولکنڈہ نے ایک سنہری فرمان کے ذریعے اُنہیں 500 پگوڈا سالانہ کے عوض گولکنڈہ کی تمام بندرگاہوں پر آزاد تجارت کی اجازت دے دی تھی۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اُنہوں نے موصلی پٹم میں سن 1611 مدراس میں 1639 اور سورت میں 1613 میں اپنی کوٹھیاں قائم کر لی تھیں۔ 1639 میں فرانسس ڈے (Francis Day) چندرگری کے راجہ سے مدراس پٹہ (Leose) پر حاصل کر لیا اور وہاں ایک قلعہ تعمیر کروایا جو بعدازاں فورٹ سینٹ جارج (Fort St. George) کے نام سے مشہور ہوا۔

انگریز کی وسعت پذیری کے عزائم شروع ہی سے ظاہر ہونے شروع ہو گئے تھے اور انہوں نے ہندوستان میں اپنی معاشی سیاسی اور قانونی حیثیت کو آہستہ آہستہ مستحکم کرنا شروع کر دیا۔ 1657 میں کرام ویل (Crom Well) نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایک چارٹر کے ذریعے جائنٹ سٹاک کمپنی کا درجہ دے دیا۔ لیکن چارلس دوئم کے زمانے مختلف چارٹر کے ذریعے اس کو سکہ ڈھالنے، قلعہ بندیاں کرنے اور برطانوی عوام کے بارے میں عدالتی اختیار بھی تفویض کر دیئے۔ ساتھ ساتھ مقامی لوگوں کے ساتھ جنگ اور امن کے معاہدات کی بھی اجازت دے دی۔

جہاں تک سیاسی چپقلش کا تعلق ہے تو یہ بات بہت پہلے شروع ہو چکی تھی اورنگ زیب (1668-1707) نے اپنے دورِ حکومت میں انگریزوں کو سبق سکھانے کے لئے سورت پر فوج کشی کی اور اُن کی تجارتی کوٹھی پر قبضہ کرنے کے بعد تمام انگریزوں کو وہاں سے نکل جانے کا حکم دیا۔ انگریزوں کے پاس معافی نامے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ گو اورنگ زیب نے تجارت کی اجازت دے دی لیکن ساتھ یہ تنبیہہ بھی کی کہ آئندہ ایسی غلطی کا ارتکاب نہ کیا جائے اور یہ کہ ہمیشہ مابدولت کی خوشنودی کے طالب گار رہو۔ اس طرح پہلے بنگال میں بھی نواب شائستہ خاں کے ساتھ بگڑتے ہوئے تعلقات کو دیکھ کر جیرالڈ اون گیر (Gerald Aungier) نے کمپنی کے کورٹ آف ڈائریکٹرز (Court of Directors) کو یہ لکھا تھا کہ اب تلوار ہاتھ میں لے کر ہی تجارت کو جاری رکھا جا سکتا ہے۔ (Ali 1984.II.13)

ونسنٹ اے سمتھ (Vincent, A. Smith) اورنگ زیب کے بعد کے عہد کو انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو ان الفاظ میں سمیٹتا ہے۔

"عظیم مغلوں کے زمانے میں ہندوستان میں برطانوی اثر ورسوخ کا علاقہ چند میل تک پھیلا ہوا تھا جس میں بمبئی کا جزیرہ مدراس شہر اور چند دوسرے شہروں میں چند کوٹھیاں شامل تھیں اور یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جو کسی کی نظر میں کھٹکے۔ لیکن پھر اُن کے بحری کپتانوں نے اسے ہندوستان میں ایک اہم طاقت بنا دیا تھا۔ اورنگ زیب کی وفات کے پچاس سال بعد جب اُنہوں نے بنگال پر اقتدار حاصل کیا۔ تو کوئی قوت اُنہیں ہندوستان کا حکمران بننے سے نہیں روک سکتی تھی خواہ وہ پارلیمنٹ کا کوئی ایکٹ ہی کیوں نہ ہو(Smith 1958.335)

1757 کی پلاسی کی جنگ نے تو بنگال پر انگریزوں کو بلاشرکت غیرے حکمران تسلیم کرلیا۔ کلائیو کی سربراہی میں تین ہزار کمپنی کی فوج نے نواب سراج الدولہ کی فوج کو شکست دی جس کے نتیجے میں سراج الدولہ اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں قتل ہوگیا۔ پانچویں رپورٹ میں دارالعوام کی سلیکٹ کمیٹی نے یہ کہا ہے کہ یہ لڑائی میر جعفر اور راجا درلاب کی مکاری اور غداری سے جیتی گئی نہ کہ کلائیو کے جنگی ماہر ہونے سے۔(Firmunger 1985. Vol I. II)

بہت سے محققین کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر میر جعفر اور راجا درلاب سراج الدولہ کا ساتھ دیتے تو انگریز ہندوستان کی وہ تاریخ نہ رقم کر سکتے جو انہوں نے بعدازاں کی۔

پلاسی کی جنگ کے بعد بنگال اور بہار سے لے کر سارے شمالی ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکمرانوں کے خلاف کوئی نہ کوئی شورش بپا رہی۔ اس کی وجوہات انگریزوں کی سیاسی اور اقتصادی پالیسیاں تھیں جس کی وجہ عوام، نوابین اور راجے سب اُن سے نالاں رہے۔ حتیٰ کہ اُن کے اپنے نامزد کردہ نوابین نے بھی اُن سے تنگ آ کر یا تو اُن کے خلاف بغاوت کی یا وہ کمپنی کے حکمنامے کی وجہ سے ہٹا دیئے گئے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ فرخ سیر نے سن 1717 میں ایک فرمان کے ذریعے کمپنی کو 38 گاؤں کی تعلقداری خریدنے کی اجازت دے دی تھی لیکن بنگال کے نواب مُرشد قلی خاں نے اُس پر عمل درآمد روک دیا تھا۔ لیکن پلاسی کی لڑائی سے پہلے فروری 1757 کو نواب سراج الدولہ نے اس بات کی اجازت دے دی تھی۔ بعدازاں میر جعفر نے مزید چوبیس پرگنے کی زمینداری بھی اُن کے سپرد کردی۔

مرشد قلی خان نے فرخ سیر کے فرمان کی پہلی شق کو لاگو ضرور کر دیا تھا۔ جس کے تحت

انگریزوں کو-/3000روپے سالانہ کے عوض آزاد تجارت کا پروانہ مل گیا۔(Simha.1927.5)

یہ رعایت اُس زمانے میں ''پیشکش'' کہلاتی تھی جو کہ شاہی خزانے ہگلی میں جمع کرائی جاتی تھی۔ یہ مراعات برآمدات اور درآمدات دونوں کے لئے تھی۔

لیکن دستک کا مسئلہ ایسا تھا جس پر مقامی تاجر اور نواب دونوں ناخوش تھے۔ سوال یہ تھا کہ آیا کمپنی کی ''دستک'' یا پاسپورٹ کو اندرونِ ملک چھوٹ کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ بنگال کے نواب کا یہ اصرار تھا کہ دستک صرف اُن اشیاء کے لئے استعمال کی جائے جو درآمد یا برآمد کے لئے ہوں۔ کیونکہ اگر یہ اندرونِ ملک تجارت کی غرض سے استعمال ہوں گی تو مقامی تاجر نقصان میں رہیں گے اور بالآخر وہ تباہ ہو جائیں گے اور اس سے شاہی آمدنی بھی کم وصول ہوگی۔ لیکن اندرون ملک تجارت کے لئے کمپنی کے ملازمین دستک کو استعمال کرتے ہوئے پائے گئے۔ وہ ایسا اپنے نجی کاروبار اور منافع کے لئے کرتے تھے۔ بعدازاں انگریزوں کے علاوہ دوسرے تاجر بھی دستکوں کو استعمال کرتے ہوئے پائے گئے۔

ان باتوں کا ایسٹ انڈیا کمپنی نے بہت فائدہ اٹھایا۔ ایک رپورٹ کے مطابق 1711 میں جو اشیاء-/43000 ہزار پاونڈ کی خریدی گئیں فرانس میں اُنہیں-/150,000 پاونڈ میں فروخت کیا گیا۔(Wilson Vol. II, Pont I, 53-54)

گو ساری تجارت ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے ہوتی تھی۔ لیکن برطانوی حکومت کی ہندوستانی معاملات میں براہ راست دلچسپی تھی اور اُس کی دیکھ بھال کے لئے اُنہوں نے بہت سے قوانین وضع کرنے شروع کر دیئے تھے۔ 1773 میں لارڈ نارتھ ریگولیٹنگ ایکٹ کے ذریعے (North Regulating Act) گورنر جنرل اُس کی کونسل اور سپریم کورٹ کو قائم کیا گیا اور پھر 1784 میں پٹ ایکٹ (Pit's Act) ہندوستان کے لئے سیکریٹری آف سٹیٹ (Secretary of State) اور لندن میں ہی بورڈ آف کنٹرول کو متعارف کرایا گیا۔

ریگولیٹنگ ایکٹ کو لاگو کئے جانے کی ایک بڑی وجہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی مالی دھاندلیاں تھیں۔ جب اُن کی لوٹ کھسوٹ کی خبریں اس شکل میں برطانیہ پہنچیں کہ 1772 میں لارڈ نارتھ کو اطلاع دی گئی کہ جب تک حکومت کمپنی کو دس لاکھ پاؤنڈ قرض نہیں دیتی اُس وقت تک کمپنی کے کاروبار بند رہیں گے۔ تو پریشانی میں اس کی تحقیقات کے لئے پارلیمانی کمیٹی کے کئی اجلاس

ہوئے جس سے یہ معلوم ہوا کہ 1757 سے 1766 تک کی مدت میں کمپنی کے ملازموں نے بنگالیوں سے اکیس لاکھ پاؤنڈ سے زیادہ نذرانے کی شکل میں وصول کئے۔کلائیو کی جاگیر کی مالیت اُس کے علاوہ تھی۔اس کے علاوہ نقصانات کی تلافی کے لئے کمپنی نے 38 لاکھ کے قریب الگ وصول کئے ان تحقیقات نے اس خیال کو یقین کے درجے تک پہنچا دیا کہ کمپنی کو پارلیمنٹ کے تحت کام کرنا چاہئے۔(1999.170۔باری)

اس کی ایک اور بڑی وجہ دوہرا نظام (Dual System) یا (Double Government) کا نظام تھا۔ جو لارڈ کلائیو نے متعارف کروایا تھا۔ کیونکہ بکسر کی جنگ (1764) اور کرناٹک کی لڑائیوں کے بعد انگریز کی عملداری بہت سے علاقوں پر بہت مضبوط ہوگئی تھی۔ کیونکہ بکسر کی لڑائی کے بعد شہنشاہ دہلی بھی اُن کے تابع ہوگیا تھا۔شاہ عالم ثانی کا 26 لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کیا گیا۔اور کڑہ اور الہ آباد کے علاقے نواب آف اودھ سے چھین کر اُسے دے دیئے گئے۔ان کے بدلے میں شاہ عالم ثانی نے بنگال، بہار اور اُڑیسہ کی دیوانی کمپنی کے حوالے کر دی۔

بنگال، بہار اور اُڑیسہ کی دیوانی حاصل کرنے اور دوہرا نظام لاگو کرنے سے یہ ہوا کہ مالیہ اکٹھا کرنا تو کمپنی کے حوالے کر دیا گیا۔ جبکہ قانون نافذ کرنا نواب کے پاس ہی رہا۔لارڈ کلائیو نے اس کے عوض ایک معاہدے (1765) کے تحت نواب نجیب الدولہ کو 53 لاکھ روپے انتظامی امور چلانے کے لئے دینا منظور کئے۔(Agarwal.1986.7)

اُن تمام خرابیوں پر قابو پانے کے لئے جو اُس وقت کمپنی کے کارندوں نے روا رکھی تھیں۔ مندرجہ ذیل اقدامات کئے گئے۔

1- بنگال میں ایک نئی انتظامی حکومت کا قیام عمل میں لایا گیا۔
2- مدراس اور بمبئی کی پریزیڈنسی کو کلکتہ کے تابع کر دیا گیا۔
3- نوکرشاہی کو غلط کاریوں سے پاک کرنے کے لئے اقدامات کئے گئے۔
4- کلکتہ میں ایک سپریم کورٹ قائم کر دیا گیا۔
5- قوانین وضع کرنے کا ایک نیا طریقہ اپنایا گیا۔

مزید برآں اس کے تحت بنگال، بہار اور اُڑیسہ کی سول اور ملٹری انتظامیہ گورنر جنرل اور چار کونسلروں کے تحت کر دی گئیں۔ گورنر جنرل اور چار کونسلر ایکٹ کے ذریعے نامزد کر دیئے گئے۔

جن کی مدت پانچ سال مقرر کی گئی جن کو اس دوران کسی بھی صورت میں ہٹایا نہ جا سکتا تھا جب تک کہ کورٹ آف ڈائریکٹرز بادشاہ برطانیہ کو اس بات کی سفارش نہ کرے۔ اس ایکٹ کے ذریعے کونسلر اور گورنر جنرل ایک سطح پر کھڑے تھے۔ لیکن کاسٹنگ ووٹ کا حق گورنر جنرل کو حاصل تھا۔

اس کے بعد نہ صرف انتظامی امور کو برطانوی توسیع پسندی کے لئے زیادہ سخت کیا گیا۔ بلکہ ٹیپو سلطان کے ساتھ لڑائیوں کے دوران (2-1790) کرناٹک کا تمام انتظام کمپنی نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ٹیپو سلطان کی شکست کے بعد باقی علاقے بھی میسور کے زیرِ انصرام دے دیئے گئے۔ اسی طرح بنگال اور مدراس کے درمیانی علاقے کا جہاں تک سوال تھا وہ کٹک، بالاسور کمپنی کے پاس آنے کے بعد ختم ہو گیا۔

بعد ازاں مرہٹوں کو زیر کرنے کے بعد ہندوستان کے بہت سے مغربی علاقے بھی اُن کے قبضہ میں آ گئے۔ اس طرح ہیسٹنگز (Hesting) جب ہندوستان سے 1823 میں گیا۔ تو ہندوستان کے بہت سے علاقوں پر کمپنی کا کنٹرول ہو گیا تھا اور دہلی پر مغل بادشاہ کا برائے نام قبضہ تھا۔ جبکہ ہر بات انگریز ریذیڈنٹ کے حکم کے تابع تھی۔

دوسری طرف ریاستوں کے حکمران وراثت کے مسئلے پر بہت سی ریاستوں میں کمپنی کے حکم کے تحت جانشین مقرر کرنے اور اپنی پہلی حالت برقرار رکھنے پر کمپنی سے نالاں تھے۔ اس لئے بہت سے علاقوں میں حکومت کے خلاف مختلف بغاوتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ اس کی ایک بڑی وجہ سیاسی اور معاشی بے چینی تھی لیکن اُس کو زیادہ تر مذہبی علماء نے مذہبی رنگ دے کر عوام کو انگریز کے خلاف صف آرا کیا۔ اور بہت سے علاقوں میں لوگ انگریز کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔

پہاڑی قبائل نے بھی اِس میں دوسرے لوگوں کا ساتھ دیا۔ ان میں زیادہ تر راجپوت راجہ شامل تھے۔ مغربی مدنا پور، بہار، چھوٹا ناگپور، اُڑیسہ، جنگل محل سے کول منڈ اور بھیل قبائل اور راج محل سے سنتھال بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ 1827 تک انگریزوں کے خلاف یہ قبائل مسلسل برسرِ پیکار رہے۔ جبکہ انگریزوں نے اُن کی شورش پر قابو پا لیا لیکن پھر 1831 میں چھوٹا ناگپور اور آس پاس کے علاقوں میں قبائل نے انگریزوں کے خلاف علم اُٹھایا۔ (Chand-5)

بعد ازاں پھر (32-1831) میں کول قبائل نے بغاوت کر دی کیونکہ اُن کی زمینوں پر نئے آبادکار بسا دیئے گئے تھے۔ اِسی طرح سنتھالوں نے دامنِ کوہ میں 400 گاؤں پر قبضہ کر لیا۔ مالیہ

کے معاملات میں سختی اور دیگر شکایتوں کی وجہ سے وہ کمپنی کے خلاف ہو گئے اور ہتھیار اُٹھا لئے۔ اسی طرح اُڑیسہ کے زمینداروں نے بھی علم بغاوت بلند کیا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں کھونڈ، خاص آسام میں بھی ایسے حالات سے سابقہ پڑا۔

تاراچند کے مطابق مسلمان اپنی پرانی حیثیت برقرار رکھنے کے لئے زیادہ پریشان تھے۔ خصوصاً بنگال میں اسی کی واضح صورتِ حال دیکھنے میں آئی۔ اس لئے مسلم فقیروں نے مجنون شاہ کی قیادت میں سب سے پہلے 77-1776 میں علم بغاوت بلند کیا۔ اُن کا مرکزی علاقہ نیپال کی ترائی کا علاقہ تھا۔ بنگال میں زیادہ تر کارروائیاں مدار گنج، مہا استھان اور بوگرہ کے اضلاع میں ہوئیں۔

بعدازاں ان کے ساتھ راجپوت اور پٹھان بھی شامل ہو گئے۔ مجنون شاہ کی وفات کے بعد اُس کا لڑکا چراغ علی شاہ کافی مستعدی کے ساتھ یہ تحریک چلاتا رہا۔ انیسویں صدی کی شروعات انہوں نے کمپنی کی افواج کو سخت پریشان کئے رکھا۔

ایسی ہی ایک تحریک ٹیپو کی طرف سے چلی جو پاگل پنتھی فرقے کا رہنما تھا۔ اِس کا آغاز اُس کے والد کرم شاہ نے 1775 کے لگ بھگ کیا تھا۔ اُس کے دستور میں سچائی، مساوات اور بھائی چارے کا درس دیا جاتا تھا۔ اس میں مسلمان اور ہندو کے علاوہ گارو اور ہاجونگ بھی شامل تھے۔ دراصل یہ انگریزوں کے پروردہ زمینداروں کے خلاف کسانوں کی تحریک تھی۔ عرصہ دراز تک کئی علاقوں پر اس تحریک کی عملداری رہی بالآخر 1833 میں کمپنی کی افواج نے اُن پر قابو پا لیا۔ ٹیپو کی وفات 1852 میں ہوئی۔

پھر حاجی شریعت اللہ کی فرائضی تحریک بھی مذہبی بنیادوں پر انگریز کے خلاف بغاوت کی شکل میں اُبھری۔ اُس نے بھی بنیادی اصلاحات کا پرچار کیا۔ وہ بھی کسانوں کا حامی تھا اور زمینداروں کے استحصال کے خلاف تھا۔ وہ بنگال سے انگریزوں کا اخراج چاہتا تھا۔ مذہبی طور پر وہ بنیاد پرست تھا۔ اُس کا بیٹا جو دُودُو میاں کے نام سے مشہور ہوا نے کسانوں کو اس بات کے لئے اُکسایا کہ وہ کمپنی کو ٹیکس ادا نہ کریں، اُس نے اپنی عدالتیں بھی قائم کیں۔ اور وسیع علاقے میں لوگ فرائضی تحریک میں شامل ہوئے بعدازاں سید احمد شہید کی تحریک بھی انہیں استحکام بخشا۔ اس سلسلے میں تیتومیر کا بھی نام بہت اہم ہے۔

علاوہ ازیں ان بغاوتوں میں سنیاسیوں کی بغاوت بھی بہت اہم ہے۔ یہ شنکر اچاریہ کے پیروکار تھے۔ 1763 میں سنیاسیوں نے کمپنی کی فیکٹریوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور کسی ایک ضلع میں حملے کرنے کے بعد وہ تتر بتر ہو جاتے تھے۔ تقریباً پچاس سال تک اُنہوں نے برطانوی انتظامیہ کو پریشان کیے رکھا۔ بعدازاں اس تحریک میں وہ جوش و خروش نہ رہا۔

راجہ وزیانگرم، دیوان دیلو اور ڈھونڈی جی کی شورشیں اس سلسلے کی اہم کڑی ہیں۔

اقتصادی اور سماجی بعد اور نوحہ گری

اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اُن سب اسباب کو دیکھتے ہوئے بھی ہمارے ہاں خارجی اور معروضی عناصر جو نظر انداز کرنے کی روایت رہی ہے۔ ہم نے اِن تمام واقعات کو مقامی رومانی رنگ میں رنگنے کی جو کوشش کی اُس کی وضاحت غالب نے اس مصرعے میں خوب کی ہے۔

"مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں"

یہ مصرعہ ہماری اُس سائیکی کی ترجمانی کرتا ہے۔ جو رومانیت میں ملفوف نوحہ گری اور ماتم گُساری کو ہی پروان چڑھاتی ہے اور پُرسے کی طرف بلاتی ہے۔ یعنی ہمارے ساتھ بہت ظلم ہوا اور ظلم کی داستان بار بار رقم ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں صدیوں پہلے سے اس کا ایک بڑا حوالہ موجود تھا۔ پھر یہ تیمور کے حملے مغلوں کے قبضے، نادر شاہ کی یلغار اور انگریزوں کے دہلی اور موجودہ پاکستان کے علاقوں پر اُس کی مکمل فتح کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ ہمارے لئے المیے اور آہ وزاری کے کئی افق کھل جاتے ہیں۔ اور ابھی سقوط ڈھاکہ کا زخم تازہ ہے۔ وہاں بھی کہا جاتا ہے کہ ہم پر ظلم ہوا۔ ان تمام واقعات کے بعد ہم فاتح کو کوستے ہیں اور اخلاقی فیصلے صادر کرتے ہیں کہ جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا یہ سب اخلاقی طور پر غلط تھا۔ ہماری کمزوری سے فائدہ اُٹھایا گیا۔ ہمارے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کی گئی۔ قارئین کو یاد رکھنا چاہئے کہ طاقت کی کوئی اخلاقیات نہیں ہوتی اور تاریخ اخلاقی فیصلے صادر نہیں کرتی۔

اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اُس کے حوالے سے بغاوت 1857 سے متعلق بہت سے سوالوں کے دائرے ذہن میں بنتے ہیں۔ ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ اُن کے جوابات تلاش کریں۔ سوال اور اُن کی تفصیلات کچھ یوں ہیں۔

پہلے سوال کا دائرہ کار

پہلا سوال اس سے متعلق ہے کہ کیا باغیوں کے سامنے کوئی مربوط منصوبہ بندی تھی ۔ کیا کمزور ہوتے ہوئے بھی وہ ویت نامیوں کی طرح کسی غیر متزلزل نظریئے سے لیس تھے کہ اُن میں کوئی جنرل گیاب اور ھوچی منھ موجود تھا۔

کیا تاریخی طور پر اُسے قومی آزادی کی تحریک کہا جا سکتا تھا۔ کیا وہ قومی آزادی کی تحریکوں کا زمانہ تھا۔ جنہیں ہم سپاہ آزادی کا نام دیتے ہیں ۔ اُن کے بارے میں غالب کا خیال تھا کہ ''میرٹھ سے کچھ کینہ پرور سوار شہر میں داخل ہوئے ۔ یہ سب شوروغل کرنے والے تھے جو اپنے آقاؤں کو ہلاک کرنے کے لئے بے تاب اور انگریزوں کے خون کے پیاسے تھے ۔''

''خدا خدا کر کے وہ منحوس دن ختم ہوا۔ ہر طرف گہرا اندھیرا پھیل گیا۔ ان سیاہ باطنوں اور بے رحم قاتلوں نے شہر میں جا بجا پڑاوٗ ڈالا، اندرونِ قلعہ شاہی باغ کو گھوڑوں کا اصطبل بنایا اور نشیمن سلطانی کو خواب گاہ اور ان نمک حراموں نے کھلم کھلا بغاوت کا شور مچا رکھا ہے ۔''

''کوتوال شہر کی زن و دختر کے علاوہ ساری نازنینیانِ شہر کا زیور بزدل اور سیہ کار رہزنوں کے قبضہ میں ہے ۔ زیور و آسائش چھن جانے کے بعد ان نازنینوں میں جو ہلکا سا اندازِ ناز باقی رہا تھا۔ اس کا ان نو دولت گدا زادوں نے چھین لیا کہ اُن کی خودنمائی کے کام آئے جو محبت کرنے والے پہلے ان نازنینانِ گل اندام کی ناز برداری کرتے تھے اب ان بدخصلتوں کے ناز اُٹھانے پر مجبور ہیں ۔''

''جو لوگ گمنامی کے گوشوں میں چھپے ہوئے تھے وہ گروہ در گروہ خنجر بہ کف اپنی آفائش اور بے شرمی کا مظاہرہ کرتے پھرتے ہیں ۔ امن پسند اور نیک نہاد لوگ گھر سے بازار تک آتے ہوئے راستے میں بیسیوں جگہ عاجزی اور مغلوبیت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں لٹیرے دن میں دلیری کے ساتھ لوٹ مار میں مصروف ہیں اور رات میں ریشمی بستروں پر محوِ خواب ۔''

دوسرا دائرہ سوال دفاعی طاقت کے بارے میں ہے

''غالب کہتے ہیں کہ دہلی کے اندر اور باہر تقریباً پچاس ہزار سواروں اور پیادوں کی فوج

پڑی ہوئی ہے یا پھر سپاہی، بادشاہ اور درویش پر ایک پر حکومت کرنے لگیں اور بڑے بڑے بہادروں کا یہ حال ہو جائے کہ وہ اپنے سائے سے ڈریں۔" (Ghalib.Dastanby)

کارل مارکس کے نزدیک 20 کروڑ دیسی باشندوں کو دو لاکھ دیسی لوگوں کی فوج فرماں بردار بنائے ہوئے تھی۔ جس کے افسر انگریز تھے۔ اس دیسی فوج کو 40 ہزار انگریزی فوج نے لگام دے رکھی تھی۔ (Marx.1968.90-100)

جبکہ غالب کے مطابق دہلی کے باہر پچاس ہزار کے قریب باغی جمع تھے۔ جبکہ ایک دوسرے اندازے کے مطابق اُن کی تعداد چالیس ہزار کے قریب تھی۔ ایک انگریز آرٹلری افسر کے مطابق اگست کے مہینے میں برطانوی سپاہ میں 229 افسر 3342 برطانوی سپاہی 46 مقامی افسر اور 2024 مقامی سپاہی تھے۔ اس کے علاوہ 520 گھوڑے اور توپیں تھیں (Marx.98) کسی وقت بھی برطانوی فوج کی تعداد گیارہ ہزار سے زیادہ نہ تھی۔

باغی افواج کی بے ترتیبی اور افراتفری کی کئی مثالیں دی جا سکتی ہے۔ جیسا کہ اُوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ انگریز کے خلاف نفرت کا جذبہ معاشی اور مذہبی وجوہات کی بنا پر موجود تھا۔ انگریز کے خلاف پلاسی کی جنگ کے بعد مقامی بغاوتوں کا حال بھی پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔

ہندوستان میں برطانوی فوج کی کل تعداد دو لاکھ سے زیادہ نہیں تھی جبکہ اُس وقت ہندوستان کی آبادی 20 کروڑ کے لگ بھگ تھی۔ یہ انگریز فوج کسی ایک جگہ مجتمع نہیں تھی بلکہ پورے ہندوستان میں جگہ جگہ پھیلی ہوئی تھی۔ دہلی کے محاصرے کے دوران مختلف جگہوں سے افواج کو کمک کے طور پر بھیجنا پڑا۔ میدان جنگ میں اُن کی تعداد بھی کم تھی۔

تو سوال یہ ہے کہ کیا ہم یہ سب ماننے کے لئے تیار ہیں۔ کہ بہت سے سوالوں کے جواب ہم اپنی خود ساختہ لاعلمی کی وجہ سے گول کر جاتے ہیں۔

جب ہم 1857 میں اپنی ناکامی کا ذکر کرتے ہیں تو ہم بہت سی باتیں بھول جاتے۔ یہ بات بہت سی دوسری ناکامیوں پر بھی صادق آتی ہے۔ ہم یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ انگریز غیر زمین پر تھے۔ رسل و رسائل کے ذرائع بھی اتنے ترقی یافتہ نہ تھے۔ اُس وقت ایک بڑی کشتی برسات کے دنوں میں الہ آباد سے کلکتہ تک کا 850 میل کا سفر دریائے گنگا کے ذریعے 20 دنوں میں طے کرتی تھی اور خشک موسم میں یہ سفر 40 سے 60 دنوں میں ہوتا تھا۔ واپسی کے سفر کو تین سے چار ماہ تک

لگ جاتے تھے۔ان تمام عوامل کی موجودگی میں انگریز کو فتح کیوں نصیب ہوئی اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ انگریز سماجی اور اقتصادی طور پر ایک ترقی یافتہ قوم تھی۔ یہ ایک فرسودہ جاگیردارانہ مغل بادشاہت اور زبوں حال اشرافیہ کی جدید سرمایہ دارانہ نظام سے جنگ تھی۔ جس کے کئی ایک روپ دیکھنے میں آئے۔

بدلتی ہوئی دنیا سے بے خبر دہلی دربار اور حکومت جو لال قلعہ کے آس پاس کے علاوہ حقیقتاً اور کہیں نظر نہیں آتی تھی ابھی تک محو استراحت تھی۔شاہ عالم ثانی کی وفات کے بعد حکومت سکڑ کر پالم تک بھی نہ تھی۔ اگر امراء کو بھی بہادر شاہ ظفر سے ملنا ہوتا تھا تو اُنہیں برطانوی ریذیڈنٹ کی اجازت درکار تھی۔(Dalrymple:2006.37)

لیکن لال قلعہ کے حرم میں داشتاؤں اور منکوحہ بیگمات کا ایک میلہ لگا ہوا تھا۔ جو ہر وقت ایک دوسرے کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتیں۔شہزادے تعلیمی مصروفیات کے علاوہ زیادہ تر کھیل تماشوں میں لگے رہتے، جن میں زیادہ تر شکار، کبوتر بازی، بٹیر بازی اور کنکرے اُڑانا شامل تھا۔ان کے علاوہ سلاطین کا بُرا حال تھا جن کی اُس وقت محل میں تعداد کوئی دو ہزار تھی یہ وہ شہزادے تھے جو پہلے بادشاہوں کی اولاد یا اُن کی اولاد کی اولاد تھے۔ وہ بہت کسمپرسی کی حالت میں تھے۔ بعض وظائف کی پابندی کی حالت میں اُنہیں احتجاج کرنا پڑا۔

بہادر شاہ ظفر کے ہاں مختلف عورتوں سے 16 بیٹے اور 31 بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ آخری بیٹا مرزا شاہ عباس جب پیدا ہوا اُس وقت بہادر شاہ ظفر کی عمر 70 سال تھی۔ جب زینت محل سے اُس کی شادی ہوئی تو بہادر شاہ ظفر کی عمر 65 سال تھی اور زینت محل 18 یا 19 سال کی تھی۔لیکن بعض جگہ 17 سال بھی کہا گیا ہے۔(Dalrymple:2006.43)

جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے تو مدرسوں میں قرآن، حدیث اور تفسیر کے علاوہ ارسطو کی منطق، صرف ونحو، فلسفہ اور فن خطابت کی تعلیم دی جاتی۔ وہ بھی پرانے درسِ نظامی کے تحت، اس حوالے سے دیکھا جائے تو جدید سائنسی علوم کا مکمل فقدان تھا۔ دہلی میں اس وقت سب سے اہم مدرسہ رحیمیہ تھا۔لیکن اُس وقت دہلی کالج بھی قائم ہو چکا تھا۔ جہاں ریاضیات کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ کرنل سلیمن کے نزدیک ان مدرسوں کے فارغ التحصیل طلباء سقراط، ارسطو، افلاطون، بقراط، جالینوس، ابن سینا پر مباحث میں شریک ہو سکتے تھے۔(Dalrymple:2006.95)

ان تمام باتوں کے باوجود مغل دورِ حکومت میں میر اور غالب کے علاوہ کوئی نامور عالم پیدا نہ ہو سکا کچھ حد تک ابوالفضل اور فیضی کا نام لیا جا سکتا ہے جبکہ اس دوران انگلینڈ میں سولہویں صدی میں شیکسپیئر فرانس بیکن (Francis Bacon) اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں آدم سمتھ، ڈارون، بائرن، کیٹس، شیلے پیدا ہو چکے تھے۔ اس طرح ہوبز، لاک، برکلے اور ہیوم جیسے فلسفیوں کا دور 1776 تک ختم ہو چکا تھا۔

ہندوستان میں اُردو میں فلسفہ پر پہلی کتاب جس نے جدید مغربی فلسفہ کو متعارف کرایا مراۃ الحکماء تھی جسے شمس العلماء نواب سید امام اثر نے لکھا تھا اور یہ 1877 میں شائع ہوئی تھی۔

اُس وقت سب سے جدید ذہن کی علامت مرزا اسداللہ خاں غالب تھے۔ اُنہوں نے اپنی بہت سی تحریروں میں انگریز کی ترقی پسندی کو خوش آمدید کہا۔ بہت سے ناقدین کا خیال یہ ہے کہ غالب جو انگریز کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اُس میں اُن کی مصلحت پسندی شامل تھی۔ وہ اپنے وظائف کی بندش پر پریشان تھے اور انگریز کے ساتھ براہ راست تضاد کو سامنے لانا نہیں چاہتے تھے۔ ابوظہیر ربانی نے ''آج کل'' کے مئی 2007 کے شمارے میں انہی خیالات کا اظہار کیا ہے کہ غالب چاہتے تھے کہ انگریز جس طرح بھی خوش ہوں اُنہیں خوش کرنا چاہیئے تا کہ پنشن پانے میں کوئی دقت نہ ہو۔ اُنہوں نے اپنی حمایت میں سید معین الرحمان کی بات بھی دہرائی ہے کہ

''غالب کی چال یہ تھی کہ کتاب (دستنبو) اپنے ناآشنا طرز تحریر کی وجہ سے ہندوستانیوں کے لئے سربستہ راز رہے تاکہ وہ ان میں ہدف ملامت بننے سے محفوظ رہیں۔'' (Moeen.1988.17)

میں سمجھتا ہوں اس قسم کی یکطرفہ رائے دینا یہاں مناسب نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ غالب اصولی طور پر یہ سمجھتے ہوں کہ انگریز جو تہذیب متعارف کروار ہا ہے اور مغل اشرافیہ کی زوال پذیر تہذیب سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہے۔ جیسے کہ انہوں نے اپنے ایک دوست کے ساتھ اس کا اظہار کیا ہے:

انگریزوں نے ایسے قوانین اور آئین کا اجرا کیا ہے جو پہلے سننے میں نہیں آیا۔ فنون میں فنکاروں نے وہ کمال حاصل کیا ہے کہ اپنے بزرگوں کو پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ آئین کی پاسداری اسی قوم کا حق ہے۔ ان سے زیادہ ملک کے انتظام و انصرام کو کوئی نہیں جانتا۔ انہوں نے حکومت

اور انصاف کے بل پر ہندوستان میں قانون کی عمل داری کو سو گنا بڑھا دیا ہے۔ لوگ پتھر سے آگ جلاتے ہیں۔ جبکہ انگریز تنکے (دیا سلائی) سے آگ پیدا کرتے ہیں انہوں نے پانی کو رام کرلیا ہے اور اس سے کشتیاں اور جہاز چلتے ہیں۔ بھاپ سے جو جہاز چلتے ہیں اُن کے آگے پانی اور طوفان بے بس نظر آتے ہیں۔ انہوں نے الفاظ کو پر لگا دیئے ہیں تمہیں اس بات کا پتہ ہے کہ ایک پیغام چند لمحوں میں 200 میل دور پہنچ جاتا ہے وہ ہوا (گیس) کو آگ لگا دیتے ہیں جو کوئلوں کی طرح جلتی ہے۔ اُن کے دستور میں سینکڑوں دساتیر سموئے ہوئے ہیں۔ اُن کے دستور کے سامنے باقی دساتیر المینک (Almanac) لگتے ہیں۔ اے میرے دوست کیا تمہارے دستور میں بھی ایسی ہی عمدہ باتیں ہیں۔ مردہ لوگوں کی پوجا کرنا وقت گزاری کے لئے اچھا نہیں ہے کہ تمہیں نظر نہیں آتا۔

اقتصادی اور سماجی بعد

اب ہم اس حوالے سے اگر برطانوی معاشی اور دفاعی صورت حال پر نظر ڈالیں تو وہ کچھ اس طرح تھی۔

1760 اور 1830 کے درمیان یورپ کی صنعتی پیداوار میں برطانیہ کا حصہ دو تہائی تھا اور دنیا کی پیداوار میں اس کا حصہ 1.9% سے بڑھ کر 9.5% ہو گیا اور اگلے تیس سالوں میں اس کا حصہ 19.9% ہو گیا۔ 1860 میں صورت حال کچھ یوں تھی کہ برطانیہ پوری دنیا کی پیداوار کا 53% لوہا اور 55% کوئلہ اور نائٹ پیدا کر رہا تھا۔ جبکہ اس وقت خام روئی کی کل پیداوار کا 50% اپنے تصرف میں لا رہا تھا۔ اُس وقت اُس کی آبادی دنیا کا کل 2% تھی اور یورپ کی آبادی کا صرف 10% تھی ان شماریات کی کوئی حد نہیں۔ لیکن پھر بھی یہ بتانا ضروری ہے کہ دنیا کی تجارت کا 1/5 حصہ اس کے قبضے میں تھا اور جبکہ مصنوعات میں یہ شرح 2/5 تھی۔ اور دنیا کے ایک تہائی جہازوں پر برطانوی جھنڈا لہراتا تھا۔

آر۔ ہیم (R.Hyam) کہتا ہے۔

"شمالی امریکہ اور روس کے میدان ہمارے غلے کے کھیت ہیں۔ شکاگو اور اوڈیسہ کے غلے گودام ہیں۔۔۔ جبکہ کینیڈا اور بالٹک کے جنگل ہمارے

> لئے لکڑی مہیا کرتے ہیں۔ آسٹریلشیا میں ہمارے بھیڑوں کے فارم ہیں۔ جبکہ ارجنٹائن اور شمالی امریکہ میں ہمارے بیل پلتے ہیں۔ پیرو ہمیں چاندی بھیجتا ہے اور سونا ہمیں جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا سے آتا ہے۔ ہندوستان اور چین ہمارے لئے چائے پیدا کرتا ہے۔ جبکہ کافی مصالحہ جات اور شکر ہمیں انڈیز سے آتی ہے۔ سپین اور فرانس ہمارے لئے انگور پیدا کرتے ہیں۔ جبکہ بحیرہ روم ہمارے لئے پھلوں کا باغ ہے اور کپاس جن کے لئے جنوبی امریکہ کے خطے مخصوص تھے اب دوسرے گرم علاقوں میں بھی پیدا ہو رہی ہے۔ (Kennedy.1995.194)

آیئے اب یہ دیکھتے ہیں کہ نوآبادیاتی نظام سے پہلے ہندوستانی سماج کیسا تھا۔

برصغیر ہندوپاکستان میں نوآبادیاتی نظام سے پہلے کا سماج

اب اس بات کا بھی جائزہ لینا ہے کہ نوآبادیاتی نظام سے قبل یا یوں کہہ لیجئے کہ مغربی دنیا کے ساتھ روابط سے ایشیا خصوصاً برصغیر ہندوستان کے ممالک کے معاشی اور سماجی حالات کیسے تھے اس بارے میں دو مختلف آراء موجود ہے۔ ایک رائے تو یہ ہے کہ نوآبادیاتی نظام نے آکر ان ملکوں کے خوشحال اور ترقی پذیر معاشرے کو تباہ کر دیا اور یہ کہ اس وقت ہندوستان کے کئی ایک علاقوں میں بورژوا طریقہ پیداوار کی طرف پیش رفت ہو چکی تھی۔ اس رائے کے پس منظر میں سوویٹ اور مقامی محبّ الوطن محققوں کا زیادہ ہاتھ ہے۔ انہوں نے نوآبادیاتی نظام کے منفی پہلو کی نشان دہی کرتے ہوئے یہ بھی باور کرایا کہ مغربی قوتوں نے یہاں آکر معاشی ارتقا کا بھی اسقاط کر دیا اور پہلے سے موجود ڈھانچے کا تیا پانچہ کر دیا۔ میں اس رائے سے اس قدر تو ضرور اتفاق کرتا ہوں کہ نوآبادیاتی نظام نے یہاں معاشی جبر اور سماجی استبداد کا ایک نیا دور شروع کیا۔ لیکن یہ بات کہ سماج بورژوا طریقہ پیداوار اور صنعتی دور میں داخل ہو رہا تھا قابل فہم نہیں ہے اور نہ ہی اس کے کوئی خاص تاریخی شواہد دستیاب ہیں۔

دوسری رائے یہ ہے کہ ہندوستان اور دوسرے ایشیائی ممالک سماجی اور اقتصادی سطح پر بہت پسماندہ تھے چند تعصبات کو چھوڑ کر اپنی جگہ بہت مستحکم ہے اور اس رائے کے حق میں بہت سی تاریخی

شہادتیں موجود ہیں۔

آیئے پہلی رائے کا کچھ تجزیہ کرتے ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ سولھویں، سترہویں اور اٹھارہویں صدی تک یورپ کے بہت سے ممالک برطانیہ کو چھوڑ کر، کے معاشی حالات بڑی ایشیائی سلطنتوں سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھے۔ چلیئے اس میں ہم برطانیہ کے علاوہ فرانس اور ہالینڈ کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ ایک آدھ مثال اور بھی مل جائے گی۔ اسی عہد میں چین اور ہندوستان میں خصوصاً تاجروں، دستکاروں اور پارچہ بافوں کا ایک بڑا طبقہ موجود اور وہاں کی پیداوار کی شرح دنیا کی کل پیداوار کے حساب سے حوصلہ افزا تھی۔ لیکن بھاپ کے انجن اور جدید کھڈیوں نے یورپ میں صنعتی ترقی کو جو مہمیز دی اس نے اس تناسب کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ 1750 میں برطانیہ کا حصہ دنیا کی کل پیداوار صرف 1.9% تھا۔ جبکہ ہندو پاکستان کی اس حوالہ سے شرح 24.5% تھی جبکہ چین کی 32.8% تھی تقریباً ایک سو دس سال بعد یعنی 1860 میں یہ اعداد و شمار کچھ یوں ہو گئے۔ برطانیہ 19.9% ہندو پاکستان 8.6% اور چین 19.7%۔ 1880 یعنی بیس سال بعد یہ فرق اور نمایاں ہو گیا یعنی برطانیہ 22.9% ہندو پاکستان 2.8% اور چین 12.5% پر آ گیا۔(Kennedy.1995.190)

جیسا کہ چیچروف کہتا ہے کہ سولھویں صدی سے اٹھارہویں صدی تک مقامی صنعت ہاتھ کی کھڈیوں سے دھاگا اور کپڑا بنانے، بناسپتی گھی، شکر بنانے، ٹوکریاں بنانے، چاول صاف کرنے اور اس طرح کی چھوٹی موٹی دستکاریوں پر مشتمل تھی۔ جو کہ گاؤں یا مقامی آبادی کی ضرورتوں کو پورا کرتی تھی۔(Chicherov.1976.20)

بڑی صنعتوں کا قیام ہندوستان میں انیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ہوا۔ سوتی کپڑے کا پہلا کارخانہ کلکتہ میں 1818 میں قائم ہوا۔ جبکہ بمبئی میں سوتی کپڑے کی پہلی مل پارسیوں نے 1854 میں قائم کی۔ 1877 کے بعد کپڑے کے کارخانے ناگپور، احمد آباد اور شولا پور میں بھی قائم ہونا شروع ہو گئے۔ پہلی جنگ عظیم میں کپڑے کے کارخانوں کی پیداوار میں بہت اضافہ ہوا۔ کیونکہ فوجیوں کے لئے کپڑے کی ضرورتوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔

بیسویں صدی کے آغاز یعنی 1900 میں ہندوستان میں کپڑے کی چھوٹی بڑی ملوں کی تعداد 193 تھی۔ جن میں 40,124 کھڈیاں (Looms) اور 49,45,783 تکلے کام کر رہے تھے ان

ملوں میں کام کرنے والوں کی تعداد 1,61,189 تھی جبکہ 1943 میں 200,890 کھڈیاں اور 10,130,568 تکلوں پر مشتمل 401 ملیں کام کر رہی تھیں۔ (Jathar, Beri.1949.20)

اس طرح پٹ سن کا پہلا کارخانہ بنگال میں سیرام پور کے نزدیک رشرا میں 1855 میں قائم ہوا لیکن پھر بعد ازاں ان میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا اور 1891 میں بنگال میں پٹ سن کے حوالے سے 8000 کھڈیاں کام کر رہی تھیں۔ جبکہ 38-1937 میں ان کی تعداد 66,705 ہوگئی۔ (Ibid.)

لوہے اور فولاد کی صنعت کی طرف کپڑے کی صنعت کے بعد دھیان دیا گیا۔ پہلے پہل 1830 میں ارکوٹ میں کارخانہ چلانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن یہ کامیابی سے ہمکنار نہ ہوئی۔ کامیابی کے ساتھ چلنے والا پہلا کارخانہ جھریا میں کوئلے کی کانوں کے قریب ''براکر آئرن ورکس کے نام سے بنگال سٹیل اینڈ آئرن کمپنی نے 1874 میں قائم کیا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں اس کی پیداوار 35000 ٹن سالانہ تھی اس سلسلے کا دوسرا بڑا قدم ٹاٹا کمپنی کے قیام کے بعد اٹھایا گیا۔ جے۔ این۔ ٹاٹا نے اس کی تعمیر کا کام 1908 میں شروع کیا۔ پگ آئرن کی پیداوار 1911 اور فولاد کی پیداوار ہندوستان 1913 میں اسی کارخانے سے شروع ہوئی 1916 میں پہلی جنگ عظیم کی وجہ سے پیداوار عروج پر پہنچ گئی۔ (Ibid)

یہاں ہم نے اُن چند بڑی بڑی صنعتوں کا ذکر کیا ہے جو انگریز کے آنے کے بعد ہندوستان میں قائم ہوئیں۔ اس سے پہلے ان کا ذکر کہیں نہ تھا۔

ان صنعتوں کے قیام کے ساتھ ساتھ جہاں ہندوستان میں بہت اہم تبدیلیاں آئیں وہاں کارخانوں کی تعداد بڑھنے کے ساتھ ٹریڈ یونین کی کارروائیوں میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ 1938 میں ٹریڈ یونینوں کی تعداد 188 تھی جبکہ ان کے رجسٹرڈ اراکین 3 لاکھ 64 ہزار کے قریب تھے۔ یہی وہ تبدیلی تھی جس کی بنا پر مارکس نے کہا تھا:

> ''یہ صحیح ہے کہ ہندوستان میں سماجی انقلاب لانے کے سلسلے میں انگلستان کے محرکات ذلیل ترین تھے اور اُس کا اِن ذلیل مفادات کو ہندوستان پر ٹھونسنے کا طریقہ بھی بہت احمقانہ تھا۔ لیکن سوال دراصل یہ نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ آیا ایشیا کی سماجی حالت میں ایک بنیادی انقلاب لائے بغیر

انسانیت اپنی تقدیر کی تکمیل کر سکتی ہے اگر نہیں کر سکتی تو انگلستان کے جرائم خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہوں اس نے بہر حال اس انقلاب کو لانے میں تاریخ کے غیر شعوری آلہ ءکار (Unconcious Tool of History) کا کام انجام دیا ہے۔" (Marx.1966.493)

برصغیر ہندو پاکستان کے بہت سے مارکسیوں کے برعکس مارکس کو نوآبادیاتی نظام سے پہلے ہندوستان کے جابر و ساکت سماج میں کوئی رمق دکھائی نہیں دیتی اور نہ ہی اُس سماج سے کوئی ہمدردی ہے مارکس کہتا ہے:

"لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ یہ پرسکون و معصوم (ہندوستانی) دیہی برادریاں بھلے بے ضرر ہی کیوں نہ معلوم ہوں۔ لیکن وہ ہمیشہ سے مشرقی استبدادیت کی ٹھوس بنیاد رہی ہیں اور انہوں نے ہمیشہ انسانی ذہن کو حتی الامکان تنگ ترین دائروں میں قید رکھا اور اس طرح اُسے توہم پرستی کا بے بس آلہ ءکار اور روایتی قاعدے اور قانون کا غلام بنایا اس طرح اسے تمام عظمت و شان اور تاریخی توانائیوں سے محروم رکھا ہے۔ ہمیں اس وحشی خود پسندی کو نہیں بھولنا چاہئے۔ (Barbarian Egotism) جو کسی حقیر سے پارہ زمین پر اپنی توجہ مرکوز کر کے سلطنتوں کی بربادی، ناقابل بیان ظلم و ستم اور بڑے بڑے شہروں کی پوری آبادی کے قتل عام کا نظارہ نہایت اطمینان قلب کے ساتھ دیکھتی تھی۔ ان چیزوں کو فطری مظاہر اور واقعات سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھی۔۔۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اس وقار سے عاری جامد و ساکن اور بے مصرف زندگی نے، اس انفعالی قسم کے وجود نے دوسری طرف ہندوستان میں وحشیانہ، بے مقصد اور بے لگام تخریبی قوتوں کو بھی جنم دیا اور خود قتل و خون کو ہندوستان میں ایک مذہبی رسم بنا دیا۔"

مارکس نے ہندوستان کی مذہبی رسوم کا اچھی طرح مطالعہ کیا تھا۔ چونکہ زیادہ تر آبادی ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ اس لئے وہ مثالیں بھی زیادہ ہندو مذہبی رسوم کی دیتا ہے۔ جنوب میں ایسی

رسوم کا رواج تھا جہاں انسان کی قربانی کو جانور کی قربانی پر ترجیح دی جاتی تھی۔ نچلی ذاتوں میں اس کے انتہائی بھیانک منظر دیکھنے میں آتے تھے۔ جو اونچی ذاتوں اور برہمنوں نے ان کے لئے روا رکھے ہوئے تھے۔ نیل گری میں بسنے والے تودا اور وسطی ہندوستان کے بنجاروں کے ہاں ایک عجیب وغریب رسم پائی جاتی تھی۔ وہ بچوں کو زمین میں آدھا دبا کر اوپر سے مویشی دوڑاتے تھے۔ اس طرح ایک اور علاقے میں وہ بچے کو گھر گھر لے کر پھرتے تھے اور ہر دروازے پر اس کی ایک انگلی کاٹ دی جاتی حتیٰ کہ خون کی کمی کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو جاتی اور اس کا خون بانس کی نالی میں جمع کر لیا جاتا۔ تنجور میں ہر جمعہ کی شام مندر میں ایک بچے کی قربانی دی جاتی تھی۔ 1830 میں بستار کے راجہ نے ایک وقت میں 125 آدمیوں کی قربانی دی۔ پونا میں ہر سال جب ستارہ کا راجہ پرتاب گڑھ کا دورہ کرتا ایک بوڑھی عورت قربان کر دی جاتی۔ بانجھ عورتیں اپنا پہلا بچہ کسی دیوی کی نظر کر دیا کرتی تھیں۔ (Marx)

سماجی تذلیل

انگریز جب ہندوستان میں آئے تو وہ خود کو مقامی لوگوں سے ہر طرح سے اعلیٰ سمجھتے تھے۔ وہ ان میں گھلتے ملتے بھی نہ تھے۔ ایک طرف تو مغل اشرافیہ کی طرف اُن کا رویہ معاندانہ تھا تو دوسری طرف عوام کی تذلیل بھی ہر جگہ ہوتی۔ یہ تذلیل اُن کی حکومت کی مضبوطی کے ساتھ ساتھ شدید قسم کے ظالمانہ رویئے میں بدل گئی۔

1780 میں سیر المتاخرین نے لکھا کہ انگریز شاذ و نادر ہی یہاں آ کر ہم میں سے کسی کے ساتھ ملتے ہیں۔ (Saleem.1989.29)

سیر المتاخرین کے فرانسیسی مترجم نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں ہر انگریز میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ وہ ہندوستان کی ساری قوم کو انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ گویا یہ ایک بے جان شے ہے۔ جسے بلا تامل اور حسب مرضی کام میں لایا جا سکتا ہے۔ (ایضاً)

اسی ڈلہوزی کے عہد حکومت کے ساتھ بے اصول الحاق اور اونچے سے اونچے معزول شدہ والیانِ ریاست کے وظیفوں میں تخفیف کی نئی جابرانہ پالیسی کا آغاز ہوا۔ جس کی وجہ سے ہندوستان میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔

اس طرح اودھ میں جو کچھ ہوا۔ وہ بھی انگریزوں کے خلاف نفرت کا باعث بنا۔ مارکس نے ایک حوالہ دیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ صوبہ اودھ میں زمین کی ملکیت کا حق برطانوی حکومت کے لئے ضبط کرلیا گیا ہے جو اس حق کا انتظام اپنے لحاظ سے مناسب طریقے پر کرے گی۔

اس قسم کے بہت سے تعلقات دوسری ریاستوں اور صوبوں سے بھی ہوئے۔

ہندوستانیوں کے ساتھ جو سلوک کمپنی کی افواج اور اہل کاروں نے کیا اُس کے بارے میں ایک تحقیقاتی کمیشن قائم کیا گیا تھا۔ مارکس کی جو کتاب نوآبادیاتی نظام کے بارے میں مرتب کی گئی اُس میں اس کمیشن کی رپورٹ کا ذکر ''ہندوستان میں اذیت رسانی کی نقش کے حوالے سے آیا ہے اُس سے چند اقتباسات قارئین کے مطالعہ کے لئے پیش کئے جا رہے ہیں۔ جس سے اندازہ ہوگا کہ ہندوستان کے عوام کے ساتھ کمپنی کے اہلکاروں کا کیا رویہ تھا۔''

لارڈ ڈلہوزی نے 1855 میں کمپنی کے ڈائریکٹروں کو یہ لکھا تھا ''ان کو بہت دنوں سے اس بارے میں شک نہیں ہے کہ ہر برطانوی صوبے میں کسی نہ کسی شکل میں چھوٹے افسروں کے ہاتھوں اذیت رسانی ہوتی ہے۔''

کمیشن کے اراکین کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے ایک دیسی عیسائی نے کہا۔

''جب کوئی یورپی یا دیسی رجمنٹ ادھر سے گزرتی ہے، تو ساری رعایا کو کھانے پینے کا سامان مفت دینے پر مجبور کیا جاتا ہے اور اگر کوئی چیزوں کی قیمت مانگتا ہے تو سخت اذیت پہنچائی جاتی ہے۔''

ڈلہوزی اس سلسلے میں آگے چل کر پھر لکھتا ہے۔

''ہمارے پاس ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔ ایسا ثبوت جس سے دراصل مسٹر بریٹون بھی انکار نہیں کرتے کہ افسر موصوف بے قاعدگی اور غیر قانونی باتوں کی بھاری فہرست میں ہر بات کے قصوروار ہیں۔ جن کے لئے چیف کمشنر نے اُن کو ملزم ٹھہرایا ہے اور جنہوں نے برطانوی انتظامیہ کے ایک حصے کو بدنام کیا ہے اور برطانوی رعایا کی بڑی تعداد کو سخت ناانصافی، من مانی قید اور ظالمانہ اذیتوں کا نشانہ بنایا ہے۔'' (Marx,1973.79-81)

آخر میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ گو ہندوستان کے سپاہیوں کی بغاوت کے پس منظر وہ تمام عوامل موجود تھے۔ جو کسی ایک قوم کو قابض قوم کے خلاف صف آرا ہونے پر مجبور کردیں۔ اس

بغاوت میں ہر طبقات کے لوگ موجود کسان، سپاہی، نوابین، امراء اور کچھ حد تک مغل حکمران بھی، پھر بھی اُن کے لئے فتح مندی راہ نہیں دیکھ رہی تھی۔ اُس کی چند بڑی اہم وجوہات تھیں۔ مارکس اپنے 22 جولائی 1853 کے مراسلے میں لکھتا ہے۔

''ہندوستان میں برطانوی اقتدار آخر کیسے قائم ہو گیا۔ مغل اعظم کے اقتدار کو مغل صوبے داروں نے پاش پاش کیا۔ صوبے داروں کی قوت کو مرہٹوں نے توڑا، مرہٹوں کی قوت کو افغانیوں نے ختم کیا اور اُس وقت جبکہ سب ایک دوسرے کے خلاف جنگ آزما تھے۔ برطانیہ جھپٹ کر پہنچ گیا اور ان سب کو زیر کر لیا۔ سو بات یہ ہے کہ ہندوستان کی تقدیر میں مفتوح ہونا لکھا تھا اور اس کی گذشتہ تمام تر تاریخ اُس کو یکے بعد دیگرے مفتوح اور زیر ہوتے رہنے کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔''

کتابیات

1- Marx. K., *The First Indian War of Indepdence1857-1859,* Progress Publishers Moscow 1968.

2- Marx, K., Frederick Engels., *Selected Works Vol. I,* Progress Publishers Moscow 1973.

3- Sapre, B.G., *The Growth of Indian Constitution Administration,* Sapre Sanghi 1929.

4- Chicherov, A. I., Economic Development in the 16th-18th Centuries, PPH, 1976 Lahore.

5- Hasan, Sibte., The Battle of Ideas in Pakistan, PPH 1986 Karachi.

6- Dutt, R. P., *India Today,* Book Traders 1979, Lahore.

7- Dalrymple, W., *The Last Mughal Bloomsbury* 2006, London.

8- Jathar, G. B. S. G. Beri., *Indian Economies Vol 2,* Oxford University Press Madras 1949.

9- Majumdar, R. C., *History of the Freedom Movement in India,* Book Traders Lahore.

10- Chand, T., *History of the Freedom Movement in India,* Book Traders, Lahore.

11- Sinha, J. C., *Economic Annals of Bengal,* Macmillan

London 1927.

12- Wilson, C. R., *Early Annals of the Egnlish in Bengal 2 Vols,* London 1895-1900.

13- Agarwal, R. C., *Constitution and Development of India and National Movement,* S. Chand & CO Ud. N. Delhi 1986.

14- Firminger, W. K., *Affaris of the East fight Report from the Select Committee 1812,* Mearaj Publishing House Delhi 1985.

15- Ali, K., *New History of Indo Pakistan,* Aziz Publishers Lahore 1984.

16- Kumar, Dharma., *The Cambridge Economic History of India Vol II,* Orient Longman.

17- Smith, V. A., *The Oxford History of India,* Oxford University Press N. Delhi 2004.

18- Chandra, Bipau., *India's Struggle for Indepdence,* Penguni Books N. Delhi 1988.

19- Economic and Political Weekly Vol XLII No 19 May 12-13-2007 Mumbei.

20- غالب ''دستنبو'' مترجم خواجہ احمد فاروق ترقی اردو بیورو دہلی 2000

21- ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ''غالب اور انقلاب 1857'' غالب انسٹیٹیوٹ نئی دہلی 1985

22- ''آج کل'' شمارہ مئی 2007 نئی دہلی

23- باری علیگ۔ ''کمپنی کی حکومت'' دارالشعور 1999 لاہور

24- احمد سلیم۔ ''1857 اور آج'' نگارشات 1989 لاہور

25- کارل مارکس فریڈرک اینگلس۔ ''نوآبادیاتی نظام'' دارالاشاعت ترقی ماسکو

❁❁❁❁❁

جنگ آزادی (59-1857)

کسانوں کی انقلابی جدوجہد

پروفیسر طفیل ڈھانہ

1857 کی جنگ جس کو اکثر انگریز تاریخ دان غدر یا شورش کہتے ہیں اور برصغیر کے مورخین جنگ آزادی قرار دیتے ہیں۔ واقعاتی طور پر 10 مئی 1857 کو میرٹھ میں فوجی بغاوت سے شروع ہوئی۔ 9 مئی 1857 کو میرٹھ چھاؤنی میں انگریز فوجی افسر کرنل سمتھ نے 85 ہندوستانی سپاہیوں کا کورٹ مارشل کیا اور ہر ایک کے لئے 10 سال قید بامشقت کی سزا سنائی۔ ان سپاہیوں کا جرم یہ تھا کہ انہوں نے کارتوس وصول کرنے اور چلانے کی مشق کرنے سے انکار کیا تھا۔ جن کے بارے میں رائے پائی جاتی تھی کہ ان کی تیاری میں گائے اور سؤر کی چربی استعمال ہوئی تھی۔ کرنل سمتھ نے سپاہیوں کی سرعام تضحیک کی۔ ان کی وردیاں اتار کر بیڑیاں لگا دی گئیں۔ میرٹھ میں ہندوستانی فوجیوں کا ردِعمل یوں ظاہر ہوا کہ انہوں نے حملہ کر کے قیدیوں کو آزاد کرا لیا اور مزاحمت کرنے والوں کو ہلاک کر دیا۔ آزادی پسند فوجیوں نے میرٹھ سے دلّی، لکھنو اور وسطی ہندوستان میں پہنچ کر جنگ آزادی منظّم کرنے کی حکمت عملی اختیار کی۔ آزادی پسند فوجیوں کا ایک دستہ 11 مئی کی رات دلّی پہنچا اور بہادر شاہ ظفر سے رابطہ کیا۔ ''سقوطِ بغداد سے سقوط ڈھاکہ تک'' کا مصنف میاں محمد افضل لکھتا ہے ''میرٹھ کی سپاہ صبح سویرے دہلی پہنچی۔ لال قلعہ میں بادشاہی جھروکہ کے سامنے پہنچ کر فوجیوں نے شور مچایا کہ ہم نے میرٹھ میں انگریزوں کو قتل کر دیا ہے۔ دین کی خاطر جنگ کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ ہماری امداد فرمائیے۔ حضور ہی ہمارے دین اور دنیا کے نگہبان ہیں۔

بہادر شاہ ظفر کو اس ہنگامے پر تعجب ہوا۔ اس نے شاہی دستہ کے افسر کیپٹن ڈگلس کو بلایا۔ کیپٹن ڈگلس نے برآمدے میں آ کر سپاہیوں سے کہا ''یہ بادشاہ کی خوابگاہ ہے۔ تم یہاں شور وغل نہ کرو اور یہاں سے چلے جاؤ۔''

معروضی تاریخی حقائق پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر ہندوستان کا نہیں بلکہ لال قلعہ کا بادشاہ تھا۔

بادشاہ کی حکمرانی لال قلعہ تک محدود تھی اور اخراجات کے لئے کمپنی کی حکومت وظیفہ دیتی تھی۔ کمپنی کی حکومت میں مغل حکمرانوں کے دو ہی بڑے مطالبات رہ گئے تھے۔ بادشاہ کا پہلا مطالبہ ہوتا تھا کہ کمپنی وظیفے کی رقم میں اضافہ کرے اور دوسرا یہ کہ ولی عہد کی منظوری میں کمپنی بادشاہ کی خواہشات کا احترام کرے۔ جس وقت آزادی پسند سپاہی بہادر شاہ ظفر سے جنگ آزادی کی قیادت کی توقع کر رہے تھے۔ بادشاہ سب سے چھوٹی بیگم زینت محل سے پیدا ہونے والے بیٹے جواں بخت کی بطور ولی عہد منظوری حاصل کرنے کی کوشش میں پریشان تھا۔ کیونکہ بڑے شہزادے مخالفت میں کمپنی کو درخواستیں بھیج رہے تھے۔

11- مئی کو آزادی پسند سپاہی دہلی میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے شہر پر قبضہ کر کے گوروں کی سول آبادی کو قتل کر دیا۔ جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ دہلی جنگ آزادی کا مرکز بن گیا۔ جس کی قیادت بہادر شاہ ظفر کو سونپ دی گئی۔ پورا ہندوستان جنگ کی لپیٹ میں آ گیا لیکن عملی طور پر جنگ ہندوستان کے تین حصوں میں لڑی گئی۔ جن میں دہلی، اودھ اور وسطی ہندوستان شامل تھے۔ کسان جنگ میں شریک ہوئے۔ دیگر علاقوں میں جاگیردار اور تاجر طبقے خاموش رہے اور کسانوں کی جدوجہد آزادی میں شریک نہ ہوئے۔ جنگ تقریباً دو برس تک جاری رہی مگر منطقی نتیجہ 20 ستمبر کو سامنے آ گیا۔ جب انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا۔ شاہی خاندان ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار ہو گیا اور مزاحمتی سپاہ دہلی سے فرار ہو گئی۔ جنگ آزادی میں حصہ لینے والی نمایاں شخصیات میں نانا صاحب، جھانسی کی رانی، حضرت محل، تانتیا ٹوپے، بخت خاں اور مولوی احمد اللہ شامل تھے۔

اسباب بغاوت (جیسا کہ اکثر مفکرین لکھتے ہیں) بیان کرنے والوں نے 10 سے 15 وجوہات کی نشاندہی کی ہے۔ ان تمام وجوہات کا بنیادی ماخذ معاشی وسماجی استحصال تھا۔

1- کسانوں کا استحصال

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت میں ہندوستان کے کسان طبقے کی معاشی بدحالی میں اضافہ ہوا۔ کیونکہ 18 ویں صدی تک کا ہندوستان سماجی اور پیداواری حوالہ سے عہد وسطیٰ کی نمائندگی کرتا تھا۔ جس میں منڈی کی قوتیں کمزور تھیں۔ تاجروں کو ہوس زر میں مبتلا طبقہ سمجھا جاتا تھا اور کاشتکاری عمومی طور سے ضروریات کی پیداوار کے لئے ہوتی تھی۔ ہندوستان کے دیہات عمومی طور سے خود کفیل کمیون کی حیثیت رکھتے تھے۔ کچہری اور منڈی سے کسانوں کا تعلق نہ ہونے کے برابر تھا۔ لباس میں مردوں کے لئے ایک دھوتی ہی کافی سمجھی جاتی تھی۔ مکان گارے اور کچی اینٹوں سے بنائے جاتے تھے۔ یہ ایک مثالی گاؤں تھا جہاں کسان خوردنی اجناس کاشت کرتے اور پالتو جانوروں کی پرورش کرتے تھے۔ ''پیپلز ہسٹری آف انڈیا'' کے مصنف حبیب الرحمان نے 10 ہزار برس قبل تشکیل پانے والی مہر گڑھ تہذیب کے ابتدائی مرحلے کا جو سماجی سٹرکچر بیان کیا ہے۔ تقریباً اسی نوعیت کا تھا۔ اگرچہ 18 ویں صدی کا ہندوستان عہد وسطیٰ کے مرحلے سے آگے نہ بڑھ سکا تھا مگر کئی علاقوں میں دیہی سماج اس سے بھی پیچھے رہ گیا تھا رہائش، لباس اور مرنے والوں کو دفن کرنے کا طریقہ ہڑپہ کی تہذیبی روایات سے کچھ ہی مختلف ہوا تھا۔

مغلیہ سلطنت میں کسان اور زمین بادشاہ کی ملکیت تھے۔ زمین کے ساتھ کسان جاگیرداروں کے سپرد ہو جاتے تھے۔ فصل کی پیداوار کا ایک حصہ لگان کے طور پر وصول کر لیا جاتا تھا۔ کمپنی حکومت نے زرعی نظام تبدیل کر دیا۔ جاگیرداروں اور کسانوں کو مالکانہ حقوق دیئے اور زر نقد کی صورت میں لگان وصول کرنے کا طریقہ اختیار کیا۔ اب فصل کم ہو یا زیادہ لگان تو دینا ہی پڑتا تھا۔ اس نظام نے کسان کو منڈی کے ساتھ منسلک کر دیا۔ پیداوار میں اضافہ ہوا مگر کسان خوشحال نہیں ہوا۔ اس کی وجہ تجارتی استحصال تھا۔ کم پیداوار کی صورت میں لگان ادا کرنے کے لئے کسان کو مویشی فروخت کرنے پڑتے یا مہاجنوں سے سود پر قرض حاصل کرنا ہوتا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ انگریزوں کی پیداواری اور معاشی پالیسی کے تحت ہندوستان میں مرکنٹائلزم کا فروغ ہوا۔ جس میں پیداوار تو بڑھتی ہے مگر سرمایہ صرف تاجروں کے پاس جمع ہوتا ہے۔ ہندوستان میں یہ تبدیلی خارجی دباؤ کے تحت عمل میں آئی تھی۔ لہٰذا کسانوں کی بدحالی اور بے کیفی میں تیزی سے

اضافہ ہوا۔ انگریزی نظامت میں کسانوں کو زرعی رقبہ فروخت کرنے کا حق بھی دیا گیا۔ جو بظاہر تو مثبت اقدام تھا مگر عملی صورت یہ ہوئی کہ سابقہ کمیون ٹوٹ گئی اور کسانوں میں عدالتی جھگڑوں کا آغاز ہو گیا۔ اس نظام سے ساہوکار اور تاجر مستفید ہوئے۔ کسان اپنی اراضی ساہوکاروں کو بیچنے لگے اور اکثریت زمین فروخت کر کے آبائی پیشے سے محروم ہو گئی۔

2- مرکزی فوج کی تشکیل

1857 کی جنگ آزادی کا ایک اہم سبب ہندوستان میں فوج کا مرکزی ادارہ تھا۔ جو کمپنی کی حکومت نے قائم کیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مغلیہ خاندان کے زوال تک ہندوستان میں موثر قومی ادارے موجود نہ تھے۔ کمپنی کی حکومت نے جو مرکزی ادارے قائم کئے ان میں ایک فوج تھی۔ 1857 کی فوج میں ہندوستانیوں کی تعداد 2 لاکھ تک تھی۔ یوں تاریخ میں پہلی بار کمپنی نے ہندوستان کے پسماندہ طبقے کی ایک موثر تنظیم قائم کر دی۔ جس میں قوم پرستی کے جذبات نمو پذیر ہوئے۔ جدید اسلحہ اور عسکری تربیت کے باعث دیسی فوج میں طاقت کا احساس پیدا ہوا۔ انگریزوں کی جانب سے روا رکھے جانے والے نسلی اور طبقاتی امتیاز نے ہندوستانی سپاہ میں طبقاتی اور قومی شعور بھی پیدا کیا۔ انگریز افسروں کی تنخواہیں، مراعات، اختیارات اور سماجی رویئے ہندوستانی سپاہ کو غلامی کا احساس دلا رہے تھے۔ اس کے علاوہ فوجی سمجھ رہے تھے کہ کسانوں کی معاشی بدحالی اور سماجی ابتری کی وجہ بھی انگریزوں کی استحصالی پالیسیاں تھیں۔ فوجیوں کا نامیاتی رشتہ کسان طبقے سے تھا۔ لہٰذا وہ اس درد کو محسوس کرتے تھے جو کسانوں کے دل میں اٹھتا تھا۔ یوں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ معاشی و سماجی استحصال کے باعث قوم پرستی کی فکر تھی جو 1857 میں جنگ آزادی کی بنیاد بنی۔ چربی والے کارتوس تو درحقیقت بارود پر چنگاری کے مترادف تھے۔ عصر حاضر کا معروف مورخ ڈاکٹر مبارک علی اپنی حالیہ تصنیف ''برطانوی ہندوستان'' میں لکھتا ہے ''وارن ہیسٹنگز (ہندوستان کا پہلا گورنر جنرل) کے زمانے میں اہم کام ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کا قیام تھا۔ ایشیاٹک سوسائٹی نے جو علمی و ادبی کام کئے اس کی وجہ سے اہل ہندوستان میں اپنی شناخت کا جذبہ ابھرا اور قوم پرستی کے جذبات پیدا ہوئے۔ جن کی مدد سے انہوں نے برطانوی اقتدار کے خلاف مزاحمت کی۔''

اسی تصنیف میں دوسری جگہ ڈاکٹر مبارک علی لکھتا ہے ''لیکن سب سے استحصال زدہ طبقہ

کسانوں کا تھا۔ ہندوستان کی اکثریت دیہاتوں میں رہتی تھی۔ ریونیو کے نئے نظام نے انہیں غربت وافلاس میں دھکیل دیا۔ اس لئے 1864 سے 1893 تک کسانوں کی بغاوتیں ہوئیں۔ جنہیں بے رحمی سے کچل دیا گیا۔''

3- کمپنی کی الحاق پالیسی

برطانوی ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک نکتہ یہ سامنے آتا ہے کہ کمپنی کی حکومت سابقہ ریاستی اور جاگیرداری نظام ختم کرنا چاہتی تھی۔ برطانوی پارلیمنٹ میں دوطرح کے خیالات پائے جاتے تھے۔ ایک رائے یہ تھی کہ ہندوستان کی قدیم تہذیب وثقافت کو برقرار رکھتے ہوئے یہاں حکومت کی جائے۔ دوسرا موقف یہ تھا کہ ہندوستان ایک پس ماندہ ملک ہے۔ اس لئے اسے جدید تہذیب سے روشناس کرایا جائے۔ اس سوال پر زیر بحث اصل حقیقت یہ تھی کہ ہندوستان میں سابقہ ریاستی اور جاگیرداری نظام بحال رکھا جائے یا کہ ختم کر دیا جائے۔ برطانوی تاجروں اور صنعتکاروں کے درمیان اس تضاد کی بنیاد معاشی اور سیاسی مفادات تھے۔

لارڈ ڈلہوزی نے (گورنر جنرل 1848 تا 1856) ریاستوں اور جاگیروں کے بارے میں الحاق کی پالیسی اختیار کی۔ اس کا موقف تھا کہ ٹیکس، ریونیو اور تجارت بڑھانے کے لئے روایتی جاگیری نظام کا خاتمہ ضروری تھا۔ لہٰذا اس نے اپنے دور میں ریاستوں کی سابقہ حیثیت ختم کرنے کی پالیسی اختیار کی۔ ڈلہوزی کی الحاق پالیسی سے ہندوستان کے نوابوں اور جاگیرداروں کے مفادات مجروح ہوئے۔ یوں نوابوں اور جاگیرداروں کی ناراضی کو جنگ آزادی کے اسباب میں اہم شمار کیا جاتا ہے۔ ''سقوط بغداد سے سقوط ڈھاکہ تک'' کا مصنف میاں محمد افضل اسباب بغاوت کے بیان میں لکھتا ہے۔ ''زمینداروں اور جاگیرداروں کی زمینیں اور جاگیریں جبراً لے لی گئیں جو انہیں مغلیہ دور سے ملی ہوئی تھیں۔ جو شخص بھی اپنی جاگیر کی سند پیش نہ کر سکا وہ جاگیر سے محروم ہوا۔ بھلا یہ کس کو خیال تھا کہ جاگیر کے کاغذات ایسے موقع کے لئے سنبھال رکھتا۔ اس طرح ہزاروں خاندانوں کو راتوں رات افلاس اور بے روزگاری کی دلدل میں دھکیل دیا گیا۔''

سر جان ولیم کی پیش گوئی 1857 کے غدر کی صورت میں نمودار ہوئی۔ جس میں الحاق کی پالیسی کو خطرناک قرار دیا گیا تھا۔ لہٰذا 1858 کے بعد اسے ہمیشہ کے لئے ترک کر دیا گیا۔ ''ہمیں مقامی

شہزادوں کے حقوق، عزت اور وقار کا پاس کرنا چاہئے۔" یہ ملکہ وکٹوریہ کا اعلان تھا جو 1858 میں ہوا۔ مقامی ریاستوں کو زندہ رہنے کا حق مل گیا اور ان کی زندگی کو برطانوی سلطنت کی حفاظتی دیوار تسلیم کیا گیا۔ سر ولیم نے لارڈ ڈلہوزی سے کہا تھا کہ ہندوستان کی مقامی ریاستیں ایک بہت بڑا بند ہیں جو طوفان کو روکے ہوئے ہیں۔ ریاستوں کی عدم موجودگی میں انگریزی حکومت مقامی فوج کے رحم وکرم پر ہوگی۔ مگر ڈلہوزی اس نکتہ نظر سے اتفاق نہ کرسکتا تھا۔ ڈلہوزی ہندوستان میں ریاستی اور جاگیرداری نظام کو ناپسند کر رہا تھا۔ جبکہ ملکہ وکٹوریہ ریاستی اور جاگیرداری نظام کو تحفظ دینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ 1856 میں لارڈ ڈلہوزی کی جگہ لارڈ کیننگ کو ہندوستان کا گورنر جنرل بنایا گیا۔ 1858 میں ہندوستان کو براہ راست تاج برطانیہ کی عمل داری میں لے کر ریاستی و جاگیرداری نظام کو تحفظ فراہم کردیا گیا۔

انگریز مورخین وڈرف، سر جان کئی اور ایچ سی فین شا کا موقف ہے کہ انگریزوں کے خلاف بغاوت اس وجہ سے ہوئی کہ انگریزوں کے ترقی پسندانہ اقدامات سے قدامت پسند طبقات کے مفادات پر زد پڑ رہی تھی۔ نواب اپنی ریاستیں واپس چاہتے تھے اور جاگیردار اپنی چھینی ہوئی جاگیروں کی واپسی کے متمنی تھے۔ "ہندوستان میں انگریز ریاست" کا مصنف پینڈرل سون لکھتا ہے "بہت سے انگریز جو ہندوستان کو مغربی آنکھ سے دیکھتے تھے ان کی رائے تھی کہ ڈلہوزی اپنے ارادوں میں کامیاب ہوجاتا تو ہندوستان کو مکمل طور پر جمہوری ملک بنایا جاسکتا تھا۔"

یوں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ کسان مسئلہ، مرکزی فوجی تنظیم کا سیاسی کردار اور کمپنی کی الحاق پالیسی جنگ آزادی کے بنیادی اسباب تھے۔

قیادت کا بحران

جنگ آزادی کی شکست کے اسباب میں قیادت کے بحران کی بنیادی اہمیت تھی۔ قیادت کرنے والوں میں نانا صاحب، رانی لکشمی بائی، حضرت محل، تانتیا ٹوپے، بخت خاں اور مولوی احمد اللہ نمایاں نام ہیں۔ اعلیٰ سیاسی قیادت بہادر شاہ ظفر کے سپرد کی گئی۔ جو نہ تو جدوجہد آزادی کی قیادت کا اہل تھا اور نہ اس کے لئے تیار۔ لیکن 1857 میں یہ فیصلہ معقول اس طرح تھا کہ ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لئے مغل بادشاہ کا سیاسی سہارا ضروری تھا۔ یورپ نے 1618 سے 1648 تک پاپائے روم کے خلاف جنگیں لڑ کے قومی آزادی کی جدوجہد کو کامیابی سے ہمکنار کیا تھا۔

قومی آزادی کی ان تحریکوں کو حقیقی توانائی فراہم کرنے والے طبقے مزدوروں، تاجروں اور صنعتکاروں پر مشتمل تھے۔ کسان جن کے اتحادی تھے۔ مگر ہندوستان میں صورت حالات ایسی نہ تھی۔ کسانوں کی امیدیں فوج اور بادشاہ سے ہی وابستہ تھیں۔ لہٰذا آزادی پسند فوجیوں نے دلّی پر قبضہ کر کے بہادر شاہ ظفر کی تاج پوشی کی اور اسے ہندوستان کا شہنشاہ قرار دیا۔ اس فیصلے کا ردِعمل اچھا ہوا۔ ہندوستان مین کسانوں نے سمجھ لیا کہ انگریزوں کا تختہ الٹ دیا گیا ہے اور مغلوں کی حکومت قائم ہوگئی ہے۔ مگر معروضی حقائق تو بالکل مختلف تھے۔ آزادی پسندوں کو بھی اسی مشکل کا سامنا ہوا۔ گذشتہ صدی کے دوران ہندوستان کا سماج تبدیل ہو چکا تھا۔ ہندوستان کا روایتی مرکزی سیاسی ادارہ مر چکا تھا۔ لال قلعے کا بجٹ تو کمپنی فراہم کرتی تھی۔ بہادر شاہ ظفر نہ صرف بوڑھا ہو چکا تھا بلکہ ذہنی طور پر مایوس اور مفلوج بھی تھا۔ لال قلعہ میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والی میڈیسن افیون تھی۔ بہادر شاہ ظفر درست طور پر سمجھتا تھا کہ ہندوستان پر مغلوں کی حکمرانی کا سورج غروب ہو چکا تھا۔ اس کے ذہن میں کوئی سیاسی امنگ نہیں تھی وہ تو صرف شاعری کرتا تھا۔ غالب اس کا ادبی رفیق تھا۔ دونوں وظیفہ خوری کی پُرامن زندگی کے متمنی تھے۔ جنگ آزادی کی ہنگامہ خیزی نے انہیں بے کل کر دیا۔ غالب نے دلّی میں جنگ کے بارے میں جو روزنامچہ لکھا اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کا عظیم شاعر جنگ آزادی کو کس نظر سے دیکھ رہا تھا۔ احمد سلیم کی تالیف ''1857 اور آج'' میں غالب کی ڈائری کے جو اقتباسات دیئے گئے ہیں بیان کرتے ہیں۔

1- چونکہ تیز سیلاب کو خس و خاشاک سے روکنا محال ہے اس لئے انگریزوں کے مددگاروں میں سے ہر ایک لاچار ہو گیا اور حالات کے بگڑنے پر گھر کی چار دیواری میں سوگوار ہو کر بیٹھ رہا۔ مجھے بھی ان ماتم داروں میں شامل کر لو۔

2- انہوں نے نامور اور دانش مند ہستیوں کی عزت اور ان کی حویلیوں کو خاک میں ملا دیا۔ نیچ اور کنگال یکا یک ممتاز ہو گئے۔ ذرا خیال کرو یہ شہدے، لچے اب تیس مار خاں بنے ہوئے ہیں۔ یہ بدبختی کے دن ہیں جب جواں مرد اپنے سایہ سے ڈر جاتے ہیں اور ایک معمولی سپاہی خاص و عام پر حکم چلاتا ہے۔

3- جب انگریزوں نے عوامی فوج کے ہاتھوں سے شہر چھین لیا تو عام لوگ باغی سپاہیوں کے ساتھ شامل ہو گئے اور گلی گلی لڑنے لگے۔ شہر کے بعض شہدے کمینے شہر پر قابض بہادر انگریز

فوجیوں کے ساتھ مقابلہ کرنے لگے۔ دو تین دن تک کشمیری دروازے سے آگے شہر کا گوشہ گوشہ بچ بچ میدان جنگ بنا رہا اور باہر جانے کے تین راستے یعنی اجمیری دروازہ، ترکمانی دروازہ اور دہلی دروازہ باغی فوجیوں کے ہاتھ میں رہے۔
بالآخر دہلی پر انگریزوں کے قبضہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ اعلیٰ اور ادنیٰ طبقات کے بہت سے لوگ ان تین دروازوں کے ذریعے شہر سے بچ کر نکل گئے۔

4- بالآخر 17 اکتوبر 1857 کو دہلی رسمی طور پر انگریزوں کے قبضے میں آ گئی۔ لیکن دیہات میں مزاحمت کسی صورت کم نہ ہوئی۔ اب بھی بریلی، فرخ آباد اور لکھنو میں کثیر تعداد باغی منظم گروہوں کی صورت میں لڑنے اور زمین کا چپہ چپہ واپس لینے پر تلے ہوئے ہیں۔ دہلی کے قرب و جوار میں سوہنہ اور نوح (ضلع گوڑگاؤں) کے میواتیوں نے ایسا اودھم مچا رکھا ہے جیسے سودائی زنجیریں توڑ کر آزاد ہو گئے ہوں۔ تلا رام اب بھی ریواڑی میں مفرور ہے اور دیوی نام کے میو کی فوجوں میں شامل ہو گیا ہے اور اس کے حکم کے تحت کام کرتا ہے۔ ان پہاڑی اور جنگلی علاقوں میں یہ گروہ برطانوی حکمرانوں کے ساتھ لڑنے کا اپنا جداگانہ منصوبہ رکھتا ہے۔ الغرض یہ کہنا بجا ہوگا کہ ہندوستان کا ذرہ ذرہ ہیجان میں مبتلا ہے۔

بہادر شاہ ظفر اپنی جگہ آزادی پسند فوجیوں کے رویئوں سے نالاں تھا۔ اس کو شکوہ تھا کہ باغی فوجی غیر مہذب تھے۔ وہ گھوڑوں پر سوار لال قلعے میں آتے تھے اور بوٹوں سمیت بادشاہ کے دربار میں داخل ہو جاتے تھے۔ انہیں آداب شاہی کا ہرگز خیال نہ ہوتا تھا۔ جنگ اور دیگر معاملات میں فوجیوں کی تنظیم خود فیصلے کرتی تھی۔ بغاوت کے خلاف مقدمہ کی سماعت کرنے والے فوجی کمیشن کے سامنے بہادر شاہ ظفر نے بیان دیا کہ وہ بے اختیار تھا اور باغیوں کی دس رکنی تنظیم کے فیصلے قبول کرنے پر مجبور تھا۔ یوں واضح ہو جاتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر ایسی جنگ آزادی کو کامیاب ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جس کے انتظامی اختیارات فوجیوں اور کسانوں کی کمیٹیوں کے پاس تھے۔ بہادر شاہ ظفر اور لال قلعہ کے وابستگان کسانوں کی فتح سے خوفزدہ تھے۔ ان کو خوف لاحق تھا کہ کسانوں کی جدوجہد کامیاب ہوئی تو بہادر شاہ ظفر لال قلعے کا شاہ بھی نہیں رہے گا۔

کسانوں سے بہادر شاہ ظفر کی نفرت کسی اشتعال کا نتیجہ نہ تھی بلکہ وراثتی طبقاتی تشخص کی نمائندہ حقیقت تھی۔ ہندوستان کی تاریخ کو تاریخی مادیت کے ارتقائی اصول کی بنیاد پر سمجھا جائے تو

نمایاں حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ ہندوستان کے عرب، افغان، ایرانی اور ترک حاکموں نے، سماجی نشوونما کے ضمن میں، ہندوستان کو ناقابل تلافی نقصان دیا ہے۔ یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ ان میں مذہب کا نمائندہ کوئی بھی نہیں تھا۔ لہٰذا قبائلی، نسلی اور طبقاتی امتیازات اور تعصبات ان کی سماجی شخصیت کے نمایاں عناصر تھے۔ انہوں نے ہندوستان کی پیداواری اور سماجی کیفیت میں کوئی تبدیلی نہ آنے دی جس کے نتیجہ میں ہندوستان عہد وسطیٰ کے مرحلہ میں قید ہوکر رہ گیا۔ بہادر شاہ اسی کردار کا تسلسل تھا۔ اس نے ہندوستان کی آزادی پر لال قلعہ کی شہنشاہیت کو مقدم جانا جو کمپنی کے وظیفہ پر قائم تھی۔ حالانکہ اس کو اتنی بھیک تو کسانوں کی حکومت بھی دے سکتی تھی۔ جتنی وہ کمپنی کی سرکار سے وظیفہ کے نام پر بھی وصول کر رہا تھا۔

کسان آزادی پسندوں نے موضوعی (Subjective) تصور قائم کیا تھا کہ آزادی کی جدوجہد قومی آزادی کی جنگ میں تبدیل ہو جائے گی مگر ایسا نہ ہوا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ آزادی پسند کسانوں کا موضوعی تصور معروضی حقائق سے مطابقت نہ رکھتا تھا۔

گذشتہ ایک صدی کے دوران ہندوستانی سماج کی ہیئت جس طرح تبدیل ہوئی تھی اس میں بری طرح متاثر ہونے والے کسان اور کاریگر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دستکار کسانوں کے اتحادی تھے۔ جبکہ تاجر، جاگیردار اور والیان ریاست انگریزوں کے ساتھ تھے کیونکہ ان کے طبقاتی مفادات کا تحفظ اسی طرح ممکن ہوسکتا تھا۔ عمل کے میدان میں معروضی صداقتوں پر پڑے ہوئے پردے سرک گئے۔ جدوجہد آزادی میں کسان تنہا رہ گئے تھے لہٰذا ہندوستان کو آزاد ملک بنانے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ جنگ آزادی دو اصولوں کی عملی وضاحت کرتی ہے۔

1- موضوعی تصور اور معروضی حقائق میں عدم مطابقت کے باعث عملی نتائج غیر متوقع ہوتے ہیں۔

2- طبقاتی مفادات قومی مفادات پر غالب آتے ہیں۔

تلمیذ خلدون جنگ آزادی کے حوالے سے اپنے ایک مضمون ''بغاوت عظیم'' میں ہندوستان کے مختلف طبقوں کے کردار پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے ''بغاوت کو دو سال کی قلیل مدت میں کچل دیا گیا۔ صاحب جائیداد طبقوں کی غداری کے سبب اسے دبانا آسان ہوگیا۔ اپنے طبقاتی مفاد کی خاطر انہوں نے آزاد قوم کی حیثیت سے اپنے کو قربان کر دیا۔ والیان ریاست میں سے کسی نے بھی بغاوت میں شرکت نہ کی۔ کیونکہ لارڈ کیننگ نے صدق دل کے ساتھ انہیں متبنٰے بنانے کے

دائمی حقوق کی ضمانت دے دی تھی۔

تلمیذ رقم طراز ہے کہ برطانوی عہد اور اس سے پہلے کے جاگیردار، تاجر، ساہوکار، پڑھا لکھا متوسط طبقہ اور دیسی حکام سبھی نے انگریزوں کا ساتھ دیا یا بادل ناخواستہ غیر جانبدار رہے۔ ان کی نگاہ میں اس وقت انگریز ان کے نجات دہندہ تھے۔ جبکہ ہندوستانی کسان غیر ملکیوں اور جاگیرداروں کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے لئے جان کی بازی لگا کر لڑ رہے تھے۔

اس تناظر میں ہمیں آگاہی ملتی ہے کہ جنگ آزادی کی ناکامی میں قیادت کے بحران کے علاوہ تاجروں، جاگیرداروں، والیان ریاست اور کمپنی ملازمین کی تاج برطانیہ کے ساتھ وفاداری بنیادی اسباب تھے۔

کارل مارکس کے تجزیئے جنگ آزادی کا اہم حوالہ سمجھے جاتے ہیں۔ ان مضامین کا اردو ترجمہ جو"ہندوستان کا تاریخی خاکہ" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس میں جنگ آزادی کی ناکامی کے بارے مارکس کی رائے ہے"عوامی بغاوت جس کا مقصد غیر ملکی حکمرانی کا تختہ الٹنا تھا شمالی اور وسطی ہند کے وسیع علاقوں تک پھیل گئی۔ بغاوت کی خاص محرک قوت کسان اور شہروں کے غریب دستکار تھے۔ لیکن قیادت جاگیرداروں کے ہاتھ میں تھی۔ جن کی اکثریت نے اس وقت غداری کی جب 1858 میں نوآبادکاروں نے وعدہ کیا کہ ان کے مقبوضات انہیں کے ہاتھ میں رہیں گے۔"

انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی ملکہ الزبتھ کے دور میں قائم ہوئی۔ 1600 میں کارپوریشن ایشیائی ملکوں کے ساتھ تجارت کے کلی اختیارات حاصل کرنے کی منظوری حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی۔ انڈیا ہاؤس کے نام سے کارپوریشن کا مرکز دفتر لندن میں قائم ہوا۔ جس کے ڈائریکٹروں کی تعداد 24 تھی۔ انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی نے جس ہندوستان کو فتح کیا اور تاج برطانیہ کی قلمرو میں شامل کیا پیداواری، سماجی اور علمی لحاظ سے پسماندہ خطہ تھا۔ اس لئے برطانیہ کے جدید معاشی، سیاسی اور سائنسی کلچر نے ہندوستان پر غلبہ پالیا۔ جس کی آبادی اور رقبہ پورے یورپ کے برابر تھا۔ یورپی تہذیب ترقی یافتہ کلچر کی حامل تھی اس لئے انگریزی راج میں ہندوستان کا پیداواری اور سماجی جمود ٹوٹ گیا۔ انگریزی حکمرانوں کی معاشی، سیاسی، علمی اور ریاستی اصلاحات اور تعمیر و ترقی کے نتیجے میں ہندوستانی سماج عہد وسطی کے حصار سے آزاد ہوا اور جدیدیت کی راہ پر گامزن ہوا۔ یہ ایک رائے ہے۔ اس نقطہ نظر کی تردید کرنے والے مفکرین قرار دیتے ہیں کہ ہندوستانی سماج

پیداواری اور سماجی اعتبار سے اعلیٰ قدروں پر مبنی تھا۔ جس پر انگریزی راج کے بد اثرات مرتب ہوئے اور ہندوستانی سماج کا روایتی سماجی ڈھانچہ ٹوٹ گیا۔

انگریزی حکومت نے دیسی وسائل کا بے دریغ استحصال کیا۔ لہٰذا ہندوستان جو کہ ایک خوشحال اور صنعتی پیداوار میں ترقی کی راہ پر گامزن ملک تھا۔ بدحالی اور غربت کا شکار ہوگیا۔ اس نقطہ نظر کے حامل مفکرین کہتے ہیں کہ حکمرانوں کی عیاشی انگریزوں کی عیاری اور مسلمانوں کی غداری کے باعث ہندوستان انگریزوں کی غلامی میں چلا گیا۔

اگر ہم سترہویں صدی کے یورپی اور ہندوستانی سماجی سٹرکچر کا موازنہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ یورپی سماج میں کیفیتی تبدیلی نمایاں ہو چکی تھی۔ عہد وسطیٰ کا سماجی ڈھانچہ ٹوٹ چکا تھا۔ یورپ جدید کلچر کے ابتدائی مرحلے کو عبور کر رہا تھا۔ کلچر کی تفہیم کے حوالہ سے میں اس تعریف کو موزوں ترین سمجھتا ہوں، جس کے مطابق ''انسانی دماغوں اور ہاتھوں نے جو کچھ دریافت اور تخلیق کیا ہے کلچر شمار ہوتا ہے۔''

یورپ میں نشاۃ ثانیہ جدید کلچر کے فروغ کا عمل تھا۔ فیوڈل سماج کا پیداواری، معاشی، سیاسی اور فکری نظام مقدس نہ رہا۔ اہل علم نے ارسطو اور کلیسا کے نظریات کو مطلق حقائق ماننے سے انکار کیا۔ نظام شمسی کے بارے میں کوپرنیکس (1542) کا نظریہ مقبول ہوا۔ جب جہاز رانوں کو پتہ چلا کہ زمین چپٹی نہیں گول ہے تو وہ بحری مہموں پر نکل پڑے۔ جہاز رانوں نے امریکہ، ہندوستان، چین، جاپان، آسٹریلیا، فلپائن تک رسائی حاصل کی اور سمندر میں کئی جزیرے دریافت کئے۔

یہ ذوق جنوں نہیں تھا بلکہ یورپ کی فروغ پذیر تجارتی معیشت کا تقاضا تھا۔ سترہویں صدی تک یورپ میں متبادل معاشی، سماجی اور سیاسی نظام کا مضبوط ڈھانچہ قائم ہو چکا تھا۔ جس کی بنیاد سائنسی علوم، ایجادات، مصنوعات اور تجارتی معیشت پر قائم تھی۔ مزدوروں، ہنرمندوں، کارخانہ داروں اور تاجروں کی تنظیمیں قائم ہو چکی تھیں۔ جن کے معاشی اور سیاسی عزائم بھی تھے۔ اپنے معاشی اور سیاسی مفادات کے حصول کے لئے یہ تنظیمیں نہ صرف زبان چلاتی تھیں بلکہ ہاتھ بھی اٹھاتی تھیں۔ پادری نے کہا۔ بادشاہ کو حکومت خدا نے دی ہے لہٰذا اس کا حکم ماننا پڑے گا۔ جواب میں تاجروں نے کہا۔ خدا نے دولت تاجروں کو دی ہے لہٰذا ان کا مطالبہ تسلیم کرنا پڑے گا۔

تاجروں نے ٹیکسوں میں مراعات اور پارلیمنٹ میں شمولیت جیسے مطالبات پیش کئے جو بادشاہ کو تسلیم کرنے پڑے۔ یہی وہ قوت تھی جس نے ترقی پسند ادیبوں اور سائنسدانوں کی پوری

حمایت کی۔ یہ تاریخی حقائق ہیں جو یورپ میں معاشی اور سماجی ترقی کے شواہد قرار پاتے ہیں۔

ہندوستان میں ایسے کوئی شواہد نہیں ملتے۔ ہندوستان پر جاگیردارانہ پیداواری نظام اور سماجی روایات کا غلبہ تھا۔ جاگیردار، کسانوں، دستکاروں اور تاجروں سے ٹیکس وصول کرتے تھے۔ لہٰذا ہندوستان کا تاجر طبقہ جاگیرداروں کے زیرسایہ تھا۔ شاعر اور ادیب درباروں کے ساتھ وابستہ تھے۔ تجارتی معیشت کی ترقی کے بغیر صنعتی پیداوار کا فروغ ممکن نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہندوستان صنعتی معاشی بنیاد قائم کرنے میں ناکام رہا۔ البتہ یہاں وافر زرعی اجناس پیدا ہوتی تھیں اور اعلیٰ معیار کی مصنوعات تیار کرنے والے دستکار معقول تعداد میں موجود تھے۔ خاص طور سے جولاہے اعلیٰ معیار کا سوتی کپڑا بننے کی مہارت رکھتے تھے۔ جس کی یورپ میں بڑی مانگ تھی۔ انگریز تاجروں نے دیگر اجناس کے ساتھ ہندوستان کا سوتی کپڑا برآمد کر کے کافی دولت کمائی۔ میں اپنے گاؤں کے جولاہے بابا دین محمد کے بارے میں جانتا ہوں کہ وہ پورے دن میں گز بھر سے زیادہ کھدر نہیں بنتا تھا۔ کیونکہ دھاگے کی ایک نال کے بعد وہ اپنے کسان دوستوں کے ساتھ تصوف پر گفتگو میں محو ہو جاتا تھا۔ اس کے علاوہ پانچوں وقت نماز کی امامت بھی اس کی ذمہ داری تھی۔ یہ دستکاری کلچر کا روایتی عملی اظہار تھا۔ کیونکہ ہندوستان میں صنعتی اور تجارتی نظام کی بجائے دستکاری کلچر غالب رہا تھا۔ جس میں دستکار منڈی کے معاشی نظام کو گناہ سمجھتا تھا اور تاجر کو لالچی اور حریص قرار دیا جاتا تھا۔ البتہ دستکاری کو اُحترام حاصل تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ بادشاہ اورنگزیب کو ہاتھ سے ٹوپیاں سی کر گذر اوقات کرنے والا حاکم بتایا گیا۔ اگر ہندوستان کا کلچر صنعتی اور تجارتی ہوتا تو بادشاہ کے لئے ٹوپیوں کی فیکٹری لگائی جاتی۔ یوں اس کو جہاں آمدنی معقول ہوتی وہاں ثواب بھی زیادہ ملتا۔

اٹھارہویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی راجپوت، روہیلے، مرہٹے، جاٹ وغیرہ ہندوستان پر غلبہ پانے کی جنگ میں کود پڑے۔

اس جنگی صورت حالات میں یورپ کی تجارتی کمپنیوں نے بھی ہندوستان پر قبضہ کرنے کی عسکری مہم شروع کی۔ 1739 میں نادر شاہ نے پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو شکست دی۔ وہ ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت بحال کرنے کی غرض سے حملہ آور ہوا تھا۔ مگر معقول خراج وصول کر کے واپس ایران چلا گیا۔ 1757 میں جب انگریز بنگال فتح کر رہے تھے احمد شاہ درانی دلّی لوٹ رہا تھا۔ احمد شاہ ہندوستان میں روہیلوں کی مدد کو آیا تھا اور وہ مغلیہ دربار میں ایک افغان کو وزیر اعظم بنا کر

واپس لوٹ گیا۔ اٹھارہویں صدی کے دوران ہندوستان میں نسلی اور فرقہ وارانہ جنگیں جاری رہیں۔ جو اپنے سماجی کردار میں فیوڈل کلچر کی جنگیں تھیں۔ انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی، فرنچ ایسٹ انڈیا کمپنی، نادر شاہ اور احمد شاہ درانی بیرونی قوتیں تھیں جنہوں نے ہندوستان میں عسکری مداخلت کی۔ لیکن بہتر فوجی اور سیاسی حکمت عملی کے باعث انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کامیاب رہی۔ شاید اسی صورت حالات کے پیش نظر ایک انگریز افسر مسٹر لائٹ فٹ نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہندوستان ایک لاش تھی جس پر کئی گدھ جھپٹ رہے تھے۔ ان میں ایک ایسٹ انڈیا کمپنی بھی تھی۔''

ادھر انگلستان میں جیمز واٹ کے جدید سٹیم انجن نے، جو اس نے 1770 میں ایجاد کیا۔ برطانیہ کے صنعت کار طبقے کو بے مثال توانائی فراہم کر دی۔ جس سے برطانوی صنعت کو پر لگ گئے۔ صنعت کار طبقے نے پارلیمنٹ میں سیاسی اثر ورسوخ بڑھایا اور 1834 میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت پر پابندی لگادی۔ یوں ہندوستان برطانوی صنعت کو خام مال فراہم کرنے والی کالونی میں تبدیل ہو گیا۔

اس حوالے سے کارل مارکس نے کہا۔ ہندوستان وافر زرعی اجناس پیدا کرنے والا ملک تھا۔ جس کی صنعت وحرفت کو برطانیہ کی بھاپ اور انجن کی قوت نے برباد کر دیا۔ برطانوی دور میں ہندوستان کا جتنا استحصال ہوا تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ مارکس نے کہا ہندوستان کا مقدر یہی تھا۔ کیونکہ یہ معاشی وسماجی اعتبار سے جمود کا شکار خطہ تھا۔ لیکن برطانوی سرمایہ داری نظام نے یہ جمود توڑ دیا ہے۔ اور ہندوستانی سماج کی نشوونما شروع ہو جائے گی۔ صنعتی ترقی کے ذریعے سماجی کیفیت تبدیل ہوگی اور ایسی قوتیں پیدا ہوں گی جو برطانیہ سے آزادی حاصل کرلیں گی۔ کارل مارکس کا تجزیہ کافی حد تک درست ثابت ہوا۔ 1947 میں ہندوستان نے آزادی حاصل کر لی اور پاکستان وجود میں آ گیا۔

گذشتہ 60 برس میں پاکستان کے جاگیردار، تاجر، صنعتکار اور ریاستی افسران برطانیہ اور امریکہ کے اتنے ہی وفادار رہے ہیں جتنے دور غلامی میں رہے تھے۔ آج ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ ملٹی نیشنل کارپوریشنوں نے حاصل کرلی ہے اور پاکستان کو عظیم ملک بنانے کے دعویداران کے اتحادی ہیں۔

(طفیل ڈھانہ بیالوجی کے پروفیسر ہیں اور ارتقا میں خاص دلچسپی رکھتے ہیں)

❁❁❁❁❁

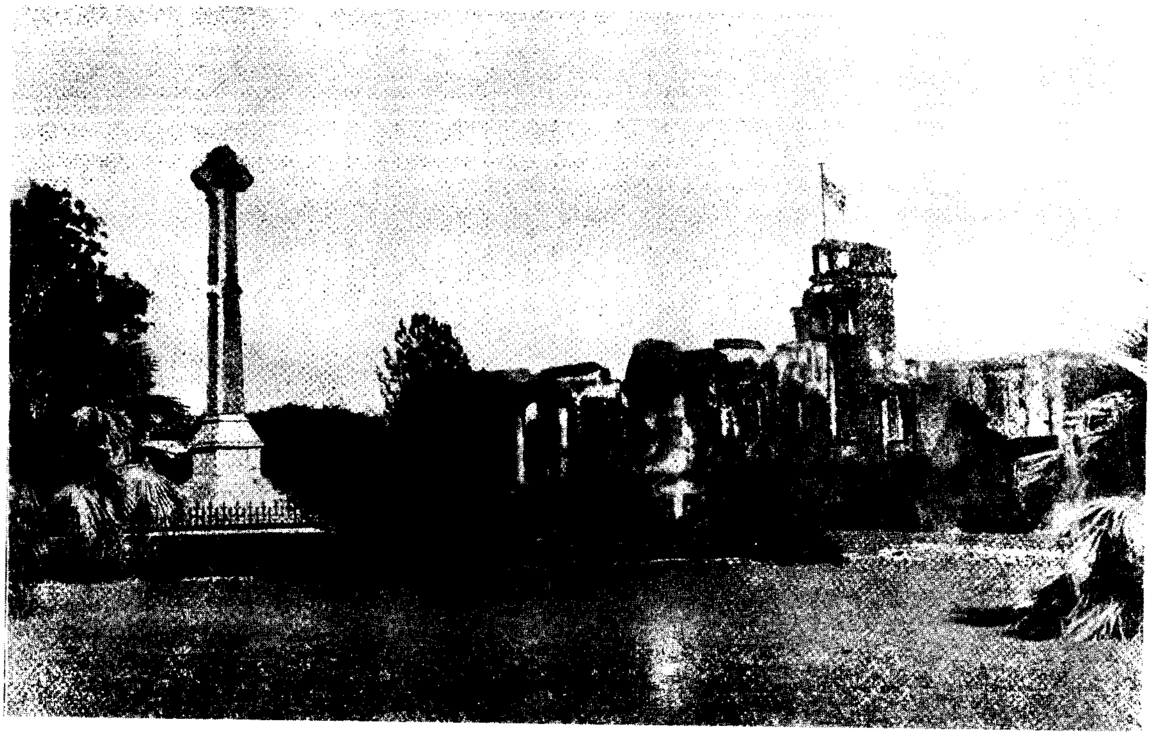

لکھنو ریذیڈنسی اور یادگار لارنس

1857 سے پہلے کے ہندوستانی انقلابی مراکز

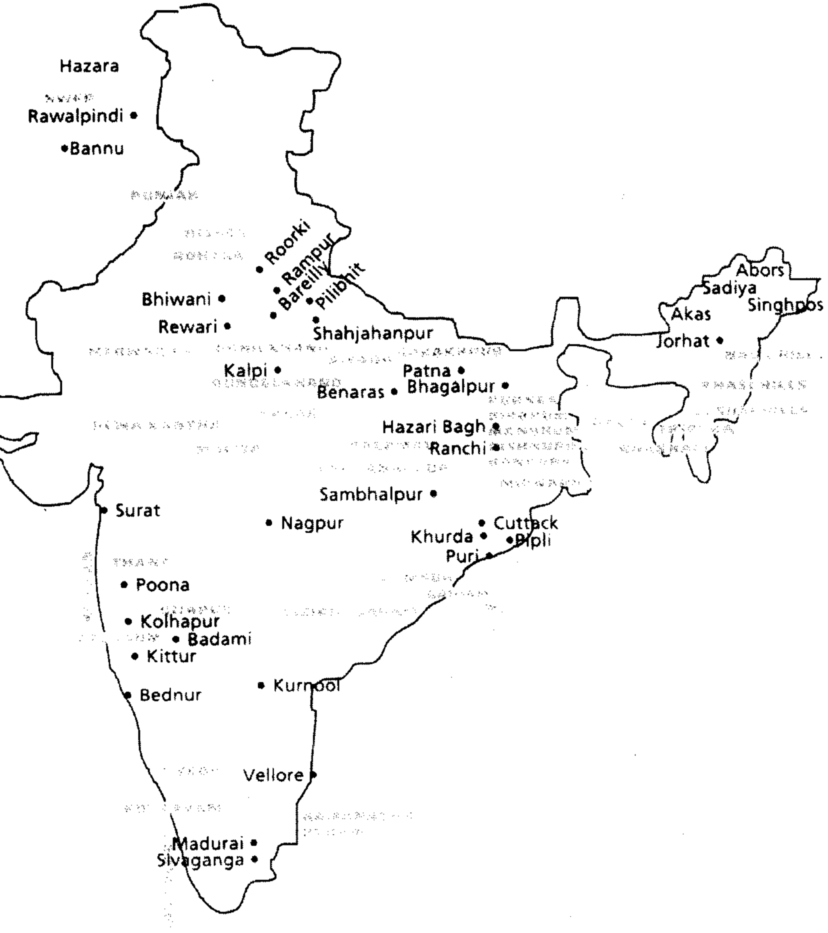

جھانسی کی رانی لکشمی بائی

لکشمی بائی کی مہر

منگل پانڈے

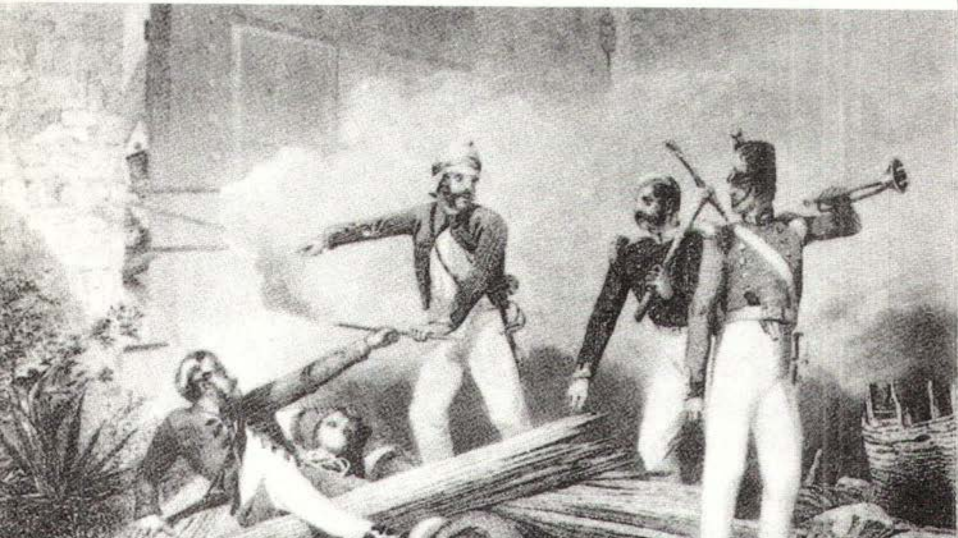

برطانوی فوجی دستہ کشمیری گیٹ دلی پر دھاوا بولتے ہوئے

1860 کے کسان

بیگم حضرت محل

سکھ ہارس رجمنٹ لکھنو

ٹاٹیا ٹوپ پھانسی کی سزا ملنے سے کچھ دیر پہلے

ناناصاحب کی فوج کا کمانڈر جوالا پرشاد

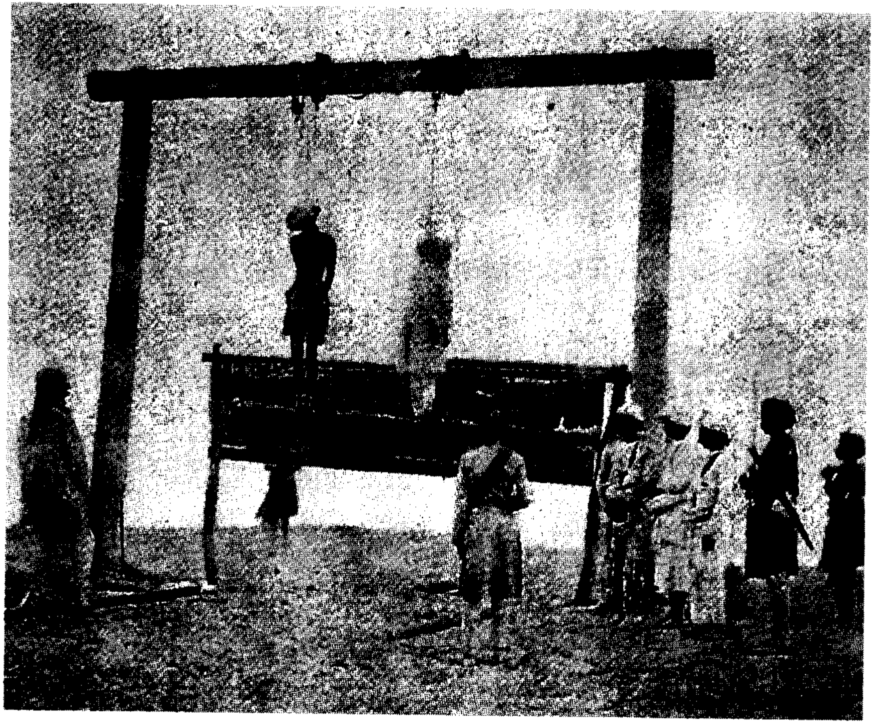

باغیوں کو پھانسی پر لٹکایا جا رہا ہے

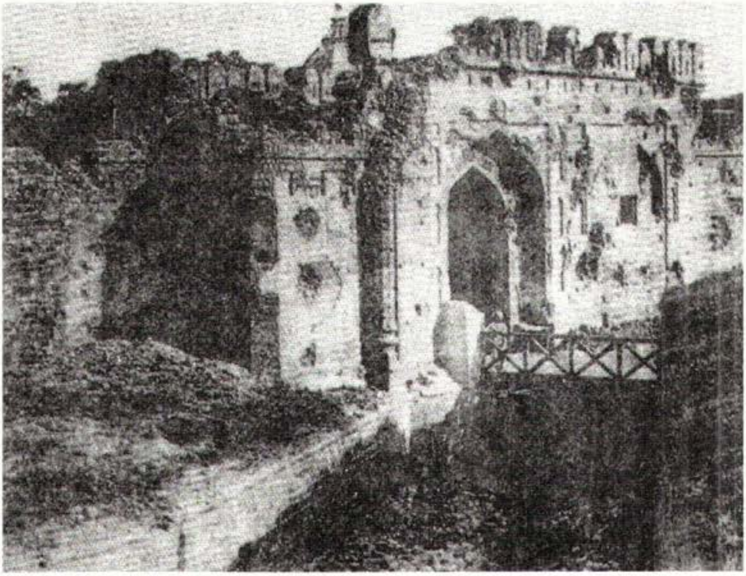

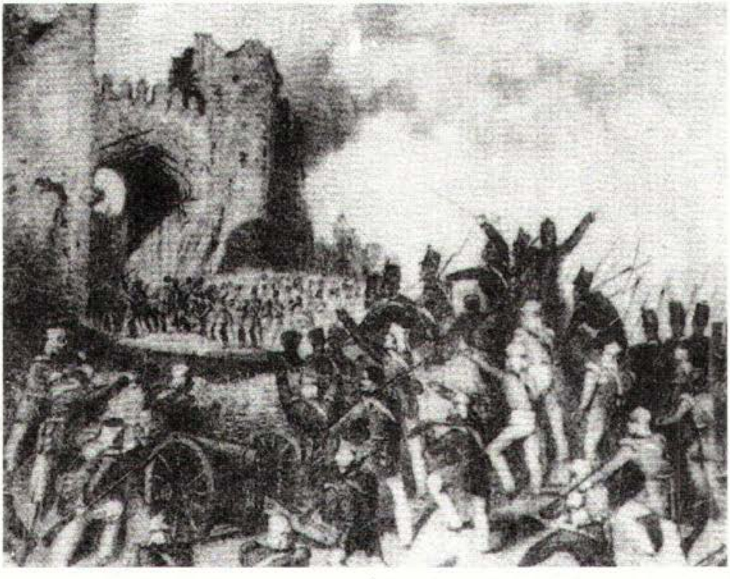

دلی کا تباہ شدہ کشمیری گیٹ

ناناصاحب

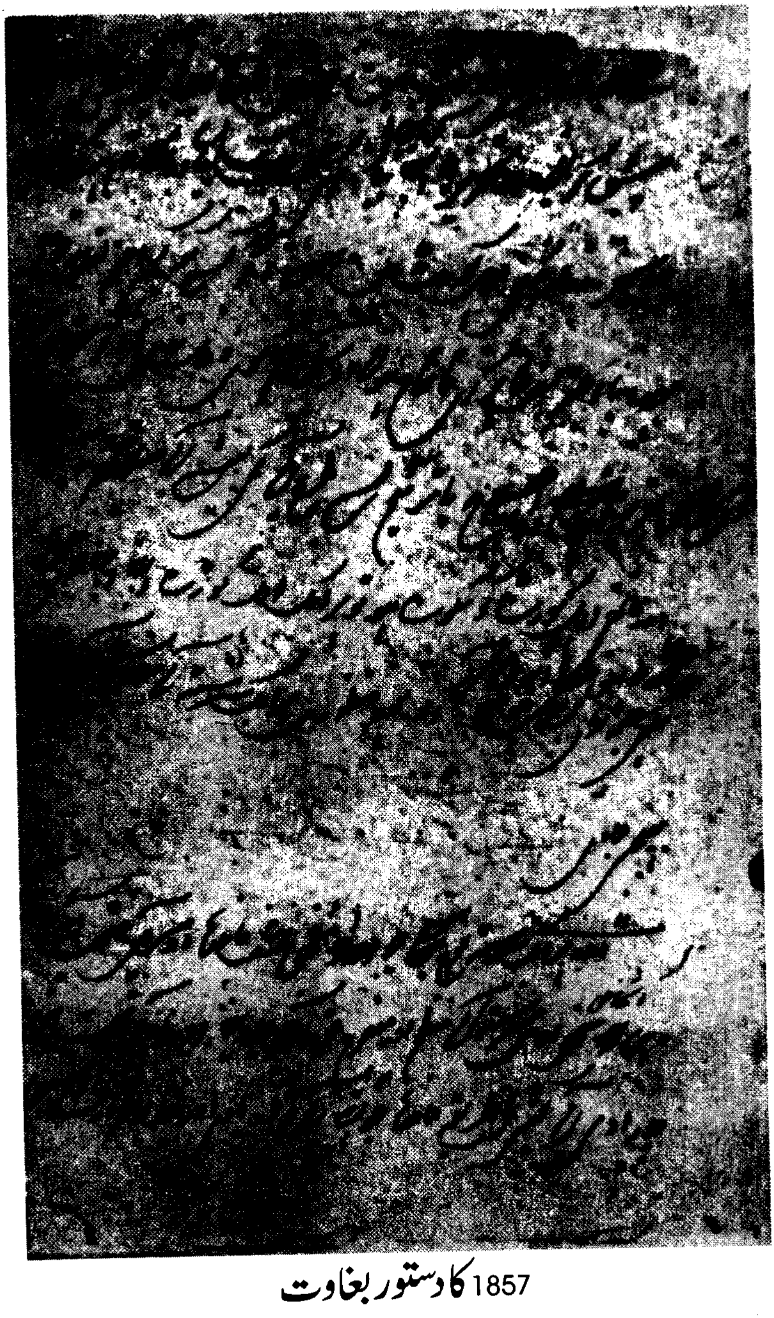

1857 کا دستور بغاوت

صادق الاخبار

اشتہار

شکریہ

سید جمیل الدین خان

اشتہار شکر

دلی کے اردو اخبار میں چھپنے والا بہادر شاہ ظفر کا اعلان

غازیوں میں بُو رہے گی جب تلک ایمان کی
تختِ لندن تک چلے گی تیغ ہندُستان کی

بہادر شاہ ظفر

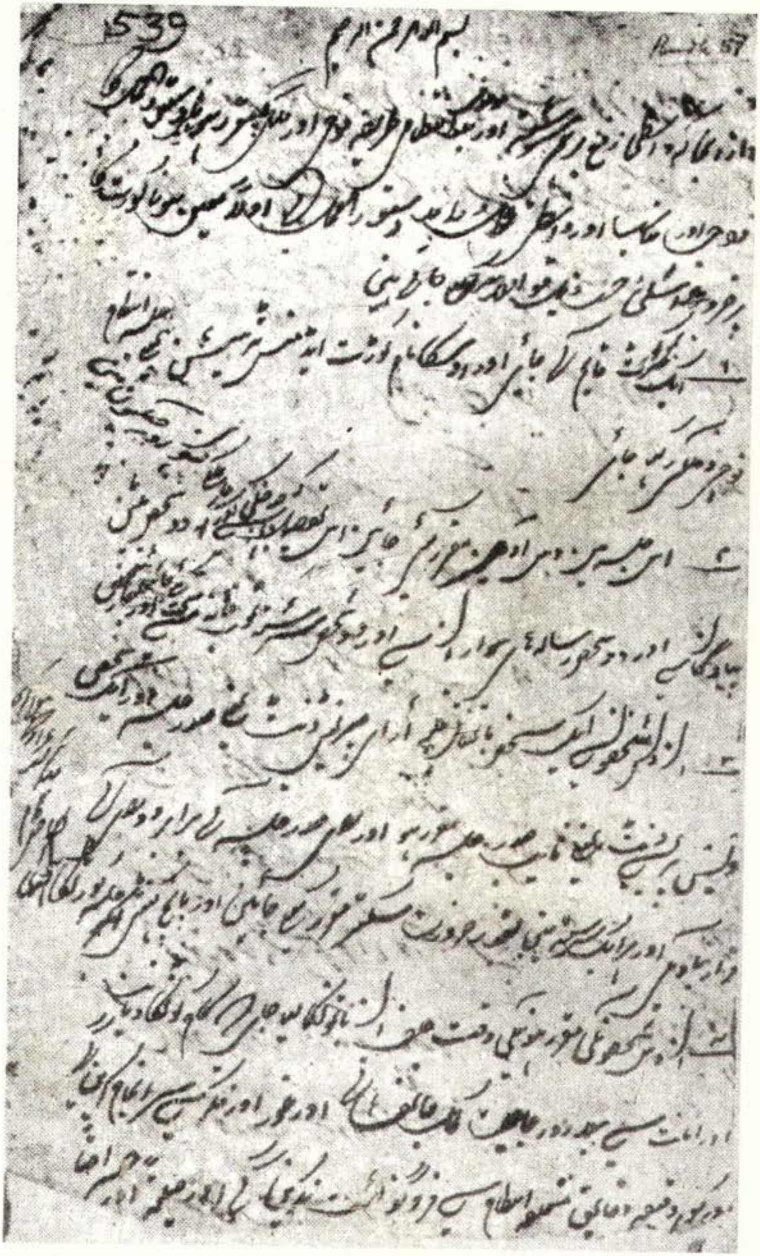

1857 کا دستور بغاوت